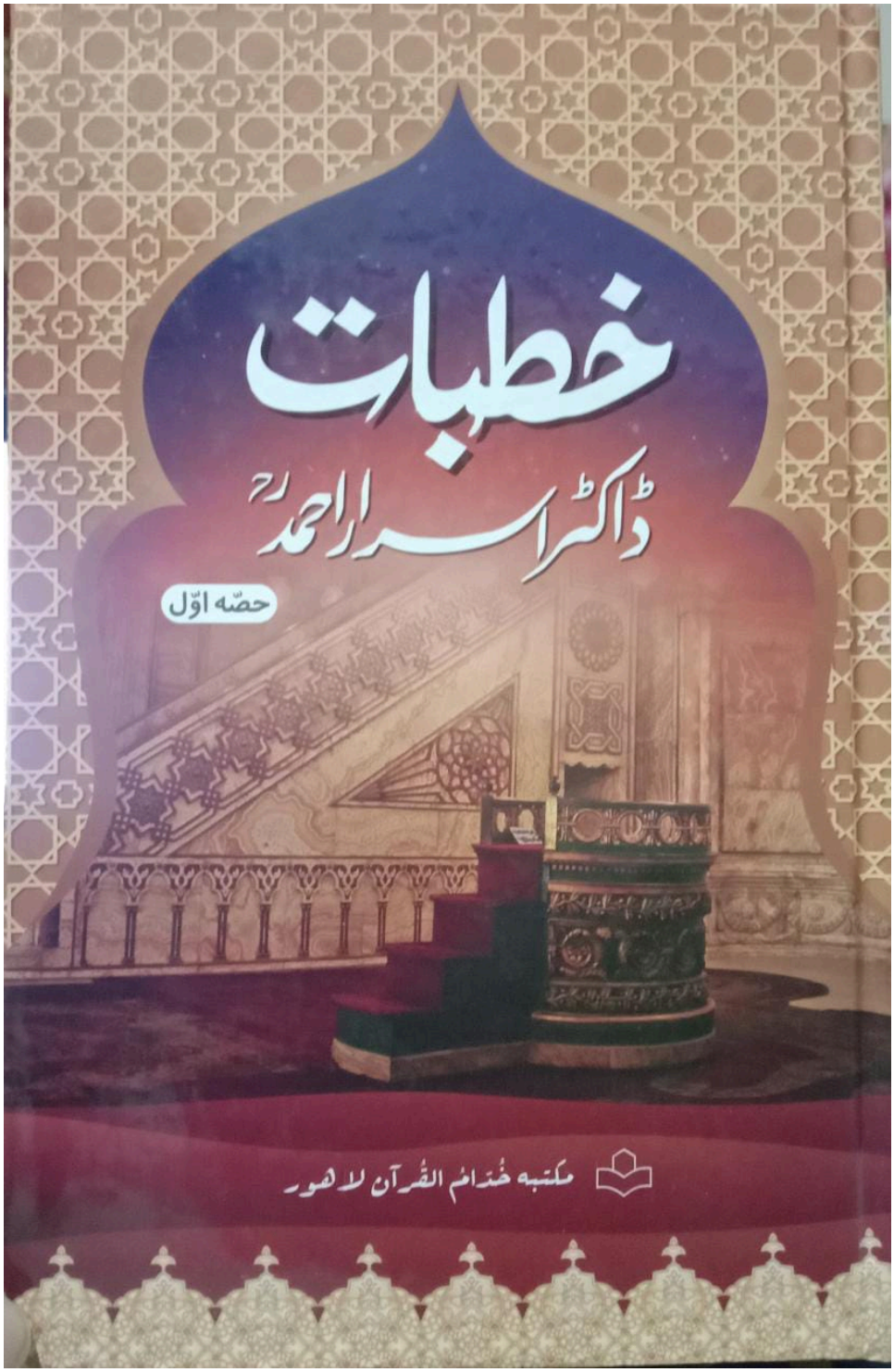

خطبات ڈاکٹر اسرار احمد

ڈاکٹر اسرار احمد

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تقدیم

اللہ تبارک و تعالیٰ کی سُنّت ہے کہ وہ ہر زمانے میں وقفہ وقفہ سے ایسے رجالِ دین پیدا فرماتا رہتا ہے جو اُس کے دینِ متین کی حقانیت کو دلائل و براہین اور اپنے حسنِ عمل سے واضح کرتے رہتے ہیں۔ انہی جلیل القدر اشخاص میں سے ایک ہمارے اپنے زمانے کی شخصیت بانی تنظیم اسلامی و صدر مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ علیہ ہیں' جنہیں اللہ تبارک و تعالیٰ نے ہمہ جہت صفاتِ عالیہ سے خوب نوازا تھا۔ آپ سچّے اور پکّے مؤمن تھے۔ قرآنِ مجید اور احادیثِ شریفہ میں مؤمن کی جن صفاتِ عالیہ کا ذکر کیا گیا ہے وہ قریباً آپؒ کی ذات میں یکجا تھیں۔ مؤمن کی ایک بہت بڑی صفت یہ ہے کہ وہ دوسروں کے لیے بھی وہی پسند کرتا ہے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے ۔ اگر اسی ایک صفت کے بارے میں غور و خوض کیا جائے تو ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی ساری زندگی اس صفت سے عبارت ہے۔ آپؒ نے اللہ سبحانہ وتعالیٰ اور اس کے رسول محمد مصطفیٰ ﷺ کی ذاتِ اَقدس اور ان کی لائی ہوئی شریعتِ مطہرہ کو دل و جان سے قبول کیا او رپھر ان تقاضوں کی ادائیگی کے لیے اپنے جسم و جان کی ساری توانائیاں نچوڑ دیں اور اس پیغام کو چار دانگ عالم میں پھیلانے کے لیے قریہ قریہ' گائوں گائوں' شہر شہر اور ملکوں ملکوں دشوار گزار اسفار کو خوش دلی سے اختیار کیا۔

حق سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے خاص فضل و کرم سے آپؒ کے زبان و دل کو دین کی تبلیغ و اشاعت کے لیے کھول دیا تھا اور آپ نے اس فضلِ ربّانی سے خوب استفادہ فرمایا۔ مَیں نے حضرت عطاء اللہ شاہ بخاریؒ مولانا ابوالکلام آزادؒ اور نواب بہادر یار جنگؒ جیسے خطباء کو دیکھا اور سنا تو نہیں لیکن اپنے اساتذہ و اکابرین سے ان کے بارے میں محیر العقول باتیں سنی اور پڑھی تھیں۔ قریباً ویسے ہی ڈاکٹر صاحبؒ کے محیر العقول خطبات اپنے سر کے

کانوں سے سنے اور سر کی آنکھوں سے سامعین و ناظرین کی ویسی ہی حالت پائی جو ان حضرات کے خطبات کے بارے میں سنی تھیں۔ ذٰلِکَ فَضۡلُ اللّٰہِ یُؤۡتِیۡہِ مَنۡ یَّشَآءُ۔

آپ کے خطباتِ عالیہ میں ڈاکٹر علامہ اقبال مرحوم کا سوزِ دروں' مولانا فراہیؒ و اصلاحیؒ کا تدبر و تعمق اور ابوالاعلیٰ

ؒ ابوالکلام ؒ کا غلبۂ دین کا حرکی تصوّر موجزن ہونے کے ساتھ ساتھ یہ ادبیت کی چاشنی سے معمور ہوتے تھے۔ آپ کے خطبات میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ اور شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے رسوخ فی العلم کی جھلک بھی نظر آتی تھی۔ اس پر مستزاد آپؒ کے منطقی و استدلالی اندازِ خطابت اور اس سے بڑھ کر الفاظ کی ادائیگی کے زیروبم، چشم و ابرو کے اشارے اور موقع محل کی مناسبت سے فارسی و اردو کے موزوں اشعار سے ایک سحر بندھ جاتا تھا۔

الحمد للہ اس حقیر و عاجز نے انسانی سمندر کے سے اجتماع میں ڈاکٹر صاحبؒ کو خطاب فرماتے سنا ہے اور سامعین کو اس حال میں دیکھا ہے کہ وہ ہمہ تن گوش ہونے کے ساتھ ساتھ زمان و مکاں کی قید سے گویا آزاد ہو چکے ہیں۔ ڈھائی ڈھائی تین تین گھنٹے گزر جانے کے بعد نہ تو خطیب تھکاوٹ کا شکار ہوتا ہے اور نہ سامعین و ناظرین سیر ہوتے ہیں۔یعنی ''دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی'' کا نقشہ چشمِ فلک نے قریباً نصف صدی سے زیادہ تک ٹکٹکی باندھے دیکھا ہے اور وہ اس سوچ میں غلطاں رہتا ہوگا ''کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل نہ بن جائے!'' فلک پیر کی یہ سوچ صدفی صد صحیح ثابت ہوئی کہ آج پوری دنیا میں جہاں بھی اردو بولنے والا طبقہ موجود ہے وہ ڈاکٹر صاحبؒ کے خطبات اور دروس سے اپنے قلوب و اذہان کو جلا بخش رہا ہے اور دینِ متین کے حرکی تصوّر سے روشناس ہو کر اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے لیے کمر کس رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی جلائی ہوئی شمع اب رحمتِ خداوندی سے مہر عالم تاب بن چکی ہے اور سینکڑوں نہیں لاکھوں سعید روحیں اس نیر تاباں سے مستفید ہو رہی ہے۔

ڈاکٹر صاحبؒ کے وہ خطبات جو طویل ہیں وہ تو کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں، مگر مختصر مختصر خطبات جو چند صفحات پر مشتمل ہوتے ہیں وہ ''حکمت و فلسفہ دین کا خزانہ'' ہیں اور ان میں ایسے لعل و گوہر پوشیدہ ہیں جن سے نوعِ انسانی فائدہ اٹھا کر دین و دنیا کی

سعادتیں سمیٹ سکتی ہے۔

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور اس عظیم مفکر و مدبر کے خطبات و دروس کو اُمّتِ مسلمہ تک پہنچانے کی سعی و جُہد کرتی رہتی ہے۔ مکتبہ خدام القرآن اپنی بساط کے مطابق آپؒ کے آڈیو، ویڈیو دروس و خطبات کے فروغ کے ساتھ ساتھ آپؒ کی تصنیفات و تالیفات کو کتابی شکل میں شائع کرتا ہے۔ اس ضمن میں یہ ایک نئی کوشش ہے کہ آپ کے چیدہ چیدہ خطبات کو یکجا کر کے ''خطباتِ ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ علیہ'' کے عنوان سے ایک سیریز کی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے، جس کی یہ پہلی جلد ہے۔ان شاء اللہ بہت جلد دوسری اور تیسری جلد بھی آپ کے ہاتھوں میں ہوگی۔ السعی منا والاتمام من اللہ۔ نیزوما توفیقی الّا باللہ!

قارئین سے دست بستہ گزارش ہے کہ حضرت ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے لیے دعا فرمائیں کہ ربّ العزت

آپ کی قربانیوں اور مساعی جلیلہ کو قبول فرماتے ہوئے اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے ۔آمین یاربّ العالمین !
اس کتاب کی تیاری میں جن جن حضرات نے حصّہ لیا ہے اللہ تعالیٰ ان کی اس خدمت کو قبول فرمائیں ،آمین !

شیخ رحیم الدین عفی عنہ

نگرانِ طباعت
06/10/21

کائنات کی تخلیق اور

آسمانی ہدایت کے تدریجی مراحل

۷،نومبر۲۰۰۸ء کا خطابِ جمعہ

تنظیم اسلامی کا کُل پاکستان اجتماعِ عام ۲ تا ۴ نومبر۲۰۰۸ء فردوسی فارم، دراجکے (سادھوکی) کے مقام پر منعقد ہوا۔ اجتماع کے آخری روز ۴نومبر کو شرکائِ اجتماع ریلی کی صورت میں اجتماع گاہ سے روانہ ہوئے اور جی ٹی روڈ کے راستے مینارِ پاکستان پہنچے۔ مینارِ پاکستان کے سبزہ زار میں بانی تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے رفقائِ تنظیم اسلامی اور دیگر حاضرین سے سورۃ المدثر کی آیات ۳۲۔۳۶ اور سورۃ الانشقاق کی آیات ۱۶۔۲۰ کی روشنی میں ایک

مختصر مگر جامع خطاب فرمایا۔ بعد ازاں محترم ڈاکٹر صاحب نے اس جامع اور compact خطاب کے مضامین کو جامع القرآن قرآن اکیڈمی لاہور میں اپنے پانچ خطاباتِ جمعہ میں سلسلہ واریان فرمایا۔

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اعوذ باللہ من الشَّیطٰن الرَّجیم ۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ {کَلَّا وَ الۡقَمَرِ ﴿۳۲﴾ وَ الَّیۡلِ اِذۡ اَدۡبَرَ ﴿۳۳﴾ وَ الصُّبۡحِ اِذَاۤ اَسۡفَرَ ﴿۳۴﴾ اِنَّہَا لَاِحۡدَی الۡکُبَرِ ﴿۳۵﴾ نَذِیۡرًا لِّلۡبَشَرِ ﴿۳۶﴾ } (المدثر)

{فَلَاۤ اُقۡسِمُ بِالشَّفَقِ ﴿۱۶﴾ وَ الَّیۡلِ وَ مَا وَسَقَ ﴿۱۷﴾ وَ الۡقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ ﴿۱۸﴾ لَتَرۡکَبُنَّ طَبَقًا عَنۡ طَبَقٍ ﴿۱۹﴾ فَمَا لَہُمۡ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۲۰﴾ } (الانشقاق)

اللہ تعالیٰ کے احسانات پر شکر کی تلقین

محترم رفقاء تنظیم اسلامی و احباب گرامی ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ !

اللہ تعالیٰ نے ہمیں جو کچھ نعمتیں بخشی ہیں اُن پر میں خود بھی اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں اور آپ سب سے بھی یہ کہتا ہوں کہ اللہ کا شکر ادا کریں۔ ویسے تو قرآن میں آیا ہے کہ: {وَ اِنۡ تَعُدُّوۡا نِعۡمَتَ اللّٰہِ لَا تُحۡصُوۡہَا} (ابرٰھیم:۳۴) ''اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرنا چاہو تو اُن کا احاطہ نہیں کر سکتے''۔ یقیناً اللہ کی نعمتیں بے شمار ہیں' جن کا ہمیں احساس اور ادراک نہیں' لیکن بہرحال جو بڑی بڑی نعمتیں ہمیں عطا ہوئی ہیں انہیں گن لیجیے۔

سب سے پہلے ہمیں اس پر شکر کرنا چاہیے کہ اللہ نے ہمیں شرفِ انسانیت سے سرفراز فرمایا۔ وہ انسان جو مسجودِ ملائک ہے' جس کے بارے میں فرمایا: {وَلَقَدۡ کَرَّمۡنَا بَنِیۡۤ اٰدَمَ} (الاسراء:۷۰) ''اور ہم نے بنی آدم کو بزرگی عطا کی ہے''۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو تکریم عطا کی ہے اس کے باعث یہ اشرف المخلوقات کہلاتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں جو بنی نوعِ آدم میں سے پیدا کیا یہ اللہ کا ہم پر بہت بڑا احسان ہے۔

پھر اس کا دوسرا بڑا احسان ہم پر یہ ہے کہ ہمیں مسلمانوں کے گھروں میں پیدا کیا۔ ظاہر ہے کہ اس میں ہماری کسی محنت کو دخل نہیں ہے' یہ تو اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے۔ اگر خدانخواستہ ہم کسی غیر مسلم گھرانے میں' ہندوئوں میں' سکھوں میں' عیسائیوں میں یا یہودیوں میں پیدا ہو گئے ہوتے تو اِس بات کا کتنا امکان تھا کہ ہمیں نعمتِ اسلام میسّر آتی؟ ہم میں سے کتنے لوگ ہیں جو پھر بھی اپنی طلب و جستجو سے تلاشِ حق میں سرگرداں ہوتے اور اسلام کو اختیار کرتے؟ ظاہر بات ہے کہ اس کا تو نہ ہونے کے برابر امکان ہے۔ تو یہ اللہ کا دوسرا بڑا فضل و احسان

ہے کہ اس نے ہمیں مسلمانوں میں پیدا کیا۔

تیسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں دولت ایمان سے نوازا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی ایک خصوصی عنایت ہے اور یہ وہ دولت ہے جس سے تمام مسلمان سرفراز نہیں ہیں۔ اگر ہم اپنے گریبانوں میں جھانکیں اور قلب کی گہرائیوں میں دیکھیں تو ہم میں سے جس کو بھی' وہاں ایمان نظر آئے وہ اللہ کا شکر ادا کرے۔ اس لیے کہ ایمان سے بڑی دولت اور کوئی نہیں۔

8

پھر اس پر بھی اللہ کا شکر واجب ہے کہ اُس نے ہمارے سینوں کو اسلام کے لیے کھول دیا۔ اس کے کیا معنی ہیں؟ ہم جو یہ دعا مانگا کرتے ہیں: اَللّٰھُمَّ نَوِّرْ قُلُوْبَنَا بِالْاِیْمَانِ وَاشْرَحْ صُدُوْرَنَا لِلْاِسْلَامِ ''اے اللہ! ہمارے دلوں کو نورِ ایمان سے منور فرما دے اور ہمارے سینوں کو اسلام کے لیے کھول دے''۔تو ایک ہے ایمان سے دلوں کا منور ہو جانا اور ایک ہے اسلام پر انشراح حاصل ہو جانا۔ یعنی یہ اطمینان حاصل ہو جانا کہ یہی بہترین نظام ہے جو اللہ نے ہمیں عطا کیا۔ اس کی تفاصیل پر بھی ذہناً اور عقلاً اطمینان ہو جانا کہ واقعتاً یہی بہترین نظام اور یہی بہترین قانون ہے جو اللہ نے عطا فرمایا ہے۔ اس پر انشراح ہو جانا کہ یہی سیاسی نظام' یہی معاشی نظام اور یہی سماجی نظام بہترین ہے جو اللہ نے دیا ہے۔ محمد رسول اللہ ﷺ کو بھی اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ احسان گنوایا ہے:{اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَ ۝ ۱ } (الانشراح) ''کیا ہم نے آپ کے لیے آپ کا سینہ کھول نہیں دیا؟'' ایک اور مقام پر آتا ہے:{فَمَنْ یُّرِدِ اللّٰہُ اَنْ یَّھْدِیَہٗ یَشْرَحْ صَدْرَہٗ لِلْاِسْلَامِ ۚ} (الانعام:۱۲۵) ''پس جس کے لیے اللہ ارادہ کرتا ہے کہ اسے ہدایت بخشے اس کے سینے کو اسلام کے لیے کھول دیتا ہے''۔ یعنی اس کو واقعتاً نظر آ جاتا ہے کہ اسلام کی ہر تعلیم بہترین ہے' نورانی ہے' عقل و شعور کے ترازو میں پوری اترنے والی ہے۔ اس پر جس کسی کو بھی انشراح حاصل ہو جائے' جس درجے میں بھی ہو اس پر اللہ کا بڑا فضل ہے' اور اس کے ذِمّے ہے کہ وہ اللہ کے اس احسان پر شکر ادا کرے۔

پھر اس سے بھی آگے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کا ہم پر یہ فضل ہوا ہے کہ اُس نے ہمیں دین کا جامع تصوّر بھی بخشا اور فرائض دینی کے جامع تصوّر کا شعور بھی عطا کیا۔دین کا جامع تصوّر یہ کہ دین اسلام صرف ایک مذہب نہیں ہے' یہ صرف انفرادی زندگی کا معاملہ نہیں ہے' یہ صرف عقائد' عبادات اور چند رسومات پر مشتمل نہیں ہے' بلکہ یہ دین ہے' ایک مکمل نظام ہے۔اور ایک مکمل نظام ہونے کی وجہ سے ہی سے یہ نوعِ انسانی کے لیے رحمت بنتا ہے۔ اس لیے کہ یہی وہ واحد نظام ہے جو سیاسی سطح پر' معاشی سطح پر اور سماجی سطح پر عدل و انصاف فراہم کرتا ہے۔ اس سوشل جسٹس کے لیے قرآن ''قسط'' کی اصطلاح استعمال کرتا ہے اور

9

اہل ِ ایمان کو حکم دیتا ہے کہ اس قسط کو قائم کرو: {یٰٓاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کُوۡنُوۡا قَوّٰمِیۡنَ بِالۡقِسۡطِ شُہَدَآءَ لِلّٰہِ} (النساء:۱۳۵) ''اے ایمان والو! عدل و انصاف کے علمبردار بن کر کھڑے ہو جاؤ پوری قوت کے ساتھ اور اللہ کی طرف سے گواہی دینے والے بن جاؤ''۔ ایک جگہ فرمایا:{قُلۡ اَمَرَ رَبِّیۡ بِالۡقِسۡطِ ۟} (الاعراف:۲۹) ''(اے نبی ﷺ!) کہہ دیجیے کہ میرے ربّ نے تو مجھے عدل کا حکم دیا ہے''۔ اور سورۃ الحدید میں یہ بھی فرمایا کہ : {لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا رُسُلَنَا بِالۡبَیِّنٰتِ وَ اَنۡزَلۡنَا مَعَہُمُ الۡکِتٰبَ وَ الۡمِیۡزَانَ لِیَقُوۡمَ النَّاسُ بِالۡقِسۡطِ ۚ}(آیت ۲۵)''ہم نے اپنے رسولوں کو بھیجا بینات (اپنی نشانیاں اوروا ضح تعلیمات) دے کر اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان اتاری' تاکہ لوگ عدل پر قائم رہیں''۔ تو وہ دین جو ہمیں ملا ہے درحقیقت ایک مکمل اور اس کے ساتھ ساتھ معتدل اور متوازن سسٹم آف سوشل جسٹس ہے' محض عقیدہ' عبادات اور رسومات کا پلندہ نہیں۔

پھر یہ کہ ہمیں فرائض دینی کا جامع تصوّر نصیب ہوا کہ جہاں نماز' روزہ' زکوٰۃ اور حج فرض ہے وہاں اقامت ِدین کی جدّوجُہد بھی فرض ہے۔ مسلمانوں میں سے بہت کم لوگ ہیں جو اِس تصوّر کے حامل ہیں۔ آج ۹۹ فیصد مسلمان تو اسلام کو صرف مذہب سمجھ رہے ہیں' دین سمجھ ہی نہیں رہے۔ اور اس کو قائم کرنا بھی کوئی ذِمّہ داری ہے' اس کا تو ہمارے ہاں کوئی تصوّر ہے ہی نہیں۔ عبادات کا تصوّر تو بہت پختہ ہے۔ ہر سال تیس تیس لاکھ آدمی حج کرتے ہیں۔ مسلمانوں میں عمروں کی ادائیگی کا بھی بہت ذوق و شوق ہے اور رمضانِ مبارک کے عمرے میں حج سے بھی زیادہ حاضری ہو جاتی ہے۔ حیران کن بات ہے کہ اب ہزاروں افراد کے اعتکاف ہونے لگے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کے اس شہر لاہور میں ۲۵ ہزار افرادکا شہر اعتکاف آباد کیا گیا۔ شنید ہے کہ اہل حدیث حضرات کے ہاں جامع قادسیہ میں بھی اڑھائی ہزار کے قریب لوگ اعتکاف میں بیٹھے۔ تو یہ مذہب کا تصوّر تو ہے' مگر دین کہاں ہے؟ روئے ارضی پر کوئی ایک انچ زمین دکھا دیں جہاں اللہ کا دین بہ تمام و کمال قائم ہو! چنانچہ اقامت ِدین کی فرضیت کا شعور بھی اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ پھر اس کے لیے

کسی منظم جماعت میں شامل ہو کر دامے' درمے' سخنے' اپنی جان اور مال کے ذریعے سے جدّوجُہد کی جائے' یہ میرے نزدیک اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا احسان ہے جو کسی فردِ بشر پر ہو سکتا ہے۔ تو اِن تمام انعامات پر اللہ تعالیٰ کا شکر و سپاس لازم ہے۔

میں نے ابھی اللہ تعالیٰ کے مادّی انعامات کا ذکر نہیں کیا جو ہمیں میسّر ہیں۔ بے شمار ایسی بیش قیمت نعمتیں ہیں جو بلاقیمت ملتی ہیں۔ مثلاً ہوا اور پانی ہی کو لیجیے جن پر ہماری زندگی کا دار و مدار ہے۔ اور نمعلوم کتنی نعمتیں ہیں جن کا ہم حساب بھی نہیں کر سکتے۔ ہمیں آج معلوم ہوا ہے کہ ہری مرچ کے اندر وٹامن سی کا بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ امیر آدمی وٹامن سی حاصل کرنے کے لیے سنگترے اور مالٹے کھاتا ہے' لیکن اللہ نے ایسا نظام رکھا ہے کہ

غریب آدمی بھی محروم نہ رہے۔ چنانچہ ہری مرچ کے اندر اس سے کئی گنا زیادہ وٹامن سی رکھ دیا ہے۔ اگر کسی غریب آدمی نے ہری مرچ میں نمک رگڑ کر اس کی چٹنی بنائی اور اس سے روٹی کھالی تو اس کو بھی وٹامن سی تو مل گیا۔ اسی طرح وٹامن اے کاڈلیور آئل اور دوسرے بڑے قیمتی روغنیات میں ہوتا ہے' لیکن اس کی سب سے بڑی مقدار گاجر میں ہے۔ یہ تو جیسے جیسے ہماری سائنسی معلومات بڑھ رہی ہیں تو اللہ کی نعمتوں کا اندازہ ہو رہا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں تو کھلی ہیں لیکن دل اندھے ہیں۔ یہ چیزیں نظر آ رہی ہیں' لیکن اللہ کی نعمت کا تصوّر اب بھی حاصل نہیں ہو رہا۔

دو قرآنی دعائوں کے التزام کی ہدایت

آپ پر اللہ تعالیٰ کے جو انعامات اور احسانات ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں ان پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے دو دعائوں کا التزام کریں اور انہیں اپنا صبح و شام کا وظیفہ بنا لیں ایک تو وہ دُعا جو سورۃ الاعراف میں نقل کی گئی ہے۔ جب اہل ِجنّت جنّت میں داخل ہو جائیں گے تب ایک ترانۂ حمد اُن کے دلوں کی گہرائیوں سے نکلے گا: {اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ ہَدٰىنَا لِہٰذَا ۫ وَمَا كُنَّا لِنَہْتَدِیَ لَوْلَآ اَنْ ہَدٰىنَا اللّٰہُ ۚ}(آیت ۴۳) ''کُل شکر و سپاس' کُل حمد وثنا اور کُل تعریف اُس اللہ کے لیے ہے جس نے ہمیں اِس مقام تک پہنچا دیا 'اور ہم کبھی یہاں نہ پہنچ پاتے اگر اللہ ہماری راہنمائی نہ کرتا''۔ ھَدٰىنَا لِھٰذَا کا

ترجمہ تو ہو گا ''جس نے ہمیں اس کی ہدایت دی''۔ یعنی ہمیں ہدایت دی جس کے نتیجے میں ہم یہاں تک پہنچ گئے۔ اور ہدایت کا آخری درجہ یہی ہوتا ہے۔ میں نے کئی مرتبہ واضح کیا ہے کہ آپ سے کوئی شخص کسی جگہ کا پتا پوچھتا ہے۔ آپ اُس کی راہنمائی کرتے ہیں کہ یہاں سے سیدھے چلے جائو' آگے چوک سے بائیں ہو جانا' پھر چوتھی لائٹ آئے گی تو اس سے دائیں مڑ جانا... یہ بھی ہدایت (راہنمائی) ہے۔ آپ نے اسے راستہ تو بتا دیا نا! لیکن اگر آپ اس کی انگلی پکڑ کر کہیں کہ آئو بھئی میں آپ کو وہاں پہنچا دیتا ہوں اور اسے اپنے ساتھ لے کر اُس کی منزل تک پہنچا آئیں تو یہ راہنمائی کا بہترین انداز ہے۔

اللہ کی ہدایت کی بھی آخری شکل یہ ہے کہ وہ انگلی پکڑ کر ہمیں ہدایت کی آخری منزل تک پہنچا دے۔ یقیناً وہ اس طرح کی ہدایت سے بھی نوازتا ہے جس کو چاہتا ہے۔ یہ اُس کی سُنّت ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:{وَالَّذِیْنَ جَاہَدُوْا فِیْنَا لَنَہْدِیَنَّہُمْ سُبُلَنَا ۭ} (العنکبوت:۶۹) ''اور جو لوگ ہماری راہ میں محنت کرتے ہیں ہم ضرور انہیں اپنے راستے دکھائیں گے۔''اور یہ محنت اللہ کی معرفت حاصل کرنے کی محنت بھی ہے ---- اللہ پر ایمان حاصل کرنے کی محنت بھی ہے ---- پھر صحیح طرز پر کام کرنے والی جماعت کی شناخت اور پہچان کی محنت بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ ایسی محنت کرنے والوں کے لیے اپنے راستے کھول دیتا ہے۔ تو یہ ساری نعمتیں جو میں نے گنوائی ہیں ان پر اہل

جنّت کا ترانہ ہماری زبانوں پر جاری ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس دنیا میں رہتے ہوئے گویا جنّت کی نعمت عطا کر دی ہے۔ یہ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ علیہ کا قول ہے۔ جب انہیں حکومت وقت کی طرف سے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں اور تشدد و تعذیب کا نشانہ بنایا گیا تو وہ کہا کرتے تھے کہ تم میرے جسم کو تکلیف دے سکتے ہو' لیکن میری جنّت تو میرے ساتھ ہے (اِنَّ جَنَّتِیْ مَعِیَ)۔ میری جنّت میرے دل میں موجود ہے' اسے تو کوئی گزند نہیں پہنچا سکتا۔ یعنی جسم کو تو مار پڑ سکتی ہے' روح کو تو نہیں پڑ سکتی ۔ وہ ایمان جو میرے اندر ہے 'جس نے میرے قلب کو منور کیا ہے اور وہ انشراح جو مجھے اسلام پر ہے اس کو تو کوئی چوٹ نہیں لگتی۔ چنانچہ ہمیں بھی اہلِ جنّت کا یہ ترانۂ حمد اپنا صبح و شام کا وظیفہ بنا' لینا چاہیے:

{اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ ہَدٰنَا لِہٰذَا ۫ وَمَا کُنَّا لِنَہْتَدِیَ لَوْلَآ اَنْ ہَدٰنَا اللّٰہُ ۚ}

''کُل شکر اور کُل حمد و ثنا اس اللہ کے لیے ہے جس نے ہمیں اس راستے کی ہدایت دی اور یہاں تک پہنچایا' اور ہم ہرگز ہدایت یافتہ نہ ہو سکتے اگر اللہ ہمیں ہدایت نہ دیتا۔''

یہ بات قرآن مجید میں واضح طور پر بیان ہوئی ہے کہ اگر اللہ نہ چاہے تو انسان نہ تو ہدایت یافتہ ہو سکتا ہے اور نہ ہی تذکر اور نصیحت حاصل کر سکتا ہے :{وَمَا یَذْکُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ ط} (المدثر:۵۶)''اور یہ کوئی نصیحت حاصل نہیں کریں گے اِلا یہ کہ اللہ ہی ایسا چاہے۔''پھر اس کے بعد دوسری دعا یہ کی جائے:

{رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ ہَدَیْتَنَا وَہَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْکَ رَحْمَۃً ۚ اِنَّکَ اَنْتَ الْوَہَّابُ ﴿ ۸ ﴾} (آل عمران)

''پروردگار! جب تو نے ہمیں ہدایت بخشی ہے تو اب ہمارے دلوں کو کج نہ ہونے دے (ایسا نہ ہو کہ ہم وساوسِ شیطانی کا شکار ہو جائیں یا شیطان کا کوئی اور وار ہم پر کارگر ہو جائے۔ کہیں دنیا کی محبّت تیری راہ میں جدّوجُہد کرنے کی محبّت سے زیادہ نہ ہو جائے۔) اور ہمیں اپنے پاس سے رحمت عطا فرما۔ یقیناً تو ہی فیاضِ 'حقیقی ہے۔''

یہ تُو ہی ہے جو ہمیں ہدایت پر قائم رکھ سکتا ہے۔ ہم سب کے دل تیری دو انگلیوں کے مابین ہیں۔ رسول اللہ ﷺ اکثر یہ دعا کیا کرتے تھے اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو بھی اس کی تلقین فرماتے تھے :((یَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قَلْبِیْ عَلٰی دِیْنِکَ))''اے دلوں کو پھیر دینے والے! میرے دل کو اپنے دین پر جمائے رکھنا''۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ((اِنَّ قُلُوْبَ الْعِبَادِ بَیْنَ اُصْبُعَیْنِ مِنْ اَصَابِعِ الرَّحْمٰنِ یُقَلِّبُھَا کَیْفَ یَشَاءُ))(رواہ الترمذی واحمد)''تمام انسانوں کے دل رحمن کی دو انگلیوں کے مابین ہیں' وہ انہیں جدھر چاہتا ہے پھیر دیتا ہے''۔ اَللّٰھُمَّ صَرِّفْ قُلُوْبَنَا اِلَی الْاِیْمَانِ' اَللّٰھُمَّ صَرِّفْ قُلُوْبَنَا اِلَی الْجِھَادِ۔ ''اے اللہ! ہمارے دلوں کو ایمان اور جہاد کی طرف پھیر دے!''

اس ضمن میں مجھے ۱۹۵۱ء کا واقعہ یاد آ رہا ہے۔ اسلامی جمعیت طلبہ کے سالانہ اجتماع کے موقع پر کراچی سے ایک دوست آئے تھے' جن سے اوّلین تعارف تو جمعیت کے رکن کی

حیثیت سے تھا‘ لیکن مزید تعارف پر معلوم ہوا کہ وہ ہمارے رشتہ دار بھی ہیں۔ ان کے پاس ایک آٹو گراف بک تھی اور انہوں نے مجھ سے آٹوگراف لینے کی خواہش ظاہر کی۔ مَیں نے اُس وقت یہی دو آیتیں لکھی تھیں۔ مجھے اپنی تحریر کے الفاظ ابھی تک یاد ہیں۔ اس لیے کہ انہوں نے اس کی بہت قدر کی تھی اور اسے بہت عام کیا تھا۔ میں نے لکھا تھا:

’’میرا دل کبھی کبھی ان لوگوں کے تصوّر سے کانپ اٹھتا ہے جو کبھی اقامت ِدین کے قافلے میں شریک تھے ‘اور نمایاں طور پر شریک تھے ‘اور اس کے بعد پھر اس قافلے کو چھوڑ کر دنیا میں گم ہو گئے۔ میں خود {اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ ہَدٰنَا لِہٰذَا ۟ وَمَا کُنَّا لِنَہْتَدِیَ لَوْ لَآ اَنْ ہَدٰنَا اللّٰہُ ۚ} کے بعد اس دُعا کا سہارا لیا کرتا ہوں کہ {رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ ہَدَیْتَنَا وَ ہَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْکَ رَحْمَۃً ۚ اِنَّکَ اَنْتَ الْوَہَّابُ ﴿ ۸ ﴾} ...‘‘

یہ دوست خرم جاہ مراد (مرحوم) تھے‘ جو بعد میں بہت مشہور ہوئے ۔ جماعت اسلامی کے نائب امیر بھی رہے اور ان کی کافی تالیفات بھی ہیں۔ اسلامی جمعیت طلبہ میں ہم ساتھی تھے۔ مجھ سے پہلے وہ جمعیت کے آل پاکستان ناظم اعلیٰ تھے۔ بہرحال یہ تو میری گفتگو کا پہلا حصّہ تھا۔ اب اس کے بعد اصل مضمون کی طرف آتے ہیں۔

تخلیق ِکائنات کے تدریجی مراحل

یہ بات ایمان و یقین کا جزوِ لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کائنات کا بلا شرکت غیرے مالک بھی ہے اور خالق بھی۔ جس طرح حروفِ تہجی میں پہلا حرف ’’الف‘‘ ہے اسی طرح یہ بات بھی ہمارے ایمان کی ’’الف‘‘ کا درجہ رکھتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس پوری کائنات کا بلاشرکت غیرے خالق و مالک ہے۔ نہ اُس کی تخلیق میں کوئی اس کا شریک ہے اور نہ ہی اُس کے مالک ہونے میں کوئی شریک ہے۔ وہ حاکم اعلیٰ بھی ہے اور آمر مطلق بھی۔ اللہ تعالیٰ کے لیے لفظ ’’آمر‘‘ مَیں پہلی مرتبہ استعمال کر رہا ہوں۔ آمر اور آمریت جیسے الفاظ ہماری سیاسی لغت میں گالی بن چکے ہیں‘ لیکن واقعہ یہ ہے کہ جس طرح تکبر ہم انسانوں کے اعتبار سے ایک بہت بری چیز ہے‘ لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات پر تو یہ جامہ بالکل راست آتا ہے‘ چنانچہ اُس کے اسماء حسنیٰ میں سے ایک ’’المُتکبّر‘‘ بھی ہے‘ اسی طرح اللہ تعالیٰ سب سے

بڑا آمر ہے ! ازروئے الفاظِ قرآنی : {اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَ الْاَمْرُ ؕ} (الاعراف:۵۴) ’’جان لو کہ تخلیق بھی اُسی کی ہے اور امر بھی اُسی کا ہے‘‘۔ یہ دونوں عالم‘ عالم ِخلق اور عالم ِامر اللہ تعالیٰ کے دست ِقدرت میں ہیں۔ عالم ِامر میں بھی کوئی شے وقوع پذیر نہیں ہو سکتی جب تک کہ اللہ کا اِذن نہ ہو اور عالم ِخلق میں بھی کسی شے کا ظہور نہیں ہو سکتا جب تک کہ اللہ کا اِذن نہ ہو۔ دوسری بات یہ واضح رہنی چاہیے کہ اُس کے امر کی شان ’’کُنْ فَیَکُوْن‘‘ ہے۔ قرآن حکیم کے

الفاظ ہیں:{اِنَّمَآ اَمۡرُهٗۤ اِذَآ اَرَادَ شَيۡـًٔا اَنۡ يَّقُوۡلَ لَهٗ كُنۡ فَيَكُوۡنُ ﴿۸۲﴾} (یٰسٓ) ''اُس کے امر کی شان تو یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اُس سے کہتا ہے ہو جا' پس وہ ہو جاتی ہے۔''اس عالمِ امر میں وقت کا عنصر (time element) بالکل نہیں ہے۔ چشم زدن میں بھی وقت لگتا ہے' جبکہ عالمِ امر میں اتنا وقت بھی نہیں لگتا۔ اس عالمِ امر سے متعلق دو مخلوقات ہیں: ملائکہ اور انسانی ارواح۔ انسانوں کا جسم یعنی حیوانی وجود تو عالمِ خلق کی شے ہے' لیکن روح عالمِ امر کی شے ہے۔ چنانچہ اس کے بارے میں سوال کیا گیا تھا۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ہے: {وَيَسۡـَٔلُوۡنَكَ عَنِ الرُّوۡحِ ؕ} ''(اے نبی ﷺ!) یہ آپ سے روح کے بارے میں پوچھ رہے ہیں''۔{قُلِ الرُّوۡحُ مِنۡ اَمۡرِ رَبِّىۡ} (آیت ۸۵) ''آپ کہہ دیجیے کہ روح میرے ربّ کے امر میں سے ہے''۔ اس کا تعلق عالمِ خلق سے نہیں ہے' اس مادّی عالم سے نہیں ہے' یہ شے بالکل دوسری ہے۔ تو عالمِ امر میں اللہ تعالیٰ کے احکام پورا ہونے میں چشم زدن کا وقت بھی نہیں لیتے۔

البتہ عالمِ خلق کا معاملہ یہ ہے کہ وہاں وقت لگتا ہے اور تدریجاً کوئی شے وجود میں آتی ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے نوٹ کیجیے کہ کائنات کی تخلیق کے بارے میں جو نظریہ سب سے زیادہ مقبول ہے وہ ''Big Bang'' کہلاتا ہے' جس کی توثیق (verification) کے لیے زیر زمین ۲۷ کلومیٹر لمبی سرنگ کھودی گئی ہے۔ سائنسی اصول یہ ہے کہ نظریہ اُس وقت تک نظریہ (Hypothesis) رہتا ہے جب تک کہ ثابت (verify) نہ ہو جائے۔ ڈارون کا نظریہ آج تک ثابت نہیں ہو سکا' لہٰذا ایک نظریے کی حیثیت سے تو لوگ اسے مانتے ہیں' لیکن اس کی شدید مخالفت بھی ہے۔ اس کے برعکس یہ بات کہ پانی ہائیڈروجن

اور آکسیجن سے مل کر بنا ہے' ایک ثابت شدہ سائنسی حقیقت ہے۔ پانی کا hydrolysis کر لیجیے' آکسیجن اور ہائیڈروجن علیحدہ علیحدہ وجود میں آ جائیں گے' جبکہ ہائیڈروجن اور آکسیجن کے اندر الیکٹرک سپارک کیجیے تو پانی بن جائے گا۔

بہرحال Big Bang ایک نظریہ ہے' اگرچہ اس پر محققین کا تقریباً اجماع ہو چکا ہے۔ اس نظریہ کی رو سے اِس مادّی کائنات کی تخلیق کا آغاز اربوں سال پہلے ایک بہت بڑے دھماکے سے ہوا تھا' جس سے ایٹم سے بھی نہایت چھوٹے ذرات fotons وجود میں آئے' جن کا درجہ حرارت ناقابلِ تصوّر حد تک بلند (کھربوں ڈگری سینٹی گریڈ) تھا اور جو ناقابلِ تصوّر تیز رفتاری کے ساتھ ایک دوسرے سے دور بھاگ رہے تھے' جس کے نتیجے میں یہ آتشیں گولہ حجم میں تیزی سے بڑھتا چلا گیا اور مرورِ زمانہ کے ساتھ ان ذرات کی حرارت اور ان کے باہمی کشش ثقل کی قوت و شدت میں کمی آتی چلی گئی۔ پھر یہ ناری ہیولیٰ یا بگولا مختلف حصوں میں پھٹتا چلا گیا جس سے کہکشائیں وجود میں آئیں اور ہر کہکشاں میں ناری کُرے پیدا ہوئے۔ آہستہ آہستہ بہت سے کرے ٹھنڈے پڑنے شروع ہوئے' جن میں سے ایک

ہماری زمین بھی ہے۔ اس سارے عمل میں کروڑہا برس لگے ہیں۔ ہماری زمین جب ٹھنڈی ہوئی تو اس کے اوپر مٹی کی ایک دبیز تہہ پیدا ہو گئی جسے ''قشرِ ارض'' یعنی زمین کا چھلکا (Crust of the Earth) کہا جاتا ہے۔ زمین کے اندر تو اب بھی آگ بھری پڑی ہے۔ زمین کے پیٹ میں تو اس قدر درجہ حرارت ہے کہ وہاں معدنیات پگھلی ہوئی صورت میں ہیں۔ اس کے اندر سے جب لاوا ابلتا ہے تو پتا چلتا ہے کہ اس زمین کے اندر کیا قیامت مخفی ہے۔

تخلیقِ کائنات کے طویل پراسیس کو میں نے تنزلات میں شمار کیا ہے۔ ایک تنزلات تو وہ ہیں جو ہمارے قدیم فلسفے کے اندر آتے ہیں۔ ایک تنزلات وہ ہیں جو ہمارے صوفیاء نے معیّن کیے ہیں اور ایک تنزلات وہ ہیں جو میں نے بیان کیے ہیں، جن کا تعلق قرآن اور سائنس کے ساتھ ہے۔ میں نے ان مباحث کو اپنے ایک کتابچے میں تفصیل سے بیان کیا ہے، جس کا عنوان ہے ''ایجاد و ابداعِ عالم سے عالمی نظامِ خلافت تک تنزل اور ارتقاء کے

مراحل''۔ اس کائنات میں جو سٹارز اور کُرے موجود ہیں، ان میں ثوابت (stars) بھی ہیں اور سیارے (satellites) بھی۔ ''ثوابت'' وہ ہیں جن کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ ساکن ہیں، لیکن اب معلوم ہوا کہ وہ بھی کم از کم اپنے محور پر گھوم رہے ہیں۔ سورج بھی سٹار ہے، لیکن اپنے گرد گھوم رہا ہے۔ آج ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ اس کائنات میں سکون نام کی کوئی شے نہیں ہے ع ''سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں!'' کائنات کی ہر شے حرکت میں ہے، جس کو قرآن نے بتکرار کہا ہے: {كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ ﴿٣٣﴾} (الانبیاء:۳۳ و یٰسٓ:۴۰) ''ہر شے اپنے مدار میں تیر رہی ہے''۔ اس حقیقت کو تو قرآن نے کھولا، ورنہ یہی سمجھا جاتا تھا کہ دراصل زمین ساکن ہے اور سورج اس کے گرد گھومتا ہے۔ مشرق سے نکلتا ہے اور مغرب میں جا کر غروب ہو جاتا ہے۔ بعد میں پتا چلا کہ نہیں، سورج تو ساکن ہے، زمین اس کے گرد گھوم رہی ہے۔ پھر معلوم ہوا کہ سورج بھی گھوم رہا ہے اور اس کی بھی دو حرکتیں ہیں۔ یہ کسی اور بڑے سٹار کے گرد بھی چکر لگا رہا ہے، جس کا ابھی تک سراغ نہیں لگایا جا سکا، اور اپنے محور (axis) پر بھی گھوم رہا ہے۔ جیسے زمین اپنے محور پر بھی گھوم رہی ہے، جس سے دن رات وجود میں آتے ہیں اور یہ سورج کے گرد بھی چکر لگاتی ہے تو اس سے موسم وجود میں آتے ہیں۔

تخلیقِ کائنات میں کتنا عرصہ لگا، آپ تصوّر نہیں کر سکتے۔ قرآن اس عرصے کو چھ دن کہتا ہے، لیکن یہ ہمارے چوبیس گھنٹے کے دن نہیں ہیں۔ قرآن مجید میں ایک دن کا ذکر ہے ہزار سال کا، ایک دن کا ذکر ہے پچاس ہزار سال کا، جبکہ یہ کروڑوں سال کا ایک دن ہے، یہ آفاقی دن ہے۔ پوری کائنات کی حرکت کے اعتبار سے شاید وہ ایک دن بنتا ہو۔ واللہ اعلم! تو جب تک کہ وہ ناری کرے ٹھنڈے ہوئے اور زمین پر crust ظاہر ہوئی، جیسے انگارے کے اوپر راکھ آجاتی ہے، تو اس میں کروڑہا برس لگ گئے۔ تو یہ عالمِ خلق کی تدریج ہے۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

ے

مت سہل ہمیں جانو ' پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتا ہے !

17

اس شعر میں ''برسوں'' کی جگہ ''صدیوں'' رکھ لیجیے۔ اس کائنات نے کتنے تنزلات طے کیے ہیں' تب خاک وجود میں آئی اور خاک سے انسان کا ہیولیٰ بنا۔ اس بات پر سائنس اور مذہب دونوں متفق ہیں کہ انسان مٹی سے بنایا گیا ہے۔ قرآن بھی یہی کہتا ہے ' سائنس بھی یہی کہتی ہے۔ البتہ مٹی سے اس کی تخلیق کس پراسیس کے تحت ہوئی ہے' یہ بات اختلافی ہو سکتی ہے۔ بہرحال ہمارا حیوانی وجود' جس کا تعلق عالمِ خلق سے ہے ' اس کا مادۂ تخلیق مٹی ہے۔ قرآن حکیم میں انسان کے مادۂ تخلیق کے لیے کہیں تُراب ' کہیں طِیْن' کہیں طِیْنٍ لَّازِبٍ' کہیں صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ اور کہیں صَلْصَالٍ کَالْفَخَّارِ کے الفاظ آئے ہیں۔یعنی کہیں فرمایا کہ انسان کی تخلیق مٹی سے ہوئی' کہیں فرمایا گارے سے' کہیں سَنے ہوئے لیس دار گارے سے' کہیں سڑی ہوئی مٹی کے سوکھے گارے سے اور کہیں ٹھیکری کی طرح کھنکھناتے ہوئے گارے سے۔ گویا حیوانِ آدم کی تخلیق سے پہلے اس کے مادۂ تخلیق ''مٹی'' اور اس کے منبع حیات ''پانی'' کے امتزاج سے وجود میں آنے والے ''گارے'' نے ارتقاء کے کتنے ہی مراحل طے کیے۔ مرزا بیدلؒ نے اس مضمون کو کس خوبصورتی سے شعر کا جامہ پہنایا ہے: ؎

ہر دو عالم خاک شد تا بست نقشِ آدمی
اے بہارِ نیستی از قدرِ خود ہوشیار باش !

یعنی یہ پوری کائنات جب تنزلات کی منزلیں طے کر کے خاک تک پہنچ گئی تب انسان کا ہیولیٰ بننا شروع ہوا۔

اس شعر کا دوسرا مصرع سمجھنے کے لیے آپ کو فلسفۂ وجود سمجھنا پڑے گا۔ نظریۂ وحدت الوجود اور وحدت الشہود وغیرہ کی رو سے یہ کائنات اصل میں خیالی ہے' اس کا کوئی حقیقی وجود نہیں ہے' گویا یہ معدوم کے درجے میں ہے۔ حقیقی وجود یا وجودِ مطلق صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کا ہے۔ اس کے سوا جو کچھ ہے اسے آپ سائے کی طرح سمجھ لیجیے۔ آپ شیشے کے سامنے کھڑے ہیں تو اُدھر بھی کھڑے نظر آرہے ہیں' جبکہ وہاں پر شیشے کے پیچھے کچھ نہیں ہے' یہ تو محض آپ کا عکس ہے جو نظر آرہا ہے۔ چنانچہ کائنات کے بارے میں کہا گیا ہے : ؎

18

کلٌّ ما فی الکون وھمٌ او خیال
او عکوسٌ فی المرایا او ظلال

یعنی کائنات میں جو کچھ ہے وہ وہم ہے یا خیال ہے ‘یا آئینے کے اندر نظر آنے والے عکس ہیں یا محض سائے ہیں ۔ جیسے درخت کا سایہ زمین پر پڑ رہا ہے‘ اس سائے کا اپنا تو کوئی وجود نہیں ہے۔ تو یہ جو معدوم (کائنات) ہے اس معدوم کی بہار انسان ہے۔ اس تخلیق کا کلائمکس انسان ہے۔ اس حوالے سے مرزا بیدلؒ انسان کو مخاطب کر کے کہہ رہے ہیں کہ اپنی قدر و قیمت سے آگاہی حاصل کرو۔ یہ کائنات معدوم ہے‘ لیکن اس کا کھلا ہوا گلاب کا پھول انسان ہے۔ اس کائنات نے تنزل کی کتنی ہی منزلیں طے کی ہیں‘ کتنا نیچے اتری ہے‘ تب انسان کا نقش پیدا ہوا ہے

نبوت و رسالت کا تدریجی ارتقاء

انسان کی تخلیق کے بعد تدریج اور ارتقاء کا ایک اور مرحلہ شروع ہوا اور وہ ہے نبوت و رسالت کا ارتقاء۔ حضرت آدم علیہ السلام پہلے انسان بھی تھے‘ پہلے نبی بھی تھے اور پہلے رسول بھی۔ لیکن نبوت و رسالت کی تکمیل تقریباً چھ سات ہزار برس کی تدریج کے ذریعے سے ہوئی ہے۔ اس لیے کہ یہ عالمِ خلق ہے اور عالمِ خلق کے اندر وقت لگتا ہے۔ جیسے جیسے انسان کا ذہنی ارتقاء ہوا‘ نبوت و رسالت کا بھی ارتقاء ہوا۔ جیسے انسان کا عہد طفولیت ہوتا ہے اور پھر وہ رفتہ رفتہ پروان چڑھتا ہے تو اس کا ذہنی شعور بھی پختہ ہوتا جاتا ہے۔ پرائمری کے ایک بچے کو آپ پی ایچ ڈی ٹیچر رکھ دیں تب بھی وہ اسے کیا پڑھائے گا؟ وہی کچھ نا جس کی اس بچے میں استعداد ہے ! وہ اپنا پی ایچ ڈی کا علم زبردستی اس کے اندر نہیں انڈیل سکتا۔ اسی طرح انسان نے دنیا میں ارتقاء کے مراحل طے کیے‘ ذہنی طور پر بھی اور تمدنی اعتبار سے بھی۔ پہلے یہ غاروں میں رہتا تھا‘ پھر اس نے جھونپڑیاں بنانا شروع کیں۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر قبائل کی شکل اختیار کی۔ قبیلے کا نظام بنا۔ پھر شہری ریاستیں وجود میں آئیں۔ پھر بڑی بڑی امپائرز وجود میں آگئیں۔ یہ انسان کا ذہنی اور تمدنی ارتقاء ہے۔ یہ دونوں ارتقاء جب اپنی پختگی(maturity)کو پہنچ گئے تو ساتھ ہی نبوت و رسالت کی بھی تکمیل ہو گئی۔

اس ارتقاء میں حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد رسول اللہ ﷺ تک کم از کم چھ سات ہزار سال کا فصل ہے۔ آدم نما مخلوق تو بہت پرانی شے ہے جس کا ذکر ڈارون کرتا ہے‘ اور اخبارات میں آتا رہتا ہے کہ اتنے لاکھ سال پرانا فاسل (fossil) نکل آیا ہے‘ جس کا جبڑا بالکل انسان کے جبڑے کی مانند ہے۔ یہ انسان نما مخلوق تو بہت پہلے تھی‘ لیکن ایک خاص انسان (Homo sapiens)جس میں اللہ نے اپنی روح میں سے پھونکا ‘وہ ایک شخص آدم تھا۔ وہ آدم دس ہزار سال سے پرانی شخصیت نہیں ہے۔ بہرحال حضرت آدم علیہ السلام سے نبوت و رسالت کا جو سفر شروع ہوا تو وہ تقریباً چھ سات ہزار سال میں حضرت محمد ﷺ پر تکمیل کو پہنچ گیا۔

نبوت ورسالت کا جو ارتقاء(evolution) ہوا ہے‘ اس میں دو پہلو ہیں۔ نبوت کی انتہا ہدایت اور دین

حق کا اِتمام و اِکمال ہے۔ ازروئے الفاظِ قرآنی:{اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ وَاَتۡمَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ نِعۡمَتِیۡ}(المائدۃ:۳) ''آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت کا اِتمام کر دیا''۔ محمد رسول اللہ ﷺ کو دو چیزیں دی گئی ہیں:الہدیٰ اور دین ِحق۔ ازروئے الفاظِ قرآنی: {ھُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَہٗ بِالۡھُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ...} (التوبۃ:۳۳' الفتح:۲۸' الصف:۹) ''وہی ہے جس نے بھیجا اپنے رسول کو الہدیٰ اور دین ِ حق دے کر...'' ہدایت قرآن کی شکل میں مکمل ہو گئی اور دین ِ حق (اسلام) کی صورت میں اللہ نے ایک کامل تمدنی نظام عطا فرمادیا۔ یہ دین اللہ نے ہمیشہ کے لیے مکمل کر دیا ہے اور اب یہی دین قابل ِ قبول ہے :{اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَ اللّٰہِ الۡاِسۡلَامُ }(آلِ عمران:۱۹) ''اللہ کے نزدیک (معتبر اور مقبول) دین صرف اسلام ہے''۔ اور یہ بھی فرما دیا کہ: {وَ مَنۡ یَّبۡتَغِ غَیۡرَ الۡاِسۡلَامِ دِیۡنًا فَلَنۡ یُّقۡبَلَ مِنۡہُ }(آلِ عمران:۸۵)''جو شخص بھی اسلام کے سوا کسی اور دین کی پیروی کرے گا اس سے وہ قبول نہیں کیا جائے گا''۔ اسے ردّ کر دیا جائے گا۔ تو یہ بھی ایک ارتقاء کا عمل ہے۔

سورۃ المدثر کی آیات ۳۲تا۳۶ کی وجدانی تشریح

اب ان آیات کی طرف آیئے جو میں نے آغاز میں تلاوت کی تھیں۔ ان آیات میں

نبوت و رسالت کے ارتقاء اور اس کی تکمیل کی طرف اشارہ ہے۔ میں ان آیات کی تفسیر بیان نہیں کر رہا' بلکہ میرے سامنے ان کی جو اذعانی اور وجدانی (intutive)شرح آئی ہے وہ بیان کر رہا ہوں۔ سورۃ المدثر کی آیات میں رسول اللہ ﷺ پر نبوت و رسالت کی تکمیل کا مضمون ہے۔ محمد رسول اللہ ﷺ سے پہلے بھی ہدایت دنیا میں موجود تھی' لیکن ابھی ناقص تھی۔ ظاہر بات ہے کہ چاند پورا بھی ہو جائے تو سورج کے برابر روشن نہیں ہو جاتا۔ فرمایا: {کَلَّا وَ الۡقَمَرِ ﴿۳۲﴾ }''ہرگز نہیں' قسم ہے چاند کی!''جس طرح چاند طلوع ہوتا ہے اور تدریجاً بڑھتے بڑھتے چودہ دنوں میں جا کر مکمل ہوتا ہے اسی طرح ہدایت حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد رسول اللہ ﷺ تک مکمل ہو رہی تھی۔

{وَ الَّیۡلِ اِذۡ اَدۡبَرَ ﴿۳۳﴾ }''اور قسم ہے رات کی جبکہ وہ پیٹھ موڑ کر چل دے''۔ اس میں اشارہ کس کی طرف ہے؟ دراصل حضور ﷺ کی بعثت سے قبل ایک طویل رات گزری ہے جس میں کوئی نبوت' کوئی رسالت دنیا میں نہیں تھی۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک اس زمین پر کوئی لمحہ ایسا نہیں آیا جب کوئی نہ کوئی نبی موجود نہ ہو۔ نبوت ہمیشہ موجود رہی۔ ایک ایک وقت میں کئی کئی نبی بھی رہے۔ ہمیں جو تاریخ بتائی گئی ہے وہ تو صرف ایک خاص علاقے میں آنے والے نبیوں سے متعلق ہے' یعنی مڈل ایسٹ ' خاص طور پر فلسطین اور اس کے ارد گرد کا علاقہ 'جبکہ قرآن مجید میں یہ کہا گیا ہے کہ : {وَ رُسُلًا قَدۡ قَصَصۡنٰہُمۡ عَلَیۡکَ مِنۡ قَبۡلُ وَ رُسُلًا لَّمۡ نَقۡصُصۡہُمۡ عَلَیۡکَ } (النساء:۱۶۴)''اور(اے نبی ﷺ !) ہم نے اُن رسولوں پر (بھی وحی بھیجی) جن کا حال ہم (قرآن میں) پہلے

آپ سے بیان کر چکے ہیں اور ان رسولوں پر بھی جن کا حال ہم نے آپ سے بیان نہیں کیا''۔ قرآن مجید میں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ:{وَ لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ۝ ۷ } (الرعد) ''اور ہم نے ہر قوم میں ایک ہادی بھیجا ہے''۔کیا چین میں قوم آباد نہیں تھی؟ کیا روس میں لوگ نہیں بستے تھے؟ کیا یورپ غیر آباد تھا؟ ان خطوں میں بھی یقیناً نبی آئے ہوں گے۔ ہو سکتا ہے کنفیوشس نبی ہو' لیکن ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے۔ ایک خیال یہ ہے کہ گوتم بدھ اور کرشن جی نبی تھے۔ ایسا عین ممکن ہے 'لیکن ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے۔

آپ اندازہ کیجیے کہ سوا لاکھ نبی آئے ہیں جبکہ قرآن مجید میں صرف ۲۷ یا ۲۸ کا ذکر ہے۔ اسی طرح ۳۱۳ رسول تھے جن میں سے قرآن میں صرف پانچ یا سات کا ذکر ہے۔ رسولوں میں حضرت نوح علیہ السلام ہیں' حضرت ہود ہیں' حضرت صالح ہیں۔ ان کے بعد حضرت ابراہیم ہیں۔ پھر نہ تو حضرت اسحاق رسول ہیں' نہ حضرت یعقوب رسول ہیں' نہ حضرت یوسف رسول ہیں۔ اس کے بعد حضرت موسیٰ رسول آئے ہیں۔ موسیٰ کے بعد بے شمار انبیاء آئے اور پھر عیسیٰؑ رسول آئے۔ حضرت عیسیٰؑ کے بعد آخری نبی اور رسول حضرت محمد ﷺ آئے۔ چنانچہ دنیا میں ہر جگہ پر یقیناً نبوت و رسالت کا سلسلہ رہا ہے۔ لیکن حضرت عیسیٰ ؑ سے حضور ﷺ تک چھ سو برس کی تاریک رات آئی جب کوئی نبی اور رسول نہیں تھا۔ یہ ہے وہ رات ! لیکن اب حضور ﷺ کی آمد پر وہ رات ختم ہو رہی ہے۔ اب اس رات نے پیٹھ موڑ لی ہے۔{وَ الصُّبْحِ اِذَآ اَسْفَرَ ۝ ۳۴ }''قسم ہے صبح کی جبکہ وہ روشن ہو گئی ہے''۔ وہ بعثتِ محمدیؐ کی صبح ہے۔ اب سورج طلوع ہو رہا ہے جس کی روشنی چار دانگ عالم میں پہنچے گی۔ (ان آیاتِ مبارکہ کا بعثت محمدی ﷺ سے تعلق اس سے بھی ظاہر ہے کہ سورۃ المدّثّر کا آغاز آنحضور ﷺ کی بعثت کے ذکر سے ہوا ہے !)

{اِنَّهَا لَاِحْدَى الْكُبَرِ ۝ ۳۵ }''یہ یقیناً بہت بڑی باتوں میں سے ہے''۔ معلوم ہوا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت اور نزولِ قرآن بہت بڑی باتوں میں سے ہے ۔ کروڑہا سال گزر کر یہ مرحلہ آیا ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا سورج طلوع ہوا ہے۔ میں جب ان آیات کو پڑھتا ہوں تو وجد میں آ جاتا ہوں۔ ان کے اندر جو کیفیات ہیں' اگر ان کو انسان وجدانی طور پر محسوس کرے تو وجد میں کیوں نہ آئے !

{نَذِيْرًا لِّلْبَشَرِ ۝ ۳۶ } ''انسان کو خبردار کرنے کے لیے''۔ محمد ﷺ پوری نوعِ انسانی کے لیے نذیر بن کر آئے ہیں۔ یہ تکمیلِ رسالت کا مظہر ہے ۔تو اس اعتبار سے تکمیل نبوت کیا ہے؟ آپؐ کو کتاب بھی دے دی گئی جس میں ہدایت کامل ہے ۔اور دینِ حق کامل بھی دے دیا گیا۔ اور رسالت کی تکمیل کیا ہے؟ سب سے پہلے یہ کہ آپؐ نے تبلیغ کا حق ادا کر دیا۔ حجۃ الوداع میں خطبہ کے موقع پر آپؐ نے پوچھا کہ :((اَلَا ھَلْ بَلَّغْتُ؟))

''لوگو! میں نے پہنچا دیا کہ نہیں؟'' اس موقع پر سوا لاکھ کا مجمع تھا' اس دنیا میں جتنی تعداد انبیاء کی آئی ہے اتنی ہی تعداد میں اُس وقت حضور ﷺ کے سامنے صحابہؓ تھے۔ سب کا جواب یہی تھا کہ اِنَّا نَشْھَدُ اَنَّکَ قَدْ بَلَّغْتَ الرِّسَالَۃَ وَاَدَّیْتَ الْاَمَانَۃَ وَنَصَحْتَ الْاُمَّۃَ وَکَشَفْتَ الْغُمَّۃَ۔ حضورؐ! ہم گواہ ہیں کہ آپؐ نے رسالت کا حق ادا کر دیا' اللہ کی امانت کا حق ادا کر دیا۔ (یہ قرآن آپ کے پاس امانت آیا تھا' جو آپؐ نے ہم تک پہنچا دیا) آپؐ نے اُمّت کا حق نصیحت ادا کر دیا اور تاریکیوں کے پردے چاک کر دیے''۔ لیکن جیسا کہ میں نے بتایا' نبوت کو یہاں تک پہنچنے میں چھ سات ہزار سال لگے۔

تجدید دین کا ارتقاء

محمد رسول اللہ ﷺ کے بعد چودہ صدیاں بیت گئی ہیں اور ان صدیوں میں مجددین آتے رہے ہیں۔ البتہ مجددِ کامل کوئی نہیں آئے۔ ختمِ نبوت سے جو خلا پیدا ہوا' اللہ نے اس کو تین چیزوں سے پُر کر دیا۔ اوّلاً: قرآن میں کامل ہدایت نازل فرمائی اور اس کی حفاظت کا خود ذِمّہ لیا۔ ثانیاً: ہر صدی میں ایک مجدد بھیجنے کا اہتمام فرمایا۔ علماء کا قول ہے جو کہ صحیح بھی ہے کہ ایک صدی میں ایک سے زائد مجددین بھی ہو سکتے ہیں۔ پھر یہ کہ چھوٹے چھوٹے مجدد بھی ہو سکتے ہیں۔ ثالثاً یہ کہ ہر زمانے میں ایک جماعت ضرور حق پر قائم رہے گی۔ اب جو حق کا متلاشی ہے جماعت کو تلاش کرنا اس کا کام ہے۔ یہ گھر بیٹھے نہیں مل جائے گی' اس کے لیے تلاش کرنی پڑے گی۔ زمانۂ طالب علمی میں ایک نظم پڑھی تھی: ع فَتِّش لقلبک عن رفیقکہ اپنے دل کے لیے کوئی دم ساز' کوئی رفیق تلاش کرو' کوئی ایسا آدمی ہو جس سے آپ دل کی بات کہہ سکیں تاکہ بوجھ ہلکا ہو جائے' ورنہ اس کا لاوا اندر ہی اندر پکتا رہتا ہے۔ اسی طرح: فتش لِذاتِکَ عن جماعۃ کہ تلاش کرو اس جماعت کو! یہ حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ دنیا کبھی اس جماعت سے خالی نہیں ہو گی۔ تاہم جماعت کے عنوان بدلتے رہیں گے۔ جیسے شیر شاہ سوری کے ڈاک کے نظام میں ہر تیس میل پر گھوڑا اور سوار بدل جاتے تھے' لیکن ڈاک کا تھیلا وہی رہتا تھا جو ایک گھوڑے سے دوسرے گھوڑے پر منتقل ہو جاتا تھا۔ اسی طرح دین چودہ صدیوں سے اپنی اصلی حالت میں منتقل ہوتا چلا آرہا ہے۔ اب یہ

پندرہویں صدی تجدید کامل کی صدی ہے۔

آنحضور ﷺ کے زمانے میں آپ ﷺ اور آپ کے صحابہؓ کی جو محنت و مشقت اور قربانیاں تھیں اس کے نتیجے میں دنیا کے سامنے خلافت کا ایک نظام قائم کر کے دکھا دیا گیا۔ اس سے دو حجتیں قائم ہو گئیں۔ اگرچہ وہ نظام کامل شکل میں صرف تیس برس رہا ہے' پھر رفتہ رفتہ اس میں زوال شروع ہو گیا۔ ع خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود! سب سے پہلے سیاسی نظام گر گیا اور موروثی بادشاہت آگئی۔ {اَمۡرُھُمۡ شُوۡرٰی بَیۡنَھُمۡ} کا تصوّر ختم ہو گیا'

لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ عالمی نظامِ خلافت آج بھی پوری عالمِ انسانیت پر حُجّت ہے کہ دیکھو یہ نظام قائم ہوا تھا۔ البتہ ہم پر جو جوابی حُجّت قائم کی جاتی ہے کہ وہ نظام اب دکھاؤ کہیں‘ تو اس پر ہم خاموش ہو جاتے ہیں۔ بہرحال یہ تاریخی حقیقت سب مانتے ہیں‘ بدترین دشمن ِ رسول اور شاتم ِرسول ایچ جی ویلز بھی مانتا ہے۔ اس نے رسالت مآب ﷺ کی شانِ اَقدس میں گستاخانہ تحریریں لکھی ہیں جیسے کہ رشدی ملعون نے لکھی ہیں‘ لیکن ایک جگہ آکر گھٹنے ٹیک کر تسلیم کرتا ہے کہ ’’اگرچہ دنیا میں انسانی اخوت ومساوات اور حرّیت کے وعظ تو پہلے بھی بہت کیے گئے تھے‘ حضرت مسیح ؑ کے ہاں بھی بہت سے وعظ ہمیں مل جاتے ہیں‘ لیکن یہ ماننا پڑتا ہے کہ یہ صرف محمد (ﷺ) کی شخصیت ہے جس نے ان اصولوں پر مبنی ایک معاشرہ قائم کر کے دکھا دیا۔‘‘(۱) یہ حُجّت ہے نوعِ انسانی پر۔ دوسری حُجّت مسلمانوں پر ہے کہ دیکھو انسانی جدّوجُہد سے یہ نظام قائم ہو سکتا ہے۔ اب اس نظام کو دوبارہ قائم کرنا تمہارے ذِمّے ہے۔ حضور ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو پیٹ پر پتھر باندھنے پڑے تھے۔ بہت سے صحابہؓ کی جانیں قربان ہوئیں۔ خون تو حضور ﷺ کا بھی بہا ہے‘ اگرچہ آپؐ کی خواہش اور تمنّا تو یہ تھی کہ اللہ کی راہ میں بار بار سر کٹانے کا موقع ملے۔ چنانچہ آپؐ نے فرمایا:

((لَوَدِدْتُ اَنِّیْ اُقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ثُمَّ اُحْیَا‘ ثُمَّ اُقْتَلُ ثُمَّ اُحْیَا‘ ثُمَّ اُقْتَلُ ثُمَّ اُحْیَا‘ ثُمَّ اُقْتَلُ)) (صحیح البخاری)

---

(۱) یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ یہ اقتباس ایچ جی ویلز کی کتاب A Concise History of the World کے پرانے ایڈیشن سے ہے۔ موجودہ ایڈیشن کے مرتبین نے اسے خارج کر دیا ہے۔

’’میرے دل میں بڑی آرزو اور بڑی تمنّا ہے کہ میں اللہ کی راہ میں قتل کر دیا جاؤں‘ پھر مجھے زندہ کیا جائے‘ پھر قتل کیا جاؤں‘ پھر زندہ کیا جاؤں‘ پھر قتل کیا جاؤں‘ پھر زندہ کیا جاؤں اور پھر قتل کیا جاؤں‘‘۔

لیکن یہ اللہ کا قانون ہے کہ رسول قتل نہیں ہو سکتے۔ ازروئے نص قرآنی :{کَتَبَ اللّٰہُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَ رُسُلِیْ} (المجادلۃ: ۲۱) ’’اللہ نے فیصلہ کر دیا ہے کہ میں اور میرے رسول لازماً غالب آکر رہیں گے‘‘۔ چاہے اس شکل میں آئیں کہ سارے کفار کو فنا کر دیا جائے اور رسول اور اس کے ساتھیوں کو بچا لیا جائے۔ جیسے قومِ نوح ؑ‘ قومِ ہودؑ‘ قومِ صالح ؑ اور قومِ شعیبؑ کے ساتھ ہوا‘ صدوم اور عاموہ کی بستیوں کے ساتھ ہوا۔ بہرحال نوعِ انسانی پر ایک حُجّت قائم ہوئی کہ یہ بہترین نظام ہے۔ دوسری حُجّت مسلمانوں پر قائم ہوئی ہے کہ انسانی محنت‘ جدّوجُہد اور جان کی قربانی کے ذریعے تم بھی یہ نظام قائم کر سکتے ہو۔

سورۃ الانشقاق کی آیات ۱۴ تا ۱۹

تجدیدِ دین کے ارتقاء اور اس کی تکمیل کی طرف اشارہ ہے قرآن کے دوسرے مقام (سورۃ الانشقاق) میں ‘جس پر میں جھوم اٹھتا ہوں۔ یہاں بھی رات کا ذکر بھی ہے اور چاند کا بھی۔ ان دونوں مقامات کے اندر یہ چیز مشترک ہے۔ فرمایا:{فَلَآ اُقۡسِمُ بِالشَّفَقِ ﴿۱۶﴾ } ’’تو نہیں‘ میں قسم کھاتا ہوں شفق کی‘‘۔ جب سورج غروب ہو جائے لیکن اس کی روشنی بادلوں سے منعکس ہو کر آسمانوں کو سرخ کر رہی ہو تو اسے شفق کہتے ہیں۔ یوں سمجھئے کہ اب سے کچھ عرصہ پہلے تک بطورِ دین اسلام کا سورج غروب ہو چکا ہے‘ ہاں شفق باقی رہ گئی ہے : {وَ الَّیۡلِ وَ مَا وَسَقَ ﴿۱۷﴾ }’’ اور قسم ہے رات کی اور اُن چیزوں کی جس کو وہ اپنے اندر سمیٹ لیتی ہے‘‘۔یہ سیاہ رات کوئی چار سو برس کی ہے۔ سورۃ المدثر میں {وَ الَّیۡلِ اِذۡ اَدۡبَرَ ﴿۳۳﴾ } کے الفاظ آئے تھے جبکہ یہاں کہا گیا : {وَ الَّیۡلِ وَ مَا وَسَقَ ﴿۱۷﴾ }’’ اور قسم ہے رات کی اور جو کچھ وہ جمع کر لیتی ہے ‘‘۔رات چوروں اور ڈاکوؤں کو بھی ڈھانپ لیتی ہے‘ سانپ بچھو بھی نکل آتے ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ اور چیزیں بھی ہیں جن کی طرف اشارہ ہے‘ انہیں آئندہ بیان کیا جائے گا۔

{وَ الۡقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ ﴿۱۸﴾} ’’اور قسم ہے چاند کی جب وہ رفتہ رفتہ پورا ہو جاتا ہے‘‘۔ جس طرح چاند چودہ دن میں پورا ہوتا ہے اسی طرح اسلام کی کامل تجدید کو چودہ صدیاں لگی ہیں۔ اب تجدید کامل کا وقت آپہنچا ہے۔پندرہویں صدی ہجری کے مجدد مہدی ہونگے‘ جن کی خبر دی گئی ہے۔ البتہ ان کا راستہ ہموار کرنے کے لیے پہلے چھوٹی چھوٹی کوششیں ہوں گی۔ کہیں اسلام کا نظام عدلِ اجتماعی قائم ہو گا جہاں سے فوجیں حضرت مہدیؑ کی حکومت قائم کرنے کے لیے جائیں گی۔یہ ایک علیحدہ بحث ہے۔ اسلام کی تعلیمات دنیا میں ایسے رہ گئی تھیں جیسے شفق ہوتی ہے۔ دین کا سورج غروب ہو چکا تھا اور پھر رات آئی تھی۔ جیسے چاند کی روشنی مستعار ہوتی ہے اسی طرح مجددین کی روشنی بھی اپنی نہیں ہے‘ بلکہ محمد رسول اللہ ﷺ سے مستعار ہے۔ لہٰذا یہ چاند ہے اور چاندچودہ راتوں میں جا کر مکمل ہوتا ہے۔

اس کے بعد فرمایا گیا:{لَتَرۡکَبُنَّ طَبَقًا عَنۡ طَبَقٍ ﴿۱۹﴾ }’’تم یقیناً درجہ بدرجہ اُوپر اٹھو گے‘‘ یعنی یہ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا نظام جب ایک دفعہ غروب ہونے کے بعدچاند کی شکل میں نکلے گا تو چودہ صدیوں میں سیڑھی کے درجوں کی طرح تدریجاً اس کی تجدید کامل کا مرحلہ آئے گا۔ کائنات کی تخلیق میں تدریج ہے‘ انسان کی تخلیق میں تدریج ہے‘نبوت و رسالت کی تکمیل میں تدریج ہے اور اس کے بعد آخر میں خلافت کا نظام قائم ہونے میں بھی تدریج ہو گی‘ یہاں تک کہ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ پوری دنیا پر قائم ہو کر رہے گی۔ (سورۃ الانشقاق کی اِن آیاتِ مبارکہ کا تعلق دین حق کی تدریجی تجدید کے ساتھ اس سے بھی ظاہر ہے کہ اس سورت کا آغاز قیامت کے ذکر سے ہوا ہے‘ اوردین کی

کامل تجدید اس کے قریب کے زمانے میں ہی ہو گی' اور اس ضمن میں ''لَتَرکَبُنَّ'' میں جو صیغہ جمع کا وارد ہوا ہے کہ یہ اُمّتِ مسلمہ کا معاملہ ہے۔ جبکہ سورۃ'المدثرمیں صیغۂ واحد میں استعمال ہوا ہے' اس لیے کہ وہ نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ مبارکہ سے متعلق ہے۔)

تجدید کامل کا مرحلہ اور ہماری ذِمّہ داریاں

یوں سمجھئے کہ ملّت اسلامی کا قافلہ چودہ سو برس کے اندر آنے والے جزوی مجددین سے گزرتے ہوئے تجدید کامل کے مرحلے پر کھڑا ہے۔ اب اللہ کا دین پورے کا پورا کامل

صورت میں پوری دنیا میں دوبارہ قائم ہو گا۔ اب چونکہ دنیا گلوبلائز ہو چکی ہے لہٰذا یہ نظام کُل روئے ارضی پر قائم ہو گا۔ ابھی اس قافلے کے لیے جزوی کوششیں ہو رہی ہیں۔ خاص طور پر برعظیم پاک و ہند میں جو کوششیں ہوئی ہیں' اس لڑی میں تنظیم اسلامی بھی شامل ہے۔ یہ کوئی آسمان سے نہیں گری ہے' بلکہ اس کا بھی تدریجی ارتقاء ہوا ہے۔ علامہ اقبال نے اس فکر کو تازہ کیا کہ اسلام محض ایک مذہب نہیں بلکہ دین ہے۔ ابوالکلام آزاد نے (۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۰ء تک) حزب اللہ قائم کی۔ اس کے بعد مولانا مودودی آئے اور ۱۹۴۱ء سے ۱۹۵۱ء تک وہ اسی اصولی انقلابی جدّوجُہد میں لگے رہے۔ اس کے بعد ان کی جماعت انتخابی سیاست کے اکھاڑے میں کود پڑی۔ پھر ہم نے اس کام کو شروع کیا ہے۔ تو یہ اصل میں تدریجی ارتقاء ہے۔ ابھی ہو سکتا ہے ایک دو نسلیں اور بیت جائیں' لیکن اس کے بعد لازماً پوری دنیا پر خلافت کا سورج طلوع ہو گا 'جو اپنی نورانی تعلیمات اور نظامِ عدلِ اجتماعی کے ذریعے روئے ارضی کو منور کر دے گا۔ بقول علامہ اقبال ؎

شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے !

یہ ہو کر رہے گا ---- اور تنظیم اسلامی درحقیقت اسی کی ایک کڑی ہے۔ اسی کی جدّوجُہد کرنے کے لیے ایک ہیئت تنظیمی ہے۔ اب یہ کام آپ لوگوں کا ہے کہ اس کے فکر کو پرکھیں' اس کے اہداف کیا ہیں ان کا شعور حاصل کریں۔ تنظیم کے طریقہ کار کو سمجھیں' اس کے نظامِ تربیت اور تزکیہ سے آگاہ ہوں۔ یہ تفتیش اور تحقیق بھی جہاد فی سبیل اللہ کا ایک حصّہ ہے۔ جب نیت یہ ہو کہ ہمیں اس کام میں لگنا ہے تو دیکھنا چاہیے کہ کون سی جماعتیں اس میدان میں برسرِ عمل ہیں۔ ان جماعتوں میں آپ تلاش کیجیے۔ وہ حدیث میں آپ کو سنا چکا ہوں کہ میری اُمّت میں ہمیشہ ایک جماعت لازماً حق پر قائم ہو گی۔ اس سے کوئی استثناء نہیں ہے۔ کوئی نہ کوئی جماعت تو موجود ہے' اس کو تلاش کرنا آپ کا کام ہے !

دجّالیت کے آفاقی اور زمینی مظاہر

۱۴، نومبر ۲۰۰۸ء کا خطابِ جمعہ

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اعوذ باللہ من الشَّیطٰن الرَّجیم ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ {ظَہَرَ الْفَسَادُ فِی الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ بِمَا کَسَبَتْ اَیْدِی النَّاسِ لِیُذِیْقَھُمْ بَعْضَ الَّذِیْ عَمِلُوْا لَعَلَّھُمْ یَرْجِعُوْنَ ﴿ ۴۱ ﴾}(الروم) {اِذْ جَآءُوْکُمْ مِّنْ فَوْقِکُمْ وَ مِنْ اَسْفَلَ مِنْکُمْ وَ اِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَ بَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَ تَظُنُّوْنَ بِاللّٰہِ الظُّنُوْنَا ﴿۱۰﴾} (الاحزاب)

گزشتہ نشست سے ربط قائم کرتے ہوئے تمہیداً عرض کر رہا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس کائنات کا بلاشرکت غیرے خالق بھی ہے اور مالک بھی' حاکم مطلق بھی ہے اور آمر مطلق بھی۔ ارشادِ الٰہی ہے :{اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ } (الانعام:۵۷' یوسف:۴۰)''حکم کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کو ہے''۔ اور:{وَّ لَا یُشْرِکُ فِیْ حُکْمِہٖٓ اَحَدًا ﴿ ۲۶ ﴾} (الکھف) ''اللہ تعالیٰ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں کرتا''۔اور:{اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَ الْاَمْرُ} (الاعراف:۵۴) ''خبردار رہو' اُسی کی خلق ہے اور اسی کا امر ہے''۔ اگرچہ کسی انسان کے لیے آمر کا لفظ اچھے معنوں میں استعمال نہیں ہوتا' انسانوں کے لیے آمریت بری شے ہے' لیکن میں جان بوجھ کر اللہ تعالیٰ کے لیے ''آمر'' کا لفظ استعمال کر رہا ہوں' اس لیے کہ اللہ واقعتاً آمر مطلق ہے۔ جیسے تکبر انسانوں کے لیے اچھی بات نہیں' لیکن اللہ کی ذات کو کبریائی کا جامہ زیب دیتا ہے۔ ایک حدیث قدسی ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے : ((اَلْکِبْرِیَاءُ رِدَائِیْ))(۱) ''تکبر میری چادر ہے۔''

(۱) سنن ابن ماجہ ' کتاب الزھد' باب البراء ۃ من الکبر والتواضع۔

عالمِ خلق اور عالمِ امر کے بارے میں آپ جان چکے ہیں کہ عالمِ امر میں اللہ تعالیٰ کے احکام آناً فاناً ظہور پذیر ہوتے ہیں‘ ان میں ’’وقت‘‘ کا عنصر قطعاً نہیں ہوتا‘ جبکہ عالمِ خلق کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ اس میں کسی کام کے تکمیل پذیر ہونے میں وقت ضرور لگتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں کئی مقامات پر آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کی تخلیق چھ دنوں میں کی ہے۔میں عرض کر چکا ہوں کہ یہ دن کوئی آفاقی دن تھے۔ انہیں چاہے ’’six ages‘‘ کہا جائے‘ six millenniums کہا جائے یا کچھ اور۔پھر یہ کہ نبوت و رسالت کا آغاز پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام سے ہوا‘ لیکن اسے بھی تدریجاً تکمیل کو پہنچنے میں تقریباً سات آٹھ ہزار برس لگے ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد ﷺ تک جیسے جیسے انسان کی ذہنی اور فکری صلاحیتیں نشوونما پاتی گئیں ویسے ویسے ہدایت بڑھتی چلی گئی۔ جیسے جیسے انسانی تمدن میں ارتقاء ہوا ایسے ہی اللہ کا دین بھی تکمیل کے مراحل سے گزرا‘ یہاں تک کہ حضور ﷺ پر آکر نعمت ہدایت کا اتمام بھی ہو گیا اور دینِ حق کی تکمیل بھی ہو گئی۔ سورۃ المدثر میں فرمایا گیا:{كَلَّا وَ الْقَمَرِ ﴿۳۲﴾ }’’ہرگز نہیں‘ قسم ہے چاند کی‘‘۔ رسول اللہ ﷺ کی آمد سے پہلے دنیا میں جو نورِ ہدایت تھا وہ چاند کے مشابہ تھا اور چاند کی روشنی سورج کی روشنی کا مقابلہ تو نہیں کر سکتی۔ گویا وہ ایک طویل رات تھی جس میں چاند رفتہ رفتہ بڑھ رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی ہدایت اور نبوت بھی بڑھ رہی تھی۔{وَ الَّيْلِ اِذْ اَدْبَرَ ﴿۳۳﴾ }’’اور (قسم ہے) رات کی جبکہ وہ پلٹتی ہے‘‘۔ یعنی پھر وہ وقت آیا کہ رات رفتہ رفتہ پیٹھ موڑ کر چلتی بنی۔ {وَ الصُّبْحِ اِذَاۤ اَسْفَرَ ﴿۳۴﴾ }’’اور صبح (کی قسم) جبکہ وہ روشن ہوتی ہے‘‘۔ اب گویا صبح طلوع ہو گئی اور ہدایت کا سورج محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت کی شکل میں ظاہر ہو گیا۔ یعنی یہ سب کچھ تدریجاً ہوا۔ {اِنَّهَا لَاِحْدَى الْكُبَرِ ﴿۳۵﴾ }’’یہ یقیناً بہت بڑی باتوں میں ہے‘‘۔{نَذِيْرًا لِّلْبَشَرِ ﴿۳۶﴾ }’’یہ خبردار کرنا (یعنی بعثتِ محمدیؐ) تمام انسانوں کے لیے ہے‘‘۔یہ صرف عرب کے لیے نہیں۔ {لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّتَقَدَّمَ اَوْ يَتَاَخَّرَ ﴿۳۷﴾ }’’تم میں سے ہر اُس شخص کے لیے جو آگے بڑھنا چاہے یا پیچھے رہ جانا چاہے۔‘‘

محمد رسول اللہ ﷺ نے دین کو کامل اور مکمل شکل میں قائم کر دیا اور وہ تیس برس تک مکمل شکل میں قائم اور نافذ رہا۔ پھر اس کے اندر تدریجاً زوال آنا شروع ہوا۔ جیسے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا:

((بَدَأَ الْاِسْلَامُ غَرِيْبًا وَسَيَعُوْدُ كَمَا بَدَأَ غَرِيْبًا فَطُوْبٰى لِلْغُرَبَاءِ))(۲)

’’اسلام کی جب ابتدا ہوئی تھی تو یہ اجنبی تھا‘ اور پھر ویسے ہی اجنبی ہو جائے گا جیسے ابتدا میں تھا۔ پس ایسے اجنبیوں کے لیے خوشخبری ہے۔‘‘

اسلام کا آغاز اس حال میں ہوا تھا کہ وہ اجنبی سی شے تھی‘ لوگ اسے پہچانتے نہیں تھے کہ محمد (ﷺ) یہ کیا نئی بات کر رہے ہیں۔ اس لیے کہ آپؐ کی بعثت مکّہ مکرمہ میں ہوئی اور وہاں تو ایمان باللہ اور ایمان

بالآخرت کا کوئی حوالہ بھی موجود نہیں رہا تھا۔ شرک کے گھٹا ٹوپ اندھیرے تھے اور بالخصوص آخرت کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ نہ کوئی شریعت تھی' نہ کوئی قانون تھا اور نہ کوئی کتاب۔ تو انہیں اسلام کی دعوت بڑی عجیب سی بات لگی کہ یہ محمدؐ' کیا کہہ رہے ہیں؟ پھر یہ ہوا کہ اسلام کو غلبہ حاصل ہو گیا ۔ تو اب چونکہ اسلام غالب ہو گیا اور اسلام کا نظام قائم ہو گیا تو سبھی اس کے جاننے اور پہچاننے والے ہو گئے۔ لیکن رسول اللہ ﷺ نے پیشین گوئی فرما دی کہ عنقریب اسلام پھر اجنبی ہو جائے گا۔ یہ اجنبی ہونے کا عمل خلافت ِ راشدہ کے بعد سے شروع ہو گیا اور مسلسل جاری رہا۔ ساتھ ہی ساتھ تجدید کا عمل بھی جاری رہا۔ ہر صدی کے اندر مجددین اُمت آئے اور رفتہ رفتہ تجدید کا یہ عمل بھی چودہ سو برس میں پورا ہو رہا ہے اور اب دنیا تجدید کامل کے دروازے پر کھڑی ہے۔ آپ ﷺ کے ہاتھوں جو تکمیل دین ہو گئی تھی اسی طرح کی تکمیل دوبارہ ہونی ہے' اور اب وہ عالمگیر ہو گی ۔ تو ان سارے معاملات کے اندر ایک تدریج ہے۔

عالم ِ خلق میں تدریج قانونِ الٰہی ہے۔ اس میں کوئی کام اچانک نہیں ہوتا' بلکہ اس میں وقت لگتا ہے' اور وقت کے حوالے سے ہمارے پیمانے بہت چھوٹے ہیں 'جبکہ اللہ کا پیمانہ بہت بڑا ہے۔ اللہ کا تو ایک دن ہمارے حساب کتاب سے کم از کم ایک ہزار سال کے برابر

_____(۲) صحیح مسلم 'کتاب الایمان' باب بیان ان الاسلام بدأ غریبا وسیعود غریبا...

ہے' ورنہ اللہ تعالیٰ کا وہ دن بھی ہے جسے سورۃ المعارج میں پچاس ہزار سال کا کہا گیا ہے۔ بالفاظِ قرآنی:

{تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ الرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ﴿ ۴ ﴾} (المعارج)

''ملائکہ اور روح اُس کے حضور چڑھ کر جاتے ہیں ایک ایسے دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے۔''

اور یہ جو تخلیقِ کائنات کا عمل میں نے بتایا ہے اس کے لیے لاکھوں کروڑوں سال کا ایک دن ہو سکتا ہے۔ بہرحال اب یہ جو تجدید کامل کی کوششیں ہو رہی ہیں یہ ایک سلسلۃ الذھب (سنہری زنجیر) ہے اور تنظیم اسلامی اس زنجیر کی ایک کڑی ہے۔ ہم یہ نہیں سمجھتے کہ ہم کوئی نئی بات لے کر آئے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا: ((مَا اَنَا عَلَیْہِ وَاَصْحَابِیْ)) ''(دین وہی ہے) جس پر میں اور میرے صحابہؓ ہیں''۔ رسول اللہ ﷺ نے اصلی اور کامل شکل کے اندر دین قائم کیا تھا اور اسے اب دوبارہ نافذ کرنا ہے۔ تنظیم اسلامی اسی کام کے لیے قائم ہوئی ہے 'کسی جزوی کام کے لیے نہیں' صرف اصلاحی 'تبلیغی اور تعلیمی کام کے لیے نہیں۔ یہ سارے کام بھی ہوں گے'

لیکن یہ سب اُس بڑے کام یعنی انقلاب کے رُخ پر ہوں گے ‘تاکہ ایک انقلاب برپا ہو اور پورے کا پورا دین حق قائم ہو جائے۔

یہ بات ظاہر ہے کہ کوئی بھی قوت‘ کوئی بھی تنظیم‘ کوئی بھی جماعت یا کوئی بھی تحریک اگر اقامت ِدین کی جدّوجُہد کے لیے کوشاں ہے تو اس کے لیے یہ شعور لازم ہے کہ دنیا میں اِس وقت کیا ہو رہا ہے‘ کون کون سی قوتیں برسرکار ہیں اور کون کون سی قوتیں برسرِپیکار ہیں۔ تصادم ہو رہا ہے تو کن کن کے مابین ہو رہا ہے۔ اگر کچھ لوگ یا قوتیں فعال ہیں تو وہ کون کون سی ہیں‘ ان کے مقاصد کیا ہیں‘ ان کا ایجنڈا کیا ہے۔ وہ کیا پیش قدمی کر رہے ہیں۔ پھر خاص طور پر اپنے ملک میں جہاں آپ کو کام کرنا ہے‘ کون کون سی قوتیں کیا کیا کام کر رہی ہیں۔ تو اس حوالے سے ان لوگوں کے اندر ایک واضح شعور کا ہونا ضروری ہے جو اقامت ِدین کی جدّوجُہد میں اپنے آپ کو شامل کر رہے ہیں۔ اس اعتبار سے ہمیں دو سطحوں پر شعور حاصل

کرنا ہو گا۔ ایک عالمی یا آفاقی سطح پر اور دوسرے زمینی سطح پر۔ میں نے آغازِ خطاب میں سورۃ الروم کی آیت ۴۱ کی تلاوت کی ہے: {ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ} ’’فساد نمایاں ہو گیا ہے بر میں بھی اور بحر میں بھی لوگوں کے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے‘‘۔ ہماری یہ زمین دو حصوں پر ہی مشتمل ہے‘ یا سمندر ہے یا خشکی ہے ۔ تو اب کوئی حصّہ بھی اس فساد سے خالی نہیں رہا اور یہ ہوا ہے لوگوں کے اپنے کرتوتوں کی وجہ سے۔ آگے فرمایا:{لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِيْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿ ۴۱ ﴾} ’’تاکہ اللہ تعالیٰ مزا چکھائے ان کو اُن کے بعض اعمال کا شاید کہ وہ باز آجا ئیں‘‘۔چنانچہ ایک ہے آفاقی فساد اور ایک ہے زمینی فساد۔

دجّالیت کے آفاقی مظاہر

آفاقی فساد کی تین سطحیں ہیں ۔ بالفاظِ دیگر دجّالیت کے تین آفاقی مظاہر یا تین سطحیں ہیں۔ میں یہ چیزیں کئی بار بیان کر چکا ہوں اور آج ایک اضافے کے ساتھ اس طرف محض اشارات کر رہا ہوں۔ سب سے اونچی سطح ہے سیاسی سطح۔ اس سطح پر فساد یہ ہے کہ سیاسی سطح پر اللہ تعالیٰ کو بے دخل کر دو(معاذ اللہ) -------اللہ حاکم نہیں ہے بلکہ عوام حاکم ہیں۔ عوامی حاکمیت اللہ تعالیٰ کے خلاف سب سے بڑا کلمۂ بغاوت ہے۔ اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے : {اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ}اور:{وَّ لَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖۤ اَحَدًا ﴿ ۲۶ ﴾ }(الکہف)ایک اور جگہ ارشاد ہے :{اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ؕ}(الحشر:۲۳) ’’وہ بادشاہ ہے‘ نہایت مقدّس‘ سراسر سلامتی‘ امن دینے والا‘ نگہبان‘ سب پر غالب‘ اپنا حکم بزور نافذ کرنے والا اور بڑا ہو کر رہنے والا۔‘‘ لیکن دجّالیت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ریاست سے‘سیاست سے‘ حکومت سے‘ قانون سے بے دخل کر دو۔ ریاست کا کسی مذہب کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے‘ مذہب صرف انفرادی معاملہ ہے۔چاہے مسجدوں میں جا کر نماز پڑھو‘ رکوع و سجود کرو‘ چاہے مندروں

میں جا کر بتوں کے سامنے ڈنڈوت کرو۔ تم اپنے چرچز ' سینیگاگزاور گردواروں میں جانے کے لیے آزاد ہو' لیکن حاکمیت عوام کی ہوگی۔یہی سیکولرازم ہے کہ دستور و قانون کا کوئی تعلق کسی مذہب' کسی آسمانی

ہدایت کے ساتھ نہیں' وہ ہم خود بنائیں گے۔ یہ فساد بمعنی بغاوت ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے خلاف سب سے بڑی بغاوت ہے' جس کا نام ہے عوامی حاکمیت اور سیکولرازم۔

آفاقی فساد یا دجّالیت کی دوسری سطح معاشی ہے اور یہ بھی یونیورسل ہے۔ اِس وقت دنیا کا پورا معاشی نظام سود اور جوئے پر مبنی ہے'جبکہ ازروئے قرآن یہ بدترین گناہ ہے' سود سے بڑاجرم کوئی نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ اگر سود سے باز نہیں آتے ہو تو اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے تمہارے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔ دوسری چیز جوا ہے۔ آج تمام کاروبار اور فنانس مارکیٹ جوئے پر مبنی ہے' سٹاک ایکسچینج میں بھی جوا ہے۔ معاشی سطح پر مزید دو چیزیں قحبہ گری اور منشیات بھی شامل ہیں ۔آج کی دنیا میں سیکس بھی جائز ذریعۂ آمدنی ہے' قحبہ گری یا عصمت فروشی (prostitution)کوئی حرام یا بُری شے نہیں' اوریواین او کی سفارشات یہ ہیں کہ اس دھندے میں ملوث عورتوں کو عصمت فروش بھی نہ کہا جائے'بلکہ انہیں سیکس ورکر کہا جائے۔ ایسے ہی نشہ آور چیزیں بنانا اور بیچنا سب جائز ہے۔ تو یہ چار چیزیں ہو گئیں' سود' جوا' فحاشی اورمنشیات۔

تیسری سطح سماجی ہے کہ شرم و حیا اور عفت و عصمت کے تصورات سب دقیانوسی باتیں ہیں۔ آزاد جنسی تعلقات استوار کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ عورت اپنے حسن کی نمائش جس طرح چاہے کرے' اسے روکنے والے تم کون ہوتے ہو؟ اسی وجہ سے آج آپ کو سڑکوں پر نیم عریاں جوان لڑکیاں تھرکتی ہوئی چلتی نظر آتی ہیں۔ یہ تیسری چیز یعنی شرم و حیا اور عفت و عصمت کے خاتمے کی وبا ہمارے ہاں ابھی اتنی نہیں آئی ہے۔ ابھی عالمِ اسلام پوری طرح اس کے دھارے میں نہیں آسکا۔ ہمارا ایلیٹ طبقہ جو بالکل مغرب پرست ہے ' وہاں پر تو یہ چیزیں آگئی ہیں 'لیکن عمومی طور پر نہیں آئیں۔ اس لیے اس وقت اس پر بہت زور لگ رہا ہے۔ این جی اوز کو اس مقصد کے لیے اربوں ڈالر دیے جا رہے ہیں کہ یہ جو شرم و حیا اور عفت و عصمت کے تصورات اور خاندانی نظام ابھی عالمِ اسلام کے اندر موجود ہے' اسے ختم کرنا ہے۔ ہنٹنگٹن نے ۱۹۹۶ء میں جوکتاب لکھی تھی: Clash of Civilizations (تہذیبی تصادم) تو اس میں اُس نے یہی لکھا ہے کہ مسلم تہذیب ہمارے اندر مدغم نہیں ہو

رہی' یہ ہمارے لیے لوہے کا چنا ثابت ہو رہی ہے' ہم اسے اپنے اندر جذب (assimilate) نہیں کر پا رہے۔ لہٰذا اس کے لیے بہت زور لگایا جا رہا ہے ۔ عورتوں کی مکمل آزادی اور ان کے مَردوں کے برابر حقوق کے نعرے لگ رہے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی ایک آرڈیننس پاس ہوا ہے اور قانون بن گیا ہے کہ جب تک زنا کے چار عینی گواہ

مجسٹریٹ کے سامنے جاکر گواہی نہ دے دیں کہ ہم نے اپنی آنکھوں سے زنا ہوتے دیکھا ہے تب تک زنا کا پرچہ ہی درج نہیں ہو گا اور اس سلسلے میں کوئی تفتیش نہیں ہو گی۔ یہ سب اس لیے کیا گیا ہے تاکہ عورت کو اس خوف سے آزاد کر دیا جائے کہ اگر وہ اس کام میں پکڑی گئی تو سزا ہو جائے گی۔

دجّالیت کا عظیم ترین منبع

اب ذرا یہ جان لیں کہ ان تینوں چیزوں کا منبع (source) کہاں ہے۔ اس کائنات کے اندر شر کا سب سے بڑا منبع ابلیس لعین ہے اور اِس وقت کم سے کم پچھلے چار سو سال سے ابلیس لعین کے سب سے بڑے ایجنٹ یہود ہیں۔ یہ دنیا میں شیطنت کی سب سے بڑی قوت (Satanic Force) ہیں۔ یہودیوں نے ہی سیکولرازم ایجاد کیا۔ اس کی جڑ بنیاد وطنیت تھی کہ ایک ملک کے رہنے والے سب برابر کے شہری ہیں اور اس کا فائدہ یہودیوں کو ہی پہنچا۔ اس لیے کہ وہ دنیا میں بہت ہی قلیل اقلیت (minute minority) میں ہیں ۔ اگر مذہب کا معاملہ ہوتا تو اُن کی کوئی حیثیت ہی نہ رہتی۔ لیکن جب مذہب کو ایک طرف نکال دیا گیا تو اب سبھی برابر کے شہری ہیں۔ اس طرح یہودیوں نے برابر کے حقوق حاصل کر لیے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ڈالر کے نوٹ پر اہرامِ مصر کے نیچے لکھا ہوا ہے: ''NOVUS ORDO SECLORUM'' یعنی ہمیں نیو سیکولرورلڈ آرڈر بنانا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی جو ۱۷۷۶ء لکھا ہوا ہے اس کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ امریکہ کی آزادی کا سال ہے اور یہی وہ سال ہے جب یہودیوں نے ''آرڈر آف الیومیناٹی'' بنایا تھا۔ اسی طرح یہودیوں نے سود خوری کے لیے یورپ میں اجازت حاصل کی۔ اس سے پہلے وہاں جب تک پوپ کی حکومت تھی دونوں قسم کا سود ممنوع تھا' یعنی مہاجنی سود (usury) اور کمرشل انٹرسٹ۔ مہاجنی سود جو عام طور پر ذاتی استعمال کے لیے

بڑی شرح کے ساتھ دیا اور لیا جاتا ہے' یہ ہمارے ہاں بھی ابھی تک موجود ہے۔ مختلف شہروں میں سود خوروں کے بڑے بڑے اڈے ہیں اور ان کی بہت بڑی طاقت ہے۔ تو یہودیوں نے یورپ میں سود کی اجازت لی۔ کیلون (Calven) نے ایک کتاب لکھی جس کے نتیجے میں سود کو جائز قرار دیا گیا۔ اور یہ سب پوپ کے خلاف بغاوت کر کے ہوا۔ پوپ سے بغاوت کر کے پہلا چرچ جو قائم کیا گیا وہ ''چرچ آف انگلینڈ'' تھا اور پھر پہلا بینک جو دنیا میں قائم ہوا وہ ''بینک آف انگلینڈ'' تھا۔ تب انگلینڈ کے بارے میں یہودیوں نے کہا کہ یہ تو ہمارا اسرائیل ہے' ہمیں تو یہاں جنّت مل گئی ہے' ہم یہاں آ گئے ہیں اور برابر کے شہری ہیں' ہمیں شہریت کے سارے حقوق حاصل ہو گئے۔ پھر یہودیوں نے دنیا میں بینکنگ کا باقاعدہ نظام قائم کیا اور بینکوں کا جال بچھا دیا۔ اس پر علامہ اقبال کہتے ہیں: ؎

ایں بنوک ایں فکر چالاکِ یہود
نورِ حق از سینۂ آدم ربود

کہ یہ بینکوں کا نظام یہودیوں کے چالاک فکر کا نتیجہ ہے' اور اللہ نے انسان کے اندر اپنا جو نور پھونکا تھا انہوں نے اسے نکال باہر کر دیا۔ اب انسان حیوان بن کر رہ گیا ہے۔ یہی معاملہ شرم و حیا اور عفت و عصمت کا ہے۔ ۱۸۹۷ء میں سوئزرلینڈ کے شہر برسلز کے اندر انہوں نے باقاعدہ طور پر جو ''Protocols of the Elders of Zions'' مرتب کیے اس میں یہی لکھا ہے کہ شرم و حیا کی یہ ساری اقدار ختم کر کے انسانوں کو اپنی شہوات اور خواہشات کا غلام بنا دیا جائے۔ انہیں حیوان بنا دیا جائے' تاکہ پھر ہم ان حیوانوں کو استعمال کر سکیں۔ اور جیسے گھوڑے کو تانگے میں یا بیل کو ہل میں جوتا جائے تو انہیں کچھ کھلایا بھی جاتا ہے 'تاکہ وہ اگلے دن بھی کام کر سکیں' ایسے ہی یہودیوں کی پالیسی ہے کہ ہم پوری دنیا کے ان انسان نما حیوانوں کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کریں گے' لیکن ان کی کمائی میں سے کچھ نہ کچھ ہم ان کو بھی دیتے رہیں گے۔ ان کی کمائی کی جو اصل ملائی ہے وہ ہم سود کے ذریعے کھینچ لیں گے اور تلچھٹ ان کے لیے چھوڑ دیں گے۔ تو درحقیقت ان تینوں چیزوں کا مرجع' منبع اور سرچشمہ یہود ہیں۔

دجّالیت کے زمینی مظاہر

اب ذرا نیچے آیئے۔ یہ تو ہوا سیاسی' معاشی اور سماجی سطح پر دجّالیت کا مظہر یا آفاقی فساد۔ اب دیکھئے کہ زمین پر کیا ہو رہا ہے۔ جب یو ایس ایس آر ختم ہوا تو امریکہ کو سول سپریم پاور آن اَرتھ ہونے کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ اِس وقت امریکہ بے شک بہت بڑی طاقت ہے۔ لیکن یاد رہے کہ دوسری عالمی جنگ سے پہلے امریکہ کسی بین الاقوامی معاملے میں نہیں آیا تھا۔ آپ کو معلوم ہے کہ امریکہ دو سمندروں کے مابین ہے۔ ایک طرف بحر اوقیانوس (Atlantic Ocean)اور دوسری طرف بحرالکاہل(Pacific Ocean)ہے اور امریکہ گویا ان دو کے درمیان ایک بہت بڑا جزیرہ ہے۔ دوسری عالمی جنگ سے پہلے اسے باقی دنیا سے کوئی تعلق نہیں تھا ۔اس نے جو بھی ترقی کی ہے اپنے اندر رہ کر کی ہے۔ دوسری عالمی جنگ میں جرمنی چھا گیا تھا اور اس نے سارا یورپ فتح کر لیا تھا۔ فرانس وغیرہ کی تو کوئی حیثیت ہی نہیں تھی' اُس نے برطانیہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔ لندن پر اتنی بمباری کی کہ یہ شہر پہچانا نہیں جاتا تھا۔ اس موقع پر چرچل نے امریکہ کا دورہ کیا اور بڑی کوشش کی کہ کسی طرح امریکہ اس جنگ میں ہمارا ساتھ دے تاکہ جرمنی اور جاپان کو شکست ہو۔ لیکن امریکہ مسلسل انکار کر رہا تھا۔ اس کے بعد جاپان کی طرف سے پرل ہاربر(Pearl Harbour) کا واقعہ ہوا۔ یہ بات یقین سے نہیں کہی جا سکتی کہ وہ بھی یہود کی سازش سے ہوا یا جاپان نے جان بوجھ کر کیا۔ پرل ہاربر بحرالکاہل میں ایک بہت بڑی امریکی بندرگاہ ہے' یہاں پر ایک بہت بڑا نیول بیس تھا۔ اس پر جاپانیوں نے اچانک بغیر کسی وارننگ کے حملہ کر دیا اور بہت سے جہاز غرق کر دیے۔ ان کے بے شمار لوگ

قتل ہو گئے اور بہت بڑی بربادی اور تباہی آئی۔ اس کے نتیجے میں گویا یہ شیر جو اپنی کچھار میں سویا ہوا تھا' اسے میدان میں نکلنا پڑا۔ اس کے بعد اس جنگ کا پانسہ پلٹ گیا۔ جرمنی کی بھی کمر ٹوٹ گئی اور جاپان کے دو شہروں ہیروشیما اور ناگاساکی پر امریکہ نے جو ایٹم بم گرائے تو اس سے اس کا بھرکس نکل گیا۔ تو اُس وقت سے امریکہ میدان میں آیا ہے۔ لیکن اس کے بعد بھی تقریباً چالیس پینتالیس برس تک امریکہ روئے ارضی کی واحد سپریم پاور نہیں بنا تھا' بلکہ ایک مدِ مقابل اس

کے سامنے کھڑا تھا' اور وہ یو ایس ایس آر تھا۔

۱۹۱۷ء میں روس میں جو انقلاب آیا تھا تو اس کے بعد کمیونزم اس تیزی کے ساتھ بڑھا کہ پورا مشرقی یورپ اس کی لپیٹ میں آگیا' چائنا بھی کمیونسٹ ہو گیا۔ یہاں تک کہ لاطینی امریکہ میں بھی کمیونزم پہنچ گیا۔ کیوبا ابھی تک کمیونسٹ سٹیٹ ہے۔ تو یہ طوفان اس تیزی سے اٹھ رہا تھا کہ امریکہ کو سرتوڑ کوشش کرنی پڑی کہ اسے کسی طریقے سے روکا جائے' اس کے آگے بند باندھا جائے۔ اسی مقصد کے لیےMEDO بنی' CENTO بنی ' SEATO بنی اور پھر NATO بنی۔ اور یہ بھی نوٹ کر لیجیے کہ ایک طرف کمیونزم کا سیلاب آ رہا تھاتو دوسری طرف فضا کی تسخیر میں روس سب پر بازی لے گیا' سائنس میں بازی لے گیا ۔ دنیا میں سب سے پہلے روس کے خلانورد خلا کے اندر گئے۔ تو امریکہ کانپ رہا تھا اور اس کی ساری بھاگ دوڑ اس پر مرکوز تھی کہ کسی طرح اس طاقت کو نیچا دکھایا جائے۔ لہٰذا سینٹو' سیٹو اور نیٹو وغیرہ سب کے سب معاہدے روس کے گھیرائو کے لیے تھے۔بہرحال امریکہ کی کوششوں سے ایک طرف یو ایس ایس آر کی اکانومی بیٹھ گئی اور دوسری طرف روس سے خاص طو رپر جو حماقت ہوئی وہ یہ تھی کہ وہ افغانستان پر حملہ آور ہو گیا۔ اب یہاں روس کے مقابلے کے لیے افغان کھڑے ہو گئے اورامریکہ نے اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے ان کی بہت مدد کی اور انہیں استعمال کیا۔ اسے بہترین موقع مل گیا کہ مریں گے افغان جبکہ پیسہ ہم دیں گے' ہتھیار ہم فراہم کریں گے۔ چنانچہ ڈالروں سے بھرے بڑے بڑے بکس افغانستان پہنچنا شروع ہو گئے ۔ اُس وقت افغان مجاہدین بڑی بڑی شاندار قسم کی گاڑیوں کے اندر گھوما کرتے تھے۔ یہ سب پیسہ امریکہ کا تھا' ہتھیار امریکہ کے تھے۔ امریکہ نے انہیں سٹنگر میزائل دے دیا جو روس کی شکست کی اصل وجہ بنا۔ اب چونکہ یو ایس ایس آر ختم ہوگیا تو امریکہ کو سول سپریم پاور آن اَرتھ کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ میں نے پوری تاریخ آپ کے سامنے رکھ کر بتا دیا ہے کہ امریکہ بین الاقوامی معاملات میں پہلے نہیں آیا تھا۔جس طرح ابھی چین بین الاقوامی معاملات میں آنے کو تیار نہیں ۔ وہ اپنی معاشی ترقی میں لگا ہوا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اپنی اکانومی کو اتنا مضبوط کر لے کہ پھر بڑی سے بڑی طاقت بھی اس

سے نہ ٹکرا سکے۔ بہرحال امریکہ اپنے ہاں ترقی میں مگن تھا۔ لیکن پھر یہودیوں کی سازش سے یا جاپانیوں کی اپنی حماقت کہ انہوں نے جا کر پرل ہاربر پر حملہ کر دیا جس سے امریکہ کو بہت بڑا نقصان پہنچا ،جس کے نتیجے میں وہ میدان میں آیا اور پھر جرمنی اور جاپان کو شکست ہوئی۔ اس کے بعد پھر صرف ''کولڈ وار'' رہ گئی۔ ''ہاٹ وار'' اس لیے نہیں ہوئی کہ ایٹمی ہتھیار اُدھر بھی تھے اور اِدھر بھی تھے ۔ پچھلی صدی کا نصف ثانی اس کیفیت میں گزرا کہ دونوں طرف سے میزائیل ایک دوسرے کا نشانہ لیے تیار حالت میں تھے۔ خطرہ یہ ہوتا تھا کہ کبھی اتفاقاً بھی کوئی بٹن دب گیا تو دنیا ختم ہوجائے گی۔ اس لیے کہ پھر جو جنگ ہو گی وہ ایٹمی جنگ ہو گی۔ اس کے بعد دنیا نہیں رہے گی' بلکہ ختم ہو جائے گی۔ لیکن بہرحال اس کے بعد امریکہ سول سپریم پاور آن ارتھ بن گیا۔

امریکہ میں اعلیٰ سطح کے پالیسی ساز اداروں میں ان کے فہیم عناصر (intellectuals) بیٹھے ہوئے ہیں اور پچھلی صدی کی آخری دہائی سے ان تھنک ٹینکس کی سوچ کا محور یہی ہے کہ اپنی اس پوزیشن کو کیسے برقرار رکھنا ہے۔ چنانچہ وہ اسی پر غور و خوض کرتے ہیں کہ اکیسویں صدی کو امریکہ کی صدی بنانا ہے تو اس کے لیے انہیں کیا کرنا ہو گا۔یعنی امریکہ کو دنیا کے پولیس مین کی حیثیت حاصل ہو جائے۔ کسی بھی جگہ کچھ بھی ہو وہ اس کی اجازت سے ہو۔ جنگ ہو تو اس کی اجازت سے ہو' صلح ہو تو اس کی اجازت سے ہو۔ ان تھنک ٹینکس کے پیش نظر دوسری چیز یہ ہے کہ اس دجّالی تہذیب اور تمدن کو بقاء اور دوام دینا ہے۔ یہ دجّالی تہذیب جو یہودیوں کے ذریعے سے پچھلے تین سو برس میں اُبھری ہے اب اس کو برقرار رکھنا ہے۔ کوئی دوسری تہذیب اس کے مقابلے میں نہ آنے پائے' کوئی تہذیب اس کو چیلنج نہ کرنے پائے۔ دجّالیت کی جو تین سطحیں میںنے گِنوائی ہیں ان کو پوری طرح برقرار رکھنا ان کا مطمحِ نظر ہے۔

اس کے علاوہ ان کا ایک تیسرا مقصد بھی ہے۔ دراصل اس ساری منصوبہ بندی کے پیچھے اصل دماغ صیہونیوں (Zionists) کا ہے اور صیہونی دو طرح کے ہوتے ہیں' یہود اور عیسائی۔ تو ان دونوں کا جو پانچ نکاتی ایجنڈا ہے اس کو مکمل کرنا ان کا تیسرا مقصد ہے۔ میں کئی دفعہ بیان کرچکا ہوں کہ مشرقِ وسطیٰ میں ایک بہت بڑی خونریز جنگ ہونی ہے جسے

احادیث میں ''الملحمۃ العظمٰی'' کہا گیا ہے۔ اسے ''ہرمجدون'' (Armageddon) بھی کہا جاتا ہے۔ صیہونیوں کا مقصد ہے گریٹر اسرائیل کا قیام' جس میں مشرقِ وسطیٰ کے تقریباً تمام ممالک آجائیں گے۔ پھر یہ کہ مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرۃ (Dome of the Rock) کو گرانا' تاکہ وہ تھرڈ ٹیمپل تعمیر کریں اور اس میں وہ تختِ داؤدؑ (Throne of David) لا کر رکھ دیں۔ اِس وقت یہ ویسٹ منسٹر ایبے کے اندر رکھا ہوا ہے۔ یہ وہ پتھر ہے جس پر بٹھا کر حضرت داؤد علیہ السلام کی تاجپوشی کی گئی تھی۔ یہ اب ایک کرسی میں ایک سیٹ کے طور پر لگا ہوا ہے۔ ان کا چوتھا مقصد

عالمِ اسلام کے وسائل خاص طور پر تیل پر قبضہ کرنا ہے۔ یہود اور امریکہ کے مقاصد کو سمجھنا بہت ضروری ہے' ان کے یہ چاروں مقاصد ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں' جیسے ایک رسّی ہوتی ہے جو مختلف لڑیوں سے بٹ کر بنائی جاتی ہے۔

بش ڈاکٹرائن

اس ضمن میں بش کے دَور کی خاص بات یہ ہے کہ امریکہ کو عالمی رائے عامہ کی کوئی پرواہ نہیں' یو این او اور خود اپنے یورپی اتحادیوں کی بھی کوئی پرواہ نہیں۔ البتہ اس جنگجوئی کے لیے وہ اپنی رائے عامہ کو تیار کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ خاص طور پر وہ جنگیں جو انہوں نے مشرقِ وسطیٰ اور عالمِ اسلام کے اوپر مسلط کی ہوئی ہیں ' اس کے لیے انہیں پیسے کی ضرورت ہے۔ اس کی منظوری کانگریس دیتی ہے اور کانگریس میں عوام کے نمائندے بیٹھے ہوئے ہیں۔ چنانچہ رائے عامہ ہموار کرنے کے لیے ایک سازش گھڑ کر ''Twin Towers'' کو گرایا گیا اور نائن الیون کا واقعہ پیش آیا۔ اس سے پہلے امریکہ میں ایک کتاب بھی لکھی جاچکی تھی:"America needs a Pearl Harbour" کہ امریکہ کو ایک بار پھر پرل ہاربر جیسے واقعہ کی ضرورت ہے۔ جیسے پرل ہاربر کے نتیجے میں وہ امریکی شیر ایک دم دھاڑتا ہوا اپنی کچھار سے نکلا تھا ایسے ہی اب پھر اس بات کی ضرورت ہے کہ امریکہ کو پھر اتنا بڑا نقصان پہنچے جتنا بڑا پرل ہاربر میں پہنچا تھا' تاکہ پوری قوم غصے میں آکر آواز اٹھائے کہ دشمن کو تہس نہس کر دو۔ یہ بش کی پالیسی (Bush Doctrine) ہے۔ اور بش ڈاکٹرائن میں یہ بھی ہے کہ ہمیں جہاں کہیں سے بھی کوئی اندیشہ ہو گا 'چاہے وہاں سے ہم پر کوئی حملہ نہ ہو' ہم

وہاں پہلے ہی از خود حملہ کر دیں گے۔ امریکہ کی طرف سے یہ باتیں کھلم کھلا کہی گئی ہیں' حالانکہ پوری دنیا میں اس رائے کے خلاف مظاہرے ہوئے اور بڑے بڑے جلوس نکلے۔ لندن میں جتنا بڑا جلوس نکلا' لندن کی تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ لیکن امریکہ نے اپنے ذرائع ابلاغ یعنی الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کے ذریعے سے اپنی رائے عامہ کو پوری طرح ہموار کرلیا کہ نائن الیون کا سانحہ مسلمانوں نے کیا ہے' یہ اسامہ نے کیا ہے' القاعدہ نے کیا ہے' ان سے ہمارے وجود کو خطرہ ہے لہٰذا ان پر ٹوٹ پڑو۔ اس کے لیے انہوں نے اپنے ہاں شہری حقوق اور شہری آزادیوں کو معطل کیا جو اُن کے لیے بہت قابلِ فخر چیزیں تھیں۔ ان کے اندر انہوں نے کٹوتیاں کیں۔ یہ ساری سکیم محض اس لیے تیار کی گئی تاکہ امریکی رائے عامہ بش کی جنگجوئی کے لیے مواد فراہم کرتی رہے اور کانگریس سے پیسے کی منظوری ملتی رہے۔ ان جنگوں اور پالیسیوں پر ان کا اربوں ڈالر روزانہ کا خرچ اٹھ رہا ہے۔

دجّالیت کا اصل ہدف : عالمِ اسلام

امریکہ اپنے مذکورہ بالا مقاصد کے حصول کے لیے جنگی جنون میں مبتلا ہے اور صدر بش امریکہ کے تمام

سابقہ صدور سے بڑا جنگجو صدر کہلاتا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ مجھے خدا نے حکم دیا ہے کہ جنگ کرو۔ یہ کٹر عیسائی ہے اور Evengelist ہے۔ اِس کا باپ بلی گراہم کے بیٹے کا مرید تھا اور یہ بھی اس کا مرید ہے۔ واضح رہے کہ بلی گراہم ایک بہت بڑا Evengelist تھا۔ اخبارات میں چھپا ہے کہ ۲۰۰۵ء میں صدر بش نے ایک کٹر کرسچین آرگنائزیشن کو چالیس ارب ڈالر دیے تھے۔ اور نیویارک ٹائمز کی ایک تازہ اطلاع ہے کہ ۲۰۰۴ء میں بش نے حکم دے دیا تھا کہ سعودی عرب پر بھی حملہ کرو' پاکستان پر بھی اور شام پر بھی ۔ لیکن امریکہ کی ڈیفنس فورسز کے کمانڈر نے کہا کہ نہیں' ہم پہلے ہی بہت پھیل گئے ہیں' ہماری قوت بہت زیادہ منقسم اور منتشر ہو گئی ہے۔ ہماری فوج افغانستان میں ہے' عراق میں ہے اور ہمارے اڈے کہاں کہاں تک بنے ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے اڈا جہاں بھی ہوتا ہے وہاں فوج بھی ہوتی ہے۔ تو اس نے روکا کہ آخر ہم کہاں سے اتنی فوج لائیں گے؟ امریکہ نے Twin Towers کا ڈرامہ رچا کر جو حملہ کیا تو اس جنگجوئی کا اوّلین ہدف عالمِ

اسلام بنا۔ اس لیے کہ پرانی کہاوت ہے ''نزلہ بر عضو ضعیف'' کہ نزلہ انسان کے جسم کے کمزور اعضاء پر گرتا ہے۔ مشرقِ وسطیٰ میں مسلمان کمزور ہیں' اس لیے ان پر فتوحات حاصل کرنا امریکی ایجنڈے میں شامل ہے۔ پھر یہ کہ تیل کے عظیم ترین ذخائر عربوں کے قدموں کے نیچے ہیں۔ امریکہ کا یہاں پر ایک نئی عرب شیعہ ریاست بنانے کا پروگرام ہے جس میں ایران کا ایک صوبہ اہواز بھی آتا ہے جو خلیج کا مشرقی ساحل بنتا ہے جہاں عرب آباد ہیں' اور خلیج کے دوسری طرف سعودی عرب کی مشرقی پٹی بھی اس نقشہ میں شامل ہے۔ پھر کویت اور عراق کا ایک جنوبی حصّہ بھی اس میں شامل ہے جہاں شیعہ آباد ہیں۔ ان کو ملا کر ایک نئی عرب شیعہ ریاست بنانا ان کے پروگرام میں شامل ہے اور وہ یہ نقشہ شائع کر چکے ہیں۔

پھر یہ کہ ان کی دجّالی تہذیب کے لیے بھی صرف عالمِ اسلام رکاوٹ ہے۔ باقی دنیا تو حیوان بن چکی ہے۔ وہاں آزاد شہوت رانی ہے۔ وہ نہیں جانتے کہ عفت و عصمت بھی کسی شے کا نام ہے۔ جبکہ مسلمان ممالک میں ابھی تک عفت و عصمت اور شرم و حیا کا تصور قائم ہے۔ والدین کا ادب اور عزت و احترام ابھی باقی ہے۔ بڑھاپے کے اندر ان کی خدمت کرنا مسلمان اپنا فرض سمجھتا ہے۔ خاندانی نظام ابھی باقی ہے ۔بیوی اور شوہر عمر بھر ایک دوسرے کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ پوری طرح وفادار رہتے ہیں۔ والدین کی ساری توجہ اولاد پر مرکوز ہے۔ اگرچہ کچھ غلطیاں کوتاہیاں ہو جاتی ہیں' لیکن مسلمانوں کا خاندانی نظام قائم ہے۔ جبکہ یورپ میں جب لڑکا لڑکی بالغ ہو جاتے ہیں تو والدین کہتے ہیں اب جاؤ اور اپنے پاؤں پر کھڑے ہوجاؤ' اب ہم ذِمّہ دار نہیں ہیں' ہم نے جتنا پالنا پوسنا تھا پال پوس دیا۔ لہٰذا ان کا خاندانی نظام برباد ہو گیا ہے۔

صیہونیوں کا جو پانچ نکاتی ایجنڈا ہے وہ بنیادی طور پر مشرقِ وسطیٰ سے متعلق ہے۔ مشرقِ وسطیٰ میں جو

صورت حال بن رہی ہے اس سے مجھے اندیشہ ہے کہ یہودی شاید بہت جلد مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرۃ کو گرا دیں۔ اس کے نتیجے میں ایک طوفان برپا ہو گا اور اس کو دبانے کے لیے پھر اتحادی افواج حملہ آور ہوں گی ۔ رسول اللہ ﷺ کی حدیث مبارکہ ہے کہ عیسائی تم پر اسّی علَم لے کر حملہ آور ہوں گے اور ہر علَم کے نیچے بارہ ہزار فوج ہو گی‘ یعنی

41

ساڑھے نو لاکھ فوج۔ یہ نیٹو جو تیار ہو رہی ہے اور اس کی مسلسل توسیع کی جا رہی ہے تو یہ کس لیے ہے؟ حالانکہ نیٹو تو بنائی گئی تھی روس کے خلاف اور روس اب ختم ہو چکا ہے‘ وہ ان کے لیے اب کوئی چیلنج نہیں رہا۔ اگرچہ وہ دوبارہ اُبھر رہا ہے لیکن ابھی اس کے اندر ان کا سامنا کرنے کا دم خم نہیں ہے ۔تو یہ نیٹو اسی لیے تیار ہو رہی ہے کہ مسلمانوں کے خلاف ان کا جو پانچ نکاتی ایجنڈا ہے اس کو پورا کیا جا سکے۔ اور اس کے لیے ظاہر بات ہے ان کو جنگ کرنا ہو گی۔ گریٹر اسرائیل کے مجوزہ نقشہ میں انہوں نے عراق‘ شام‘ اردن اور لبنان کے پورے پورے ممالک شامل کیے ہیں۔ ترکی کا جنوبی حصّہ اور سعودی عرب کا شمالی حصّہ بشمول مدینہ بھی اس نقشے میں شامل ہے۔ مکّہ مکرمہ کی بات وہ نہیں کرتے ‘اس لیے کہ یہودی کبھی بھی مکہ میں آباد نہیں رہے ۔اس کے علاوہ مصر کا جشن کا علاقہ بھی اس نقشے میں شامل کیا گیا ہے جو ڈیلٹا کا انتہائی زرخیز علاقہ ہے اور جہاں حضرت یوسف علیہ السلام کے دَور میں حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کے گیارہ بیٹے جا کر آباد ہوئے تھے۔تو یہ ان کا گریٹر اسرائیل کا منصوبہ ہے‘ جس کے لیے بش نے جنگجویانہ پروگرام بنایا۔

صدر اوباما اور اس کی پالیسیاں

امریکہ میں جو اِس وقت بہت بڑی تبدیلی آئی ہے کہ باراک حسین اوباما صدرِ امریکہ بن گیا ہے‘ اس سے بڑی امیدیں وابستہ کی جا رہی ہیںکہ شاید وہ کچھ تبدیلی لائے گا اور کچھ اچھا کام کرے گا‘ اس لیے کہ اس کی رگوں میں مسلمان کا خون ہے۔ اس کا باپ اور دادا کینیا کے سیاہ فام مسلمان تھے جبکہ ماں عیسائی تھی اور وائٹ امریکن تھی۔ لیکن اس ضمن میں پہلی بات تو یہ سمجھ لیجیے کہ امریکہ کی پالیسیاں دو ہوتی ہیں‘ ایک ڈومیسٹک اور ایک گلوبل یا انٹرنیشنل۔ ان کی جب حکومتیں بدلتی ہیں تو ڈومیسٹک پالیسیوں میں تو تبدیلیاں آسکتی ہیں کہ ٹیکس کے اندر زیادتی یا کمی کر دی جائے‘ شرحِ سود میں اضافہ کر دیا جائے یا کمی کر دی جائے‘ امیگریشن پر پابندیاں لگائی جائیں یا دروازے کھول دیے جائیں‘ لیکن ان کی جو گلوبل ‘ انٹرنیشنل یا فارن پالیسیاں ہیں ان کے اندر کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ ان کا نقشہ دس دس پندرہ پندرہ سال پہلے سے بنا کر رکھ دیا جاتا ہے۔ اس کے لیے ان کے ہاں بڑے بڑے

42

تھنک ٹینکس ہیں۔ ان کے جو تین سب سے بڑے ادارے ہیں‘ یعنی سی آئی اے‘ پینٹاگون (جو اُن کی مسلح افواج کا مرکز ہے) اور سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ‘ ان میں انتہائی ذہین و فطین لوگ بیٹھے ہوئے ہیں‘ جو طے کرتے ہیں کہ ہمیں کیا کرنا

ہے‘ اور کوئی بھی امریکی صدر آکر اس میں بال برابر تبدیلی نہیں کر سکتا۔ لہٰذا بش کی یہ پالیسی جوں کی توں جاری رہے گی۔ اور اوباما نے جو سفید فام امریکیوں سے ووٹ لیے ہیں تو اس وجہ سے کہ اس نے عالم ِ اسلام کے خلاف دوسروں سے بڑھ چڑھ کر باتیں کی تھیں‘ اگرچہ بعد میں اس نے کچھ نرم لب و لہجہ اختیار کیا ۔ یہ ایفرو امریکنز میں سے ہے ۔ لہٰذا یہ خاص طو رپر ایسے کام کرے گا کہ سفید چمڑی والے امریکی اور خاص طور پر یہودی لابی ناراض نہ ہو جائے۔ چنانچہ اس نے پہلا کام یہ کیا ہے کہ ایک بڑے کٹر یہودی کو وائٹ ہائوس کا چیف آف سٹاف بنایا ہے‘جس کا نام رام عمانویل ہے اور یہ اسرائیل کی Likudپارٹی سے ہے جو زیادہ کٹر‘ زیادہ مذہبی اور زیادہ انتہا پسند جماعت ہے۔ اس کے اس اقدام پر اسرائیل کے اخبارات نے فتح کے شادیانے بجائے ہیں کہ اب ہمارے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں بن سکتا‘ اب تو ہمارا اپنا آدمی پورے سیکرٹیریٹ کی سب سے بڑی اتھارٹی ہے۔ اس کے علاوہ اس نے ایک ہندو سونال شا کو اپنا مشیر بنایا ہے‘ جو ہندوئوں کی ایک متعصب اور مسلمانوں کی بہت شدید مخالف جماعت ’’وشوا ہندو پریشد‘‘ کے یوتھ ونگ ’’بجرنگ دل‘‘ سے متعلق ہے۔ گویا جنوبی ایشیا کے لیے اوباما کا مشیر یہ ہندو ہو گا۔ لہٰذا اس سے کسی خیر کی توقع نہ رکھیے۔

سورۃ الاحزاب کی آیت ۱۰ میں فرمایا گیا ہے: {اِذْ جَآءُوْکُمْ مِّنْ فَوْقِکُمْ وَ مِنْ اَسْفَلَ مِنْکُمْ}’’اور (یاد کرو وہ وقت) جب دشمن تمہارے اوپر سے بھی چڑھ کر آئے تھے اور نیچے سے بھی‘‘۔غزوۂ احزاب کے موقع پر دشمن کی فوجیں اوپر سے یعنی شمال اور مشرق سے بھی آئی تھیں اور جنوب سے بھی جو نیچے کا علاقہ کہلاتا تھا ۔آج بعینہٖ یہی صورت حال ہے جو میں نے آپ کو بتائی ہے کہ اِس وقت ایک تو اوپر سے دجّالیت کے تین غلاف ہیں اور زمین پر یہودی صیہونیوں اور عیسائی صیہونیوں سب کا یہی پروگرام بن رہا ہے کہ عالم ِ اسلام کو درہم برہم کر دینا ہے اور مشرقِ وسطیٰ کے اندر ایک گریٹر اسرائیل قائم کرنا ہے۔

اگرچہ ان کے چاہنے سے کچھ نہیں ہو گا جب تک کہ اللہ نہیں چاہے گا۔ ارشادِ الٰہی ہے: {وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ }(الدھر:۳۰)چنانچہ ہو گا وہی جو اللہ چاہے گا۔

یہ مَیں نہیں کہہ سکتا کہ اللہ کا کیا نقشہ ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے اللہ ہمیں آخری سزا دینے پر تل گیا ہو۔ آخری سزا کے ہم مستحق تو ہو چکے ہیں۔ خاص طو رپر عرب سب سے بڑے مجرم ہیں جن کی مادری زبان میں اللہ کا کلام موجود ہے اور پھر بھی انہوں نے اللہ کے نظام کو قائم نہیں کیا۔ ان کے ہاں بھی وہی مغرب کا نظام ہے‘ وہی سودی معیشت ہے‘ وہی تہذیب و تمدن ہے۔ دوسرے بڑے مجرم ہم پاکستانی مسلمان ہیں جنہوں نے اسلام کے نام پر ایک ملک تقسیم کرایا۔ لاکھوں جانیں قربان ہوئیں‘ ہزارہا عورتوں کی عصمت دری ہوئی‘ ہزارہا عورتیں اور بچے اغوا ہوئے ۔ یہ سب اسلام کے نام پر ہوا کہ ہمیں ایک ایسا خطۂ زمین چاہیے جہاں ہم اسلام کا نظام قائم کر

سکیں،لیکن کہاں ہے وہ اسلام؟ ہم نے اللہ تعالیٰ سے وعدہ خلافی کی جس کی پاداش میں ہو سکتا ہے اللہ تعالیٰ ہمیں آخری سزا دے اور وہ یہود و نصاریٰ کے ہاتھوں ہو۔ یہ بات ضرور امریکہ کے پیش نظر ہو گی کہ اپنے پانچ نکاتی ایجنڈے کو مکمل کرنے کے لیے پہلے پاکستان کے ایٹمی دانت توڑ دیے جائیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ عالمِ اسلام کے اندر ایک طوفان آجائے اور عوامی بہاؤ کے اندر حکومتیں بہہ جائیں تو پھر یہ ایٹمی ہتھیار بنیاد پرست مسلمانوں کے ہاتھ لگ جائیں۔ میں پہلے یہ سن کر ہنسا کرتا تھا جب لوگ یہ کہتے تھے کہ کہیں یہ ایٹمی ہتھیار بنیاد پرستوں کے ہاتھ نہ لگ جائیں۔ میں کہتا تھا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ پاکستان کے اندر بنیاد پرست مسلمانوں کی حکومت بنے؟ لیکن اب مجھے نظر آ رہا ہے کہ ہاں یہ ممکن ہے۔ جس دن مسجد اقصیٰ شہید کی گئی اور قبۃ الصخرہ کو گرایا گیا تو عالمِ اسلام کے اندر ایک قیامت آجائے گی ۔ اسلامی ملکوں کی حکومتیں اور ہیں جبکہ عوام اور ہیں ۔ عوام کے جذبات مختلف ہیں۔ پھر واقعۃً ایک طوفان برپا ہو گا اور اسے دبانے کے لیے عیسائی فوجیں اسّی علم لے کر آئیں گی۔ یہ باتیں اب زیادہ دُور نظر نہیں آرہیں۔

اب ہمیں کرنا کیا ہے' اس موضوع پر اِن شاء اللہ آئندہ نشست میں گفتگو ہو گی۔

اقول قولی هذا واستغفراللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلماتoo

---

عالمِ اسلام پر یہود و نصاریٰ کی سازشیں

۲۱ ؍نومبر ۲۰۰۸ء کا خطابِ جمعہ

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اعوذ اللہِ من الشَّیطٰن الرَّجیم ۔ بِسْمِ اللہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ {فَلَآ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ ﴿۱۶﴾وَ الَّیْلِ وَ مَا وَسَقَ ﴿۱۷﴾وَ الْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ ﴿۱۸﴾لَتَرْکَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ﴿۱۹﴾فَمَا لَہُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ﴿۲۰﴾ } (الانشقاق)

مینارِ پاکستان کے سبزہ زار میں ۴ نومبر کو میں نے جو خطاب کیا تھا اس کے مضامین کی سلسلہ وار وضاحت ان خطاباتِ جمعہ میں جاری ہے۔ ۷ نومبر کے خطابِ جمعہ میں اس خطاب کا پہلا حصّہ بیان ہو گیا تھا۔ اِس وقت اس کا اعادہ

مقصود نہیں ہے‘ لیکن میں نے اپنی اس تقریر کے لیے جن آیاتِ قرآنیہ کا انتخاب کیا تھا‘ اس کے حوالے سے کچھ مزید عرض کرنا چاہتا ہوں۔

سورۃ المدثر کی جن آیات پر گفتگو کی گئی تھی ان میں اللہ تعالیٰ نے چاند‘ رات اور صبح کی قسمیں کھائی ہیں۔ یہی معاملہ ہمیں سورۃ الانشقاق میں نظر آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں سورتوں کے درمیان میں قسمیں کھائی ہیں۔ قرآن حکیم میں عام طور پر قسمیں سورتوں کے شروع میں ہوتی ہیں۔ مثلاً سورۃ الفجر کا آغاز ہوتا ہے : {وَ الۡفَجۡرِ ۙ﴿۱﴾ وَ لَیَالٍ عَشۡرٍ ۙ﴿۲﴾ وَّ الشَّفۡعِ وَ الۡوَتۡرِ ۙ﴿۳﴾ } سورۃ العصر کا آغاز بھی قسم سے ہوتا ہے: {وَ الۡعَصۡرِ ۙ﴿۱﴾} سورۃ التین کے شروع میں ہے:{وَ التِّیۡنِ وَ الزَّیۡتُوۡنِ ۙ﴿۱﴾ وَ طُوۡرِ سِیۡنِیۡنَ ۙ﴿۲﴾ وَ ہٰذَا الۡبَلَدِ الۡاَمِیۡنِ ۙ﴿۳﴾ } تو عام طور پر سورتوں کے آغاز میں قسمیں کھائی جاتی ہیں‘ لیکن کچھ استثناء ات ہیں‘ جن میں سے یہ دو مقامات بہت اہم ہیں۔ میں

عرض کر چکا ہوں کہ ان دو مقامات کے ضمن میں مجھے جو ایک وجدانی (intutional) تأثر حاصل ہوا ہے وہ میں بیان کر رہا ہوں‘ اسے آپ ان آیات کی تفسیر نہ سمجھیں۔

میرے نزدیک سورۃ المدثر کی آیات میں بعثتِ محمدیؐ کا ذکر ہے۔ ارشاد ہوا:{کَلَّا وَ الۡقَمَرِ ﴿۳۲﴾ }’’ہرگز نہیں‘ قسم ہے چاند کی‘‘۔ آنحضور ﷺ کی بعثت سے پہلے جو ہدایتِ نبوت تھی وہ گویا چاند کی مانند تھی۔ ابھی نبوت و رسالت کا تدریجاً ارتقاء ہو رہا تھا۔ پھر ایک بڑی طویل رات آئی‘ جو چھ سو برس پر محیط تھی‘ جس میں کوئی نبی‘ کوئی رسول دنیا میں موجود نہیں تھا۔ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت کا درمیانی زمانہ ہے۔ {وَ الَّیۡلِ اِذۡ اَدۡبَرَ ﴿۳۳﴾ }’’اور قسم ہے رات کی جبکہ وہ پیٹھ موڑ کر چل دے‘‘۔ اب جبکہ نبی اکرم ﷺ کی بعثت ہوئی ہے تو وہ رات اب گویا پیٹھ موڑ کر جا رہی ہے‘ اس کی روانگی ہے۔{وَ الصُّبۡحِ اِذَاۤ اَسۡفَرَ ﴿۳۴﴾ }’’اور قسم ہے صبح کی جبکہ وہ روشن ہو جائے‘‘۔ یعنی خورشید نبوتِ محمدی علی صاحبہا الصلوۃ والسلام اب طلوع ہو گیا ہے۔ ہدایتِ نبوت اب گویا سورج کی مانند ہے۔ وہ چاند کا معاملہ تھا‘ یہ اب خورشید نبوتِ محمدیؐ ہے۔ اور فرمایا:{نَذِیۡرًا لِّلۡبَشَرِ ﴿۳۶﴾ } ’’یہ خبردار کرنے کے لیے ہے پوری نوعِ انسانی کو‘‘۔ آنحضور ﷺ کی بعثت کسی خاص قوم کے لیے نہیں تھی بلکہ پوری نوعِ انسانی کے لیے تھی۔ چنانچہ بعد میں واضح کیا گیا:{وَ مَاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیۡرًا وَّ نَذِیۡرًا} (سبا:۲۸)’’اور (اے نبی ﷺ !) ہم نے آپ کو نہیں بھیجا ہے مگر تمام نوعِ انسانی کے لیے بشیر اور نذیر بنا کر‘‘۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ ان آیاتِ مبارکہ کا بعثتِ محمدیؐ سے تعلق اس سے بھی ظاہر ہے کہ سورۃ المدثر کے شروع میں آنحضور ﷺ کی بعثت ہی کا ذکر ہے: {یٰۤاَیُّہَا الۡمُدَّثِّرُ ۙ﴿۱﴾ قُمۡ فَاَنۡذِرۡ ۪ۙ﴿۲﴾ وَ رَبَّکَ فَکَبِّرۡ ۪ۙ﴿۳﴾ }

گزشتہ خطاب کا تکملہ

آج کے موضوع سے متعلق کچھ گفتگو گزشتہ خطابِ جمعہ میں ہو چکی ہے‘ لیکن اس میں کچھ خلا رہ گئے تھے جنہیں میں آج پورا کروں گا۔ سورۃ المدثر اور سورۃ الانشقاق میں تین تین قسمیں کھائی گئی ہیں اور دونوں مقامات پر رات اور چاند کا ذکر ہے۔ یہ ان دونوں

مقامات میں مشابہت کا پہلو ہے۔ ان آیات کا پس منظر یہ ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ پر خورشید نبوت طلوع ہو گیا‘ لیکن اس کے بعد جلد ہی ایک زوال کا آغاز ہو گیا‘ جیسا کہ حضور ﷺ نے خود فرما دیا تھا :

((بَدَأَ الْاِسْلَامُ غَرِيْبًا وَسَيَعُوْدُ كَمَا بَدَأَ غَرِيْبًا فَطُوْبٰى لِلْغُرَبَاءِ))(۱)

’’اسلام کی جب ابتدا ہوئی تھی تو یہ اجنبی تھا‘ اور پھر ویسے ہی اجنبی ہو جائے گا جیسے ابتدا میں تھا۔ پس ایسے اجنبیوں کے لیے خوشخبری ہے۔‘‘

چنانچہ خلافت ِراشدہ کے اختتام کے ساتھ ہی اسلام کے زوال کا آغاز ہو گیا۔ اس لیے کہ خلافت کا نظام شورائی نظام تھا‘ مسلمانوں کے مشورے سے اہل ترین آدمی خلیفہ مقرر ہوتا تھا‘ کوئی موروثی نظام تو نہیں تھا۔ لیکن اب وہ ملوکیت کا دور آگیا تو گویا ایک منزل گر گئی۔ پھر رفتہ رفتہ زوال میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ تو اس اعتبار سے آج سے تین سو برس قبل ایک وقت وہ آیا کہ گویا خورشید نبوتِ محمدیؐ غروب ہو گیا۔ البتہ اس کی صرف شفق کی لالی باقی رہ گئی۔ اسلام بحیثیت ِدین پوری دنیا میں کہیں نہیں رہا‘ بلکہ اس کی حیثیت مذہب کی رہ گئی۔ اسلام بحیثیت مذہب انگریز کے دور میں بھی ہر جگہ رہا ہے۔ یورپی استعمار کے دور میں بھی کسی نے نماز‘ روزے پر پابندی نہیں لگائی۔ لیکن بحیثیت دِین اسلام کا آفتاب آج سے تین سو برس قبل غروب ہو گیا۔ سورج کے غروب ہونے کے بعد بھی شفق کی روشنی کچھ دیر تک رہتی ہے۔ اب گویا دنیا میں جو نبوت کی تعلیم باقی رہ گئی تھی وہ شفق کی مانند تھی :{فَلَآ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ ﴿۱۶﴾ وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ ﴿۱۷﴾ }

اس کے بعد جو رات شروع ہوئی ہے اس نے اپنے اندر بہت کچھ سمیٹ لیا ہے۔ اس کے دو پہلو اچھی طرح سمجھ لیجیے۔ تین سو برس سے نوعِ انسانی پر طاری اس طویل رات میں پہلا کام یہ ہوا کہ اُمّت ِمحمد ﷺ والسلام غلام ہو گئی۔ یورپی استعمار نے انڈونیشیا سے لے کر مراکو تک اپنے پنجے گاڑ دیے۔ یہاں تک کہ بیسویں صدی کے آغاز میں سلطنت عثمانیہ بھی ختم ہو گئی۔ اس رات کی سیاہی کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس کے دوران دُنیا میں دجّالیت نے اپنا تانا

47

بانابُنا ہے۔ یہ جو فرمایا گیا: {وَ الَّیۡلِ وَ مَا وَسَقَ ﴿۱۷﴾} ’’اور قسم ہے رات کی اور جو کچھ اس نے اپنے اندر سمیٹ لیا ہے‘‘۔ اس کے بارے میں عام مفسرین نے لکھا ہے کہ رات کے وقت چور ڈاکو بھی نکل آتے ہیں‘ وحوش اور درندے بھی جنگل میں نکل آتے ہیں۔ لیکن میں اس کے بارے میں اپنا وجدانی خیال آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں کہ اس رات نے اپنے اندر کیا کچھ سمیٹا ہے اور اس پر مجھے بہت وثوق حاصل ہے۔

اس طویل رات میں دجّالیت نے نوعِ انسانی پر جو تین پردے تان دیے ہیں ان کا ذکر میں گزشتہ خطاب میں کر چکا ہوں‘ لیکن یہ باتیں بار بار بیان کرنے اور یاد کرنے کی ہیں۔ سب سے اونچا پردہ ریاست اور سیاست کی سطح پر تانا گیا‘ جس کے تین اجزاء ہیں: (i) سیکولرزم۔ یعنی مذہب کا ریاست سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ (ii) عوامی حاکمیت ۔یعنی حاکمیت اللہ کی نہیں عوام کی ہے اورقانون سازی کا اختیار عوامی نمائندوں کو ہے‘ وہ جو چاہیں گے قانون بنائیں گے۔ (iii) وطنی قومیت۔ یعنی کسی ایک محدود علاقے میں رہنے والے سب برابر کے شہری ہیں۔ یہ تینوں باتیں دین سے متصادم ہیں۔ دین تو مسلم اور غیر مسلم میں فرق کرتا ہے۔ اسلامی ریاست میں مسلم اور غیر مسلم کا سٹیٹس ہرگز برابر نہیں ہے۔ غیر مسلم ذمی یا معاہد ہو سکتا ہے‘ وہ برابر کا شہری نہیں ہے۔ اسلامی ریاست کا اصل شہری مسلمان ہے۔ اس لیے کہ اسلامی ریاست ایک نظریاتی ریاست ہے‘ وہ معروف معنوں میں ایک قومی ریاست نہیں ہے۔

دجّالیت کا دوسرا پردہ معاشی سطح پر ہے۔ یعنی سود اور جوئے پر مبنی معیشت‘ اور اس کے ساتھ ساتھ فحاشی و عصمت فروشی اور منشیات جیسے ذرائع آمدن کو قانونی تحفظ دینا۔

دجّالیت کا تیسرا پردہ سماجی و معاشرتی سطح پر ہے کہ شرم و حیا اور عفت و عصمت جیسی اقدار کا خاتمہ اور بے حجابی‘ عریانی‘ بے شرمی اور بے حیائی کا فروغ۔ مزید برآں ہر اعتبار سے عورت اور مرد کی مکمل مساوات۔ عورت کو چراغِ خانہ کے بجائے شمع محفل کی حیثیت دینا۔ البتہ یہ تیسرا پردہ ابھی عالمِ اسلام پر پوری طرح نہیں چھایا۔ لیکن اس کے لیے بھرپور جدّوجُہد ہو رہی ہے اور این جی اوز کو اربوں ڈالرز دیے جا رہے ہیں۔ سابق صدر پرویز

48

مشرف کے دور میں حکومتی سطح پر اس ایجنڈے کی سرپرستی کی گئی اور وہ پالیسیاں اب بھی جاری ہیں۔ ہماری اپنی اسلامی نظریاتی کونسل سراسر غیر اسلامی سفارشات پیش کر رہی ہے۔ حال ہی میں اس کی سفارشات آئی ہیں کہ طلاق

کے معاملے میں مرد اور عورت کو برابر کا حق ہونا چاہیے۔ اسلام کے نظام میں طلاق دینے کا حق مرد کو ہے' عورت کو طلاق کا اختیار نہیں ہے۔ وہ عدالت کے ذریعے یا اپنے خاندان کے بزرگوں کے ذریعے خلع حاصل کر سکتی ہے۔ وہ ان کو قائل کرے گی کہ میں اس شخص کے گھر میں نہیں بس سکتی اور اس کی یہ وجوہات ہیں۔ تب اس کو خلع مل جائے گا۔ اس کے ہاتھ میں طلاق کا اختیار نہیں ہے۔ اسلامی تہذیب چونکہ دجّالیت کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے لہٰذا یہ سب کوششیں اس کو سبوتاژ کرنے کے لیے ہیں۔ اسی ایجنڈے پر کام کرتے ہوئے پرویز مشرف نے تمام سیاسی اداروں میں ہر سطح پر عورتوں کو ۳۳ فیصد نمائندگی دے ڈالی تھی۔ اس تناسب سے عورتوں کی نمائندگی دنیا میں کہیں بھی نہیں' نہ بھارت میں ہے نہ امریکہ میں۔ لیکن ہمیں تو گویا ان کی چشم ابرو کا اشارہ چاہیے کہ ہم آگے سے آگے نکل جائیں۔ بہرحال اِس وقت دجّالیت کی بھرپور کوشش ہے کہ یہ تیسرا پردہ عالمِ اسلام پر بھی پوری طرح اوڑھا دیا جائے۔ اس لیے کہ ابھی عالمِ اسلام میں کچھ شرم و حیا اور عصمت و عفت کی اقدار باقی ہیں' کچھ خاندانی نظام کی قدریں باقی ہیں۔

یہ فطرت کا نظام ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مرد کو مرد بنایا' عورت کو عورت بنایا۔ ان کے مابین جسمانی فرق ہے' نفسیات کا فرق ہے۔ اس دجّالی تہذیب نے یہ سارے تخلیقی فرق مٹا کر وہ کام کیا ہے جس کا دعویٰ ابلیس لعین نے اللہ تعالیٰ کے روبرو کیا تھا۔ سورۃ النساء میں اس کے تحدیانہ الفاظ نقل ہوئے ہیں:

{وَ قَالَ لَاَتَّخِذَنَّ مِنۡ عِبَادِکَ نَصِیۡبًا مَّفۡرُوۡضًا ﴿۱۱۸﴾ وَّ لَاُضِلَّنَّہُمۡ وَ لَاُمَنِّیَنَّہُمۡ وَ لَاٰمُرَنَّہُمۡ فَلَیُبَتِّکُنَّ اٰذَانَ الۡاَنۡعَامِ وَ لَاٰمُرَنَّہُمۡ فَلَیُغَیِّرُنَّ خَلۡقَ اللّٰہِ ؕ}

'اور اُس نے (اللہ تعالیٰ سے) کہا کہ میں تیرے بندوں میں سے ایک مقرر حصّہ

لے کر رہوں گا۔ میں لازماً انہیں بہکاؤں گا' میں انہیں آرزوؤں میں الجھاؤں گا' میں انہیں حکم دوں گا تو وہ جانوروں کے کان پھاڑیں گے' اور میں انہیں حکم دوں گا تو وہ اللہ کی تخلیق کو تبدیل کریں گے۔''

یہ اسی کا مظہر ہے کہ مرد عورتوں کا سا لباس پہنیں' عورتیں مَردوں جیسا لباس پہنیں۔ اور ایک زمانے میں تو ''یونی سیکس ڈریس'' کا بڑا چرچا ہوا تھا کہ مرد اور عورت کا ایک ہی قسم کا لباس ہونا چاہیے۔ اور اب جیسا کہ آپ کو معلوم ہے 'دنیا میں دو مَردوں کی شادی اور دو عورتوں کی شادی کو قانونی تحفظ فراہم کیا جارہا ہے۔ تو یہ اللہ کی فطرت' اللہ کی خلقت' اللہ کی تخلیق کے خلاف بغاوت ہے۔

تین سو سال پر محیط اس تاریک رات کے دوران جو یورپی استعمار پروان چڑھا اُس کی انتہائی کیفیت ۱۹۹۰ء کے بعد سے شروع ہوئی ہے جب سوویت یونین کا خاتمہ ہوگیا۔ اس طرح امریکہ یا مغرب کے مقابلے میں اگر کوئی نظام موجود تھا جو اسے چیلنج کر رہا تھا وہ زمین بوس ہو گیا اور امریکہ کو ''سول سپریم پاور آن ارتھ'' کی حیثیت

حاصل ہو گئی۔ اب وہ کرۂ ارضی کی عظیم ترین قوت بن گیا جس کے مقابلے میں کوئی نہیں ہے۔مَیں نے کئی دفعہ بیان کیا ہے کہ دس پندرہ سال پہلے امریکہ کا ایئر فورس چیف پاکستان آیا تھا اور اُس نے کراچی میں ماڑی پور ایئر بیس پر ہمارے ایئر فورس کے آفیسرز کو خطاب کیا تھا۔ اُس نے اس وقت یہ بات کہہ دی تھی کہ امریکہ اِس وقت ایک مست ہاتھی کی مانند ہے' جو اس کے سامنے آئے گا کچلا جائے گا۔ پہلے اسے اندیشہ ہوتا تھا کہ ایک دوسری طاقت بھی موجود ہے' ہم نے کسی ملک کو ذرا ڈرایا دھمکایا' تو وہ اس کا سہارا لے لے گا' اس کی گود میں چلا جائے گا۔ جیسے بھارت روس کے 'کیمپ میں چلا گیا تھا۔ جیسے ہی ہم نے امریکہ کا سہارا لیا بھارت فوراً روس کی جھولی میں چلا گیا اور یہ روس ہی تھا جس نے ہمیشہ مسئلۂ کشمیر کے حل میں رکاوٹ ڈالی۔ جب بھی یو این او میں کشمیریوں کے حق خودارادیت کے حق میں کوئی قرارداد پیش ہوتی تو روس اسے ویٹو کر دیتا۔

مغرب کا چار نکاتی ایجنڈا اور اس کا ہدف

مَیں نے آپ کو بتایا تھا کہ ۱۹۹۰ء کے بعد سے یورپ میں ایک چار نکاتی ایجنڈے پر مسلسل غور ہو رہا ہے۔ ان نکات کی حیثیت ایک رسّی کی مختلف لڑیوں (strands) کی ہے' جن کو سمجھنا ضروری ہے۔ وہ لڑیاں کون سی ہیں' یہ جان لیجیے:

(۱) امریکہ کے سارے تھنک ٹینکس' خواہ سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے ہوں اور چاہے پینٹاگون کے' سب کے سب اس غور و فکر میں مصروف ہیں کہ امریکہ کو روئے ارضی کی عظیم ترین طاقت ہونے کی جو حیثیت حاصل ہو گئی ہے اس مقام کو کس طرح برقرار رکھا جائے۔

(۲) دجّالی تہذیب کے ایجنڈے کی تکمیل ۔ دجّالی تہذیب کے ایجنڈے کا ابھی نصف حصّہ پورا ہوا ہے اور نصف باقی ہے۔ چنانچہ عالمِ اسلام کی حد تک اس کی تکمیل ان کے پیشِ نظر ہے۔

(۳) صیہونیت (Zionism) کے پانچ نکاتی ایجنڈے کی تکمیل' جو یہودی اور عیسائی دونوں قسم کے صیہونیوں کا متفق علیہ ایجنڈا ہے:

(i) آرمیگاڈان' یعنی بڑی عظیم جنگ جس میں بہت زیادہ خونریزی ہو گی۔

(ii) عظیم تر اسرائیل کا قیام جو صیہونیوں کا ہدف ہے۔

(iii) مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرۃ کو گرانا۔

(iv) تھرڈ ٹیمپل تعمیر کرنا۔ اور

(v) وہاں حضرت داؤد علیہ السلام کا تخت لا کر رکھ دینا۔

یہاں تک دونوں متفق ہیں۔ اس کے بعد عیسائیوں کے نزدیک حضرت عیسیٰ علیہ السلام زمین پر نازل ہو کر اس تخت پر بیٹھ کر پوری دنیا پر حکومت کریں گے ‘جبکہ یہودیوں کا خیال ہے کہ ان کا میسایاح (Messiah)جس کے وہ ابھی تک منتظر ہیں‘ وہ آئے گا اور اس تخت پر بیٹھ کر حکومت کرے گا‘ جسے ہم کہتے ہیں کہ وہ دجّال ہو گا۔ عیسائی بھی اسے دجّال کہتے ہیں‘ جو اینٹی کرائسٹ ہو گا۔ وہ دعویٰ کرے گا کہ میں مسیح ہوں لیکن وہ مسیح نہیں ہو گا‘ اسے اصلی مسیح عیسیٰ ابن مریم علیہا السلام آکر قتل کریں گے۔

---

(۴) امریکہ و یورپ کے چار نکاتی ایجنڈے کا چوتھا ہدف روئے ارضی کے تمام‘ قدرتی وسائل پر قبضہ کرنا ہے‘ جن میں تیل خاص طور پر اہمیت کا حامل ہے۔

یہ چار نکاتی ایجنڈا سارے تھنک ٹینکس کے غور و فکر اور سوچ بچار کا موضوع رہا ہے‘ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ امریکہ نے ایک فیصلہ کیا کہ اب ہم یہ نہیں دیکھیں گے کہ کوئی ہم پر حملہ آور ہو تو ہم جواب دیں۔ ہمیں کسی کی طرف سے ذرا سا بھی اندیشہ ہوا تو ہم پہلے اس پر حملہ کر دیں گے۔ ہمیں نہ تو عالمی رائے عامہ کی کوئی فکر ہے اور نہ ہی ہمیں اقوام متحدہ سے کوئی سروکار ہے۔ اب ہمیں اپنے اتحادیوں کی بھی کوئی پرواہ نہیں ہے‘ ہم خود اتنے طاقتور ہیں کہ ہم سارے معاملے خود طے کر سکتے ہیں۔ جنگجوئی کا یہ نقشہ بش ثانی کا تیار کردہ ہے‘ جو امریکہ کے صدور میں جنگجو صدر کی حیثیت سے تاریخ میں یاد رکھا جائے گا۔ اس نے preemption کو باقاعدہ ایک اصول بنا کر بالکل اسی انداز میں جیسے دوسری جنگ عظیم کے دوران ’’پرل ہاربر‘‘ کے نتیجے کے طور پر امریکہ بپھرے ہوئے شیر کی مانند جاپان پر حملہ آور ہو گیا تھا‘ اپنے Twin Towersکو خود گرایا‘ تاکہ عوام میں غم و غصہ پیدا کیا جائے اور اپنی رائے عامہ ہموار کی جائے۔ انہوں نے اس کا الزام القاعدہ اور اسامہ بن لادن پر لگایا اور اس کے لیے اس قدر جوشِ انتقام پیدا کر دیا کہ پھر ان کو ایوانِ نمائندگان سے ہر طرح کے مالی اخراجات کی منظوری ملتی چلی گئی۔ یہ سارا معاملہ انہوں نے اس لیے کیا کہ اس ایجنڈے کو پورا کریں۔

ہمارے لیے لمحہ فکریہ ہے کہ اس سارے ایجنڈے کا اوّلین ہدف عالمِ اسلام ہے۔ اس لیے کہ

اوّلاً: یہ ’’نزلہ بر عضو ضعیف‘‘ کا مصداق ہے۔ بالفاظِ دیگر: ع ’’ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات!‘‘

ثانیاً: تیل کے عظیم ترین ذخائر اس کے قدموں تلے ہیں۔

ثالثاً: دجّالی تہذیب کے تیسرے پردے کے بتمام و کمال چھا جانے کے راستے میں رکاوٹ یہی علاقہ ہے۔ یہاں پر اسلامی تہذیب کے آثار ابھی باقی ہیں ‘جس میں عورت کو عورت اور مرد کو مرد سمجھا جاتا ہے اور ان کے الگ الگ دائرۂ کار معیّن ہیں۔ عورت کے اپنے

حقوق وفرائض ہیں اور مرد کے اپنے حقوق و فرائض ہیں۔ ازروئے الفاظِ قرآنی: {وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ} (البقرۃ:۲۲۸) ''مردوں کو عورتوں کے اوپر ایک درجہ فوقیت کا حاصل ہے''۔یہ قرآن کی تعلیم ہے' جبکہ دجّالی تہذیب میں مرد و عورت ہر اعتبار سے بالکل برابر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تو دو ٹوک انداز میں فرمایا ہے:{اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ} (النساء:۳۴) ''مرد عورتوں پر قوام ہیں''۔یہ سارا قرآن مجید کا فلسفہ ہے' جس سے مغرب خائف ہے۔

رابعاً: صیہونیت کا جو ایجنڈا ہے وہ تو مشرقِ وسطیٰ ہی سے متعلق ہے کہ مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرۃ کو مسمار کر کے تھرڈ ٹیمپل تعمیر کرنا اور گریٹر اسرائیل کا قیام۔میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ عراق' شام 'اردن' لبنان وغیرہ ان کے نقشے میں شامل ہیں۔ مصر سے تو انہوں نے پورا جزیرہ نمائے سینا لینا ہے' جس میں کوہِ سینا ہے جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہونے کا شرف حاصل ہوا اور انہیں پتھر کی الواح پر لکھے ہوئے احکامِ عشرہ دیے گئے ۔ پھر یہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانے میں ان کے سارے کے سارے بھائی اپنے خاندانوں کے سمیت مصر آ گئے تھے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام بھی وہاں آ گئے تھے' جہاں بنی اسرائیل کئی سو برس تک رہے۔ یہ علاقہ بھی انہوں نے مصر سے واپس لینا ہے۔ مزید برآں عرب کے شمالی حصے پر بھی ان کا دعویٰ ہے جس میں مدینہ منورہ اور خیبر وغیرہ شامل ہیں۔مدینہ میں یہودیوں کے تین قبیلے آباد تھے جہاں سے ان کو نکالا گیا تھا۔ اسی طرح ترکی کا جنوبی حصّہ بھی گریٹر اسرائیل کے نقشے میں شامل ہے۔ اس سارے ایجنڈے کا تعلق مشرقِ وسطیٰ سے ہے اور ان کے پیشِ نظر مشرقِ وسطیٰ کا ایک نیا نقشہ بنانا ہے' جسے وہ شائع بھی کر رہے ہیں۔ تو درحقیقت یہ چار اسباب ہیں جن کی وجہ سے دجّالیت یا نیو ورلڈ آرڈر کا اوّلین ہدف بھی عالمِ اسلام ہے۔

اس سارے منصوبے کو بش اوّل نے ''نیو ورلڈ آرڈر'' کا نام دیا تھا جو موجودہ بش کا باپ تھا۔ اس نے جیسے ہی عراق پر حملہ کر کے اس کو تہس نہس کیا اور اُس کی فوج کا بھرکس نکالا تو اس کے بعد اس نے کہا تھا اب ''نیو ورلڈ آرڈر'' کا وقت آگیا ہے۔ یعنی اس

ایجنڈے کے آخری حصے کی تکمیل کا وقت آ گیا ہے۔ اور یہ بش ثانی بھی اپنے باپ کی طرح کٹر عیسائی اور Evengelist ہے۔

عالمِ اسلام میں مغرب کے اہداف کا ایک جائزہ

آج مَیں چاہتا ہوں کہ آپ ایک ایک کر کے عالمِ اسلام کے مختلف ممالک کا معاملہ سمجھ لیں کہ یہ کس اعتبار سے مغرب کا ہدف ہیں۔

افغانستان : عراق کے بعد عالمِ اسلام میں ان کا پہلا ہدف افغانستان بنا ہے۔مَیں نے مغرب کے مقاصد کی جو چار

لڑیاں بتائی ہیں‘ جو آپس میں بٹی ہوئی ہیں‘ اب ان کے حوالے سے دیکھئے۔ افغانستان میں عظیم ترین بات یہ ہوئی کہ نظامِ اسلامی کی ایک ہلکی سی جھلک دنیا نے دیکھ لی۔ یہ وہ چیز ہے جو شیطان کو اور اس کے چیلوں اور ایجنٹوں کو کسی صورت گوارا نہیں۔ اقبال نے اپنی نظم ''ابلیس کی مجلس شوریٰ''۱۹۳۶ء میں لکھی تھی۔ اس میں انہوں نے ابلیس کی زبان سے یہ کہلوایا ہے: ؎

عصرِ حاضر کے تقاضائوں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں!

یعنی مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں دنیا میں شرعِ محمدیؐ کی برکات کا ظہور نہ ہو جائے۔ اگر ایسا ہو گیا تو میری ابلیسیت کا پردہ چاک ہو جائے گا۔ میرا سارا تانا بانا جو میں نے صدیوں کی محنت سے بنا ہے‘ وہ سارا برباد ہو جائے گا۔ افغانستان میں اس ''شرعِ پیغمبرؐ'' کی جھلک نظر آئی تھی‘ اگرچہ ابھی وہاں کوئی اسلامی نظام قائم نہیں ہوا تھا۔ چند اسلامی سزائوں کے نفاذ ہی کا نتیجہ یہ ہوا کہ سو فیصد امن قائم ہو گیا۔ چوری‘ ڈاکہ‘ اغوا‘ زیادتی اور جنسی جرائم سب ختم ہو گئے۔ پھر یہ کہ ''امیر المؤمنین'' کے ایک حکم پر پوست (poppy) کی کاشت یکسر بند ہو گئی۔ امریکہ اس مقصد کے لیے اربوں ڈالر دیتا ہے کہ کسی طریقے سے باز آجائو‘ خدا کے لیے پیسے لے لو لیکن تم یہ پوست کاشت نہ کرو‘ لیکن وہاں پر ہر سال اس کی مقدار بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ تو مغرب کو یہ خطرہ لاحق ہو گیا کہ اگر یہاں اسلام کا نظامِ عدلِ اجتماعی قائم ہو گیا اور جدید تصوّرات کے مطابق کوئی ایسی ریاست قائم ہو گئی جس میں ایک طرف تمام اسلامی

اقدار اور خلافتِ راشدہ کے اصول موجود ہوں اور دوسری طرف عہد حاضر میں جو بھی ریاستی ادارے پروان چڑھے ہیں وہ بھی پورے طور پر بروئے کار آجائیں تو گویا ابلیسیت کا خاتمہ ہو جائے گا۔

یہی وجہ ہے کہ تاریخِ انسانی کا جتنا بڑا اتحاد (coalition) افغانستان پر حملے کے لیے بنا ہے وہ کبھی نہ تو اس سے پہلے بنا ہے نہ اب بنے گا۔ نیٹو کی فورسز عراق میں نہیں گئیں‘ یہاں آگئیں۔ اس لیے کہ اَلْکُفْرُ مِلَّۃٌ وَّاحِدَۃٌ۔ اور اس ملّتِ واحدہ کو سب سے بڑا اندیشہ اسلام سے ہے۔ لہٰذا اس معاملے میں امریکہ اور یورپ کو روس کی پشت پناہی بھی حاصل رہی ہے۔ برطانیہ کے وزیر اعظم گورڈن براؤن نے واشنگٹن میں یہ بیان دیا تھا کہ عنقریب چین بھی اپنی فوجیں افغانستان میں بھیج دے گا۔ یہ بات کسی عام صحافی نے نہیں‘ برطانیہ کے وزیر اعظم نے کہی تھی‘ لہٰذا بے بنیاد نہیں ہو سکتی‘ اگرچہ چند دن کے بعد چین کی طرف سے اس کی تردید آگئی تھی۔ آپ کو معلوم ہے موجودہ سیاست کا معاملہ عام طور پر یہی ہوتا ہے کہ ایک بات آئی‘ پھر اس کی تردید آگئی‘ پھر معلوم ہوا کہ اس میں کچھ جزوی حقیقت تھی‘ پھر بعد میں وہ بات کھل کر سامنے آگئی۔ دراصل اس طرح کے feeler لوگوں کا ردِّ عمل معلوم کرنے

کے لیے چھوڑے جاتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں چین اس اتحاد میں آئے گا۔ اس لیے کہ چین کو خود اسلام سے اندیشہ ہے۔ اس کے بہت بڑے صوبے سنکیانگ میں مسلمانوں کی عظیم اکثریت ہے اور وہ ان میں کسی انقلابی تحریک کے جنم لینے سے خائف ہے۔ اور ظاہر ہے کسی نظریے یا فکر کے لیے نہ تو کوئی ویزا درکار ہے نہ پاسپورٹ۔ وہ تو ملکوں کی سرحدیں عبور کر جاتا ہے اور اسے نہ کوئی پہاڑ روک سکتا ہے نہ دریا۔ اور افغانستان کا ایک کونہ چین کے ساتھ جا کر مل بھی جاتا ہے۔ ''واخان''کی پٹی کا ایک سرا چین کے ساتھ ملتا ہے۔ اس طرح چین بھی گویا افغانستان کی سرحدوں میں شامل ہے۔ تو ان کو خطرہ ہے کہ افغانستان سے اسلام کا انقلابی اور جہادی فکر اگر کہیں ہمارے اس صوبے سنکیانگ کے اندر آگیا تو ہمارے لیے معاملہ مشکل ہو جائے گا۔ تو پہلی بات تو یہ ہے کہ افغانستان میں اسلامی نظام کے ایک امکان کا معاملہ پیدا ہوا۔ لہٰذا اس پر اتنی بڑی فوج کشی کی گئی۔

55

مَیں محسوس کرتا ہوں کہ یہ حدیث اسرائیل کے علم میں ہے جو ہمارے ہاں بیان ہوتی ہے:

((تَخْرُجُ مِنْ خُرَاسَانَ رَایَاتٌ سُوْدٌ لَا یَرُدُّھَا شَیْئٌ حَتّٰی تُنْصَبَ بِاِیْلِیَاءَ))(۲)

''خراسان کے علاقے سے سیاہ پرچم (لے کر لشکر) نکلیں گے' ان کا رُخ کوئی موڑ نہیں سکے گا' یہاں تک کہ وہ جا کر یروشلم میں نصب ہو جائیں گے۔''

یہود کے استیصال کا معاملہ چونکہ خراسان (افغانستان) ہی سے شروع ہونا ہے لہٰذا وہ یہاں اپنے پنجے مضبوطی کے ساتھ گاڑے رکھنا چاہتے ہیں۔ اوباما کا بھی یہی ایجنڈا ہے اور اس نے کہا ہے کہ میں عراق سے فوج نکال لوں گا اور افغانستان میں مزید داخل کروں گا۔ دراصل عراق کا معاملہ متذکرہ بالا چار لڑیوں (strands) میں سے صرف دو پر مشتمل تھا۔ لہٰذا وہاں کوئی بڑا اتحاد وجود میں نہیں آیا ۔ وہ دو چیزیں یہ تھیں: (i) تیل کے ذخائر (ii) اسرائیل کی اوّلین توسیع --- یعنی عراق پر حملہ گریٹر اسرائیل کے قیام کی طرف پہلا قدم تھا۔ اس لیے کہ جیسے ہی صدام کو شکست ہوئی اور بغداد میں اس کے مجسمے بھی گرائے گئے تو اسرائیل کے اُس وقت کے وزیر اعظم شیرون نے فوراً کہہ دیا تھا کہ عنقریب عراق پر ہماری حکومت ہو گی' اور پہلے تو ہم صرف فرات تک کا علاقہ مانگتے تھے اب ہمارا مطالبہ دجلہ تک ہے۔

افغانستان میں امریکہ کا ایک اور ایجنڈا بھی ہے۔ اسے ایشیا کے وسط میں قدم جمانے کے لیے ایک خطۂ زمین کی ضرورت ہے۔ اُس نے ایک اسرائیل تو عالمِ عرب کے قلب میں گویا خنجر کے طور پر گاڑا ہے اور وہاں پر اپنے پائوں جمائے ہیں' جبکہ اسے ایک اور ''اسرائیل ''ایشیا کے قلب میں درکار ہے' جہاں اسرائیلی حکومت کی طرح کوئی حکومت ہو جو اُس کی پشت پناہ ہو' جو اُسی کے اشارے پر ناچے اور اُسی کے ایجنڈے کی تکمیل کی خاطر اپنے تمام وسائل و ذرائع صرف کرے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے افغانستان کو منتخب کر لیا ہے۔ یہ ان کا

پروگرام ہے۔ فی الواقع کیا ہو گا' یہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔ انہوں نے بہرصورت یہاں اپنے پنجے گاڑ کر ہی رکھنے ہیں۔ یہیں سے پاکستانی علاقوں پر امریکی حملے ہوتے ہیں' جو صوبہ سرحد کے وسطی علاقے بنوں تک جا پہنچے ہیں۔ ہماری حکومت کا کہنا ہے

_____(۲) سنن الترمذی' ابواب الفتن' باب ما جاء فی النهی عن سبّ الریاح۔

کہ ان حملوں کے حوالے سے ہمارا امریکہ سے کوئی معاہدہ نہیں' جبکہ ان کی طرف سے مسلسل کہا جا رہا ہے کہ یہ ہمارا سہ فریقی تعاونِ باہمی کا معاہدہ ہے' جس میں افغانستان کی حکومت' پاکستان کی حکومت اور نیٹو شریک ہیں۔ اس معاہدے کی رو سے ہم آپس میں ایک دوسرے کے تعاون سے یہ حملے کر رہے ہیں۔ہمارے حکمرانوں کی طرف سے کبھی کبھی ایک چھوٹا سا احتجاجی بیان آ جاتا ہے کہ بس بس اب مزید برداشت نہیں ہو گا' آپ ہماری sovereignty کو چیلنج نہیں کر سکتے' لیکن یہ سلسلہ جاری ہے۔ اس لیے کہ انہوں نے اپنے بس پڑتے افغانستان کو چھوڑنا نہیں ہے۔

اسی افغانستان کے بارے میں علّامہ اقبال کے دو شعر ملاحظہ کیجیے:

آسیا یک پیکر آب و گِل است
ملّتِ افغاں در آں پیکر دِل است !

''ایشیا مٹی اور پانی کا ایک پیکر ہے' جیسے انسان کا جسم مٹی اور پانی کے آمیزے سے بنا ہے۔ جس طرح انسان کے جسم کے اندر دل ہوتا ہے اسی طرح افغانستان ایشیا کے دل کی حیثیت رکھتا ہے۔''

از فسادِ اُو فسادِ آسیا
در کشادِ اُو کشادِ آسیا

''اگر وہاں فساد ہو گا تو پورے ایشیا میں فساد ہو جائے گا اور اگر وہاں کے حالات بہتر ہو جائیں گے تو پورے ایشیا کے حالات میں بہتری آ جائے گی۔''

تو امریکہ افغانستان کو قلبِ ایشیا میں ایک اسرائیل کی صورت دینا چاہتا ہے' اور جیسا کہ میں نے عرض کیا' اس کے ضمن میں رسول اللہ ﷺ کی احادیث بھی یقیناً اسرائیلیوں کے علم میں ہوں گی۔ یہ لوگ بہت ریسرچ

کرتے ہیں اور ایسی احادیث ان کے علم میں ہیں۔ چنانچہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ جب حضرت مسیحؑ کا نزول ہو گا اور اس کے بعد جو یہودیوں کا قتل عام ہو گا تو اُس وقت صرف ایک درخت ''غرقد'' ایسا ہو گا جو یہودیوں کو پناہ دے گا۔ ورنہ کوئی شجر ہو یا حجر، کوئی یہودی اس کے پیچھے چھپے گا تو وہ پکار کر کہے گا کہ اے عبداللہ ! اے

مسلمان ! دیکھ میرے پیچھے یہ یہودی چھپا ہوا ہے ، آئو اور اسے قتل کرو !----اور یہودیوں نے اسرائیل میں سب سے زیادہ شجر کاری غرقد کی ہی کی ہوئی ہے۔ اس لیے کہ انہیں معلوم ہے کہ یہی درخت ان کا پشتیبان بن سکتا ہے۔

امریکہ کو سنٹرل ایشیا کے تیل کے ذخائر کے لیے راستہ چاہیے اور وہ افغانستان سے ہو کر گزرتا ہے۔ وسطی ایشیا میں تیل کے بہت زبردست ذخائر موجود ہیں۔ ابھی تو چائنا اس کے لیے کوشش کر رہا ہے اور اُس نے وہاں پائپ لائن بچھا دی ہے، جبکہ امریکہ چاہتا ہے کہ وہاں سے تیل وہ اپنے ہاں لے جائے۔ یہ امریکہ کے ایجنڈے میں ہے۔ وہ اصل میں گریٹر بلوچستان بھی اسی لیے بنانا چاہتا ہے کہ اس کے راستے سے افغانستان اور وہاں سے سنٹرل ایشیا کے تیل کے ذخائر تک رسائی حاصل ہو سکے۔

خود افغانستان کے اندر معدنی ذخائر بے انتہا ہیں اور یہ بات ہم سے زیادہ امریکہ کے علم میں ہے۔ مارچ ۲۰۰۱ء میں مشہور ایٹمی سائنس دان ڈاکٹر سلطان بشیر الدین محمود (جو ایک مخلص سنی مسلمان ہیں) نے ہمارے ہاں ایک خطاب کیا تھا : ''افغانستان پر عالمی پابندیاں کیوں؟'' ان کا یہ خطاب مئی ۲۰۰۱ء کے یثاق میں شائع بھی ہو گیا تھا۔ انہوںنے روسی اور جرمن ماہرین ارضیات کی رپورٹوں کے حوالے سےبیان کیا تھا کہ صوبہ بلخ میں اتنا تیل ہے کہ افغانستان مستقبل میں سعودی عرب ہوگا۔ گیس اس قدر ہے کہ روس زمانۂ جنگ میں لاکھوں کیوبک میٹر یومیہ کے حساب سے وہاں سے گیس لے کر جاتا رہا۔ اس کے علاوہ وہاں پر لوہے اور کاپر کے ذخائر دنیا کے تمام ممالک سے زیادہ ہیں۔ UNDP کی رپورٹ کے مطابق افغانستان میں ایک لاکھ ٹن سے زیادہ سونا موجود ہے۔ اس کے علاوہ وہاں انتہائی قیمتی جواہرات، انڈسٹریل اور سٹریٹجک دھاتوں اور دیگر معدنیات کے عظیم ترین ذخائر موجود ہیں۔ مزید برآں میٹھے پانی کے اتنے ذخیرے ہیں کہ ان کے ذریعے پورے افغانستان کو باغ و بہار بنایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ افغانستان پر قبضہ کرنے میں یہ فیکٹر بھی نہایت اہم ہے۔

گریٹر کشمیر: اس ضمن میں یہ بات بھی لائقِ توجہ ہے کہ امریکہ جیسی سپر پاور اپنے تمام

آپشنز کو ایک ہی جگہ نہیں رکھا کرتی، متبادل آپشنز بھی ان کی نظر میں رہتے ہیں۔ چنانچہ افغانستان کے علاوہ ان کی نظریں کشمیر پر بھی رہی ہیں کہ مقبوضہ کشمیر، پاکستانی کشمیر اور ادھر سے گلگت، ہنزہ اور کچھ دوسرے علاقوں کو شامل کر کے ''گریٹر کشمیر'' بنایا جائے۔ یاد رہے کہ گلگت اور ہنزہ ایک زمانے میں سکھوں کی ریاست کشمیر میں شامل تھے۔

''گریٹر کشمیر'' کے منصوبے کا مقصد بھی وسط ایشیا میں ایک ''اسرائیل'' کا قیام اور چائنا کا گھیرائو ہے۔ مسز رابن رافیل امریکہ کی انڈر سیکریٹری آف سائوتھ ایشیا ہوا کرتی تھی۔ (جس کا شوہر امریکی سفیر رابن رافیل ضیاء الحق صاحب کے ساتھ حادثے میں ہلاک ہوا تھا) اُس نے باقاعدہ طور پر یہ بیان دیا تھا کہ ہم بھارت سے اس کا کشمیر لیں گے' پاکستان سے اس کا کشمیر اور شمالی علاقہ جات لیں گے اور پاکستان نے تبت کا جو علاقہ کبھی چین کو دے دیا تھا وہ بھی واپس لیں گے اور ان سب کو ملا کر ایک ''گریٹر کشمیر'' قائم کریں گے۔ وہ تو بھارت اُس وقت تک امریکہ کے پھندے میں پھنسا نہیں تھا اور اُس کے وزیردفاع نے قومی اسمبلی کے اجلاس کے دوران کہہ دیا تھا کہ کشمیر کے بارے میں امریکہ کی اپنی نیت خراب ہو چکی ہے' لہٰذا بھارت نے اس معاملے میں کوئی لچک نہیں دکھائی۔ اب تو ظاہر بات ہے کہ بھارت بھی اس کی جھولی میں ہے' لہٰذا امریکہ اسے اس منصوبے پر قائل کر سکتا ہے۔

ایک اور اسکیم بھی سامنے آئی ہے کہ شمالی علاقہ جات میں ایک اسماعیلی ریاست قائم ہوجائے۔ پاکستان آرمی کے ایک حاضر سروس میجر جو آج کل شمالی علاقہ جات کے اندر ہی کام کر رہے ہیں' انہوں نے مجھے بتایا کہ وہاں اس کا شدید اندیشہ پیدا ہو رہا ہے۔ اسماعیلی وہاں بہت متحرک ہیں اور آغا خان ایک عرصے سے وہاں بہت زیادہ پیسہ لگا رہے ہیں۔ اس وجہ سے اس کا امکان موجود ہے کہ وہاں ایک گریٹر اسماعیلی ریاست قائم ہو جائے۔ بہرحال یہ ان کے آپشنز ہیں۔

پاکستان: اب آیئے پاکستان کی طرف کہ پاکستان ان کا ہدف کیوں ہے؟

اوّلاً: پاکستان اسلامک فنڈامنٹلزم کا فکری اور علمی گڑھ ہے' لہٰذا اس قلعہ کو مسمار کرنا ان کے پیش نظر ہے۔

ثانیاً: پاکستان ایک مسلمان ایٹمی طاقت ہے۔ لہٰذا ان کے نزدیک گریٹر اسرائیل کا نقشہ شروع کرنے سے پہلے پاکستان کے ایٹمی دانت توڑنے ضروری ہیں۔ ورنہ اگر وہ منصوبہ شروع ہو گیا تو پورے عالمِ اسلام کے اندر عوامی سطح پر جو طوفان اٹھے گا وہ حکومتوں کو بہا کر لے جائے گا اور اس صورت میں خطرہ موجود ہے کہ کہیں پاکستان میں فنڈامنٹلسٹ حکومت قائم نہ ہو جائے۔ اور ان کے ہاتھ میں اگر ایٹمی ہتھیار آ گئے تو ظاہر بات ہے کہ پھر وہ استعمال بھی ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا اس کے ایٹمی دانت توڑنا ان کے پروگرام میں شامل ہے۔

ثالثاً: چائنا کا گھیرائو (containment) مکمل کرنے کے لیے پاکستان کو استعمال کرنا پیش نظر ہے۔ اس لیے کہ یہی ایک آئوٹ لٹ ہے جو چائنا کو ملا ہوا ہے۔ چائنا نے پاکستان میں بہت سرمایہ کاری کی ہے۔ شاہراہِ ریشم کی تعمیر پر اس کا کتنا پیسہ خرچ ہوا ہے اور اس کے کتنے فوجیوں نے وہاں پر جانیں دی ہیں! پہاڑوں کو کاٹ کاٹ کر جو سڑکیں بنائی گئی ہیں اس میں ہماری آرمی نے بھی کام کیا ہے لیکن اس میں بہت بڑا حصّہ

چائنیز کا ہے۔ پھر اُس نے گوادر پر کتنا پیسہ خرچ کیا ہے ! اس لیے کہ وہ پاکستان سے گوادر کے راستے مشرقِ وسطیٰ کے ممالک سے تجارتی روابط بڑھانا چاہتا ہے۔ اس طرح وہ بحرالکاہل سے ہو کر سٹیٹ آف ملاکا (ملائشیا) سے ہوتے ہوئے بحرِ ہند میں پہنچنے کے بجائے براہِ راست شاہراہِ ریشم کے ذریعے پاکستان میں اتر کر گوادر کے راستے بحیرۂ عرب کے گرم پانیوں میں پہنچ جائے گا۔ چین کی اس منصوبہ بندی کو روکنے کے لیے امریکہ پاکستان پر اپنا تسلط قائم کرنا چاہتا ہے۔

رابعاً: پاکستان کو غیر مستحکم کر کے بلوچستان کو گریٹر بلوچستان بنانا بھی ان کے پروگرام میں شامل ہے۔ اس طرح ایک تو انہیں بلوچستان سے افغانستان کے راستے وسط ایشیا کے تیل کے ذخائر تک رسائی مل جائے گی اور دوسرے بلوچستان کے اندر جو بڑے پیمانے پر معدنی دولت موجود ہے اس پر ان کا قبضہ ہو جائے گا ۔ پاکستان کے بارے میں وہ یہ چاہتے ہیں کہ اس کے ایٹمی دانت توڑ کر اسے بھارت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے۔ امریکہ کی سیکریٹری آف سٹیٹ کنڈولیزا رائس کے اس بیان کا مَیں کئی بار ذکر کر چکا ہوں کہ پاکستان کے مستقبل کا فیصلہ بھارت اور امریکہ مل کر کریں گے۔ اس کے یہ الفاظ آن ریکارڈ ہیں۔

اس اعتبار سے افغانستان کے بعد پاکستان کا نمبر ہے۔

بھارت کو اپنا سٹریٹجک پارٹنر اور اتحادی بننے پر امریکہ نے اسے اتنا بڑا تحفہ دیا ہے کہ اس کے ساتھ سول نیوکلیئر معاہدہ کیا ہے۔ اس طرح اسے کھلی چھوٹ حاصل ہو گئی ہے کہ دنیا میں جہاں سے چاہے نیوکلیئر بم بنانے والے آلات ووسائل حاصل کرے۔ یہ تحفہ دینے کے ساتھ ساتھ پاکستان کے ایٹمی دانت توڑ کر اسے بھارت کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا بھی ان کے پیش نظر ہے اور اس کی طرف پیش قدمی شروع ہو گئی ہے۔ چنانچہ بھارت ہمارے گرد اپنا شکنجہ کس رہا ہے اور دریائوں کا پانی روک کر ہمیں گھٹنوں کے بل گرانے کا منصوبہ بنا چکا ہے۔ پنجاب کا علاقہ کبھی باروں (نیلی بار وغیرہ) پر مشتمل ہوتا تھا اور یہ سب صحرا تھے۔ دریائوں کا پانی رک جانے سے ہماری نہریں خشک ہو جائیں گی اور پورا پنجاب پھر سے صحرائوں میں تبدیل ہو جائے گا۔

سعودی عرب : پاکستان کے بعد ان کا اگلا ٹارگٹ سعودی عرب اور شام ہیں۔ اس لیے کہ سعودی عرب ''وہاب ازم'' کا منبع (source)ہے' جس نے دنیا کے اندر اسلامک فنڈامنٹلزم کو بہت تقویت دی ہے' اور مغرب فنڈامنٹلسٹ کی حیثیت سے ''وہاب ازم'' کو بھی گالی کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ ''قرآن'' وہاں کے نظامِ تعلیم کا جزوِ لازم ہے۔ اگرچہ وہاں کی حکومت نے امریکہ کے ایماء پر اپنی نصابی کتب میں سے جہاد و قتال کی آیات اور یہود و نصاریٰ کے خلاف آیات نکال دی ہیں' مثلاً:{یٰٓاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَّخِذُوا الۡیَہُوۡدَ وَ النَّصٰرٰۤی اَوۡلِیَآءَ ۘ}(المائدۃ:۵۱)تاکہ نوجوان نسل کے اذہان میں ایسے افکار پروان نہ چڑھیں' لیکن یہ لوگ قرآن کو تو نہیں بند کر سکتے۔ قرآن تو ان کے رگ

و پے میں ہے‘ قرآن تو پڑھا جا رہا ہے اور پڑھا جاتا رہے گا۔ لہٰذا فنڈامنٹلزم کا بڑا سورس ہونے کے ناتے سعودی عرب بھی ان کی آنکھ کا کانٹا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ میں مسلمانوں کے مقدّس مقامات (مکّہ و مدینہ) پر حملہ کرنے کا معاملہ زیر بحث آیا ہے۔ ٹام ٹینکریڈو (Tom Tancredo)‘ جو جان مکین کے مقابلے میں ریپبلکن پارٹی کے ٹکٹ کا امیدوار تھا‘ اُس نے یہ ہرزہ سرائی کی تھی کہ ہم مسلمانوں کے مقدس مقامات پر بمباری کریں

گے۔ اس کی انتخابی مہم کے مینیجر نے بھی یہی بکواس کی تھی۔

یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ ’توحید سے

جیسا کہ قبل ازیں عرض کیا جا چکا ہے‘ اسلام میں جیسے ہی غربت کا آغاز ہوا تھا‘ تجدیدی مساعی کا بھی آغاز ہو گیا تھا۔ یہ تجدیدی مساعی چودہ سو برس تک تدریجاً بڑھتے بڑھتے اب اپنے کلائمکس کو پہنچنے والی ہیں۔ اب وہ وقت آگیا ہے کہ اللہ کے دین کی تجدید کامل ہو کر رہے گی۔ اور یہی درحقیقت سورۃ الانشقاق کی ان آیات میں سے تیسری آیت کا مطلب ہے۔ یہ جو فرمایا:

{فَلَآ اُقۡسِمُ بِالشَّفَقِ ﴿۱۶﴾ وَ الَّیۡلِ وَ مَا وَسَقَ ﴿۱۷﴾ وَ الۡقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ ﴿۱۸﴾}

’’تو نہیں‘ میں قسم کھاتا ہوں شفق کی۔ اور قسم ہے رات کی اور اُن چیزوں کی جن کو وہ اپنے اندر سمیٹ لیتی ہے۔ اور قسم ہے چاند کی جب وہ رفتہ رفتہ پورا ہو جاتا ہے۔‘‘

جس طرح چاند رفتہ رفتہ بڑھتا ہے اور چودہ دن میں ہلال سے بدر بن جاتا ہے اسی طرح تجدید کا چاند تدریجاً بڑھ رہا ہے اور چودہ صدیوں میں آکر اب اسلام کی تجدید کامل ہونے والی ہے۔ گویا وہ وقت آچکا ہے جب مجددِ کامل کا ظہور ہو گا۔ اور اسی کے ضمن میں عالمِ اسلام میں مختلف تجدیدی مساعی ہو رہی ہیں‘ برعظیم پاک و ہند میں اور خاص طور پر پاکستان میں یہ تجدیدی مساعی جاری ہیں۔ اس کے بعد چوتھی آیت میں فرمایا:

{لَتَرۡکَبُنَّ طَبَقًا عَنۡ طَبَقٍ ﴿۱۹﴾}

’’تم یقیناً درجہ بدرجہ اوپر اٹھو گے۔‘‘

یعنی تجدید دین کا کام اسی طرح تدریجاً تکمیل کو پہنچے گا جیسے نبوت کی تکمیل ہوئی تھی۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر محمد رسول اللہ ﷺ تک کئی ہزار برس میں تدریجاً تکمیل نبوت اور تکمیل رسالت ہوئی۔ اسی طرح اب دین اسلام کی تجدید کامل ہونی ہے‘ اس کا وقت اب آگیا ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ بالآخر اسلام کا غلبہ پوری دنیا میں ہو کر رہنا ہے ع ’’یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے!‘‘ لیکن اس سے پہلے مسلمانوں کو کچھ زخم لگنے ہیں۔ عالمِ عرب پر اللہ کی طرف سے کچھ عذاب کے کوڑے برسنے ہیں‘ اور اسی طرح ہو سکتا ہے کہ ہم اہلِ پاکستان پر

بھی عذاب کے کوڑے برسیں۔ اس لیے کہ اوّلین مجرم اہلِ عرب ہیں اور دوسرے نمبر پر ہم مجرم ہیں۔ ہم نے اسلام کے نام پر یہ ملک بنایا اور ۶۱ برس ہو گئے مگر اسلام ہماری ترجیحات میں کہیں نہیں ہے‘ یہاں اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی کی کوئی ادنیٰ سی جھلک بھی موجود نہیں ہے۔ لہٰذا ہم بہت بڑے مجرم ہیں۔ اللہ ہمیں معاف کر دے اور مزید مہلت دے دے تو یہ اس کا کرم ہے ۔ اس کے لیے ہم دعا کر سکتے ہیں۔ لیکن اونچ نیچ ہونے کے بعد ہو کر یہی رہے گا کہ بالآخر اسلام کا بول بالا ہو گا اور دین کی کامل تجدید ہو گی‘ اِن شاء اللہ العزیز۔

اب ہم میں سے ہر شخص کو چاہیے کہ وہ اپنی جگہ سوچے کہ ان مساعی میں اس کا کیا حصّہ(contribution) ہے۔ دورِ نبویؐ میں اسلامی انقلاب محمد رسول اللہ ﷺ کے دست ِمبارک سے تمام مراحل طے کرتے ہوئے پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔ ابوجہل‘ ابولہب اور دیگر کفار و مشرکین اس جدّوجُہد میں شرکت سے محروم رہ گئے‘ لیکن حضرات ابوبکر‘ علی‘ عمر‘ حمزہ اور عثمان وغیرہم رضوان اللہ علیہم اجمعین رسول اللہ ﷺ کے دست و بازو بن گئے۔ یہ تو ہر شخص کا اپنا معاملہ ہے کہ کون آگے رہتا ہے اور کون پیچھے رہتا ہے۔ جیسے سورۃ المدثر کی یہ آیت ہم نے پڑھی: {لِمَنۡ شَآءَ مِنۡكُمۡ اَنۡ يَّتَقَدَّمَ اَوۡ يَتَاَخَّرَ ﴿۳۷﴾}یعنی اب جو چاہے آگے بڑھ جائے اور جو چاہے پیچھے رہ جائے ! نبوت کا خورشید طلوع ہونے کے بعد یہ پکار تھی کہ اب کون ہے جو آگے بڑھتا ہے‘ تصدیق کرتا ہے اور کون ہے جو پیچھے رہ جاتا ہے؟ پیچھے رہنے والے محروم رہ جائیں گے اور آگے بڑھ کر تصدیق کرنے والے اللہ کی رحمتوں کے اہل قرار پائیں گے۔ اسی طرح اب تجدید کامل تو ہو کر رہنی ہے ‘لیکن اب کون ہے جو اِس جدّوجُہد میں حصّہ ڈالنے کو تیّار ہو؟ کون ہے جو اپنے جسم و جان کی توانائیاں اس کے اندر صَرف کرنے کو تیار ہو؟ کون ہے جو اپنے مالی وسائل و ذرائع کو اس کے لیے صَرف کرنے کو تیار ہو؟ یہ درحقیقت افراد کا فیصلہ ہے۔ یہ میرے موضوع کا آخری حصّہ ہے‘ جو اِن شاء اللہ اگلے جمعہ میں زیر بحث آئے گا۔

* * *

پاکستان کا مستقبل

۲۸ ؍نومبر ۲۰۰۸ء کا خطابِ جمعہ

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اعوذ باللہ من الشَّیطٰن الرَّجیم ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ {وَ اذْکُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِیْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِی الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ یَّتَخَطَّفَکُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىکُمْ وَ اَیَّدَکُمْ بِنَصْرِہٖ وَ رَزَقَکُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ ﴿۲۶﴾} (الانفال){وَ ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا قَرْیَۃً کَانَتْ اٰمِنَۃً مُّطْمَئِنَّۃً یَّاْتِیْہَا رِزْقُہَا رَغَدًا مِّنْ کُلِّ مَکَانٍ فَکَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰہِ فَاَذَاقَہَا اللّٰہُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَ الْخَوْفِ بِمَا کَانُوْا یَصْنَعُوْنَ ﴿ ۱۱۲ ﴾}(النحل)

گزشتہ تین جمعوں سے جاری گفتگو میں جو مضامین زیر بحث آچکے ہیں ان پر ایک طائرانہ نگاہ ڈال لیجیے۔ سب سے پہلے ہم نے اس کائنات کی تخلیق میں جو تدریج ہے اس کے بارے میں گفتگو کی۔ پھر یہ کہ حضرت آدم علیہ السلام سے نوعِ انسانی کا جو سفر شروع ہوا اس کے ساتھ ہی نبوت و رسالت کے سفر کا آغاز ہوا' جسے اپنے نقطۂ عروج اور تکمیل تک پہنچنے میں' یعنی آنحضور ﷺ تک کم سے کم چھ سات ہزار سال لگے۔ میں نے کئی مرتبہ عرض کیا کہ اس کا اشارہ سورۃ المدثر کی آیات ۳۲ تا ۳۶ میں ہے۔

اسلام اور مسلمانوں کا عروج و زوال

دورِ نبوی ؐ کے بعد اگرچہ اُمّت ِ مسلمہ پر تو عروج و زوال کے دو دور آئے' لیکن اسلام مسلسل زوال سے دوچار ہوتا رہا۔ پہلا عروج عربوں کی زیر قیادت آیا' پھر زوال آیا اور

۱۲۵۸ء میں بنوعباس کے آخری خلیفہ کو تاتاریوں نے ان کے محل سے کھینچ کر نکالا' ایک جانور کی کھال میں لپیٹا اور گھوڑوں کے سُموں سے کچل دیا۔ اس کے ساتھ ہی اُمّت میں عربوں کی قیادت کا دور ختم ہو گیا ۔ اس کے بعد کچھ عرصہ انتہائی زوال کی کیفیت رہی۔پھر دوسرا عروج ترکوں کی زیر قیادت آیا۔ اب وہ خلافت ِ راشدہ والی شان تو دوبارہ نہیں آئی' لیکن چار عظیم مملکتیں قائم ہوئیں ----- ہندوستان میں ترکانِ تیموری' ایران میں ترکانِ صفوی' مشرق وسطیٰ میں ترکانِ سلجوقی' جبکہ ترکانِ عثمانی نے اتنی عظیم مملکت قائم کی جو تین براعظموں پر محیط تھی -----لیکن اسلام مسلسل زوال سے دوچار رہا۔ یہاں تک کہ وہ وقت آگیا جس کا لرزا دینے والا نقشہ ایک حدیث میں کھینچا گیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((یُوْشِکُ اَنْ یَّاْتِیَ عَلَی النَّاسِ زَمَانٌ)) ''اندیشہ ہے کہ لوگوں پر ایک زمانہ ایسا بھی آ جائے گا'' ((لَایَبْقٰی مِنَ الْاِسْلَامِ اِلَّا اسْمُہٗ)) ''کہ اسلام میں سے سوائے اس کے نام کے کچھ نہیں بچے گا'' ((وَلَایَبْقٰی مِنَ الْقُرْاٰنِ اِلَّا رَسْمُہٗ)) ''اور قرآن میں سے سوائے اس کے رسم الخط کے کچھ نہیں بچے گا''۔یعنی قرآن کی صرف تحریر بچ جائے گی' قرآن کا نظام دنیا میں کہیں نظر نہیں آئے گا۔ ((مَسَاجِدُھُمْ عَامِرَۃٌ وَھِیَ خَرَابٌ مِنَ الْھُدٰی)) ''ان کی مسجدیں آباد تو بہت ہوں گی' لیکن ہدایت سے خالی ہوں

لی ''معاذ اللہ ' ثم معاذ اللہ ! اور چوتھی بات سخت ترین ہے : ((عُلَمَاؤُھُمْ شَرُّ مَنْ تَحْتَ اَدِیْمِ السَّمَاءِ)) ''ان کے علماء آسمان کی چھت کے نیچے کی بدترین مخلوق ہوں گے'' ((مِنْ عِنْدِھِمْ تَخْرُجُ الْفِتْنَۃُ وَفِیْھِمْ تَعُوْدُ)) انہی میں سے فتنے برآمد ہوں گے اور انہی میں لوٹ جائیں گے''۔ یعنی فتنہ انگیزی اور فتنہ پروری کے سوا ان کے پاس کچھ نہیں ہوگا۔ (یہ حدیث مشکوٰۃ المصابیح ' کتاب العلم میں امام بیہقی کی شعب الایمان کے حوالے سے نقل ہوئی ہے۔) اِس وقت یہ کیفیات لفظ بلفظ نہ سہی ' ان کا ایک عکس تو بہرحال ہمارے ہاں موجود ہے۔

اس حوالے سے میں نے عرض کیا تھا کہ اب یہاں سے دوبارہ اسلام کا عروج ہونا ہے۔ یہ مسلمانوں کا تیسرا عروج ہوگا ' جبکہ اسلام کی نشاۃِ ثانیہ ہوگی ' لیکن اس میں بھی تدریج

ہوگی ' جس کا ذکر سورۃ الانشقاق کی آیات ۱۶ تا ۱۹ میں ہوا ہے۔ ان آیات کی روشنی میں عرض کیا جا چکا ہے کہ اس وقت دنیا میں اسلام بس شفق کی مانند رہ گیا ہے ' جیسے سورج غروب ہو جائے تو افق پر ایک سرخی سی رہ جاتی ہے۔ اور نوعِ انسانی پر تین سو برس کی جو بڑی تاریک رات گزری ہے اس کی تفصیل بھی بیان کر چکا ہوں کہ اس رات نے اپنے اندر کیا کچھ سمیٹ لیا ہے۔ اس طویل رات کے دوران ایک طرف پورے عالمِ اسلام پر یورپی استعمار نے اپنے پنجے گاڑ دیے اور دوسری طرف اس رات کی سیاہی میں نوعِ انسانی پر دجّالیت نے تین پردے تان دیے ----- سیاست کی سطح پر سیکولرزم ' عوامی حاکمیت اور وطنی قومیت ' معاشی میدان میں سود ' جوا اور منشیات کی تجارت ' جبکہ سماجی سطح پر فحاشی و عریانی کا فروغ اور شرم و حیا اور عصمت و عفت کی اقدار کا خاتمہ۔ اگرچہ اس معاملے میں ابھی دجّالیت کو عالمِ اسلام پر پوری طرح غلبہ حاصل نہیں ہوا ' لیکن اس کے لیے بہت تیزی سے جدّوجُہد ہو رہی ہے۔ لیکن یہ رات بہرحال ختم ہونی ہے۔ محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت تو خورشید کی مانند تھی ' اب جو اسلام کا احیاء ہوگا وہ چاند کی مانند ہوگا ' اور یہ چاند رفتہ رفتہ پورا ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ نے جو ۲۳ برس میں عظیم انقلاب برپا کر دیا تھا یہ حضور ﷺ کا خاصّہ تھا۔

پھر پچھلی مرتبہ میں نے واضح کیا تھا کہ اس وقت جو روئے ارضی کی سول سپریم پاور اور اس کو جو یہودی اور عیسائی صیہونی (Zionists) کنٹرول کر رہے ہیں عالمِ اسلام کے بارے میں ان کے عزائم کیا ہیں ' اور خاص طور پر افغانستان اور پاکستان کے بارے میں ان کے کیا نقشے ہیں۔ میں نے عرض کیا تھا کہ یہ تو ان کے عزائم ہیں ' بالفعل ہوگا کیا ' یہ اللہ کے علم میں ہے۔

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے حوالے سے پاکستان کی خصوصی اہمیت

میرا آج کا موضوع خاص طور پر پاکستان کے مستقبل کے حوالے سے ہے۔ مستقبل کے بارے میں ہمارے سامنے دو چیزیں تو وہ ہیں جو بالکل یقینی ہیں۔ ایک تو قیامت یقیناً آنی ہے ' یہ ہمارے ایمان کا حصّہ ہے۔ یہ

دنیا ہمیشہ رہنے والی نہیں ہے' یہ ختم ہو گی۔ اُس روز پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر ریت بن جائیں گے اور یہ پوری زمین کوٹ کوٹ کر پھیلا دی جائے

لی۔ تمام نوعِ انسانی جو آدم سے لے کر آخری وقت تک پیدا ہوئی ہو گی' اسے بیک وقت زندہ کیا جائے گا۔ یہ سب کچھ تو یقیناً ہو کر رہنا ہے۔ قرآن مجید میں سب سے زیادہ جس چیز کا ذکر ہے وہ قیامت ہے۔ اس سے پہلے ایک اور یقینی بات ہے' جس کا ذکر احادیث میں تو صراحۃً ہے اور قرآن مجید میں بھی اشارتاً موجود ہے ---- اور وہ یہ کہ قیامت سے قبل پوری دنیا میں اسلام کا غلبہ ہو گا۔ گویا یہ چاند چودھویں کے چاند کی مانند لازماً پورا ہو جائے گا۔ اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کے لیے ہونے والی تجدیدی مساعی بالآخر اس مقام تک پہنچیں گی کہ پوری دنیا میں خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا نظام قائم ہو گا۔ لیکن یہ کب اور کیسے ہو گا' اس کے بارے میں ہم یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتے' لیکن میرے خیال میں یہ وقت اب زیادہ دور نہیں ہے۔ احادیث کے اندر قربِ قیامت کی جو پیشین گوئیاں آئی ہیں اور دنیا میں آج کل یہودی اور عیسائی دانشوروں کے ہاں بھی جو Endtimes کی پیشین گوئیاں ہیں' ان کے اعتبار سے یہ یقین کے ساتھ کہا جا رہا ہے کہ اب ہم اس کرۂ ارضی پر حیاتِ انسانی کے آخری دور میں سانس لے رہے ہیں۔

جہاں تک غلبۂ اسلام اور خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے قیام کا تعلق ہے' وہ ظاہر بات ہے کہ پہلے کسی ایک ملک میں ہو گا۔ اگر یہ کام بیک وقت پوری دنیا میں ہو سکتا تو رسول اللہ ﷺ کے دستِ مبارک سے ہو جاتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی مشیت کے مطابق اسے مستقبل کے لیے اٹھا رکھا۔ یہ اُس کی پلاننگ ہے کہ یہ کام کہاں سے شروع ہو گا۔ اب یہاں سے میری گفتگو کا تعلق پاکستان سے جڑ رہا ہے۔

پاکستان کے ساتھ ہمارا ایک تعلق تو یہ ہے کہ یہ ہمارا وطن ہے' لہٰذا ہمیں اس سے محبت ہے۔ ایک حدیث بھی بیان کی جاتی ہے کہ ((حُبُّ الْوَطَنِ مِنَ الْاِیْمَانِ)) (۱) ''وطن کی محبت بھی ایمان میں شامل ہے''۔ لیکن ہم وطن پرست نہیں ہیں' وطن پرستی شرک ہے: ع ''صورت نہ پرستم من' بت خانہ شکستم من!'' یہ ملک خاص طور پر وطنی قومیت کی نفی مطلق

(۱) المقاصد الحسنۃ للسخاوی:۲۱۸۔ والدرر المنتشرۃ للسیوطی : ۶۵۔ ناصر الدین البانیؒ نے اسے موضوع قرار دیا ہے: السلسلۃ الضعیفۃ: ۳۶۔

کے اوپر قائم ہوا۔ کانگریس کا موقف یہ تھا کہ ہندوستان میں رہنے والے سب ایک قوم ہیں' لہٰذا ان کا ایک ملک ہونا چاہیے۔ خود ہمارے مسلمانوں میں سے بڑے مؤثر طبقات تھے جو یہی رائے رکھتے تھے۔ جمعیت علمائِ ہند کا یہی موقف تھا۔ مولانا حسین احمد مدنی جیسی متدین شخصیت اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسا نابغہ شخص اسی رائے کے حامل تھے۔ پنجاب میں مجلس احرار اسلام اور سرحد میں خدائی خدمت گار' یہ سب بڑی بڑی طاقتیں قیامِ پاکستان کے حق میں نہیں تھیں' لیکن اللہ تعالیٰ کے خصوصی فضل و کرم سے یہ ملک وجود میں آیا۔ قیامِ پاکستان کے مخالف حضرات اپنی جگہ نیک نیت تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان سے انگریز کو نکالنے کے لیے ہندو مسلم اتحاد ضروری ہے۔ جبکہ قیامِ پاکستان کے حامیوں کا خیال یہ تھا کہ اگر ہندوستان ایک وحدت کی حیثیت سے آزاد ہوگیا تو یہاں مسلمانوں کا اور اسلام کا مستقبل بہت تاریک ہو گا۔ ہندو مسلمان کو ملیچھ (ناپاک) سمجھتا تھا اور بھارت ورش کی پوتر زمین کو ان سے پاک کرنے کے لیے ان کا خاتمہ کرنے پر تلا ہوا تھا۔

اسلامیانِ ہند کی اکثریت ایک الگ خطۂ زمین اس لیے چاہتی تھی کہ یہاں اسلام کا نظام قائم ہو۔ ہمیں درحقیقت پاکستان سے زیادہ محبت اس اعتبار سے ہے کہ اس سرزمین سے یہ توقع وابستہ تھی کہ یہ احیائِ اسلام کا نقطۂ آغاز بنے گی' یہاں سے نظامِ خلافت کا آغاز ہو گا۔ اپنا وطن ہونے کے اعتبار سے بھی اس سے محبت ہے کہ ہمارے گھر اسی سرزمین پر ہیں اور ہماری اولاد کا مستقبل اسی سرزمین سے وابستہ ہے' لیکن اصل محبت اس اعتبار سے ہے کہ ہمیں اُمید تھی کہ یہ اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کا نقطۂ آغاز بنے گا۔ علامہ اقبال نے ۱۹۳۰ء میں پاکستان کے قیام کا خواب دیکھا تھا' اور ان کا دوسرا خواب یہ تھا کہ یہاں خلافتِ راشدہ کا ایسا نظام دوبارہ قائم ہو جائے جو پوری دنیا کے لیے ایک مینارۂ نور بن جائے۔ ان کا پہلا خواب تو ۱۷ سال کے اندر اندر ۱۹۴۷ء میں پورا ہو گیا' جبکہ دوسرے خواب کی ابھی تک کوئی تعبیر نظر نہیں آ رہی' بلکہ مایوسی کا غلبہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ تحریک پاکستان کے دوران قائداعظم نے ہندوستان کے مشرق و مغرب اور شمال و جنوب میں جگہ جگہ تقاریر کیں کہ ہمیں پاکستان اس لیے چاہیے کہ ہم وہاں اسلام کے اصولِ حریت و اخوت و مساوات کی بنیاد پر

نظام قائم کر سکیں جو پوری دنیا کے لیے نمونہ بن جائے۔

اس کے علاوہ آنحضور ﷺ کی احادیث موجود ہیں جن میں اس خطۂ زمین کی طرف اشارہ نظر آتا ہے۔ احادیث کی رو سے حضرت مہدی کا ظہور عرب میں ہونا ہے اور وہ اصل میں مجدد کامل ہوں گے' اسلام کی جو درجہ بدرجہ تجدید ہو رہی ہے وہ ان کی ذات پر مکمل ہو گی۔ لیکن ایک حدیث میں فرمایا گیا:

((یَخْرُجُ نَاسٌ مِنَ الْمَشْرِقِ فَیُوَطِّئُوْنَ لِلْمَھْدِیِّ یَعْنِیْ سُلْطَانَہٗ)) (۲)

''مشرق سے فوجیں نکلیں گی' جو مہدی کی سلطنت کو جما دیں گی۔''

اس حدیث سے میں یہ سمجھا ہوں کہ چونکہ دولت کی زیادتی اور عیاشیوں کی وجہ سے عرب کھوکھلے ہو چکے ہیں' لہٰذا اگرچہ حضرت مہدی کا ظہور تو عرب میں ہو گا لیکن ان کی حکومت کو قائم کرنے کے لیے فوجیں کسی مشرقی ملک سے آئیں گی' اور پاکستان' افغانستان اور بھارت عرب کے مشرق میں واقع ہیں۔ علامہ اقبال نے جو ''ہندوستانی بچوں کا قومی گیت'' لکھا تھا' جو ''بانگ ِ درا'' میں شامل ہے' اس میں یہ الفاظ بھی موجود ہیں کہ ؎

''میر عربؐ کو آئی ٹھنڈا ہوا جہاں سے
میرا وطن وہی ہے' میرا وطن وہی ہے!''

یہ بات انہوں نے اس حدیث کی بنیاد پر کہی تھی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مجھے ہند کی طرف سے ٹھنڈی ہوا آتی ہے''۔ (ہمیں ابھی تک اس حدیث کا متن اور حوالہ نہیں مل سکا۔)

پھر یہ کہ اُمّت ِ مسلمہ کی گزشتہ چار سو سالہ تاریخ میں بر عظیم پاک و ہند کو ایک خصوصی مقام حاصل ہے۔ مجددین کا سلسلہ ایک ہزار برس تک عالم ِ عرب میں جاری رہا۔ اس کے بعد چار سو سال سے یہ سلسلہ ہندوستان میں جاری ہے۔ جب خلافت ِ عثمانیہ کے خلاف سازشیں ہو رہی تھیں' اُس وقت عالم ِ اسلام میں کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگی' لیکن ہندوستان میں ''تحریک ِ خلافت'' کے عنوان سے ایسی عظیم تحریک اٹھی کہ گاندھی کو اس میں شریک ہونا پڑا' حالانکہ گاندھی کا خلافت سے کیا سروکار تھا؟ لیکن اسے اندازہ تھا کہ

(۲) سنن ابن ماجہ' کتاب الفتن' باب خروج المهدی۔ عن عبدالله بن الحارث رضی الله عنہ۔

مسلمانوں سے تعاون حاصل کرنے کے لیے ان کی اس تحریک میں شرکت ضروری ہے۔ پھر تمام دنیا میں آزادی کی جو تحریکیں اٹھیں وہ لوکل نیشنلزم پر مبنی تھیں۔ مصطفی کمال پاشا ترک نیشنلزم کا علم بردار بن کر کھڑا ہو گیا۔ سلطنت ِعثمانیہ ختم ہو گئی' لیکن ترکی بہرحال بچ گیا' اور یورپ کے سینے پر مونگ دلنے والا شہر قسطنطنیہ اب بھی یورپ کے ساحل پر موجود ہے۔ احادیث میں آتا ہے کہ آخری زمانے میں جو ملاحم ہوں گے تو قسطنطنیہ مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل جائے گا۔ مصر کے جمال عبدالناصر نے بھی انگریز کو اٹھا کر بحیرۂ روم میں پھینکا تو عرب نیشنلزم کے نام پر' اسلام کے نام پر نہیں۔ عراق اور شام میں بھی عرب نیشنلزم کا نعرہ لگا اور اسی بنیاد پر بعث پارٹی کی حکومت رہی۔ انڈونیشیا اور ملائشیا میں ملائے نیشنلزم کی بنیاد پر آزادی کی تحریک چلی۔ عالم ِ اسلام میں آزادی کی صرف ایک تحریک

''تحریکِ پاکستان'' اٹھی، جس کا نعرہ تھا: ''پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ!''

اُمید و یاس کے مختلف ادوار

قیامِ پاکستان کے بعد ۱۹۴۹ء سے لے کر ۱۹۵۷ء تک تقریباً یقین کی کیفیت تھی کہ یہاں اسلام بس آیا ہی چاہتا ہے۔ قراردادِ مقاصد کی منظوری اللہ کی حاکمیت کا اعلان اور انسانی حاکمیت کی نفی مطلق تھی۔ یہ گویا ریاستی سطح پر سیکولرزم کے خلاف اعلانِ بغاوت تھا۔ پھر جب یہ کہا گیا کہ کس کا اسلام نافذ ہو گا، شیعہ کا یا سنی کا؟ تو تمام مکاتبِ فکر اور دینی جماعتوں کی چوٹی کی قیادت نے مل بیٹھ کر متفقہ طور پر ۲۲ نکات منظور کیے کہ ان کی راہنمائی میں اسلامی دستور بنایا جائے۔ یہ بہت اچھا اور امید افزا آغاز تھا۔ اُس وقت میں بھی جماعت اسلامی کا ایک ادنیٰ کارکن تھا اور خاص طور پر اپنے جماعتی ماحول میں تو ہمیں یوں محسوس ہوتا کہ بس اسلامی انقلاب آیا کہ آیا! نعیم صدیقی مرحوم جو پنجاب میں مولانا مودودی مرحوم کے اوّلین ساتھی تھے، انہوں نے اس دَور میں بڑی ولولہ انگیز اور جذباتی نظمیں کہیں۔ ان کا یہ شعر ہم اکثر پڑھا کرتے تھے ؎

بول شہرِ نظامِ اسلامی! کیا ترے سقف و بام کہتے ہیں؟
تیرے در پر کھڑے ترے والی آج تجھ کو سلام کہتے ہیں!

گویا ہم نظامِ اسلامی کے دروازے پر کھڑے دستک دے رہے تھے اور دروازہ کھلنے کے منتظر تھے۔

۱۹۵۶ء میں پاکستان کا اسلامی دستور بن چکا تھا اور اب انتخابات ہونے والے تھے، لیکن ۱۹۵۸ء میں اس گاڑی کو پٹڑی سے اتار دیا گیا۔ یاد رہے کہ دنیا میں ابلیس لعین کے سب سے بڑے ایجنٹ یہودی ہیں اور ان کا سب سے بڑا آلۂ کار امریکہ ہے۔ امریکہ نے پاکستان کے کمانڈر انچیف جنرل ایوب خان کو اپنے ہاں بلا کر اس کی پیٹھ تھپکی، اور اس نے واپس آکر دستور یہ کو بھی لپیٹ دیا، دستور بھی ختم کر دیا اور مارشل لاء نافذ کر دیا۔

اس کے بعد پاکستان میں جو تاریک رات آئی اُس میں مایوسیاں پروان چڑھتی گئیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ سارے خواب پریشان ہو رہے ہیں۔ ایوب خان کے دور میں ''عائلی قوانین'' کا نفاذ کیا گیا تو تمام مکاتبِ فکر کے علماء نے کہا کہ یہ غیر اسلامی ہیں، مگر وہ غیر اسلامی قوانین ''اسلامی جمہوریہ پاکستان'' میں نافذ ہو گئے۔ مسلمانوں کے عائلی قوانین کو انگریز نے بھی نہیں چھیڑا تھا، اور بھارت کے مسلمانوں نے اب تک اپنے عائلی قوانین میں کسی مداخلت کی اجازت نہیں دی، لیکن یہاں ایک فوجی آمر نے غیر اسلامی عائلی قوانین نافذ کیے جو اَب تک نافذ ہیں۔ اس دور میں نعیم صدیقی صاحب نے یہ شعر کہا تھا ؎

اے آندھیو سنبھل کے چلو اِس دیار میں
اُمید کے چراغ جلائے ہوئے ہیں ہم!

اُس دور میں مولانا کوثر نیازی بھی جماعت اسلامی کے سرگرم کارکن تھے۔ بعد میں ان کا جو بھی معاملہ رہا میں اس کو زیر بحث نہیں لانا چاہتا۔ اُس وقت انہوں نے بڑا تلخ شعر کہا تھا کہ :

اسلام کو گر تیری فضا راس نہ آئے
اے میرے وطن تجھ کو کوئی آگ لگائے !

یعنی ہماری نگاہ میں پاکستان کی اصل قدر و قیمت اس اعتبار سے ہے کہ یہ اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کا گہوارہ بنے۔ ۱۹۵۸ء سے لے کر ۱۹۸۵ء تک معاملات ایسے رہے کہ وہ مایوسی بڑھتی ہی چلی گئی اور یہاں اسلامی نظام کے قیام کی جو اُمید تھی وہ تقریباً دم توڑ گئی' اگرچہ اُس وقت تک

پاکستان کے وجود کے بارے میں کوئی مایوسی نہیں ہوئی تھی کہ یہ ملک رہے گا یا نہیں !

۱۹۸۵ء میں مجھے تاریخ بنی اسرائیل کے حوالے سے ایک اُمید پیدا ہوئی اور میں نے اس کا برملا اظہار کیا۔ بنی اسرائیل جب آلِ فرعون کی غلامی سے آزاد ہوئے اور مصر سے نکلے تو انہیں جنگ کا حکم ہوا' جیسے رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے جب مکہ سے مدینہ ہجرت کی تو اب قتال کا دور شروع ہوا۔ بنی اسرائیل کو جب جنگ کا حکم دیا گیا تو پوری قوم نے کورا جواب دے دیا۔ چھ لاکھ میں سے صرف دو آدمیوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوتِ قتال پر لبیک کہا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس بزدلی اور کم ہمتی کی یہ سزا دی کہ ارضِ مقدّس ان پر چالیس برس تک حرام کر دی ۔ چنانچہ وہ چالیس برس تک صحرائے سینا میں بھٹکتے پھرتے رہے۔ اس دوران وہ پوری نسل جو مصر کی غلامی کا داغ اٹھائے ہوئے تھی' ختم ہو گئی۔ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کا بھی انتقال ہو گیا۔ اب ایک نئی نسل جوان ہو چکی تھی جو صحرا ہی میں پیدا ہوئی اور صحرا میں پروان چڑھی۔ اس نے صحرا کی سختیاں جھیلی تھیں' اور اقبال کہتا ہے ؎

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی
یا بندۂ صحرائی یا مردِ کہستانی !

آج بھی سوات سے نفاذِ شریعت کی تحریک چلانے والے مردانِ کہستانی ہی ہیں نا ! خود اسلام کا آغاز بھی عرب کے صحرا ہی سے ہوا تھا۔ بنی اسرائیل کی جو نئی نسل صحرا میں پیدا ہوئی اُس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلیفہ یوشع

بن نون ؑ جو نبی تھے‘ کی قیادت میں جنگ کی‘ جس کے نتیجے میں فلسطین میں ان کی حکومت قائم ہوگئی۔ چنانچہ اس حوالے سے مجھے خیال ہوا کہ ہمیں بھی آزاد ہوئے چالیس برس ہونے کو ہیں اور ہم ابھی تک صحرائے تیہہ میں بھٹک رہے ہیں‘ اسلام کی طرف ہماری کوئی پیش قدمی نہیں ہو رہی بلکہ مایوسی ہو رہی ہے‘ لیکن کیا عجب کہ اب نئی نسل اُبھر کر آگئی ہے تو شاید حالات ہمارے بھی بدل جائیں جیسے کہ بنی اسرائیل کے بدل گئے تھے۔ لہٰذا اُس زمانے میں میں نے ’’استحکامِ پاکستان‘‘ کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی‘ جس میں یہ اُمید کی جھلک دکھائی تھی ۔جو حضرات بھی اس سے دلچسپی رکھتے

ہوں کہ پاکستان کا صغریٰ کبریٰ کیا تھا‘ پاکستان کیسے بنا اور اس کے استحکام کے لیے سوائے اسلام کے اور کوئی بنیاد نہیں‘ وہ اس کتاب کا مطالعہ ضرور کریں۔ بہرحال اس کے بعد معلوم ہوا کہ اس نئی نسل سے بھی کوئی توقع نہیں رکھی جا سکتی‘ اس نئی نسل نے بھی مغرب کو اپنا قبلہ بنا رکھا ہے۔ اگرچہ اس نئی نسل میں ایک بڑی تعداد مذہبی رجحان رکھنے والوں کی بھی ہے‘ لیکن ان کا تصوّر بھی مذہب کا ہے‘ دین کا انقلابی تصوّر موجود نہیں‘ دین کو قائم کرنے کی جدّوجُہد کا کوئی جذبہ نہیں۔ چنانچہ اس دوران یاس و اُمید کی کیفیت مسلسل چلتی رہی‘ جس میں مایوسی غالب رہی۔

میری مایوسی کی یہ کیفیت آج سے ساڑھے چار سال پہلے اس انتہا کو پہنچ گئی کہ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اب پاکستان کا خاتمہ ہونے والا ہے ۔ چنانچہ ۲۹ فروری ۲۰۰۴ء کو مَیں نے قرآن آڈیٹوریم میں پاکستان کے مستقبل کے بارے میں جو خطاب کیا تھا اس کے اخباری اشتہار کا عنوان یہ دیا تھا :’’کیا پاکستان کے خاتمے کی الٹی گنتی شروع ہو گئی ہے؟‘‘ یہ خطاب اب ’’پاکستان کے مستقبل کو لاحق خطرات و خدشات‘‘ کے عنوان سے کتابچے کی صورت میں شائع ہوتا ہے۔ اُس وقت واقعتاً میری کیفیت شکیل بدایونی کے اس مصرعے کا مصداق تھی کہ ع ’’اُڑتے اُڑتے دُور اُفق پر آس کے پنچھی ڈوب گئے !‘‘ اس انتہائی مایوسی کی بنیاد یہ تھی کہ پاکستان اپنے وجود کی نفی کر چکا ہے‘ یہ جس مقصد کے لیے قائم کیا گیا تھا اس مقصد کی طرف کوئی پیش قدمی نہیں ہوئی۔ یہ ایک نظریاتی ریاست کی حیثیت سے وجود میں آیا تھا‘ یہ کوئی نسلی‘ لسانی یا وطنی ریاست نہیں تھی۔ وطنیت کی تو نفی کر کے ہم نے یہ ملک بنایا تھا‘ لیکن اس ملک میں نظریۂ پاکستان یعنی دین اسلام کہیں نہیں۔ اسلام ہے تو مذہب کی صورت میں ہے‘ لیکن مذہب اسلام تو ہندوستان میں بھی ہے۔ پھر کاہے کو لاکھوں جانیں دے کر یہ تقسیم کروائی گئی؟ مسجدیں تو وہاں بھی ہیں۔ مسجدیں تو امریکہ میں بھی ہیں اور ان میں اضافہ ہو رہا ہے۔ لیکن وہ اسلام کا نظامِ عدل اجتماعی اور اس کے اصولِ حریت و اخوت و مساوات کہاں ہیں؟

اس مایوسی میں ۹ مارچ ۲۰۰۷ء کے بعد کے حالات و واقعات سے کچھ تھوڑی سی کمی

آئی جب جسٹس افتخار محمد چودھری نے آمریت کے خلاف ایسی ہمت دکھائی کہ ہماری پوری عدلیہ کی تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ پھر اس کے بعد جو وکلاء کی تحریک چلی' اس کا کوئی سیاسی پس منظر نہیں ہے' کوئی سیاسی عزائم نہیں ہیں۔ پھر یہ پڑھے لکھے سنجیدہ لوگ ہیں جو مڈل کلاس سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ جس طرح ڈٹے ہوئے ہیں اور جتنی سختیاں انہوں نے جھیلی ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک جاندار تحریک ہے۔ مجھے محسوس ہوا کہ شاید ہم سے کوتاہی ہوئی ہے کہ ہم نے ملک کے اس پڑھے لکھے طبقے تک اسلام کا پیغام پہنچانے کا حق ادا نہیں کیا۔

اس کے بعد جب فروری ۲۰۰۸ء میں انتخابات کے انعقاد کا اعلان ہوا تو بڑا شدید خطرہ تھا کہ ان میں دھاندلی ہو گی اور تحریک چلے گی' جیسے ۱۹۷۷ء میں بھٹو کے خلاف تحریک چلی تھی ۔ اس کے بعد شدید اندیشہ تھا کہ اگر یہاں بدامنی پیدا ہو گئی تو ایک طرف سے نیٹو فورسز اور دوسری طرف سے بھارتی افواج پاکستان میں داخل ہوجائیں گی۔ اخبارات میں اطلاع آئی تھی کہ بھارتی افواج کو الرٹ کر دیا گیا ہے کہ ہو سکتا ہے انہیں کسی پڑوسی ملک میں امن کے قیام کے لیے داخل ہونا پڑے۔ لیکن پاکستان میں انتخابات کے پُرامن انعقاد سے یہ خطرہ ٹل گیا۔ ان دو باتوں سے کچھ امید بندھی ہے کہ شاید اللہ تعالیٰ ہمیں مزید مہلت دے دے اور اس کے ذریعے سے یہاں پر خیر کی طرف کوئی پیش قدمی ہو جائے اور ہمیں اپنا بھولا ہوا سبق یاد آجائے کہ ع

''کبھی بھولی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو !''

وطن عزیز پر عذابِ الٰہی کے سائے

اِس وقت جو صورتِ حال ہے' اگر زمینی حقائق کو دیکھیں تو انتہائی مایوسی ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ کہ' جیسا کہ میں نے بارہا کہا ہے' ہم پر اللہ کا ایک عذاب منافقت کی صورت میں مسلط ہے۔ سورۃ التوبۃ کی آیات ۷۵تا۷۷ میں منافقین مدینہ میں سے ایک خاص قسم کے لوگوں کا ذکر ہے جنہوں نے اللہ سے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ ان کو اپنے فضل سے مال و دولت عطا فرما دے تو وہ خوب صدقہ و خیرات کریں گے اور نیک ہو جائیں گے۔ لیکن جب اللہ نے انہیں اپنے فضل سے نواز دیا تو اب انہوں نے بخل سے کام لیا' تجوریوں کو

تالے لگائے اور پیٹھ موڑ لی اور بھول گئے کہ ہم نے کیا وعدہ کیا تھا۔ تو اس وعدہ خلافی کی سزا کے طور پر اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں نفاق کا روگ پیدا کر دیا۔ یہی سزا مسلمانانِ پاکستان کو ملی ہے اور آج یہ دنیا کی منافق ترین قوم ہے۔ افراد کی حد تک اس قوم میں نیک اور صالح لوگ موجود ہیں' جیسے علامہ اقبال کے بقول ابلیس نے کہا تھا : ؎

خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ
کرتے ہیں اشک سحر گاہی سے جو ظالم وضو !

لیکن مجموعی طور پر بحیثیت قوم ہم منافقت کا شکار ہو چکے ہیں۔ اس کا ایک مظہر نفاقِ باہمی ہے کہ ہم ایک قوم نہیں رہے‘ قومیتوں میں منقسم ہیں۔ ہمارے ہاں پختون نیشنلزم‘ بلوچ نیشنلزم‘ سندھی نیشنلزم‘ سرائیکی نیشنلزم اور اردو نیشنلزم کے نعرے لگتے ہیں۔ ہم ایک قوم ہوتے تو کبھی کا کالا باغ ڈیم بن چکا ہوتا۔ دوسرے یہ کہ ہم نفاقِ عملی کا شکار ہو چکے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے کہ منافق کی تین علامتیں ہیں : جب بات کرے تو جھوٹ بولے‘ وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے‘ اور اگر اسے امین بنایا جائے تو خیانت کرے۔ یہ تینوں چیزیں ہمارے ہاں رواج پا چکی ہیں۔ آج ہمارے ہاں جو جتنا بلند مرتبت ہے وہ اتنا ہی بڑا جھوٹا‘ وعدہ خلاف اور خائن ہے۔ اب تو اربوں کے غبن ہوتے ہیں۔ اس ملک کو لوٹ لیا گیا ہے اور اس کا خون چوس چوس کر مغربی دنیا کے بینکوں میں جمع کرا دیا گیا ہے۔ بحیثیت مجموعی ہمارے اخلاق کا دیوالہ نکل چکا ہے اور اِس وقت اس کا سب سے بڑا مظہر یہ ہے کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کا صدر وہ شخص ہے جو کہتا ہے کہ وعدے کوئی قرآن و حدیث تو نہیں ہوتے ! ظاہر ہے یہ صرف ایک فرد کا معاملہ نہیں‘ بلکہ یہ ہماری قوم کا مرض ہے‘ جس کا ظہور ((اَعْمَالُکُمْ عُمَّالُکُمْ))کی صورت میں ہو رہا ہے۔ یعنی ’’تمہارے اپنے عمل ہی تم پر حاکم ہو جاتے ہیں‘‘۔ حدیث نبویؐ ہے:
((کَمَا تَکُوْنُوْنَ کَذٰلِکَ یُؤَمَّرُ عَلَیْکُمْ)) (۳)

_____(۳) مشکوٰۃ المصابیح‘ کتاب الامارۃ والقضاء‘ الفصل الثالث۔ و شعب الایمان للبیھقی ۶/۲۵۰۶

’’جیسے تم خود ہو گے ویسے ہی تم پر امراء مقرر ہوں گے۔‘‘
چنانچہ یہ تو قوم کی اخلاقی حالت کا ایک انعکاس (reflection) ہے۔
پھر مالی اعتبار سے بھی ہمارا تقریباً دیوالہ نکل چکا ہے۔ ملکی معیشت کو آئی ایم ایف سے لے کر آکسیجن کی جو نلکی لگائی گئی ہے اس کا نتیجہ کیا نکلے گا اور وہ آپ سے کیا ڈیمانڈ کریں گے‘ یہ سوچنے کی بات ہے۔ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ آئی ایم ایف کے شکنجے میں جو ملک بھی آیا اس کی معیشت تباہ ہو کر رہ گئی ۔ جو کچھ انڈونیشیا کے ساتھ ہوا تھا وہ کون نہیں جانتا؟ ملائشیا پھر بھی کچھ بچ گیا تھا‘ لیکن یہ جو ایشیائی ٹائیگر زتھے یہ آئی ایم ایف کی وجہ سے ہی

ختم ہوئے تھے۔ ہم پر ایک وقت آیا تھا کہ ہم نے بڑی خوشی کے ساتھ کہا تھا کہ ہم نے کشکول توڑ دیا ہے ‘ہم نے آئی ایم ایف سے آزادی حاصل کر لی ہے‘ لیکن ہم اب دوبارہ وہاں بھیک مانگنے کے لیے پہنچ گئے ہیں۔ ’’فرینڈز آف پاکستان‘‘ تو ہمیں ایک پیسہ بھی دینے کو تیار نہیں‘سب نے ہمیں آئی ایم ایف کی طرف ہانک دیا ! بہرحال زمینی حقائق کی روشنی میں صورت حال بہت ہی مخدوش ہے۔

آیاتِ قرآنی میں پاکستان کی منظر کشی

میں نے آغازِ خطاب میں سورۃ الانفال اور سورۃ النحل کی آیات تلاوت کی تھیں۔ پاکستان کا وجود میں آنا (genesis)سورۃ الانفال کی آیت ۲۶ کی روشنی میں سمجھنا چاہیے۔ ہندوستان میں ہم اقلیت میں تھے اور ڈر رہے تھے۔ اُس وقت بھی ہندو نے ہمیں معاشی اعتبار سے دبایا ہوا تھا‘اور خطرہ یہ تھا کہ اگر ہندوستان ایک ملک کی حیثیت سے آزاد ہو گیا تب تو یہ ہمیں ختم ہی کر دیں گے۔ اس آیت میں ہمیں یہی نقشہ نظر آتا ہے: {وَاذْکُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِیْلٌ} ’’یاد کرو جب تم اقلیت میں تھے‘‘{مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِی الْاَرْضِ} ’’زمین میں تمہیں دبا لیا گیا تھا‘‘۔ تمہارے دشمنوں نے تمہیں دبایا ہوا تھا۔ {تَخَافُوْنَ اَنْ یَّتَخَطَّفَکُمُ النَّاسُ} ’’تمہیں اندیشہ تھا کہ لوگ تمہیں اچک کر لے جائیں گے‘‘۔ یہ پورا تحریک پاکستان کا پس منظر ہے۔{فَاٰوٰىکُمْ} ’’پس اللہ نے تمہیں پناہ دی‘‘ {وَاَیَّدَکُمْ بِنَصْرِہٖ}’’اور تمہاری مدد کی اپنی نصرت سے‘‘۔ معجزے کے طور پر پاکستان

عطا کیا۔ اور میں نے اپنی کتاب ’’استحکامِ پاکستان‘‘ میں یہ ثابت کیا ہے کہ پاکستان کا قیام ایک معجزہ تھا‘ یہ کسی طور بھی کسی حساب کتاب میں آنے والی بات نہیں تھی۔ {وَرَزَقَکُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ ﴿۲۶﴾}’’اور ہم نے پاکیزہ چیزوں سے تمہیں روزی عطا کی تاکہ تم شکر کرو‘‘۔ یہ تو ہے پاکستان کا آغاز ! اور اب اس کی جو حالت ہے اس کا نقشہ بھی قرآن مجید میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ایک حدیث میں یہ الفاظ موجود ہیں: ((فِیْہِ خَبَرُ مَا قَبْلَکُمْ وَنَبَأُ مَا بَعْدَکُمْ)) ’’اس قرآن میں تم سے پہلے لوگوں کی خبریں بھی ہیں اور تمہارے بعد آنے والوں کے حالات بھی ہیں‘‘۔

آج کی حالت کا نقشہ سورۃ النحل کی آیت ۱۱۲ کی روشنی میں دیکھئے: {وَضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا قَرْیَۃً}’’اللہ تعالیٰ نے ایک بستی کی مثال بیان کی ہے‘‘{کَانَتْ اٰمِنَۃً مُّطْمَئِنَّۃً}’’وہ امن میں بھی تھی‘ مطمئن بھی تھی‘‘ {یَّاْتِیْہَا رِزْقُہَا رَغَدًا مِّنْ کُلِّ مَکَانٍ}’’اس کا رزق بھی اسے ہر طرف سے پہنچ رہا تھا‘‘{فَکَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰہِ} ’’لیکن اس بستی نے اللہ کی نعمتوں کا کفران کیا‘‘۔ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ آزادی اور اس کی نعمتوں کا تقاضا تو یہ تھا کہ اس کا شکر ادا کرتے اور یہاں پر اللہ کا دین قائم کرتے‘ لیکن ان لوگوں نے کفرانِ نعمت کی روش اختیار کی اور اُس کے دین سے غداری کی۔ {فَاَذَاقَہَا اللّٰہُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا کَانُوْا یَصْنَعُوْنَ ﴿۱۱۲﴾}’’تو اللہ نے انہیں بھوک اور خوف کا لباس پہنا دیا‘ بسبب ان کے کرتوتوں کے۔‘‘

اس آیت کی روشنی میں آج پاکستان کی حالت دیکھ لیجیے۔ ایک طرف غذائی اجناس کی قلت اور گرانی کا یہ عالم ہے کہ کبھی ہم نے ایسا سوچا بھی نہ تھا۔ دوسری طرف خوف کی یہ کیفیت ہے کہ کوئی شخص اپنے آپ کو محفوظ و مامون نہیں سمجھتا' کسی کا مال و جان محفوظ نہیں ہے۔ اخبارات میں روزانہ کالم شائع ہو رہے ہیں کہ پاکستان کا مستقبل بہت مخدوش ہے۔ پوری دنیا میں اس کے بقا و استحکام کے خلاف منصوبے بن رہے ہیں۔ وہ تو کہتے ہیں کہ ۲۰۲۰ء تک پاکستان کے نام سے کوئی ملک دنیا میں موجود نہیں ہوگا۔ اس کے حصے بخرے کرنے کے نقشے بن چکے ہیں۔ ۲۰۰۶ء میں یہ نقشہ بن چکا تھا کہ پاکستان کے ٹکڑے کر دیے

77

جائیں گے۔اس مخدوش صورتحال کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے اللہ سے وعدہ خلافی کی۔ اور اس میں اگر تبدیلی کا کوئی امکان ہے تو اس کی صورت یہی ہے کہ ہم اپنی روش تبدیل کریں اور اللہ کی طرف رجوع کریں۔ اس پر ان شاء اللہ العزیز آئندہ نشست میں گفتگو ہو گی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توبہ کی توفیق عطا فرمائے' اور ہم میں سے ہر شخص کو یہ توفیق دے کہ ہم کمر کس لیں اور طے کر لیں کہ{قُلۡ اِنَّ صَلَاتِیۡ وَ نُسُکِیۡ وَ مَحۡیَایَ وَ مَمَاتِیۡ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۪ۙ﴿۱۶۲﴾} ''یقیناً میری نماز' میری قربانی 'میرا جینا اور میرا مرنا اللہ ربّ العالمین کے لیے ہے''۔ آمین !

اقول قولی هذا واستغفر اللّٰہَ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات

78

کائنات کی سب سے بڑی حقیقت

اور پاکستان

۵؍دسمبر۲۰۰۸ء کا خطابِ جمعہ

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اعوذ باللہ من الشَّیطٰن الرَّجیم ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

{وَ اِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمًا ۙ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۱۶۴﴾} (الاعراف)

{وَ اِنْ اَدْرِیْۤ اَقَرِیْبٌ اَمْ بَعِیْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ ﴿ ۱۰۹ ﴾}(الانبیاء)

{وَ اِنْ اَدْرِیْ لَعَلَّهٗ فِتْنَةٌ لَّكُمْ وَ مَتَاعٌ اِلٰى حِیْنٍ ﴿ ۱۱۱ ﴾}(الانبیاء)

وَعَنْ سلمان الْفَارِسِیِّ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ : ((لَا یَرُدُّ الْقَضَاءَ اِلَّا الدُّعَاءُ وَلَا یَزِیْدُ فِی الْعُمُرِ اِلَّا الْبِرُّ)) (رواہ الترمذی)*

اگر انسان اس بات پر غور کرے کہ انسانی زندگی کی سب سے یقینی شے جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں' کون سی ہے 'تو پتہ چلے گا کہ زندگی کی سب سے بڑی حقیقت جس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا وہ موت ہے۔ اور یہ اس قدر یقینی ہے کہ وہ طبقہ جو کسی خدا' رسول 'کتاب' ہدایت کو تسلیم نہیں کرتا وہ بھی اس کا انکاری نہیں ۔لیکن ہمارا حال یہ ہے کہ ہم اسے بھلائے رکھتے ہیں اور کبھی خیال بھی نہیں گزرتا کہ ہم نے مرنا بھی ہے۔ حتیٰ کہ کسی قریبی عزیز کا جنازہ پڑھتے ہوئے بھی ہمارا ذہن اس طرف نہیں جاتا کہ ممکن تھا اس کے بجائے یہاں میرا لاشہ ہوتا۔ قبر میں اتارتے وقت احساسات کی دنیا میں کچھ نہ کچھ حرکت ضرور ہوتی ہے' لیکن واپس آنے کے بعد یہ بھی ختم ہوجاتی ہے۔

_____* سنن الترمذی 'ابواب القدر' باب ما جاء لا یردّ القدر الا الدّعاء۔

دنیا میں جس طرح انسانیت کے لیے موت ایک یقینی امر ہے' بالکل اسی طرح قرآن مجید نے بھی اس کے لیے لفظ ''یقین'' ہی استعمال کیا ہے۔ سورۃ الحجر کی آخری آیت میں رسول اللہ ﷺ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا:

{وَ اعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى یَاْتِیَكَ الْیَقِیْنُ ﴿ ۹۹ ﴾}

''(اے نبی ﷺ !) آپ اپنے رب کی بندگی (اور اس کی اطاعت و فرمانبرداری) میں لگے رہیے یہاں تک کہ موت آجائے۔''

جس طرح حیاتِ انسانی کی سب سے یقینی شے موت ہے اسی طرح اس کائنات کی سب سے یقینی شے قیامت ہے۔ کچھ عرصہ پہلے جب سائنس کی دنیا میں نیوٹن کے اصولوں کا بڑا چرچا تھا 'اُس وقت ''قانون بقائے مادہ'' زبان زدِ عام تھا کہ مادہ (matter) کبھی بھی فنا نہیں ہو سکتا' یہ کائنات ہمیشہ سے ہے ' ہمیشہ رہے گی۔ اس دور کو طبیعیات کا دورِ نیوٹن (Newtonian Era of Physics) کہا جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نیوٹن ماڈرن فزکس کا باوا آدم ہے۔ ڈاکٹر مائیکل ہارٹ نے اپنی کتاب ''The 100''میں دنیا کی سو کامیاب ترین شخصیتوں کا انتخاب کیا ہے جنہوں نے تاریخ کے دھارے کا رخ موڑا ہے۔ اپنی درجہ بندی میں وہ پہلے نمبر پر محمد رسول اللہ ﷺ کو اور دوسرے نمبر پر نیوٹن کو لایا ہے۔ موجودہ سائنسی ترقیاں ' سائنسی اکتشافات' انکشافات اور ایجادات نیوٹن ہی کے مرہونِ منت ہیں۔ لیکن نیوٹونین فزکس میں بہت سی خامیاں تھیں جو بعد میں معلوم ہوئیں۔ آج کا دور آئن سٹائن ایرا کہلاتا ہے۔ اب مادے (matter) کے بارے میں سائنسی تصوّر یہ ہے کہ اسے کسی بھی وقت توانائی (energy) میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ آج تسلیم کیا جاتا ہے کہ کائنات کا آغاز بھی ایک خاص وقت پر ہوا تھا اور ایک وقت میں جا کر یہ ختم ہو جائے گی۔ گویا سائنس آج وہی نقشہ پیش کر رہی ہے جو قرآن مجید نے بایں الفاظ پیش کیا ہے:

{یَوۡمَ نَطۡوِی السَّمَآءَ کَطَیِّ السِّجِلِّ لِلۡکُتُبِ ؕ کَمَا بَدَاۡنَاۤ اَوَّلَ خَلۡقٍ نُّعِیۡدُہٗ ؕ} (الانبیاء:۱۰۴)

''(یاد کرو) جس دن ہم لپیٹ دیں گے آسمان کو جیسے طومار میں کاغذات لپیٹ

دیے جاتے ہیں ۔جس طرح ہم نے تخلیق کی ابتدا کی تھی اسی طرح ہم اسے واپس لوٹائیں گے۔''

کائنات کی مثال ایک پھلجھڑی کی سی ہے 'جس طریقے سے وہ پھیلتی ہے اسی طرح یہ کائنات اور اس کی گلیکسیز پھیلی ہیں اور دوبارہ اسی طریقے پر واپسی کا عمل ہو گا اور سب کچھ لپیٹ لیا جائے گا ' جیسے کتابوں کے طومار لپیٹے جاتے تھے۔ یاد رہے کہ گزشتہ زمانوں میں کتابیں اس طرح مجلد نہیں ہوتی تھیں 'بلکہ کتابوں کے طومار (scrolls)ہوتے تھے۔ کچھ عرصہ پہلے بحیرۂ مردار کے قریب 'کچھ غاروں میں سے انجیل کے بہت پرانے نسخے برآمد ہوئے تھے 'ان کو ''Dead Sea's Scrolls'' کہتے ہیں۔

بہرحال انسان کی انفرادی زندگی کی سب سے بڑی حقیقت موت اور اس کائنات کی سب سے بڑی حقیقت قیامت ہے۔ لیکن قبل قیامت کی ایک حقیقت اور بھی ہے جس پر ہر مسلمان کو یقین رکھنا چاہیے ۔ وہ یہ کہ قیامت سے پہلے پوری دنیا میں حق کا بول بالا ہوگا۔ یہ وہ بات ہے جس پر دنیا کے اکثر مذاہب یقین رکھتے ہیں 'اور خاص طور پر وہ تین مذاہب جنہیں ابراہیمی مذاہب کہا جاتا ہے (یہودیت' عیسائیت اور اسلام) ان میں یہ بات صراحت

کے ساتھ موجود ہے کہ کائنات کے اختتام اور زمین پر قیامت برپا ہونے سے پہلے' اس پر اللہ کا دین ضرور غالب ہو گا۔ یہی بات حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنے مخاطبین یہودیوں سے کہی تھی کہ ''توبہ کر لو' کہ اب آسمانی بادشاہت آیا چاہتی ہے!'' اور وہ آسمانی بادشاہت حضور ﷺ کا ورود ہی تھا۔ آپ ﷺ اور آپؐ کے ساتھیوں کی جدّوجُہد سے وہ آسمانی بادشاہت قائم ہوئی اور پھر بہت بڑے علاقے میں پھیل گئی' اگرچہ پوری دنیا میں نہیں پھیل سکی' لیکن اس کو بہرحال پھیلنا ہے۔ لہٰذا اس تیسری بات پر یقین ہونا چاہیے۔

احادیثِ صحیحہ اور قرآن مجید کا صغریٰ کبریٰ اس پر دلالت کرتا ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ پوری نوعِ انسانی کے لیے مبعوث ہیں اور آپ کا مقصدِ بعثت غلبۂ دین ہے۔ تو جب تک غلبۂ دین پوری نوعِ انسانی پر نہ ہو تب تک آپؐ کا مقصدِ بعثت مکمل نہیں ہے۔ اسی کو اقبال نے کہا تھا: ؎

وقت فرصت ہے کہاں' کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اِتمام ابھی باقی ہے!

اور ؎

شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے!

ایک وقت آئے گا کہ پورا کرۂ ارضی نغمۂ توحید سے گونج جائے گا جو ابھی تو نہیں ہوا' لیکن ضرور ہو گا (ان شاء اللہ)۔

اخبارِ صحیحہ کے مطابق غلبۂ دین حق سے پہلے بڑی خوفناک جنگوں کا ایک سلسلہ ہے' اور یہ اخبار یہودیوں اور عیسائیوں کے ہاں بھی ہیں۔ بائبل کا آخری باب ''مکاشفاتِ یوحنا'' انہی پر مشتمل ہے۔ کتب احادیث میں ''ابواب الملاحم'' موجود ہیں' جن میں ان جنگوں کا تذکرہ ہے۔ ان میں سے ایک جنگ کو مکاشفاتِ یوحنا میں ''ہرمجدون'' (Armageddon) کہا گیا ہے۔ غالباً اسی کو حضور ﷺ نے الملحمۃ العظمیٰ (عظیم ترین جنگ) کہا ہے۔ یہ بھی یقیناً ہو گی۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ ملاحم کیو ہو گی؟ تو یہ اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ دنیا میں قوموں پر اللہ کا عذاب دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک عذابِ اکبر اور دوسرا عذابِ اصغر۔ قرآن و حدیث کی روشنی میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ عذابِ اکبر یہودیوں پر اور عذابِ اصغر مسلمانوں پر آئے گا۔ میں نے آج سے ۲۰ سال پہلے ایک کتاب ''مسلمان اُمتوں کا

ماضی‘حال اور مستقبل‘‘ لکھی تھی ‘جو قبل ازیں نوائے وقت میں کالموں کی شکل میں شائع ہوئی تھی‘ جس میں مَیں نے ان تمام چیزوں کا تفصیل سے تذکرہ کیا ہے۔ ’’عذابِ اکبر‘‘ یہ ہے کہ کسی قوم کا نام و نشان مٹا دیا جائے۔ یہ صرف ان قوموں پر آتا تھا جن کی طرف رسول بھیجے گئے اور قوموں نے بحیثیت ِمجموعی ان کا انکار کر دیا۔ اسے عذابِ استیصال بھی کہتے ہیں۔ جیسے فرمایا گیا: {فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا} (الانعام:۴۵) ’’پس جڑ کاٹ دی گئی ظالم قوم کی‘‘۔ ایک ہوتا ہے درخت کاٹنا اور ایک ہے جڑ کاٹنا۔ درخت کٹے گا تو شاید دوبارہ نکل

آئے‘ لیکن جڑ سے اکھیڑا ہوا درخت دوبارہ نہیں نکل سکتا۔ اسی عذابِ اکبر کے لیے قرآن حکیم میں یہ الفاظ آئے ہیں: {لَا یُرٰٓی اِلَّا مَسٰکِنُہُمْ} (الاحقاف:۲۵) یعنی ان کے صرف گھر ہی دکھائی دیتے ہیں۔ یہ عذاب اب کسی قوم پر نہیں آ سکتا۔ اس لیے کہ اب کوئی رسول تو آئے گا نہیں۔ لیکن ایک قوم پر یہ عذاب تاریخ کے قرض کی حیثیت سے باقی ہے ‘اور وہ قومِ یہود ہے۔ ان کی طرف حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام رسول بنا کر بھیجے گئے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ انہیں مانتے اور ان پر ایمان لاتے ‘لیکن انہوں نے آپؑ کو ولد الزنا ‘ جادوگر اور واجب القتل قرار دیا اور اپنے بس پڑتے سولی پر چڑھا کر دم لیا۔ حالانکہ ہوا یہ کہ اللہ نے انہیں زندہ آسمان پر اٹھا لیا اور وہ دوبارہ آئیں گے۔ لیکن اس قوم پر وہ عذاب تاریخ کا قرض ہے‘جو بہرحال ادا ہونا ہے اور خود حضرت مسیح علیہ السلام ہی کے ہاتھوں اس امت کا خاتمہ ہو گا‘ ان کا ایک ایک فرد قتل ہو جائے گا۔

جب میں نے یہ باتیں کہی تھیں تو امریکہ میں یہودیوں نے بڑا شور مچایا اور میرے خلاف ایک مہم بھی چلائی کہ اس کی کتابوں پر پابندی لگائی جائے اور اس کی ویب سائٹس وغیرہ بند کی جائیں‘ یہ سامی مذاہب کے خلاف ہے۔ یہاں پر بھی میرے ساتھ ڈائیلاگ کے لیے امریکہ وغیرہ سے جو پروفیسر آئے تھے ان میں ایک یہودی پروفیسر تھا ‘اس نے بہت ناراضگی کا اظہار کیا کہ آپ کہہ رہے ہیں کہ سارے یہودی قتل کر دیے جائیں گے ! میں نے کہا ہاں آپ کے لیے یہ بات یقیناً پسندیدہ (palatable) نہیں ہے۔ امریکہ میں کرسچین زائنسٹس کا رسالہ ’’دی فلا ڈلفیا ٹرمپٹ‘‘ کے نام سے نکلتا ہے۔ اس کے مدیر نے خود لکھا کہ اسّی فیصد یہودی قتل ہو جائیں گے۔ اس کو ہم نے یوں سمجھا ہے کہ ۲۰ فیصد وہ ہوں گے جو حضرت مسیح کی آمدثانی پر ایمان لے آئیں گے اور بچ جائیں گے ‘ لیکن جو اَڑے رہیں گے وہ ختم کر دیے جائیں گے۔ لہٰذا یہ ’’عذاب الاکبر‘‘ یہودیوں کے سوا اب کسی قوم پر نہیں آسکتا۔ لیکن دوسرے درجے میں اُمّت ِمسلمہ پر جو عذاب نازل ہو گا یہ وہ عذاب ہے جو یہودیوں پر بہت پہلے آیا تھا ۔ان کے بارے میں قرآن کریم (البقرۃ:۶۱) میں آیا ہے :

{وَ ضُرِبَتْ عَلَیْہِمُ الذِّلَّۃُ وَ الْمَسْکَنَۃُ ۞ وَ بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰہِ}

''ان پر ذلت و مسکینی مسلط کر دی گئی اور وہ اللہ کے غضب کا شکار ہوئے ۔''

حالانکہ ان کا خیال تھا کہ We are the chosen people of the Lord.

''ہم تو اللہ کی منتخب قوم ہیں'' ۔قرآن ان کا قول نقل کرتا ہے : {نَحۡنُ اَبۡنٰٓؤُا اللّٰہِ وَ اَحِبَّآؤُہٗ}(المائدۃ:۱۸)''ہم تو اللہ کے بیٹوں کی مانند ہیں اور اس کے بڑے چہیتے ہیں'' ۔ان کی پیٹھ پر عذاب کے کئی کوڑے برسے۔ کبھی بخت نصر اور کبھی آشوریوں کے ہاتھوں برباد ہوئے۔ کبھی یونانیوں نے انہیں تہہ و بالا کیا تو کبھی رومیوں نے ۔ سب سے قریب تر جو ان کی بربادی ہوئی وہ پچھلی صدی میں جرمنوں نے کی۔ اس بے انتہا تباہی کے باوجود یہ قوم ختم نہیں ہوئی' کیونکہ وہ عذابِ اکبر نہیں تھے ۔اسی طرح کے کئی عذاب ہم پر بھی آئے ۔ہم پر صلیبیوں نے یلغار کی اور لاکھوں مسلمان قتل ہوئے۔ یروشلم ہمارے ہاتھ سے اٹھاسی برس تک نکلا رہا 'جس پر عیسائیوں کا قبضہ رہا اور وہاں مسلمانوں کی خون کی ندیاں بہہ گئیں ۔اس کے علاوہ پورا بحیرۂ روم کا علاقہ بھی عیسائیوں کے قبضے میں رہا ہے۔ اُس وقت تقریباً پورا یورپ ہمیں نیست و نابود کرنے کے لیے نکل کھڑا ہوا تھا۔ یہ صلیبی جنگیں پونے دو سو برس تک جاری رہیں۔ اس کے بعد پھر اس سے بھی بڑا عذاب تاتاریوں کی شکل میں آیا ' جس میں کروڑوں مسلمان قتل ہوئے۔ پھر یورپی اقوام ہمارے اوپر اس طرح مسلط ہوئیں جس طرح ان پر یونانی' رومی اور جرمن مسلط ہوئے تھے 'اور پورا عالمِ اسلام ان کے زیر نگیں آگیا ' جسے آپ ''نوآبادیاتی دور''(The Colonial Era) کہتے ہیں۔

اس دور کے اختتام نے ہمارے اوپر ایک بہت بڑی ذِمّہ داری عائد کی۔ یہ اُمّتِ مسلمہ کے لیے بہت بڑا امتحانی مرحلہ تھا۔ پہلے تو ہم کہہ سکتے تھے کہ ہم کیا کریں' ہم تو مجبور ہیں' ہمیں انگریزوں' فرانسیسیوں' ولندیزیوں اور اطالویوں نے غلام بنا لیا ہے اور ان کی طاقت کے آگے ہم بے بس اور لاچار ہیں۔ لیکن اب آزادی دے کر اللہ دیکھے گا کہ تم کیا کرتے ہو؟ {فَیَنۡظُرَ کَیۡفَ تَعۡمَلُوۡنَ} لیکن ہم نے کیا کیا؟ جو مسلمان قوم یا ملک آزاد ہوا اُس نے اپنا قبلہ یا تو واشنگٹن کو بنایا یا ماسکو کو۔ کسی نے بھی قرآن کو اپنا امام نہیں بنایا۔ ہم دعائیں تو مانگتے ہیں: اَللّٰھُمَّ اجْعَلْہُ لَنَا اِمَامًا وَّنُوْرًا وَّھُدًی وَرَحْمَۃً---- لیکن

قرآن کو اپنا امام بنانا' اس کے پیچھے چلنا ' اس کے احکام کو نافذ کرنا ' شریعت کی تنفیذ کرنا' اس کی تہذیب و تمدن کو اپنانا' اس کا دیا ہوا معاشی نظام قائم کرنا' ان تمام امور میں ہم صفر ہیں۔ اس لیے ہم بہت بڑے عذاب کے مستحق ہیں ۔یہ کڑوی بات میں آج نہیں ۱۹۸۰ء سے کہہ رہا ہوں۔

البتہ ایک بات واضح ہے کہ اُمّت میسسب کا معاملہ ایک جیسا نہیں ہے۔ جیسے سورۂ آلِ عمران میں ارشاد ہوا: {لَیۡسُوۡا سَوَآءً ؕ مِنۡ اَہۡلِ الۡکِتٰبِ اُمَّۃٌ قَآئِمَۃٌ یَّتۡلُوۡنَ اٰیٰتِ اللّٰہِ اٰنَآءَ الَّیۡلِ وَ ہُمۡ یَسۡجُدُوۡنَ ﴿۱۱۳﴾}یعنی یہ اہلِ کتاب بھی سب ایک جیسے نہیں ہیں' ان میں بھی کچھ نہ کچھ نیک لوگ تھے' جو راتوں کو کھڑے رہنے والے اور

عبادت کرنے والے تھے۔ عیسائیوں میں احبار اور رہبان بڑے نیک لوگ تھے اور اُس وقت بھی موجود تھے۔ لیکن بحیثیت ِ مجموعی صورت حال وہی تھی جو آج ہماری ہے۔ ہم نے کہیں بھی اللہ کے دین کو قائم نہیں کیا ‘اگرچہ اسلام بحیثیت مذہب موجود ہے۔ظاہر بات ہے کہ جرم پوری اُمّت کا ہے ‘لیکن سب برابر نہیں ہیں۔ سب سے بڑے مجرم عرب مسلمان ہیں ‘کیونکہ انہیں اللہ نے جو مقام دیا وہ کسی اور کو نہیں دیا کہ محمد ِعربی ﷺ ان میں سے تھے ع ’’یہ رتبہ ٔ بلند ملا جس کو مل گیا‘‘۔ دوسری بات یہ کہ اللہ کی کتاب ان کی مادری زبان میں ہے۔ اسے سمجھنے کے لیے انہیں کوئی نئی زبان سیکھنے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں تو پہلے صرف و نحو اور کئی علوم پڑھنے پڑتے ہیں تب کہیں جا کر اپنی آنکھ سے قرآن پڑھ سکتے ہیں‘ ورنہ ترجمہ پر ہی گزارا کریں گے‘ اور ظاہر بات ہے کہ ترجمہ تو الہامی شے نہیں ہے‘ لہٰذا وہ آپ کے ذہن و قلب کو متاثر (inspire) نہیں کر سکتا۔ ترجمہ تو سیکنڈ ہینڈ نالج ہے‘ کیونکہ ترجمہ آپ مترجم کی آنکھ سے پڑھ رہے ہیں‘ نہ کہ اپنی آنکھ سے۔ لہٰذا سب سے بڑا عذاب عربوں پر آنا ہے۔

جب گریٹر اسرائیل کا قیام عمل میں لایا جائے گا تو سب سے بڑی تباہی انہی عرب ملکوں پر آئے گی۔یہ بات پہلے بیان ہو چکی ہے کہ عراق پر حملہ اصل میں گریٹر اسرائیل کی طرف پہلا قدم ہے۔۲۰۰۶ء میں ایشیا کا جو نیا نقشہ تیار کیا گیا تھا ‘اس کے مطابق عراق کے تین حصے ہوں گے۔ ایک حصّہ گریٹر کردستان کے ساتھ شامل کر دیا جائے گا جس میں

ایران‘ عراق اور ترکی کا کردستان شامل ہوں گے۔ جیسے ہمارے ہاں پاکستان ‘ افغانستان اور ایران کا بلوچستان ملا کر گریٹر بلوچستان بنے گا۔ اس کے علاوہ عراق کا کثیر حصّہ گریٹر اسرائیل میں شامل ہو جائے گا اور باقی کچھ بچا کھچا عراق رہے گا ۔ اس نقشے کا اگلا حصّہ یہ ہے کہ سعودی عرب کے ٹکڑے ہوں گے۔ مدینہ اور مکہ کے شہروں پر مشتمل ایک چھوٹی سی ریاست بنا دی جائے گی جیسے روم میں ویٹی کن سٹی ہے جو عیسائیوں کا ایک بڑا مرکز ہے۔ یہ ایک چھوٹی سی علیحدہ حکومت ہے جس پر اطالوی حکومت کا قبضہ نہیں بلکہ وہاں کا فرماں روا پوپ ہے۔ اسی طرز کا گویا ایک مسلم ویٹی کن بنا دیا جائے گا۔

یہ نہ سمجھئے کہ یقیناً ایسا ہی ہو گا ۔ یہ تو ان کے نقشے ہیں۔ ہو گا وہی جو اللہ چاہے گا‘ کیونکہ ازروئے الفاظِ قرآنی:{وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ۭ}(الانفال:۳۰) ’’وہ اپنی سی چالیں چل رہے ہیں اور اللہ اپنی چال چل رہا ہے‘‘۔ لیکن یقیناً انہیں اس میں ایک حد تک کامیابی ہو گی جس کی ہمیں خبریں دی گئی ہیں۔ گریٹر اسرائیل ایک دفعہ قائم ہو گا۔ اس میں سعودی عرب سے بھی شمالی حصّہ لے کر شامل کیا جائے گا۔مدینہ کے بارے میں ان کا دعویٰ ہے کہ یہ ہمارا وطن ہے اور وہ اس کو لینے کے خواب بھی دیکھتے ہیں‘ لیکن وہ مدینہ میں داخل نہیں ہو سکیں گے‘ کیونکہ حدیث میں صراحت ہے کہ دجال اور اس کی فوجیں مدینہ میں داخل نہیں ہو سکیں گی۔باقی شام‘ عراق‘ فلسطین‘ لبنان ‘ترکی کا جنوبی حصّہ

اور مصر کا جزیرہ نمائے سینا اور دریائے نیل کے ڈیلٹا کا زرخیز علاقہ بھی گریٹر اسرائیل کے نقشے میں شامل ہے۔ جزیرہ نمائے سینا کو تو یہودی ابھی تک رو رہے ہیں کہ انہوں نے کیوں واپس کر دیا۔ انہوں نے ۱۹۶۷ء میں یہ علاقہ مصر سے چھین لیا تھا' جو بعد میں معاہدے کے تحت مصر کو واپس ہوا' لیکن اسے وہ واپس لیں گے۔ یہ بات حقیقت ہے کہ جب ایسا ہو گا تو بڑی تباہی آئے گی' جس کے سب سے زیادہ شکار مسلمانانِ عرب ہوں گے۔ اس وجہ سے کہ انہوں نے قرآن کو اپنا امام نہیں بنایا۔

عالمِ عجم کے بارے میں 'میں ہمیشہ کہتا رہا ہوں کہ اس میں سب سے بڑے مجرم ہم مسلمانانِ پاکستان ہیں 'کیونکہ ہم نے اسلام کے نام پر ایک تقسیم کرائی ۔ ہم نے کہا کہ ہم

یہاں اسلام کا نظام قائم کریں گے تو اللہ نے ہمیں معجزے کے طور پر ملک پاکستان عطا کر دیا۔ اب قمری حساب سے ۶۳ برس گزر چکے ہیں' لیکن کہاں ہے وہ اسلام؟ کہاں ہے وہ نظامِ عدلِ اجتماعی؟ لیکن پاکستان کے معاملے کو میں ابھی میزان میں معلق(Hanging in the balance) والا معاملہ سمجھتا ہوں۔ شاید اللہ تعالیٰ کوئی توفیق دے دے 'کوئی معجزہ رونما ہو جائے۔ میرا یقین ہے کہ یہ قائم بھی معجزے کے طور پر ہوا تھا'جس پر میں نے تفصیلاً ایک کتاب ''استحکامِ پاکستان'' کے نام سے لکھی تھی۔ لہٰذا دوبارہ بھی کوئی معجزہ ہو سکتا ہے۔ وہ معجزہ یہ ہو گا کہ پوری قوم میں توبہ کی ایک کیفیت پیدا ہو جائے' اور یہ اللہ کی توفیق ہی سے ہو سکتی ہے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں خبر دی ہے کہ انسانوں کے دل اللہ کی دو انگلیوں کے مابین ہیں' وہ جدھر چاہتا ہے پھیر دیتا ہے۔ تو کوئی عجب نہیں کہ ایسا ہو جائے۔ اس اعتبار سے میں نے سورۃ الانبیاء کے آخر سے جو دو آیات تلاوت کی تھیں' قابلِ غور ہیں۔ رسول اللہ ﷺ سے کہا جا رہا ہے کہ آپ ان سے کہہ دیجیے:

{وَ اِنۡ اَدۡرِیۡۤ اَقَرِیۡبٌ اَمۡ بَعِیۡدٌ مَّا تُوۡعَدُوۡنَ ﴿۱۰۹﴾} (الانبیاء)

''(دیکھو لوگو!) مجھے یہ معلوم نہیں کہ جس (عذابِ خداوندی) کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے وہ قریب آگیا ہے یا دور ہے۔''

{وَ اِنۡ اَدۡرِیۡ لَعَلَّہٗ فِتۡنَۃٌ لَّکُمۡ وَ مَتَاعٌ اِلٰی حِیۡنٍ ﴿۱۱۱﴾}

''اور مجھے نہیں معلوم' ہو سکتا ہے کہ یہ تمہارے لیے ایک فتنہ بن کر آگیا ہو اور ابھی تمہیں مزید مہلت دے دی جائے۔''

اس حوالے سے ہم نہیں کہہ سکتے کہ ہم پر کوئی عذاب مسلط ہونے والا ہے یا ہم مہلت کے پیریڈ میں ہیں ۔ لیکن مجموعی طور پر پاکستان کا گھیرائو کیا جا رہا ہے۔ صیہونیوں (Zionists) کے گٹھ جوڑ میں عیسائی صیہونیوں اور یہودی صیہونیوں کے ساتھ اب ہندو صیہونی بھی شامل ہو چکے ہیں' اور یہ سارے ہمیں گھیرے میں لے رہے ہیں

۔ خصوصاً بھارت کی فوج جس طرح افغانستان میں آ رہی ہے اور وہاں بھارت نے اپنے کتنے قونصل خانے کھولے ہیں' یہ سب کچھ کس لیے ہے؟ اس کے علاوہ جو کچھ بلوچستان 'صوبہ سرحد اور اس سے آگے بڑھ کر کراچی میں ہو رہا ہے' یہ سارے معاملات آپ خود دیکھ سکتے ہیں ۔تو

گویا باہر سے ہمارا گھیرائو مکمل ہو چکا ہے۔ ممبئی حملوں نے ہماری پوزیشن ہمارے حکمرانوں کی وجہ سے مزید کمزور کر دی ہے اور ڈھٹائی سے کہا جا رہا ہے کہ یہ سارا کام مسلمانوں نے کیا ہے ۔ ممبئی حملوں کے بعد وقتی طور پر جس طرح کا طوفان اور جوش اٹھا تھا' معلوم ہوتا تھا کہ شاید نائن الیون کی طرح جیسے یک دم امریکہ افغانستان پر چڑھ دوڑا تھا کہیں کوئی ایسا حادثہ نہ ہو جائے 'لیکن اللہ کا شکر ہے کہ ایسا نہیں ہوا ۔

تازہ رپورٹ کے مطابق اوباما کو بریفنگ دی گئی ہے کہ پاکستان کے نیوکلیئر بمز شدّت پسندوں کے ہاتھ لگ سکتے ہیں۔ یعنی انہوں نے ہمارے ایٹمی دانت توڑنے کا کوئی نہ کوئی بہانہ بنانا ہے ۔اور ادھر ہمارے لوگوں نے باراک اوباما سے بڑی امیدیں باندھ رکھی تھیں۔مَیں نے ایک مضمون بھی پڑھا 'جس میں لکھا تھا کہ باراک کا لفظ اسلامی ہے 'یہ برکت سے ہے 'اس لیے کہ اس کے باپ کی زبان سواحلی تھی' جو کینیا کے ساحلی علاقے میں بولی جاتی ہے اور اس میں عربی کی بڑی آمیزش ہے ۔لہٰذا اس برکت والے نام باراک حسین سے کچھ لوگوں کو بڑی توقعات وابستہ ہو گئی تھیں ۔لیکن نظر یہ آ رہا ہے کہ جو بش کا ایجنڈا تھا اس کی کسی نہ کسی شکل میں تکمیل ہو گی' کیونکہ اصل میں اُس کی پالیسی بنانے والا کوئی ایک فرد تو نہیں تھا 'وہاں تو پورے ادارے ہیں ' بڑے بڑے تھنک ٹینکس ہیں جنہوں نے یہ پالیسی تشکیل دی۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ اوباما نے صدر منتخب ہوتے ہی اپنے ارد گرد کس طرح کے لوگوں کو جمع کرنا شروع کر دیا ہے تو اس اعتبار سے حالات انتہائی خطرناک موڑ پر پہنچ چکے ہیں۔

دوسری طرف پاکستان کا اندرونی معاملہ بھی تشویش ناک ہے۔ سائنس کی دو اصطلاحات آپ نے سنی ہوں گی:(۱) مرکز گریز قوتیں (centrifugal forces) اور (۲) مرکز مائل قوتیں(centripetal forces) ----- مقدّم الذکر مرکز سے توڑنے والی قوتیں ہوتی ہیں 'جن میں ہر ایک مرکز کو چھوڑ کر بھاگتی ہے۔ مؤخر الذکر وہ قوتیں ہوتی ہیں جن کا رخ مرکز کی طرف ہو' جو مرکز کی طرف لانے والی ہوں۔ ہمارے پاس سینٹری پیٹل فورس یعنی مائل بہ مرکز اور مرکز دوست قوت صرف ایک ہے اور وہ ''اسلام'' ہے' اور اس

کا حال یہ ہے کہ ع ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے ! اسلام بطور نظام ہمارے پاس نہیں ہے' البتہ بطور مذہب موجود ہے۔ لیکن بطور مذہب تو انڈیا میں بھی ہے' امریکہ میں بھی ہے۔ آج دنیا میں اسلام کو سب سے زیادہ تیزی سے پھیلنے والا مذہب مانا جا رہا ہے۔ لیکن مذہب ہے' دین نہیں۔ جبکہ محمد رسول اللہ ﷺ غلبۂ دین کے لیے بھیجے گئے تھے :

{ہُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَہٗ بِالۡہُدٰی وَ دِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡہِرَہٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّہٖ ۙ}(التوبۃ:۳۳‘ الفتح:۲۸‘ الصف:۹)

سینٹری فیوگل فورسز (مرکز گریز قوتیں) آپ کے شمال میں بھی ہیں اور جنوب میں بھی۔ صوبہ سرحد میں اسفندیار ولی حکومت میں شامل ہے‘ جس کے دادا نے پاکستان میں دفن ہونا گوارا نہیں کیا۔ اس کے باپ ولی خان اور ان کی جماعت کا یہ پختہ موقف رہا ہے کہ پاکستان انگریز کی سازش کے نتیجے میں وجود میں آیا۔ ان کے ساتھ مولانا فضل الرحمٰن ہیں‘ جن کے والد مرحوم نے کہا تھا کہ اللہ کا شکر ہے ہم پاکستان بنانے کے گناہ میں شامل نہیں تھے۔ جنوب میں جب سے ایم کیوایم (مہاجر قومی موومنٹ) وجود میں آئی ہے تب سے پاکستان کے نئے نقشے بن رہے ہیں۔ اگرچہ بعد میں انہوں نے اپنا رنگ بدلا ہے‘ لیکن اصلاً یہ قومیت کی بنیاد پر اٹھے تھے اور کراچی میں خوب فساد برپا کیا تھا‘ پٹھانوں اور پنجابیوں کو بے دریغ قتل کیا تھا‘ اور آج بھی ان میں وہی قومی تعصب بالکل اسی طرح باقی ہے۔ بلوچستان کے معاملہ سے سب لوگ آگاہ ہیں۔

اندرونی طور پر جو سینیٹری پیٹل فورس (مرکزی قوت انضباط) ہو سکتی ہے اس کو ہم نے مضبوط نہیں کیا بلکہ کمزور سے کمزور تر کرتے چلے گئے اور اب نتائج آپ کے سامنے ہیں۔ اسلام کی معاشرتی اقدار کے خلاف مضامین لکھے جا رہے ہیں‘ عائلی قوانین میں تبدیلیاں کی جا رہی ہیں۔ یو این او میں ہونے والی بیجنگ پلس فائیو کانفرنس میں یہ بات طے ہوئی تھی کہ طلاق کے معاملے میں مرد اور عورت کو بالکل برابر کر دیا جائے‘ اور آپ بھی وہی کر رہے ہیں کہ جیسے مرد طلاق دے سکتا ہے عورت بھی دے سکتی ہے۔ حالانکہ اسلام میں یہ ہے کہ عورت طلاق لے سکتی ہے‘ دے نہیں سکتی۔ شوہر سے کہے گی کہ تم نے مجھے جو مہر دیا تھا میں واپس

کرتی ہوں مجھے آزاد کر دو۔ اگر ایسا ممکن نہیں تو وہ اپنے بزرگوں کو اور اس کے بزرگوں کو بیچ میں ڈالے یا عدالت میں جائے اور عدالت کو قائل کرے کہ ہمارا گزارا ممکن نہیں ہے‘ تو وہ ان کے مابین علیحدگی کرا دے گی۔ یعنی عورت خلع لے سکتی ہے‘ طلاق نہیں دے سکتی۔ اسلام میں یہ فرق رکھا گیا ہے۔ باقی مرد اور عورت انسان ہونے کی حیثیت سے برابر ہیں‘ کوئی اونچا نہیں‘ کوئی نیچا نہیں۔ اشرف المخلوقات ہونے کے اعتبار سے شرفِ انسانیت مرد و عورت دونوں کو حاصل ہے۔ لیکن جب ایک مرد اور ایک عورت مل کر ایک خاندان کی بنیاد ڈالتے ہیں تو اب وہ برابر نہیں ہیں‘ بلکہ خاندان کا سربراہ مرد ہے {اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوۡنَ عَلَی النِّسَآءِ} ۔کوئی بھی نظم ہو اس میں دو برابر کے سربراہ نہیں ہو سکتے۔ دونوں کا اختیار ایک ہی جیسا ہو تو گاڑی چل ہی نہیں سکتی۔ آپ کسی ادارے میں ڈائریکٹر جتنے چاہیں بنا لیں‘ مینیجنگ ڈائریکٹر ایک ہی ہو گا۔ چنانچہ خاندان کے ادارے کے لیے اسلام نے جو نظام دیا ہے وہی فطری اور قابل عمل ہے کہ ذمّہ داریوں کے اعتبار سے مقام و مرتبہ دیا جائے۔ یہی وراثت کا معاملہ ہے۔ عورت کے ذمے کچھ اور کام لگائے گئے ہیں‘ مردوں کی کچھ اور ذمّہ داریاں ہیں۔ مرد ذمّہ دار ہے‘ کفیل ہے‘ لہٰذا وراثت میں اسے دوہرا حصّہ ملتا

ہے ‘جبکہ لڑکی کی کوئی ذِمّہ داری نہیں ہے ‘بلکہ وہ تو شادی کے وقت شوہر سے مہر لیتی ہے ۔ تو یہ تمام چیزیں آپس میں مربوط اور ایک دوسرے کے ساتھ منطقی طور پر جڑی ہوئی ہیں ‘انہیں توڑا جائے گا تو پورا خاندانی نظام تباہ ہو جائے گا۔ اور وہ جو ہمارے خاندانی نظام کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں انہوں نے عورت اور مرد کو برابر کر دیا ہے۔

اس سے پہلے جو حدود آرڈیننس میں تبدیلیاں کی گئی ہیں اس نے تو زنا اور بدکاری کا سرے سے خوف ہی ختم کر دیا ہے ۔ قانون اس قدر پیچیدہ بنا دیا گیا ہے کہ جب چار چشم دید گواہ ہوں اور وہ مجسٹریٹ کے سامنے جا کر گواہی دیں تب پرچہ درج ہو گا ‘ تحقیقات بعد میں ہوں گی۔ اس طرح زنا کے معاملے میں جو خوف ہو سکتا تھا وہ بھی ختم ہو گیا۔ دوسرا بیڑا غرق آبادی کے کنٹرول کی مہم نے کر دیا کہ اب جو چاہو کرو ‘حمل وغیرہ کا بھی کوئی خطرہ نہیں ہے۔ امریکہ اور یورپ میں تو ٹین ایجرز کو سکولوں میں باقاعدہ تعلیم دی جاتی ہے کہ جو چاہو کرو‘

لیکن ذرا احتیاط سے۔ یہ سب وہی کچھ ہے جس پر کفار ہماری تہذیب کو لے جانا چاہتے ہیں۔ اب یہ دونوں نقشے ایسے ہیں کہ ان میں وہی صورت حال پیدا ہو سکتی ہے‘ جس کے بارے میں کہا گیا :{وَ اِنۡ اَدۡرِیۡ لَعَلَّہٗ فِتۡنَۃٌ لَّکُمۡ وَ مَتَاعٌ اِلٰی حِیۡنٍ ﴿۱۱۱﴾}(الانبیاء) ہو سکتا ہے کہ اللہ کی طرف سے پہلے کی طرح کوئی معجزہ آ جائے۔تو دعا ہے کہ ع ’’خدایا آں گرم بارِ دگر کن !‘‘ اللہ ہمیں ان تمام سختیوں سے گزار کر دوبارہ بھی کوئی معجزہ دکھا سکتا ہے‘ اس کا امکان بھی موجود ہے جس کی نفی نہیں کی جا سکتی ۔ کیونکہ قدرتِ الٰہی ہے : {یُخۡرِجُ الۡحَیَّ مِنَ الۡمَیِّتِ} ’’وہ مُردے سے زندہ برآمد کرتا ہے‘‘۔ عین ممکن ہے کہ ایک قوم مر چکی ہو مگر اس میں سے ایک زندہ قوم برآمد ہو جائے۔ جیسا کہ میں نے وکلاء کی تحریک کے بارے میں کہا تھا کہ اس سے مجھے امید کی کرن نظر آئی کہ ابھی قوم میں کچھ جان ہے‘ ورنہ میں یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ یہ قوم بالکل مر چکی ہے۔ ہمارے اس پڑھے لکھے طبقے اور تعلیم یافتہ لوگوں نے جو سختیاں جھیلی ہیں اور جس طریقے سے مصائب برداشت کر کے انہوں نے اس تحریک کو برقرار رکھا ہوا ہے‘ یہ بہت بڑا کارنامہ ہے۔ تو اس سے کچھ نہ کچھ اُمید کی کرن پھوٹتی نظر آتی ہے۔ اور وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ پاکستان اللہ کے حکم سے ہی بنا تھا اور اسی کے حکم سے قائم رہے گا‘ ان سے میں کہا کرتا ہوں کہ وہ اللہ کی سُنّت سے واقف نہیں ہیں ‘کیونکہ سزا بھی اللہ کی سُنّت ہے۔ وہ رسی دراز کرتا رہتا ہے اور اچانک یک دم کھینچ لیتا ہے۔ شیطان لوگوں کو دھوکے میں رکھتا ہے کہ کچھ نہیں ہوتا ‘اللہ بڑا غفور بڑا رحم والا ہے ۔اسے قرآن مجید نے یوں بیان کیا ہے:{یٰۤاَیُّہَا الۡاِنۡسَانُ مَا غَرَّکَ بِرَبِّکَ الۡکَرِیۡمِ ۙ﴿۶﴾}(الانفطار) ’’اے انسان !تجھے کس شے نے تیرے کریم رب کے بارے میں دھوکے میں رکھا ہوا ہے؟‘‘ یہ بجا ہے کہ وہ غفورٌ رحیم ہے‘ لیکن اس کی صفت منتقم بھی ہے کہ سخت انتقام لینے والا ہے۔ بفحوائے الفاظِ قرآنی:{اِنَّا مِنَ الۡمُجۡرِمِیۡنَ مُنۡتَقِمُوۡنَ ﴿۲۲﴾}(السجدۃ)’’ہم ان مجرموں سے انتقام لے کر رہیں گے‘‘۔وہ سزا بھی تو

دیتا ہے ۔اُس نے جہنم کوئی ڈیکوریشن پیس کے طور پر تو نہیں بنائی ہے ‘بلکہ فرمایا: {لَاَمۡلَئَنَّ جَہَنَّمَ مِنَ الۡجِنَّۃِ وَ النَّاسِ اَجۡمَعِیۡنَ ﴿ ۱۳ ﴾}(السجدۃ) ’’یقیناً میں جہنم کو جنوں اور انسانوں سے بھردوں

گا‘‘۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے بچائے ۔

بہرحال پھر بھی ممکن ہے اللہ تعالیٰ ہمیں مہلت دے دے ‘اور یہ مہلت دو چیزوں سے حاصل کی جا سکتی ہے: (۱) توبہ اور (۲) دُعا۔ پہلے توبہ کی جائے پھر دعا ۔یاد رکھیں توبہ کے بغیر دُعا قبول نہیں ہو گی۔ پہلا کام توبہ ہے: {یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا تُوۡبُوۡۤا اِلَی اللّٰہِ تَوۡبَۃً نَّصُوۡحًا ؕ}(التحریم:۸) ’’اے اہلِ ایمان ! اللہ کی جناب میں توبہ کرو خالص توبہ‘‘۔ کیا مطلب ہے؟ اپنی زندگیوں سے شریعت اور اخلاقیات کے خلاف اعمال مثلاً جھوٹ‘ دغا‘ فریب‘ دھوکہ‘ غبن‘ سود‘ بے پردگی‘ عریانی ‘فحاشی‘ عیاشی سب ختم کر دو اور یہ طے کر لو کہ آئندہ شریعت اور اخلاقیات کے خلاف کوئی کام نہیں کریں گے۔ کیونکہ شریعت کے ساتھ بنیادی اخلاقیات پر عمل بھی ضروری ہے ‘جس سے خصوصاً مسلمانانِ پاکستان دستبردار ہو چکے ہیں۔ جھوٹ اور وعدہ خلافی جتنا ہمارے ہاں ہے اس قدر آپ پوری دنیا میں کہیں نہیں دیکھیں گے اور یہ دنیا کی سب سے بڑی منافقت ہے۔ اس لیے پہلے توبہ کی جائے اور پھر دعا کی جائے۔ اسی لیے میں نے آپ کو ترمذی شریف کی حدیث ((لَا یَرُدُّ الۡقَضَاءَ اِلَّا الدُّعَاءُ)) سنائی کہ اللہ کے فیصلے کو کبھی کبھی دعا بھی لوٹا دیتی ہے۔ لیکن اُس وقت جب آپ نے اللہ کے ساتھ اپنا معاملہ صحیح کر لیا ہو۔ جس طرح حضرت یونس علیہ السلام کی قوم پر اللہ کا فیصلہ آچکا تھا اور عذاب کے آثار نمودار ہو چکے تھے ‘ اُس وقت پوری قوم نے اجتماعی توبہ کی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک مدت تک کے لیے مہلت دے دی اور عذاب جو ان کے سروں پر منڈلا رہا تھا ‘ ہٹا لیا۔ چنانچہ توبہ کی جائے اور دعا کی جائے۔ اور اس توبہ کا ایک لازمی حصّہ یہ ہونا چاہیے کہ اے اللہ اب میں اپنی تمام بہترین توانائیاں اور قوتیں ‘تمام صلاحیتیں اور وسائل تیرے دین کو قائم کرنے کے لیے خرچ کروں گا ۔ اور اس کے لیے آپ کسی ایسی جماعت میں شامل ہو جائیں جسے آپ سمجھیں کہ یہ صحیح ترین جماعت ہے جو واقعی اسلام کے لیے کام کر رہی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول کے مطابق ((لَا اِسۡلَامَ اِلَّا بِجَمَاعَۃٍ))(۱) ’’جماعت کے بغیر کوئی اسلام نہیں ہے‘‘۔ اور مرفوع حدیث میں ہے :

_____(۱) سنن الدارمی‘ المقدمۃ‘ باب فی ذھاب العلم۔

((اٰنَا آمُرُكُمْ بِخَمْسٍ، اَللّٰهُ اَمَرَنِیْ بِهِنَّ: بِالْجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَالْهِجْرَةِ وَالْجِهَادِ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ))(۲)

''میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دے رہا ہوں (اور یہ پانچ باتیں وہ ہیں) جن کا اللہ نے مجھے حکم دیا ہے: جماعت' سمع و طاعت' ہجرت اور جہاد فی سبیل اللہ۔''

اس لیے توبہ کا یہ لازمی جزو ہونا چاہیے کہ:{قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۶۲﴾}(الانعام) ''بلاشبہ میری نماز 'میری قربانی' میرا جینا اور مرنا صرف اللہ ربّ العالمین کے لیے ہے''۔ یہ فیصلہ کر لیجیے ۔اس کے بعد استقامت کی دُعا کیجیے کہ اے اللہ تو نے مجھے ہدایت دے دی ' اب اس سے محروم نہ فرمانا۔ ازروئے الفاظِ قرآنی: {رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ ہَدَیْتَنَا وَ ہَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْکَ رَحْمَۃً ۚ اِنَّکَ اَنْتَ الْوَہَّابُ ﴿۸﴾} (آلِ عمران) ''اے ہمارے رب ! ہمیں سیدھی راہ پر لگانے کے بعد ہمارے دلوں میں کجی نہ پیدا کرنا اور ہمیں اپنے خزانۂ فیض سے رحمت عطا فرمانا کہ تو ہی فیاض حقیقی ہے۔''

آخری بات میں بڑے ڈرتے ڈرتے کہہ رہا ہوں کہ اگر خدانخواستہ' خاکم بدہن' پاکستان کے لیے بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے آخری سزا جس کے چرچے ہو رہے ہیں' کا فیصلہ ہو گیا ہو تو ہمیں کیا کرنا ہو گا۔ ایک تو اوپر کے آسمان ہیں اور ایک زمین کے آسمان بھی تو ہیں' مثلاً امریکہ' وائٹ ہائوس' پینٹاگون' سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ' نیٹو ہیڈکوارٹرز۔یہاں کیا ہو رہا ہے؟ ع

''تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں !''

اس کی خبریں وہ مسلسل دیتے آرہے ہیں ۔ بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ خواہ مخواہ ہمارے اندر بددلی پیدا کرنے کے لیے یہ پروپیگنڈا ہے۔ یاد رکھیے' یہ صرف پروپیگنڈا نہیں ہے 'بلکہ ماضی کے وہ تمام نقشے جو انہوں نے بنائے تھے پورے ہوئے ہیں۔ ۱۸۹۷ء میں یہودیوں نے جو فیصلے کیے تھے ۲۰ برس کے بعد بالفور ڈیکلریشن کی شکل میں وہ سامنے آئے کہ یہودیوں کو فلسطین میں آبادکاری کا حق دے دیا گیا اور اس کے ٹھیک ۲۰ سال بعد ۱۹۴۸ء میں اسرائیل قائم ہو گیا۔ پچھلی صدی میں دنیا میں کوئی تصوّر کر سکتا تھا کہ یہودیوں کی حکومت قائم ہو گی ؟یقیناً اس کا کوئی

(۲) مسند احمد' مسند الشامیین' عن الحارث الاشعری رضي الله عنه۔

امکان نہیں تھا 'لیکن وہ ہوئی۔یہ پوری دنیا میں منتشر تھے۔ یورپ میں ان کے خلاف شدید نفرت تھی 'لیکن جس طرح رفتہ رفتہ انہوں نے وہاں پر قدم جما کر ان کو اپنے قابو میں لیا ہے اور جس طرح ان میں کیتھولکس اور پروٹسٹنٹس

لی مذہبی تقسیم پیدا کی ہے' یہ ان کی کامیابی کی دلیل ہے۔ پروٹسٹنٹس کو آلۂ کار بنا کر سیکولرزم کو فروغ دیا اور اس کے بعد سود پر مبنی معیشت اور بینکوں کا نظام وہاں نافذ کیا۔ع ''ایں بنوک ایں فکر چالاک یہود''۔ سب سے پہلا بینک انہوں نے انگلینڈ میں قائم کیا ۔اس طرح انہوں نے اپنے منصوبوں کو عملی شکل دی۔ اور اب ان کے جو نقشے ہیں وہ سامنے آرہے ہیں۔

اس حوالے سے 'خاکم بدہن' اگر خدانخواستہ یہ لکیر ختم ہو جائے تب بھی زمین تو ختم نہیں ہو جائے گی۔ اگر پاکستان نہ بنتا تو کیا ہمارے ذمے نہیں تھا کہ اللہ کے دین کو دنیا میں قائم کرنے کے لیے جدّوجُہد کرتے؟ وہ تو بحیثیت مسلمان ہمارا فرض ہے۔ کیا محمد رسول اللہ ﷺ عرب میں اکثریت میں تھے؟ وہ تو اقلیت میں بھی نہیں تھے' ایک فرد تھے۔ آپؐ 'تن تنہا کھڑے ہوئے اور قیامِ دین کے لیے جدّوجُہد شروع کر دی۔ جنوں نے ایک مرتبہ حضور ﷺ کی بات سنی تو اپنی قوم میں جا کر کہا :{یٰقَوْمَنَا اَجِیْبُوْا دَاعِیَ اللّٰہِ وَاٰمِنُوْا بِہٖ ...}(الاحقاف: ۳۱)''اے ہماری قوم ! اللہ کی طرف دعوت دینے والے کی پکار پر لبیک کہو اور اس پر ایمان لے آئو...''کوئی عجب نہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی اور قوم کو اس کی توفیق عطا فرما دے۔ یہ جو اقبال نے الفاظ کہے ہیں: ؎

تو نہ مٹ جائے گا ایران کے مٹ جانے سے
نشۂ مے کو تعلق نہیں پیمانے سے

اور: ؎

ہے عیاں فتنۂ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

تاتاریوں کے ہاتھوں کروڑوں مسلمان قتل ہوئے اور پھر وہی تاتاری مسلمان ہو گئے اور اُمّتِ مسلمہ کی قیادت عربوں سے نکل کر ان کے ہاتھوں میں آگئی۔ سورۂ محمد کی آخری آیت

میں فرمایا گیا: {وَاِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ}''اور اگر تم پیٹھ موڑ لو گے تو ہم تمہاری جگہ کسی اور قوم کو لے آئیں گے''---- یہ بات اہلِ عرب سے کہی جا رہی ہے کہ جو مقام ہم نے تمہیں دیا ہے' اپنا رسول تم میں سے مبعوث کیا ہے:{بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْھُمْ}تمہاری زبان میں اپنی کتاب نازل کی ہے' جو تمہیں مشن سونپا ہے' اگر تم نے اس سے پیٹھ دکھا دی تو تمہیں ہٹا کر ہم کسی اور قوم کو لے آئیں گے۔ اور پھر تیرہویں صدی عیسوی میں یہی ہوا ۔ ۱۲۵۸ء

میں بنو عباس کے آخری خلیفہ مستعصم باللہ کو اس کے محل سے نکال کر جانور کی کھال میں لپیٹ کر گلی میں ڈال دیا گیا اور اوپر سے گھوڑے دوڑا دیے گئے‘ جس سے بنو عباس کا آخری چراغ بھی گُل ہو گیا۔ اس پر سعدی نے مرثیہ کہا کہ :

؎

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں
بر زوالِ ملک مستعصم امیر المومنین

یعنی مستعصم باللہ کی حکومت کے زوال پر آسمان سے زمین پر خون بھی برسے تو آسمان کو اس کا حق ہے۔

اگر خدانخواستہ ایسا ہو جائے کہ پاکستان نہ رہے تو اسلام پھر بھی زندہ رہے گا‘ کیونکہ ہم مر سکتے ہیں اسلام نہیں مرے گا۔ اسلام کو تو رہنا ہے ‘جیسا کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں آخری رسول ہوں اور تم آخری اُمّت ہو۔ البتہ ہم سے قیادت چھین کر کسی اور کو دے دی جائے گی۔ کوئی عجب نہیں کہ ہمیں ہندوئوں سے پٹوا کر اسلام کا پرچم ان کے ہاتھوں میں تھما دیا جائے۔ آخر ہندوستان میں ۲۰ کروڑ سے زیادہ مسلمان ہیں۔ آپ غور کریں کہ اسی ہندوستان کی سرزمین سے شیخ احمد دیدات پیدا ہوئے تھے ‘ جنہوں نے مناظروں میں پوری دنیا کے عیسائیوں کو شکست دی ‘اور آج اسی ہندوستان سے ڈاکٹر ذاکر نائیک کھڑا ہوا ہے‘ جو پوری دنیا میں اسلام کا ڈنکا بجا رہا ہے۔ وہ موجودہ عیسائیت ‘ یہودیت اور ہندومت کے خلاف دلائل ان کی کتابوں‘ ویدوں اور ان کے صحائف (scriptures) سے لا رہا ہے اور ثابت کر رہا ہے کہ تمہارا موجودہ دین غلط ہے‘ تمہارے ہاں تو محمد ﷺ کی بشارتیں موجود ہیں‘ اپنی کتابوں کو کبھی پڑھ کے تو دیکھو۔ میں نے ۸۳۔۱۹۸۲ء میں مولانا علی میاںؒ سے کہا

تھا کہ آپ ندوۃ العلماء لکھنؤ میں سنسکرت کی تعلیم کو لازمی کریں تاکہ آپ کے فارغ التحصیل علماء خود ویدوں کو پڑھ سکیں اور ہندو کے ذہن کو سمجھ سکیں کہ اس کی فکر‘ اس کی سوچ اور اس کے عقائد کیا ہیں؟ ان کے اعمال اور حقیقی نظریات میں کہیں تضاد تو نہیں؟ جیسا کہ آج اسلام کو کوئی تعزیوں کے جلوسوں سے یا صوفیاء کے مقبروں پر جو ان کے عرس ہو رہے ہیں ان سے پہچانے گا تو کیا وہ صحیح اسلام کو پہچان پائے گا؟ چنانچہ ہندوستانی علماء کو یہ علم ہونا چاہیے کہ ہندو مذہب کا ذہن کیا ہے۔ انہوں نے اس پر آمادگی ظاہر کی لیکن اس تجویز کو عملی جامہ نہ پہنا سکے۔ دراصل ہمارے علماء کے لیے کسی بھی نئی بات کو قبول کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ لیکن آج ڈاکٹر ذاکر نائیک ان کے ویدوں سے ان کے خلاف دلائل دے رہے ہیں۔

اسی طرح دورئہ ترجمہ قرآن کی پذیرائی جس قدر بھارت میں ہو رہی ہے ‘ وہ پاکستان میں نہیں ہے۔ پاکستان میں تو میرے چینلز بند کر دیے گئے ہیں اور بہت سے چینلز کا دروازہ مجھ پر بند ہے۔ خصوصاً پی ٹی وی میں تو

میرا داخلہ بھی حرام ہے۔ ہمارے ہاں ایک اقلیتی گروہ اتنا زور آور ہے کہ وہ اپنی بات منوا کر رہتا ہے۔ انہوں نے ممبئی میں کچھ عرصے کے لیے ڈاکٹر ذاکر نائیک کا پروگرام بھی بند کرا دیا تھا ‘لیکن وہاں یہ پابندی برقرار نہیں رہی۔ اس لیے کہ ڈاکٹر ذاکر نے پچھلے دنوں کانگریس کے ایک اجلاس میں کہا تھا کہ ہندوستان میں مسلمان تعلیم حاصل نہ کرنے کی وجہ سے جاہل تھے جس کے سبب وہ ہمیشہ پیچھے رہے ہیں ‘ اور آج اگر مسلمان آگے آئے ہیں تو انفارمیشن ٹیکنالوجی کے شعبہ میں ان کے لیے دروازے بند کر دیے گئے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ڈاکٹر ذاکر نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ہندوستان میں عدلیہ صحیح جگہ پر کھڑی ہے۔ کیا ہمارے ہاں کسی مقدمے کی اس قدر شفاف انکوائری کا تصوّر ہے کہ ایک حاضر سروس کرنل کو مجرم قرار دیا جائے اور پھر پوری رپورٹ عوام کے سامنے پیش کر دی جائے۔ ہمارے ہاں تو کسی انکوائری کمیٹی کی رپورٹ کبھی سامنے آتی ہی نہیں۔ جنگ عظیم دوم میں جب بے انتہا تباہی ہوئی تو لوگ چرچل کے پاس آئے ۔چرچل نے کہا یہ بتاؤ کہ برطانیہ میں عدالتیں صحیح کام کر رہی ہیں؟ تو انہوں نے کہا کہ ہاں ! اس نے کہا بس ٹھیک ہے ‘پھر یہ ملک قائم رہے گا۔ اسی طرح بھارت میں عدالتیں

صحیح طور پر چل رہی ہیں ۔

مَیں یہ بات واضح کر چکا ہوں کہ ہم زمین پرست‘ وطن پرست نہیں ہیں‘ بندے ماترم ہمارا نعرہ نہیں ہے ۔ہاں پاکستان ہمارا وطن ہے‘ ہمیں اس سے محبّت ہے‘ ہم اس کا دفاع کریں گے۔ اس موقع پر یہ بات خوش آئند ہے کہ ہماری تمام اپوزیشن پارٹیز بھی آل پارٹیز کانفرنس کے اندر جمع ہو گئی ہیں اور یکجہتی کا ثبوت دیا ہے ‘لیکن یہ اسلام کے لیے ہونا چاہیے صرف ایک خطۂ زمین کے لیے نہیں۔ ہمارا اصل مقصود اسلام ہے ‘ اور اسلام کی آواز کہیں بھی اُٹھ سکتی ہے ۔ پچھلے دنوں ہمارے ایک بہت اہم ساتھی سید قاسم محمود صاحب جو بے شمار کتابوں کے مصنف ہیں‘ دہلی گئے تھے اور پھر یوپی کے مختلف شہروں میں بھی ان کا جانا ہوا۔ انہوں نے واپس آکر مجھے خط لکھا جو ندائے خلافت میں شائع بھی ہو چکا ہے کہ وہاں تو گلی کوچوں میں آپ کا نام گونج رہا ہے اور آپ کے درس قرآن کا پروگرام اس درجہ مقبول ہوا ہے کہ آپ تصوّر نہیں کر سکتے۔ ممبئی میں ہونے والے میرے دس لیکچرز آپ نے کبھی ٹیس ٹی وی پر دیکھے ہوں تو آپ کو اندازہ ہو گا کہ ایک لیکچر میں ۱۵‘۱۵ ہزار سے بھی زائد لوگوں نے شرکت کی۔ کیا پاکستان میں اتنے مجمع کا تصوّر بھی کیا جا سکتا ہے؟

قرآن مجید میں سورۃ الانعام میں نبی مکرم ﷺ سے فرمایا گیا ہے :{فَاِنۡ یَّکۡفُرۡ بِہَا ہٰۤؤُلَآءِ فَقَدۡ وَکَّلۡنَا بِہَا قَوۡمًا لَّیۡسُوۡا بِہَا بِکٰفِرِیۡنَ ﴿۸۹﴾}(الانعام) ’’پس اگر یہ (مکہ والے) اس قرآن کا انکار کرتے ہیں (اور اس کی قدر نہیں کرتے) تو ہم یہ (نعمت) کسی ایسی قوم کو سونپ دیں گے کہ وہ اس کی ناقدری نہیں کریں گے‘‘۔ (آپؐ مایوس اور بددل نہ ہوں !) چنانچہ پھر کیسا معجزہ ہوا کہ مدینہ میں ابھی آپؐ کے قدم مبارک بھی نہیں پہنچے تھے کہ وہاں انقلاب آ

لیا۔ آپؐ کے دو ادنیٰ خادم اورادنیٰ شاگرد سیّدنا مصعب بن عمیر اور سیّدنا عبداللہ بن اُمّ مکتوم رضی اللہ عنہما جو نابینا تھے وہاں گئے اور اوس و خزرج تقریباً دونوں قبیلے ایمان لے آئے' ان کی ساری چوٹی کی لیڈر شپ ایمان لے آئی اور وہ یثرب 'مدینۃ النبیؐ اور دار الہجرت بن گیا۔ لہٰذا ہمیں تو اسلام کے ساتھ چمٹے رہنا ہے اور اس کے لیے اپنی جدّوجُہد کو جاری رکھنا ہے۔

اس ملک کے اندر بھی ہم ہر سطح پر دعوت دیتے رہیں گے' مشورے دیتے رہیں گے۔ البتہ لوگ یہ کہہ سکتے ہیں کہ تم کس قوم کو دعوت دے رہے ہو 'کس کو ڈرا رہے ہو' یہ تو ختم ہونے والی ہے۔ اسی لیے میں نے آیت پڑھی تھی:{وَ اِذْ قَالَتْ اُمَّۃٌ مِّنْہُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمًا ۙ اللّٰہُ مُہْلِکُہُمْ اَوْ مُعَذِّبُہُمْ عَذَابًا شَدِیْدًا ؕ}''اور جب ان میں سے ایک گروہ نے (نہی عن المنکر کرنے والوں سے) کہا کہ تم ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کر رہے ہو جن کو اللہ ہلاک کرنے والا یا سخت عذاب دینے والا ہے؟''{قَالُوْا مَعْذِرَۃً اِلٰی رَبِّکُمْ وَ لَعَلَّہُمْ یَتَّقُوْنَ ﴿ ۱۶۴ ﴾}(الاعراف)''تو انہوں نے کہا کہ تمہارے رب کے حضور معذرت پیش کرنے کے لیے' اور اس لیے بھی کہ شاید یہ لوگ باز آجائیں''۔ ہم اپنے رب کے حضور میں جا کر معذرت تو پیش کر سکیں گے کہ اے اللہ! ہم تیرے دین کے ساتھ چمٹے رہے 'ہم نے اپنے آپ کو اس سے وابستہ کیے رکھا اور اس کام کے لیے اپنی بہترین صلاحیتیں' قوتیں اور توانائیاں صَرف کیں۔

میں نے آغازِ خطاب میں کہا تھا کہ لفظ ''یقین'' قرآن میں موت اور قیامت کے بارے میں آیا ہے۔ جان لیجیے کہ یہی لفظ قرآن کے بارے میں دو مرتبہ آیا ہے: {اِنَّ ہٰذَا لَہُوَ حَقُّ الْیَقِیْنِ ﴿۹۵﴾}(الواقعۃ)اور {وَ اِنَّہٗ لَحَقُّ الْیَقِیْنِ ﴿ ۵۱ ﴾} (الحاقۃ)۔ چنانچہ جو یقین کا حق دار ہے وہ قرآن ہے۔ تو کیا پتا یہ جو یقین اللہ کی کتاب کی شکل میں ہے 'اس سے کسی اور جگہ پر انقلاب آجائے۔ یہ بات کوئی بعید نہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے ہوتے ہیں کہ وہ کس قوم کو اپنے دین کی سربلندی کے لیے چن لیتا ہے۔

اقول قولی ھذا واستغفر اللّٰہَ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلماتoo

---

انسان کے تخلیقی مراحل اور

حقیقتِ انسان

۱۳/اگست ۲۰۰۷ء کا خطابِ جمعہ

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ {وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَۃٍ مِّنْ طِیْنٍ ﴿۱۲﴾ثُمَّ جَعَلْنٰہُ نُطْفَۃً فِیْ قَرَارٍ مَّکِیْنٍ ﴿۱۳﴾ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَۃَ عَلَقَۃً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَۃَ مُضْغَۃً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَۃَ عِظٰمًا فَکَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا * ثُمَّ اَنْشَاْنٰہُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ فَتَبٰرَکَ اللّٰہُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ ﴿۱۴﴾ثُمَّ اِنَّکُمْ بَعْدَ ذٰلِکَ لَمَیِّتُوْنَ ﴿۱۵﴾ } (المؤمنون)

عَنْ اَبِیْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ مَسْعُوْدٍ رضی اللہ عنہ قَالَ : حَدَّثَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ وَھُوَ الصَّادِقُ الْمَصْدُوْقُ:((اِنَّ اَحَدَکُمْ یُجْمَعُ خَلْقُہٗ فِیْ بَطْنِ اُمِّہٖ اَرْبَعِیْنَ یَوْمًا نُطْفَۃً ثُمَّ یَکُوْنُ عَلَقَۃً مِّثْلَ ذٰلِکَ ثُمَّ یَکُوْنُ مُضْغَۃً مِّثْلَ ذٰلِکَ ثُمَّ یُرْسَلُ اِلَیْہِ الْمَلَکُ فَیَنْفُخُ فِیْہِ الرُّوْحَ...)) (۱)

''ابوعبدالرحمن' سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' وہ کہتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے ہم سے بیان فرمایا اور وہ صادق اور مصدوق ہیں: ''تم میں سے ہر ایک کی تخلیق یوں ہوتی ہے کہ وہ اپنی ماں کے پیٹ میں چالیس یوم تک نطفہ کی صورت میں' اس کے بعد اتنے ہی روز تک علقہ کی صورت میں 'اور اس کے بعد اتنے ہی روز گوشت کے لوتھڑے کی صورت میں رہتا ہے۔ بعدازاں اس کی طرف ایک فرشتہ بھیجا جاتا ہے 'پس وہ اس میں روح پھونکتا ہے...''

(۱) صحیح البخاری' کتاب احادیث الانبیاء' باب خلق آدم وذریتہ۔ و صحیح مسلم' کتاب القدر' باب کیفیۃ خلق الآدمی فی بطن امہ وکتابۃ رزقہ وأجلہ۔

معزز سامعین کرام! میں نے آپ کے سامنے امام یحییٰ بن شرف الدین النووی رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور کتاب ''اربعین'' کی چوتھی حدیث کا ابتدائی حصہ پڑھا ہے۔ اس میں ایک نہایت اہم موضوع ''حقیقت اِنسان'' زیر بحث آیا ہے' جسے قرآن مجید کے فلسفے اور حکمت دین کے اعتبار سے ذروۃ السنام کہا جا سکتا ہے ۔ یہ گویا tip of the iceberg ہے۔چنانچہ اس موضوع کو قدرے تفصیل سے سمجھنے کے لیے ہم سورۃ المؤمنون کی چند آیات کا مطالعہ بھی کریں گے۔ حدیث کے اس حصے سے اس اہم موضوع'' انسان کے تخلیقی مراحل اور حقیقت انسان'' کا تھوڑا سا اندازہ ہوتا ہے 'جبکہ ان آیات مبارکہ میں اس موضوع کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اور انسان

کے تخلیقی مراحل کا مرحلہ وار تذکرہ کیا گیا ہے۔

قرآنی علمِ جنین پر جدید ماہرین کا تحیّر

قرآن مجید میں رحم مادر میں انسانی جنین کے ارتقاء کا ذکر، کہیں تفصیل سے اور کہیں اجمالی انداز میں، بہت مرتبہ آیا ہے۔ اس حوالے سے میں آپ کے سامنے عہدِ حاضر میں ''علمِ جنین'' (Embryology) کے چوٹی کے دو پروفیسرز کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔ ایک ہیں یونیورسٹی آف ٹورنٹو، کینیڈا کے ڈاکٹر کیتھ ایل مور، جن کی علمِ جنین کے موضوع پر کئی تصانیف ہیں اور ان میں سے دو کتابیں اکثر یونیورسٹیوں میں نصابی کتب (text books) کے طور پر پڑھائی جاتی ہیں۔ دوسرے ٹیسٹ ٹیوب بے بی کے موجد ڈاکٹر رابرٹ ایڈورڈز ہیں --- ٹیسٹ ٹیوب بے بی کا معاملہ یہ ہے کہ کبھی عورت کی ٹیوبز بند ہوتی ہیں جس کی وجہ سے اُس کے ہاں ولادت نہیں ہو سکتی اور بعض اوقات شوہر کا معاملہ کچھ ایسا ہوتا ہے کہ اس کے اندر مردانگی کی قوت نہیں ہوتی جس کی وجہ سے وہ صاحبِ اولاد نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے ٹیسٹ ٹیوب بے بی کا راستہ نکالا گیا کہ شوہر کا نطفہ اور بیوی کی بیضہ دانی میں سے بیضہ لے کر، ان کی تخم ریزی (fertilization) ٹیسٹ ٹیوب میں کر کے، پھر اسے رحم مادر میں plant کر دیا جاتا ہے اور اس کے ذریعے اولاد حاصل کی جاتی ہے۔ چنانچہ ٹیسٹ ٹیوب بے بیز دنیا میں اب عام ہیں اور اس طریقے کا موجد پروفیسر رابرٹ ایڈورڈز ہے -- پروفیسر رابرٹ ایڈورڈز اور ڈاکٹر کیتھ ایل مور دونوں نے نہایت متحیرانہ انداز میں گواہی

دی ہے کہ چودہ سو برس قبل جب dissection اور جسم کو چیر پھاڑ کر دیکھنے کا کوئی رواج نہ تھا، طب ابھی بالکل ابتدائی stages میں تھی، خوردبین (microscope) بھی ایجاد نہیں ہوئی تھی، اُس دَور میں علم الجنین کا جو صحیح اندازہ اور رحم مادر میں انسانی جنین کی درجہ بدرجہ پرورش کی جو نقشہ کشی قرآن نے کی ہے وہ حیران کن حد تک ان معلومات سے مطابقت رکھتی ہے جو خوردبین کی ایجاد کے بعد حال ہی میں انسان کے علم میں آئی ہیں۔ پھر اس پر انہوں نے سعودی عرب جا کر لیکچرز بھی دیے جن کی ویڈیوز آج بھی آپ کو مل سکتی ہیں۔

انسان کے تخلیقی مراحل: قرآن کی روشنی میں

قرآن مجید میں دو سورتوں، سورۃ الحج اور سورۃ المؤمنون کا ایک جوڑا ہے جس میں خاص طور پر علم الجنین اور رحمِ مادر میں انسانی جنین کے ارتقائی مراحل کا تفصیل سے تذکرہ ہے۔ سورۃ الحج میں فرمایا:

{یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّ غَیْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَیِّنَ لَكُمْ ؕ وَ نُقِرُّ فِی الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْۤا اَشُدَّكُمْ ۚ وَ مِنْكُمْ مَّنْ یُّتَوَفّٰی وَ مِنْكُمْ مَّنْ یُّرَدُّ اِلٰۤی اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَیْلَا یَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَیْـًٔا} (آیت ۵)

''اے لوگو! اگر تمہیں (مرنے کے بعد) دوبارہ جی اٹھنے کے بارے میں کوئی شک ہے تو (ذرا اپنی تخلیق پر

غور کرو کہ) ہم نے تمہیں پیدا کیا مٹّی سے‘ پھر اس سے نطفہ بنا کر‘ پھر اس سے علقہ بنا کر‘ پھر اس سے بوٹی بنا کر جس کی بناوٹ کامل بھی ہوتی ہے اور ناقص بھی‘ تاکہ تم پر (اپنی خالقیت) ظاہر کر دیں۔ پھر ہم جس کو چاہتے ہیں ایک میعاد مقرر تک رحم مادر میں ٹھہرائے رکھتے ہیں‘ پھر ہم تم کو بچہ بنا کر نکالتے ہیں‘ پھر تم اپنی پوری قوت (جوانی) کو پہنچتے ہو‘ اور تم میں سے کچھ (قبل ازپیری) مرجاتے ہیں اور کچھ ایسے ہوتے ہیں جو (بڑھاپے کی) بدترین عمر کو بھی پہنچا دیے جاتے ہیں کہ (جہاں پہنچ کر) سب کچھ جاننے کے بعد وہ کچھ نہیں جانتے۔‘‘

اس آیت میں بڑھاپے کی عمر کو ’’اَرْذَلِ الْعُمُرِ‘‘ سے تعبیر کیا گیا ہے ۔یہ انسان کی زندگی کا وہ حصہ ہے جب وہ پھر سے بچہ بن جاتا ہے اور جو کچھ اس نے پوری زندگی سیکھا پڑھا ہوتا ہے وہ سب ختم ہوجاتا ہے‘ حتیٰ کہ اس کی یادداشت بھی ختم ہوجاتی ہے۔

اب سورۃ المؤمنون کی ان آیات کی طرف آتے ہیں جو میں نے خطاب کے شروع میں تلاوت کی تھیں۔ ان میں پہلی آیت ہے: {وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِیْنٍ ﴿۱۲﴾} ’’ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے گارے کے کشید کردہ جوہر سے ‘‘۔ سُلٰلَہ کہتے ہیں کسی چیز کو کھینچ لینا۔ تلوا رکو میان میں سے کھینچنے کے لیے بھی فعل سَلَّ یَسُلُّ استعمال ہوتا ہے۔ کسی چیز کا عرق نکالنے کا ایک نظام ہے کہ اس کو پانی میں ڈال کر‘ اس کے نیچے آگ جلا کر ‘اور ایک لمبے process سے گزار کر عرق کشید ہوتا ہے ۔یہاں فرمایا کہ ’’ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے گارے کے کشید کردہ جوہر سے ‘‘۔ {ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِیْ قَرَارٍ مَّكِیْنٍ ﴿۱۳﴾} ’’پھر اس کو ایک مضبوط (اور محفوظ) جگہ میں نطفہ بنا کر رکھا‘‘۔ رحم ِمادر کی دیوار بڑی مضبوط ہوتی ہے اور وہ نطفہ اس کے اندر مضبوطی سے جما ہوا (embeded) ہوتا ہے۔ {ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً} ’’پھر ہم نے نطفے کو علقہ کی شکل دی‘‘ ۔ وہ نطفہ جب بڑھتا ہے تو رحم مادر کی دیوار سے ابھر کر‘ bulge out کر کے لٹکنے لگتا ہے ‘اس لیے اس حالت کو ’’عَلَقَۃ‘‘ یعنی لٹکی ہوئی چیز سے تعبیر کیا گیا ہے۔ {فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً} ’’پھر اسی علقہ کو ہم گوشت کا ایک لوتھڑا بنا دیتے ہیں‘‘ {فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا} ’’پھر اسی لوتھڑے کے اندر ہڈیاں بنا دیتے ہیں‘‘ {فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ۤ} ’’پھر ہم ان ہڈیوں پر گوشت چڑھاتے ہیں‘‘ {ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ} ’’پھر ہم اسے اٹھاتے ہیں ایک اور ہی تخلیق پر‘‘۔ {فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ ﴿۱۴﴾} ’’پس بہت بابرکت ہے اللہ جو بہترین پیدا کرنے والا ہے۔‘‘

حدیث کی تشریح

اس آیت میں ’’خَلْقًا اٰخَرَ‘‘ کا ذکر آیا ہے ۔یہ خَلْقًا اٰخَرَ کیا ہے ؟اس کا جواب اربعین نووی کی زیر مطالعہ حدیث میں آیا ہے۔ حدیث کے راوی حضرت ابوعبدالرحمن

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہیں جو کبارِ صحابہ اور فقہائِ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں: حَدَّثَنَا رَسُوْلُ اللهِ ﷺ وَهُوَ الصَّادِقُ الْمَصْدُوْقُ ''ہمیں اللہ کے رسول ﷺ نے یہ بات بتائی اور (جان لو کہ جنہوں نے ہمیں بتایا) وہ صادق اور مصدوق ہیں''۔یعنی وہ سچے ہیں اور ان کی صداقت پر اللہ گواہ ہے۔

اس روایت کے شروع میں ''وَهُوَ الصَّادِقُ الْمَصْدُوْقُ'' کے الفاظ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کیوں کہے ؟حالانکہ اور بھی متعدد روایات حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہیں ،لیکن کسی اور روایت میں تمہیداً یہ الفاظ نہیں آتے ،تو پھر یہاں کیوں آئے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس روایت میں ایک ایسی بات سامنے آ رہی ہے جو اُس وقت تک انسان کی ذہنی سطح اور مادی معلومات کے اعتبار سے کچھ ناقابل فہم سی تھی۔ لہٰذا اس بات کو بیان کرنے سے پہلے خاص طور پر تاکید کے انداز میں کہا جا رہا ہے کہ یاد رکھو ،یہ کہنے والے محمدرسول اللہ ﷺ ہیں ،جو سچے ہیں اور اللہ نے ان کی صداقت کی تصدیق بھی کی ہے۔

حدیث کا متن ان الفاظ سے شروع ہو رہا ہے : ((اِنَّ اَحَدَكُمْ يُجْمَعُ خَلْقُهٗ فِيْ بَطْنِ اُمِّهٖ اَرْبَعِيْنَ يَوْمًا نُطْفَةً)) ''تم میں سے ہر شخص کی تخلیق ہوتی ہے اس کی ماں کے رحم میں چالیس دن تک نطفے کی شکل میں'' ((ثُمَّ يَكُوْنُ عَلَقَةً مِّثْلَ ذٰلِكَ)) ''پھر اتنا ہی عرصہ وہ علقہ کی شکل میں ہوتا ہے''((ثُمَّ يَكُوْنُ مُضْغَةً مِّثْلَ ذٰلِكَ)) ''پھر اتنا ہی عرصہ (یعنی چالیس دن) وہ ایک لوتھڑے کی شکل میں ہوتا ہے''۔ جب یہ چالیس+ چالیس+ چالیس= ایک سو بیس دن یعنی چار ماہ مکمل ہو جاتے ہیں : ((ثُمَّ يُرْسَلُ اِلَيْهِ الْمَلَكُ)) ''پھر اُس کی طرف ایک فرشتہ بھیجا جاتا ہے '' ((فَيَنْفُخُ فِيْهِ الرُّوْحَ)) ''پس وہ اس میں روح پھونک دیتا ہے۔''

حقیقتِ انسان

اب یہاں غور کیجیے کہ چودہ سو سال پہلے نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ نے یہ بات فرمائی اور اُس وقت اگر لوگوں نے ((فَيَنْفُخُ فِيْهِ الرُّوْحَ))سے مراد یہ لیا کہ فرشتہ اس بے جان گوشت کے لوتھڑے (مُضْغَة)میں جان ڈال دیتا ہے ،تو اُس دور کی علمی سطح

کے اعتبار سے یہ بات قابلِ فہم ہے۔ لیکن سائنس کی ترقی اور خوردبین کی ایجاد کے بعد ہماری آج کی علمی سطح اتنی ہے کہ ہم خوردبین کے ذریعے باریک سے باریک جرثومہ بھی دیکھ رہے ہیں -- انسان کے آغاز سے متعلق سورۃ القیامۃ میں آیا: {اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ﴿۳۷﴾} ''کیا (ابتدا میں) وہ منی کا ایک قطرہ نہ تھا جو (عورت کے رحم میں) ٹپکایا گیا؟ '' -- آج ہمیں معلوم ہے کہ منی کی بوند جو باپ کی طرف سے آ رہی ہے ،اس میں بے شمار جرثومے (spermetozoa)ہوتے ہیں اور یہ جرثومے مُردہ نہیں بلکہ زندہ وجود ہیں۔ مائیکروسکوپ کے نیچے وہ آپ کو بھرپور جوش و خروش کے ساتھ دوڑتے ہوئے نظر آئیں گے ۔اسی طرح ماں کا بیضہ (ovum) جو fallopian

tube سے ہو کر چلا آ رہا ہے وہ بھی مُردہ تو نہیں ہے بلکہ زندہ خلیہ (living cell) ہے۔اب مرد کے جرثومے اور عورت کے بیضہ کے ملاپ سے رحم ِمادر میں انسان کی تخلیق کا آغاز ہوتا ہے: {اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَۃٍ اَمْشَاجٍ ۚ} (الدھر:۲) ''ہم نے انسان کو مخلوط نطفہ سے پیدا کیا'' --- مرد کا نطفہ اور عورت کا بیضہ مل کر جفتہ (zygote) بن گیا اور یہ مردہ نہیں بلکہ زندہ ہے' اس لیے کہ زندگی تو آغاز سے چلی آ رہی ہے۔ پھر یہ جفتہ بڑھ رہا ہے' نشوونما پا رہا ہے اور یہ نشوونما پانا ہی زندگی کا ایک ثبوت ہے۔ لہٰذا ((فَیَنْفُخُ فِیْہِ الرُّوْحَ)) کا مطلب زندگی یا جان ڈالنا نہیں ہو سکتا' اس لیے کہ زندگی تو آغاز ہی سے موجود ہے۔ لہٰذا یہ ثابت ہو گیا کہ یہاں ''روح'' سے مراد ''جان'' نہیں کچھ اور ہے ۔ یہ ہے وہ حقیقت جو بد قسمتی سے آج بہت سے قرآن پڑھنے والوں اور دین کا مطالعہ کرنے والوں کی نگاہوں سے اوجھل ہے۔

سمجھنے کی بات یہ ہے کہ یہاں ''روح'' سے کیا مراد ہے اور پھر اس سے ''حقیقت ِانسان'' سمجھ میں آئے گی جسے میں نے ابتدا میں قرآن مجید کے فلسفے اور حکمت ِدین کے اعتبار سے ذروۃ السنام سے تعبیر کیا تھا --- اصل میں انسان ایک مرکب وجود ہے' اس میں ایک مکمل حیوان بھی ہے اور ایک فرشتہ یعنی ایک روحانی وجود بھی ہے۔یہ بات بہت خوبصورت انداز میں شیخ سعدیؒ نے کہی تھی:

آدمی زادہ طُرفہ معجون است از فرشتہ سرشتہ وز حیواں

یعنی انسان کچھ چیزوں سے مل کر بنا ہے' اس مرکب میں فرشتہ بھی پیوست ہے اور حیوان

بھی۔ انسان کے بارے میں یہ عظیم حقیقت ہے ،جس کو اگر نہ سمجھا جائے تو حکمت ِقرآنی کے جو غامض اور عمیق پہلو ہیں وہ سمجھ میں نہیں آ سکتے۔ انسان عقیدت اور اندھے یقین کی بنیاد پر ایسے مقامات سے گزر جائے گا' لیکن عقل (logic) کا تقاضا تو یہ ہے کہ وہاں رکا جائے اور غور و فکر کا حق ادا کیا جائے ۔

تخلیق ِکائنات کے مراحل

آج دنیا میں تخلیق ِکائنات (Creation of the Universe) کا جو تصوّر ہے اس میں یہ بات تقریباً متفق علیہ ہے کہ اس کائنات کی کوئی ابتدا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک' بابائے طبیعیات نیوٹن کے دور میں تخلیق کائنات کے حوالے سے یہ تصوّر تھا کہ یہ کائنات ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی ' مادہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا اور یہ کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد آئن سٹائن کے ذریعے دنیائے طبیعیات میں انقلاب عظیم آیا اور آج محققین کا اس پر تقریباً اجماع ہے کہ اس کائنات کا ایک آغاز (beginning) ہے اور انہوں نے اس کو Big Bang کا نام دیا ہے ۔ یعنی اربو سال پہلے ایک بہت بڑا دھماکہ ہوا اور پھر اس سے کائنات کا آغاز ہوا۔ اس کے ساتھ ساتھ اب یہ

بھی تسلیم کیا جاتا ہے کہ اس کائنات کا ایک اختتام (end) بھی ہے، جسے قرآن ''اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی'' سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی یہ کائنات ہمیشہ کے لیے نہیں ہے بلکہ ایک خاص معینہ مدّت تک رہے گی اور اس کے بعد اس کائنات کا خاتمہ ہو جائے گا۔

Big Bang کے نتیجے میں حرات کا وہ گولہ وجود میں آیا جو بہت چھوٹے چھوٹے ذرات پر مشتمل تھا، جن کا درجہ حرارت ناقابل تصوّر حد تک بلند تھا اور یہ ذرات ایک دوسرے سے دُور بھاگتے تھے ۔یہ اس مادی دنیا کی شروعات کا پہلا مرحلہ تھا۔ مرورِ زمانہ کے ساتھ ان ذرات کی حرارت یکمی آتی چلی گئی۔ پھر یہ ذرات تیزی سے حرکت کرتے ہوئے قریب آئے اور مختلف forms میں اکٹھے ہوئے تو کہکشائیں (galaxies) وجود میں آئیں- پھر یہ کہکشائیں ایک دوسرے سے دور بھاگتی رہیں۔ آج بھی یہ مانا جا رہا ہے کہ کائنات ابھی پھیل رہی ہے اور کہکشائوں کے درمیان فاصلہ بڑھ رہا ہے ۔ اس کی بڑی

بیاری مثال دی جاتی ہے کہ اگر آپ ایک غبارے کے اوپر کچھ نقطے(dots) لگا دیں، اور پھر اس غبارے کو آپ جتنا پھلائیں گے، ان نقطوں (dots) کے مابین فاصلہ بڑھتا چلا جائے گا۔ اسی طرح ان کہکشائوں کے درمیان فاصلے بڑھنے سے کائنات میں وسعت ہورہی ہے ۔نظریہ توسیع کائنات (Theory of the Expanding Universe) کے حوالے سے اقبال نے کہا ہے ؎

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دَما دَم صدائے کن فیکون !

قرآن مجید میں بھی اس کی طرف اشارہ موجود ہے : {یَزِیۡدُ فِی الۡخَلۡقِ مَا یَشَآءُ ؕ} (فاطر:۱)''وہ اپنی تخلیق میں وسعت کر دیتا ہے جس قدر چاہتا ہے۔''

کہکشائیں بننے کے بعد پھر وہ دور آیا کہ جب ان کے اندر ستارے اور سیارے بنے۔ ان ستاروں میں ایک ستارہ ہمارا سورج بھی تھا،جس کے اندر مزید ٹوٹ پھوٹ کے نتیجے میں اس کے سیارے وجود میں آئے۔ ان ہی سیاروں میں سے ایک سیارہ ہماری یہ زمین ہے۔ ابتدا میں یہ سورج کی طرح آگ کا کرہ تھا لیکن آہستہ آہستہ یہ ٹھنڈا ہوا اور ٹھنڈا ہونے سے یہ سکڑگیا۔ اس کی وجہ سے اس پر نشیب و فرازپیدا ہوئے ۔پھر اس میں سے جو بخارات نکلے انہوں نے زمین کے غلاف ''فضا'' (atmosphere)کی شکل اختیار کی۔ پھر اس فضا میں موجود گیسز ہائیڈروجن اور آکسیجن کے باہمی ملاپ (interaction) سے پانی وجود میں آیا اور یہ پانی ہزارہابرس تک زمین پر برستا رہا، جس سے سمندر وجود میں آئے۔ زمین ٹھنڈی ہونے سے اس پر خاک کی ایک تہہپیدا ہو گئی جسے ''قشرارض'' (Crust of the

Earth) کہا جاتا ہے۔ پھر اس خاک اور پانی کے امتزاج سے اس کرۂ ارضی پر حیات کا آغاز ہوا جو کروڑوں سال کے ارتقائی مراحل سے گزر کر اپنے آخری نتیجہ کو پہنچی' جو آج کے نظریے کے مطابق موجودہ انسان (Homo sapiens) ہیں۔

یہ مَیں نے آج کا نظریہ تخلیق آپ کے سامنے رکھ دیا ہے۔ اس میں پہلے حصوں کے بارے میں تو اب کوئی اختلاف نہیں ہے' البتہ نظریۂ ارتقاء(Theory of Evolution)

کے بارے میں اختلافات اب بھی ہیں۔ بہرحال یہ ایک نظریہ ہے۔ اگرچہ علم الحیات (Biology) کے میدان میں اس نظریہ ارتقاء کو من وعن قبول نہیں کیا گیا' لیکن اس کو ایک حقیقت کے اعتبار سے (as a matter of fact) تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ انسان کی سوچ' سوشل سائنسز اور ہر چیز میں ارتقاء کا تصوّر موجود ہے۔

آغازِ تخلیقِ کائنات سے پہلے ارواحِ انسانیہ کی تخلیق

آج کے اس نظریۂ تخلیق میں حقیقتِ انسان کے حوالے سے ایک اہم بات کا تذکرہ موجود نہیں ہے' وہ یہ کہ اس Big Bang یعنی مادی کائنات کی شروعات سے پہلے بھی ایک دور ہے جسے سائنس نہ دیکھ سکتی ہے' نہ جان سکتی ہے' نہ اس تک اس کی پہنچ ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کے ایک حرف ''کُنْ'' سے ایک بہت بڑا دھماکہ (Big Bang) ہوا جس سے اس مادی کائنات کا آغاز ہوا' اسی طرح اس سے بہت پہلے اللہ تعالیٰ کے اوّلین حرفِ کُنْ سے ایک بہت لطیف نور پیدا ہوا۔ اس کو لطیف نور کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس مرحلہ پر اس میں نہ حرارت تھی اور نہ حرکت۔ پھر اس لطیف نور سے انسانی ارواح اور فرشتے پیدا کیے گئے۔ (واضح رہے کہ یہ اس عظیم دھماکے سے پہلے (Pre Big Bang) کا معاملہ ہے۔) ارواحِ انسانیہ اور فرشتے مادہ نہیں ہیں اور ان کا تعلق اس مادی کائنات (material universe) سے نہیں ہے ---- اُس وقت انسانی وجود موجود نہیں تھے' صرف ارواح تھیں۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر اس دنیا میں قیامت تک آنے والے آخری انسان تک کی روح موجود تھی اور اُس وقت اللہ نے ان سے ''عہدالست'' لیا تھا: {اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى ۛ شَهِدْنَا ۛ}(الاعراف:۱۷۲)''کیا میں تمہارا ربّ نہیں ہوں؟ انہوں نے کہا: کیوں نہیں' ہم اس پر گواہ ہیں۔''

عہد لینے کا یہ واقعہ عالمِ ارواح میں وقوع پذیر ہوا تھا جبکہ انسانی جسم ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ اب جو آدمی اس بات کو نہیں مانتا وہ کیسے سمجھے گا کہ کس سے اور کس وقت یہ عہد لیا گیا تھا؟ جدید دور کے ایک مفسر نے اپنی تفسیر میں لکھا تھا کہ ''یہ عہد انسان کی تخلیق سے قبل عالمِ غیب میں لیا گیا تھا''۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ آپ کا یہ جملہ تو مہمل ہے' اس

لیے کہ جو شے پیدا ہی نہیں ہوئی اس سے کیسے عہد لے لیا گیا؟ عہد اور معاہدہ ہوتا ہی ان کے درمیان ہے جو موجود ہوں اور پھر اس میں یہ الفاظ آتے ہیں کہ میں بقائمی ہوش و حواس (full consciousness کے ساتھ) اقرار کرتا ہوں، عہد کرتا ہوں، معاہدہ کرتا ہوں۔ میرے توجّہ دلانے پر انہوں نے تسلیم کیا کہ آپ کا موقف ٹھیک ہے کہ یہ عہد، اجسادِ انسانیہ کی تخلیق سے قبل ارواحِ انسانیہ سے عالمِ ارواح میں لیا گیا تھا۔

یہاں وہ مشہور روایت بھی نوٹ کر لیجیے جو روحِ محمدی ﷺ کے بارے میں ہے۔ حدیث کے الفاظ ہیں: ((اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللہُ نُوْرِیْ))(۲) ''پہلی شے اللہ نے جو تخلیق کی وہ میرا نور تھا''۔ بریلوی مکتبہ فکر کے علماء کے ہاں تو یہ روایت قابلِ اعتماد سمجھی جاتی ہے، لیکن اہلِ حدیث مکتبہ فکر، جو روایت اور سند پر زیادہ زور دینے والے ہیں، وہ اس حدیث کو تسلیم نہیں کرتے

عالمِ ارواح میں وقت کا کوئی تصوّر نہیں

عالمِ ارواح میں، جبکہ ابھی مادّی دنیا (material world) کی شروعات نہیں ہوئی تھیں، جاری وقت (serial time) کا کوئی تصوّر نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ عالمِ ارواح میں جو کچھ ہوتا ہے اس میں وقت نہیں لگتا۔ صرف ایک حرف ''کُنْ'' سے تمام ارواحِ انسانیہ وجود میں آ گئیں۔ البتہ عالمِ خلق میں آ کر تخلیق کے مراحل میں وقت لگتا ہے، جیسے آسمان اور زمین کے متعلق آتا ہے کہ یہ چھ دنوں میں پیدا کیے گئے، اور وہ دن ہمارے چوبیس گھنٹوں والے دن نہیں ہیں، بلکہ چھ ادوار ہیں۔ اسی طرح انسان کے نطفے سے لے کر ایک بچے کے مکمل ہونے تک نو مہینے لگتے ہیں۔ الغرض عالمِ خلق میں تو وقت لگتا ہے لیکن عالمِ ارواح میں وقت کا کوئی تصوّر نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جبریل کو عرشِ معلی سے یہاں آنے میں کوئی وقت نہیں لگتا، اس لیے کہ فرشتے اس دور کی تخلیق ہیں جبکہ ٹائم ابھی پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ time and space کا تصوّر تو بگ بینگ کے بعد کا ہے۔ اسی طرح حرکت کا تعلق بھی وقت کے تصوّر کے ساتھ ہے۔ لہٰذا یہ ارواحِ انسانیہ اس دور میں پیدا کی گئیں جبکہ ابھی مادی کائنات

(۲) شرح الموافق للسیوطی: ۲۱

کی ابتدا نہیں ہوئی تھی اور پھر ان کو ایک ''کولڈ سٹوریج'' میں رکھ دیا گیا۔ اس کے بعد تنزلات اور ارتقاء کا لمبا سفر شروع ہوا۔

''تنزلات'' اور ''ارتقاء'' کی اصطلاحات فلسفہ میں ایک دوسرے کے متضاد سمجھی جاتی ہیں۔ قدیم فلسفیوں نے تخلیق

کائنات کے بارے میں منطق کے زور پر اپنے تصوّرات پیش کیے اور عقولِ عشرہ ،نہ افلاک ،تنزلاتِ ستہ اور تنزلاتِ خمسہ تجویز کیے۔ ان تصوّرات کے مطابق سب سے پہلے وجود باری تعالیٰ سے عقلِ اوّل وجود میں آئی۔ عقل اول سے پھر فلکِ اوّل اور پھر فلک ِثانی وغیرہ --- لیکن ان تصوّرات کی کوئی دلیل نہ تو قرآن یا حدیث میں ہے اور نہ ہی سائنس ان کی تائید کرتی ہے۔

انسان کا مادۂ تخلیق ''مٹّی'' اور جنوں کا ''آگ''

کائنات کی تخلیق کے آغاز کے بارے میں میری سوچ مطالعہ قرآن حکیم اور سائنس کی روشنی میں بنی ہے اور آپ کو اس پورے تصوّر اور سائنس کے درمیان مکمل ہم آہنگی نظر آئے گی ۔سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کے کلمہ کُنْ سے نور کی تخلیق ہوئی ،جبکہ اس نور میں ابھی نہ حرارت تھی اور نہ حرکت ،اور پھر اس نور سے ارواحِ انسانیہ اور ملائکہ کی تخلیق ہوئی۔ اس کے بعد Big Bang کے نتیجے میں شدید ترین حرارت رکھنے والے ذرات وجود میں آئے ۔اس دَور میں جِنّات پیدا کیے گئے۔ قرآن مجید جِنّات کی تخلیق کے حوالے سے کہتا ہے :{خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ صَلۡصَالٍ کَالۡفَخَّارِ ﴿۱۴﴾ وَ خَلَقَ الۡجَآنَّ مِنۡ مَّارِجٍ مِّنۡ نَّارٍ ﴿۱۵﴾ } (الرحمٰن)''اسی نے انسان کو ٹھیکرے کی طرح کھنکھناتی مٹّی سے بنایا اور جنات کو آگ کے شعلے سے پیدا کیا''۔ سورۃ الحجر میں فرمایا:{وَ لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ مِنۡ صَلۡصَالٍ مِّنۡ حَمَاٍ مَّسۡنُوۡنٍ ﴿۲۶﴾ وَ الۡجَآنَّ خَلَقۡنٰہُ مِنۡ قَبۡلُ مِنۡ نَّارِ السَّمُوۡمِ ﴿۲۷﴾ }''اور ہم نے انسان کو سَنے ہوئے گارے کی کھنکھناتی مٹّی سے پیدا کیا۔ اور اس سے پہلے جِنّات کو بے دھوئیں کی آگ سے پیدا کیا''۔بادِ سموم اس ہوا کو کہتے ہیں جس میں آگ جیسی تپش ہو۔ سخت لو خاص طور پر صحرا کی لو سے آپ اس کا تصوّر کر سکتے ہیں ۔اس حرارت سے جنات پیدا کیے گئے۔ یہ جِنّات اس زمین کی پیداوار نہیں ہیں ،مٹّی کی پیداوار

نہیں ہیں ،بلکہ یہ ایک لطیف تر شے سے بنے ہیں ،جبکہ ہم انسان تو مٹّی سے بنے ہیں ،چاہے ارتقاء (evolution) کے لمبے process کے ذریعے بنے ہوں یا ہماری بلاواسطہ تخلیق (direct creation) ہوئی ہو ،لیکن ہیں تو مٹّی سے۔ اس بارے میںتو قرآن اور سائنس دونوں متفق ہیں کہ انسان کی تخلیق مٹّی سے ہوئی ہے۔سائنس بھی کہتی ہے کہ انسان کی تخلیق مٹّی) (crust of the earth سے ہوئی ہے اور قرآن بھی کہتا ہے :{ہُوَ الَّذِیۡ خَلَقَکُمۡ مِّنۡ تُرَابٍ } (المؤمن:٦٧) ''(اللہ ہی وہ ذات ہے) جس نے تم کو مٹّی سے پیدا کیا ''۔سورۂ صٰ میں فرمایا: {اِذۡ قَالَ رَبُّکَ لِلۡمَلٰٓئِکَۃِ اِنِّیۡ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنۡ طِیۡنٍ ﴿۷۱﴾ }''جب کہا تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہ میں ایک انسان پیدا کرنے والا ہوں مٹّی سے''۔ سورۃ الانبیاء میں ہر ذی حیات کے منبع حیات کے بارے میں فرمایا گیا: {وَ جَعَلۡنَا مِنَ الۡمَآءِ کُلَّ شَیۡءٍ حَیٍّ } (آیت۳۰) ''اور ہم نے بنایا ہر زندہ چیز کو پانی سے''--- چنانچہ ہر شے میں حیات کا سرچشمہ اور منبع پانی ہے اور حیواناتِ ارضی ،جن میں انسان بھی شامل ہے ،کا مادۂ تخلیق مٹّی ہے۔ سائنس کا بھی یہی نکتہ نظر ہے کہ زمین پر

سمندروں کے وجود میں آنے کے بعد سمندر کے کناروں پر' دلدلی جگہوں پر یہ ہوتا تھا کہ کبھی پانی پیچھے ہٹ جاتا اور کبھی آگے آ جاتا۔ یہ تعامل کافی عرصہ چلتا رہا اوراس کے نتیجے میں وہاں اولاً غیر نامیاتی مرکبات (inorganic compunds)اور اس کے بعد نامیاتی مرکبات (organic compunds) وجود میں آئے۔ اور بالآخر اسی کے اندر حیات کا جرثومہ (cell)''ایبا''کی صورت میں پیدا ہوا۔ اس کے بعد حیات کا مرحلہ وار ارتقاء ہوا اور اس کے بلند ترین مرحلے پر انسان کی تخلیق ہوئی۔میں اِس وقت اس نظریے کی نہ تو تصدیق کر رہا ہوں اور نہ تردید' بس آپ کو اتنا بتا رہا ہوں کہ قرآن اور سائنس دونوں اس پر متفق ہیں کہ انسان کی تخلیق مٹّی اور پانی سے ہوئی ہے۔ البتہ سائنس اس حقیقت سے ناآشنا ہے کہ جسدِ آدمؑ کی تخلیق کے بعدخالقِ کائنات نے اس وجود میں اپنی روح میں سے پھونکا۔

اس کے بعدیہی سلسلہ ہر انسان کے تخلیقی مراحل میں دہرایا جاتا ہے ۔البتہ یہاں ایک خلیہ سے رحمِ مادر میں بچہ نو ماہ میں پروان چڑھتا ہے 'لیکن ہو سکتا ہے کہ ابتدا میں ایک

جرثومے سے انسان بننے تک کا معاملہ نو ملین سال میں ہوا ہو --- اس جرثومہ کے ارتقاء کے مراحل وہی ہیں جو ماقبل بیان ہو ئے 'لیکن اصل یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ آغاز سے ہی اس میں حیات ہے 'اس لیے کہ وہ ہر مرحلہ میں زندہ ہے۔ باپ کی طرف سے آنے والا نطفہ بھی زندہ ہے' ماں کی طرف سے آنے والا بیضہ بھی زندہ ہے' عَلَقہ بھی زندہ ہے' مُضغہ بھی زندہ ہے۔ پھر مرد کے نطفے اور ماں کے بیضہ کے امتزاج سے وجود میں آنے والا جفتہ (zygote)' جسے قرآن نے ''نطفۃ امشاج'' سے تعبیر کیا ہے' وہ بھی زندہ ہے۔ پھر جب ۱۲۰ دن ہو جاتے ہیں تو اب ایک فرشتہ بھیجا جاتا ہے'جو عالمِ ارواح سے اس انسان کی روح (جو Big Bang سے بھی کہیں پہلے وجود میں آچکی تھی) لا کر اس کی والدہ کے رحم میں اس کا جو ہیولا وجود میں آیا ہے' اس کے اندر ڈال دیتا ہے۔ اس کے بعد یہ وجود انسان کی شکل اختیار کرتا ہے۔یہ ہے ''حقیقت انسان''۔

دو موتیں اور دو زندگیاں 'کیسے؟

اس حوالے سے میں ایک عجیب بات آپ کے سامنے بیان کرنے لگا ہوں 'آپ میں سے اکثر لوگوں کے لیے شاید یہ نئی بات ہو۔ قرآن مجید میں سورۃ المؤمن میں اہلِ جہنم کی ایک فریاد نقل کی گئی ہے کہ جہنمی لوگ کہیں گے :

{رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثۡنَتَيۡنِ وَ اَحۡيَيۡتَنَا اثۡنَتَيۡنِ فَاعۡتَرَفۡنَا بِذُنُوۡبِنَا فَهَلۡ اِلٰى خُرُوۡجٍ مِّنۡ سَبِيۡلٍ ﴿ ۱۱ ﴾}

''اے ہمارے پروردگار! تو نے ہمیں دو مرتبہ مارا اور دو مرتبہ زندہ کیا 'پس اب ہم نے اپنے گناہوں کا اعتراف کرلیاتو اب یہاں سے نکلنے کا بھی کوئی راستہ ہے؟''

اب یہ دو مرتبہ مارنا اور دو مرتبہ زندہ کرنا کیا ہے 'اس کو سمجھ لیجیے۔ سب سے پہلے عالمِ ارواح میں

ہماری تخلیق ہوئی اور پھر ہم سلا دیے گئے ---موت اور نیند ایک ہی شے ہے اور یہ دونوں آپس میں بہنیں ہیں' اسی لیے نیند سے بیداری کے وقت کی جو دعا نبی اکرم ﷺ سے منقول ہے اس کے الفاظ یوں ہیں: اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَحْیَانِیْ بَعْدَ مَا اَمَاتَنِیْ وَاِلَیْہِ النُّشُوْرُ ''تمام شکر اور حمد وثنا اس اللہ کے لیے ہے جس نے ہمیں مرنے کے بعد زندہ

کیا اور اسی کی طرف لوٹ جانا ہے'' ---- اس کے بعد ہماری اس دنیا میں آمد ہوئی اور ہم اس نیند سے بیدار ہو گئے۔ اس کے بعد پھر ہماری روح قبض کر لی جائے گی۔ اس حساب سے ہمارا دو مرتبہ مرنا اور دو مرتبہ زندہ ہونا ہے۔

ہمارا سب سے بڑا المیہ

میرے نزدیک اس ضمن میں سب سے بڑا المیہ (the biggest tragedy) یہ ہے کہ ہمارے ذہنوں پر ڈارون کے ارتقاء کا فلسفہ چھا گیا ہے اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج ہم اپنے آپ کو صرف ایک حیوان سمجھتے ہیں اور اس سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں۔ زیادہ سے زیادہ ہم اپنے آپ کو نسبتاً زیادہ ارتقاء یافتہ حیوان سمجھتے ہیں۔ لہٰذا جتنا فرق گدھے اور گھوڑے میں ہے بس اتنا ہی فرق گوریلا اور انسان میں سمجھا جاتا ہے کہ نوعیت کا فرق نہیں ہے' بس کمیت کا فرق ہے۔ اپنے آپ کو حیوان سمجھنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم اپنی اس عظمت سے مستعفی ہو چکے ہیں جس کی بنا پر انسان مسجودِ ملائک اور خلیفۃ اللہ قرار پایا تھا۔ پھر اس سب کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ہم اپنی زندگیوں میں سارا سبق ' ساری رہنمائی حیوانوں کی زندگی سے حاصل کر رہے ہیں۔ اس حوالے سے یورپ میں باقاعدہ لٹریچر فروغ دیا جا رہا ہے کہ حیوانوں میں چونکہ ماں' بیٹی' بہن' بیوی کا کوئی فرق نہیں ہوتا ہے اس لیے انسانوں میں بھی محرمات کا کوئی تصوّر نہیں ہے' یہ تو خواہ مخواہ ہم انسانوں نے ایسے قانون بنا لیے ہیں اور ایسی پابندیاں اپنے اوپر عائد کر لی ہیں۔ اس سب کی وجہ وہی ہے کہ ہم نے اپنی عظمت کو بھلا دیا ہے اور اب ہمیں زندگی کا سارا سبق حیوانوں سے مل رہا ہے۔

انسان کے لیے اس حقیقت کو سمجھ لینا ضروری ہے کہ میرا مادی وجود تو میرا حقیر سا پہلو ہے' جبکہ میری اصل حقیقت وہ روح ربانی ہے جو میرے اندر پھونکی گئی ہے۔ وہ روح ربّ العالمین کی طرف سے آئی ہے اور وہیں لوٹ جائے گی: انا للہ وانا الیہ راجعون ''بے شک ہم اللہ کے ہیں اور پھر اسی کی طرف لوٹ جائیں گے''۔ جبکہ ہمارا یہ مادی وجود مٹّی سے بنا ہے اور پھر مٹّی ہی میں چلا جائے گا۔ عربی کا مقولہ ہے : کُلُّ شَیْءٍ یَرْجِعُ اِلٰی اَصْلِہٖ ''ہر چیز اپنی اصل کی طرف لوٹ جاتی ہے''۔ روح وہاں سے آئی ہے وہیں جائے گی' جسد

یہاں سے آیا ہے' یہیں رہ جائے گا۔ یہ ہے انسان کی حقیقت !

نظریۂ ارتقاء کا موجد ڈارون نہیں ہے

اس حوالے سے آپ ایک اور بات بھی نوٹ کر لیں کہ نظریہ ارتقاء اصل میں چارلس ڈارون (۱۸۰۹ء تا ۱۸۸۲ء) کا نظریہ نہیں ہے ۔ ارتقاء کو ڈارون کا نظریہ کہنا اور ڈارون کو اس کا موجد سمجھنا ایک بڑی غلطی ہے ۔ جن لوگوں کو ان موضوعات سے دلچسپی ہو وہ اس موضوع پر میرے دو کتابچوں کا ضرور مطالعہ کریں: (i)زندگی‘ موت اور انسان: آئینہ قرآنی میں(ii) ایجاد و ابداع عالم سے عالمی نظامِ خلافت تک‘تنزلات و ارتقاء کے مراحل -- حقیقت یہ ہے کہ حیاتِ ارضی میں ارتقاء کا تصوّر قدیم یونانی حکماء کے ہاں بھی موجود تھا اور اس کا نہایت واضح نقشہ صدیوں پہلے مسلمان حکماء اور علماء بھی پیش کر چکے ہیں۔ چنانچہ فلسفہ ارتقاء ڈارون سے لگ بھگ چھ سو برس قبل مولانا روم کی شہرۂ آفاق اور زندۂ جاوید ’’مثنوی‘‘ میں واضح طور پر دو مقامات پر موجود ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے بڑے حکماء میں سے ابن مسکویہ نے سب سے پہلے فلسفہ ارتقاء پیش کیا۔ ڈارون نے تو ارتقاء کی صرف توجیہہ کی ہے اور اس کا جو فلسفہ ہے وہ غلط ہے‘ وہ تو ثابت ہی نہیں ہو سکا۔ اس کا خاص میدان علم الحیات (Biology) ہے جس میں اس نے بہت محنت کی ہے‘ لیکن اس میں اس کا نظریہ مانا نہیں جاتا--میں حیوانِ انسان کی تخلیق کی حد تک نظریہ ارتقاء کا قائل ہوں ۔ میرے نزدیک اس کی توجیہہ یہ ہے کہ ہر نئی نوع (species) کے لیے اللہ کا ایک نیا حرفِ کُنْ آتا ہے: {اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿ ۸۲ ﴾}(یٰسٓ)’’اس کے امر (کی شان) تو بس یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ فرما لیتا ہے تو (بس یہ) کہتا ہے : ’ہوجا‘ تو وہ ہوجاتی ہے۔‘‘

روحِ ربانی‘ عظمتِ انسانی کا سبب

آج کے ہمارے اس خطاب کا حاصل یہ ہے کہ انسان ایک مرکب وجود کا حامل ہے‘ ایک اس کا مادی وجود ہے اور ایک اس کا روحانی وجود ہے۔ انسان اصل میں اس روحانی وجود کا نام ہے جس کے سامنے فرشتے جھکائے گئے ‘ورنہ مادۂ تخلیق کے اعتبار سے تو جِنّات ہم سے بہت اونچے ہیں کہ وہ آگ سے پیدا کیے گئے ہیں ۔ ان کا وجود بہت لطیف ہے کہ وہ

ہمیں نظر نہیں آتے اور مختلف شکلیں اختیار کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہ نظامِ شمسی میں بہت دور تک چلے جاتے ہیں‘ جبکہ ہم تو بڑے بڑے راکٹ بنا کر بھی بڑی مشکل سے چاند تک پہنچنے کا دعویٰ کر سکے ہیں‘ معلوم نہیں پہنچے بھی ہیں یا نہیں ! اور وہ تو آسمانوں تک کی خبر لے آتے ہیں‘ اس لیے کہ وہ اس دور میں پیدا ہوئے ہیں جبکہ ابھی کہکشائیں وجود میں آ رہی تھیں۔ چنانچہ خِلقت کے اعتبار سے جن انسان سے بلند ہیں اور انسان اس اعتبار سے بہت پست ہے۔ یہی فرق تھا جس کی بنا پر عزازیل نامی جِن ‘ جو بعد میں ابلیس اور شیطانِ لعین قرار پایا‘ نے آدم کو سجدہ نہ کرنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہا تھا: {قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۭ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ﴿ ۷۶ ﴾}(صٓ)’’میں اس (آدم) سے بہتر ہوں‘ مجھے تو نے پیدا کیا آگ سے اور اسے پیدا کیا مٹّی سے۔‘‘مٹّی پستی کی شے ہے ‘جیسے اقبال نے

جواب ِشکوہ میں کہا ہے ع ''شوخ و گستاخ یہ پستی کے مکیں کیسے ہیں!'' ابلیس اس روحِ ربانی کو نہیں سمجھتا تھا جو اس آدم کی عظمت کی دلیل ہے اور جس کے عزّ و شرف کے اظہار کے لیے اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی ذات کی جانب منسوب کیا ہے۔ قرآن مجید میں اس کا تذکرہ دوجگہ آیا ہے:{فَاِذَا سَوَّیۡتُہٗ وَ نَفَخۡتُ فِیۡہِ مِنۡ رُّوۡحِیۡ فَقَعُوۡا لَہٗ سٰجِدِیۡنَ ﴿۷۲﴾} (الحجر:۲۹۔ ص:۷۲) ''پھر جب میں اس (انسان) کی تخلیق مکمل کر دوں اور اس میں اپنی روح میں سے پھونک دوں تب تم سب گر پڑنا اس کے سامنے سجدے میں۔''

یہ بڑے گہرے مضامین ہیں اور بدقسمتی سے آج ہم ان چیزوں سے بہت دور چلے گئے ہیں' اسی لیے سورۃ الحشر میں فرمایا گیا: {وَ لَا تَکُوۡنُوۡا کَالَّذِیۡنَ نَسُوا اللّٰہَ فَاَنۡسٰىہُمۡ اَنۡفُسَہُمۡ ؕ}(الحشر:۱۹) ''اور ان لوگوں کی مانند نہ ہوجانا جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا تو اللہ نے انہیں اپنے آپ سے غافل کر دیا۔''

آج ہم اپنی عظمت سے غافل ہیں۔ ہم تو مسجودِ ملائک ہیں' لیکن آج ہماری سوچ یہ ہے کہ ہم حیوانوں میں سے بس ایک حیوان ہیں اور اس کے سوا کچھ نہیں۔

اقول قولی هذا واستغفر اللّٰہَ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات

قرآن اور سُنّت کا باہمی تعلق

انجمن کے سالانہ اجلاس (منعقدہ ۱۹۸۴ء) کے موقع پر صدارتی خطاب

نحمدہٗ ونصلی علٰی رَسولِہ الکریم ... امّا بَعد:

اعوذ باللّٰہِ من الشَّیطٰن الرَّجیم ۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ {لَمۡ یَکُنِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ اَہۡلِ الۡکِتٰبِ وَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ مُنۡفَکِّیۡنَ حَتّٰی تَاۡتِیَہُمُ الۡبَیِّنَۃُ ﴿۱﴾ رَسُوۡلٌ مِّنَ اللّٰہِ یَتۡلُوۡا صُحُفًا مُّطَہَّرَۃً ﴿۲﴾ فِیۡہَا کُتُبٌ قَیِّمَۃٌ ؕ﴿۳﴾ } (البیّنۃ)

{وَ مَنۡ یُّشَاقِقِ الرَّسُوۡلَ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا تَبَیَّنَ لَہُ الۡہُدٰی وَ یَتَّبِعۡ غَیۡرَ سَبِیۡلِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ نُوَلِّہٖ مَا تَوَلّٰی وَ نُصۡلِہٖ جَہَنَّمَ ؕ وَ سَآءَتۡ مَصِیۡرًا ﴿۱۱۵﴾ ٪} (النّساء)

اس نشست میں ''قرآن اور سُنّت رسول ﷺ کا باہمی تعلق'' کے موضوع پر بہت مفصل اور طویل خطاب پیشِ نظر نہیں ہے۔ آپ حضرات اس مسلّمہ حقیقت کو جانتے اور مانتے ہیں کہ قرآن اور سُنّت رسول ﷺ لازم و ملزوم ہیں اور ان کا باہم چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اِس وقت مَیں سورۃ البیّنۃ کی ابتدائی چار آیات کی روشنی میں گفتگو کروں گا' جنہیں شاید ہی کبھی اس موضوع پر پیش کیا گیا ہو۔ میرے نزدیک یہی آیات اس موضوع کے ضمن میں اہم ترین ہیں۔ ارشاد ہوا:

{لَمۡ یَکُنِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ اَہۡلِ الۡکِتٰبِ وَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ مُنۡفَکِّیۡنَ حَتّٰی تَاۡتِیَہُمُ الۡبَیِّنَۃُ ۙ﴿۱﴾} (البیّنۃ)

''اہلِ کتاب اور مشرکین میں سے جن لوگوں نے کفر کی روش اختیار کی تھی وہ (اپنی اس گمراہی سے اور کفر سے) ہرگز باز آنے والے نہ تھے جب تک کہ ان کے پاس

بیّنہ نہ آجاتی۔''

یہاں ''بیّنہ'' کا لفظ بہت اہم ہے اور اسی سے اس سورۂ مبارکہ کا نام ماخوذ ہے۔ ''بیّن'' عربی زبان میں ایسی شے کو کہتے ہیں جو اظہر من الشمس ہو' اسے کسی خارجی و اضافی دلیل کی حاجت نہ ہو۔ جیسے کہا جاتا ہے ''آفتاب آمد دلیلِ آفتاب'' کہ سورج کے طلوع ہوجانے کے بعد وہ خود ہی اپنے وجود پر بہت بڑی دلیل ہے' اگر کسی منطقی استدلال سے سورج کے وجود کو ثابت کرنے کی کوشش کی جائے گی تو کچھ شکوک و شبہات تو پیدا کر دیے جائیں گے' لیکن یقین میں اضافہ نہیں کیا جا سکتا' اس لیے کہ سورج خود اپنے وجود پر دلیلِ قاطع ہے۔ چنانچہ وہ چیز جو بالکل روشن ہو' از خود واضح ہو اور اسے کسی خارجی سہارے اور استدلال کی ضرورت نہ ہو وہ ''بیّن'' ہے۔ ''بَیِّنَۃ'' اصل میں ہے کیا' اسے اگلی آیت میں define کیا گیا ہے:

{رَسُوۡلٌ مِّنَ اللّٰہِ یَتۡلُوۡا صُحُفًا مُّطَہَّرَۃً ۙ﴿۲﴾ فِیۡہَا کُتُبٌ قَیِّمَۃٌ ؕ﴿۳﴾}

''ایک رسول جو اللہ کی طرف سے آیا ہے' جو پڑھتا ہے ایسے پاکیزہ صحیفے کہ جن میں بالکل راست اور درست تحریریں (اللہ کی کتابیں) درج ہیں۔''

معلوم یہ ہوا کہ دونوں چیزیں مل کر ''بَیِّنَہ'' بنتی ہیں' ان میں سے کسی ایک کو ''بَیِّنَہ'' قرار نہیں دیا جا سکتا۔ رسول اور کتاب ایک حیاتیاتی وحدت (organic whole) ہیں اور یہ دونوں مل کر بَیِّنَہ بنتی ہیں۔ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کا سب سے بڑا معجزہ قرآن ہے۔ غور کیجیے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے اپنی دعوت کا آغاز کیا تو قرآن کہا تھا! اُس وقت قرآن معجزے کے طور پر ابھی موجود نہیں تھا۔ چنانچہ بَیِّنَہ ہونے کے اعتبار سے جو شے مقدّم ہے وہ رسول ﷺ کی ذات اور ان کی شخصیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب آنحضور ﷺ نے اپنی دعوت کا آغاز فرمایا تو

سب سے پہلے اپنی سیرت و کردار کو دلیل کے طور پر پیش کیا۔ کوہِ صفا پر کھڑے ہو کر آپ ﷺ نے جو پہلا خطاب کیا وہ یہ تھا کہ ''لوگو! تم نے مجھے کیسا پایا...؟'' گویا رسول اپنی ذات میں سب سے پہلے خود دلیل ہے۔ یعنی بیِّنہ ہونے میں رسول کی ذات مقدّم ہے کتاب پر۔ کتاب کو تو بطورِ معجزہ تحدّی کے

ساتھ، دلیل اور چیلنج کے انداز میں پہلی مرتبہ مکی دَور کے اواخر میں پیش کیا گیا۔ تین مکی سورتوں سورۂ بنی اسرائیل، سورۂ یونس اور سورۂ ہود میں یہ بات کہی گئی ہے کہ تم اس قرآن کا جواب نہیں لا سکتے۔ سب سے پہلے سورۂ بنی اسرائیل میں پوری کتاب کا ذکر کیا گیا:

{قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَ الْجِنُّ عَلٰٓی اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ ہٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِہٖ وَ لَوْ کَانَ بَعْضُہُمْ لِبَعْضٍ ظَہِیْرًا ﴿۸۸﴾}

''(اے نبی ﷺ! ان سے) کہہ دیجیے کہ اگر تمام انسان اور جِن جمع ہو جائیں (اور پوری قوتوں اور صلاحیتوں کو جمع کر کے کوشش کریں) کہ اس قرآن جیسی کتاب پیش کریں تو وہ ہرگز ایسی کتاب نہیں لا سکیں گے، چاہے وہ ایک دوسرے کی مدد کرنے والے ہوں۔''

سورۂ ہود میں دس سورتوں کا ذکر ہے:

{قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِہٖ مُفْتَرَیٰتٍ ...} (آیت ۱۳)

''کہہ دیجیے (اگر تمہارا خیال ہے کہ یہ قرآن منزل مِن اللہ نہیں ہے) تو اس جیسی دس سورتیں ہی گھڑ کر لے آئو...''

اس کے بعد سورۂ یونس میں بر سبیلِ تنزل ایک سورۃ کا چیلنج دیا گیا کہ:

{قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَۃٍ مِّثْلِہٖ وَ ادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۳۸﴾}

''(اے نبی ﷺ! ان سے) کہیے پس تم بھی ایک سورت بنا کر لے آئو ایسی ہی اور بلا لو جس کو بلا سکو اللہ کے سوا اگر تم سچّے ہو۔''

پھر اسی چیلنج کو مدنی سورت، سورۃ البقرۃ میں بایں الفاظ دہرایا گیا:

{وَ اِنْ کُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَۃٍ مِّنْ مِّثْلِہٖ ۪ وَ ادْعُوْا شُہَدَآءَکُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۲۳﴾}

''اور اگر تم لوگوں کو شک ہے اس کلام کے بارے میں جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا ہے (کہ یہ اللہ کا کلام نہیں ہے) تو اس جیسی ایک سورت تم بھی (موزوں کر کے) لے آئو اور اپنے تمام مددگاروں کو بلا لو اللہ کے سوا، اگر تم سچّے ہو۔''

چنانچہ اصل بات یہ ہے کہ قرآن مجید بطورِ معجزہ مکی دَور کے اواخر میں پیش ہوا ہے‘ جبکہ نصف سے زائد قرآن نازل ہو چکا تھا۔ یہ بات بالکل عقلی اور منطقی ہے‘ اس لیے کہ ابھی جب چند آیات ہی اُتری تھیں تو اُن کو اس طور سے چیلنج کے انداز میں پیش کیا جانا غیر منطقی بات ہوتی۔ گویا بَیِّنَۃ ہونے کے اعتبار سے رسول ﷺ کی ذات خود قرآن مجید پر مقدّم ہے۔

جہاں تک دین کے عملی پہلو کا تعلق ہے‘ اس ضمن میں بے شمار ایسی مثالیں مل جائیں گی کہ رسول اللہ ﷺ کے ذریعے کسی کام کا آغاز پہلے کرا دیا گیا اور اس کے بعد کہیں جا کر اس کے بارے میں آیات نازل ہوئیں۔ اس ضمن میں سب سے بڑی مثال وضو کی ہے۔ وضو کا نظام مکّہ کے اندر نافذ ہو چکا تھا۔ پنج گانہ نماز کا نظام ۱۱ نبوی میں آچکا تھا‘ جبکہ مطلقاً نماز تو اس سے پہلے آچکی تھی۔ کیا کوئی شخص یہ باور کر سکتا ہے کہ تب وضو کا معاملہ نہ ہوگا؟ لیکن قرآن مجید کے الفاظ میں وضو کا جو حکم نازل ہوا وہ سورۃ المائدۃ میں ہے‘ جو ۷ ہجری میں نازل ہوئی۔ تو کیا یہ پورا عرصہ یعنی سات برس مسلمانوں نے وضو کے بغیر نمازیں پڑھیں؟ اس سے معلوم ہوا کہ دین کے عملی پہلو کے اعتبار سے بھی رسولؐ مقدّم ہے قرآن پر۔

وحی کے مختلف ذرائع

اس حقیقت کو ایک اور بات سے بھی سمجھ لیجیے‘ اس لیے کہ اس دَور میں بعض چیزیں جدید عقلیت پسندی (rationalism) کے زیر اثر ذہنوں سے اوجھل ہو گئی ہیں۔ آج شاید یہ سمجھا جاتا ہے کہ وحی کی بس ایک ہی شکل ہے جسے وحی نبوت کہتے ہیں‘ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مختلف ذرائع (channels) بیان ہوئے ہیں۔ مثلاً حیوانات میں جو جبلی ہدایت (animal instinct) ہے اسے بھی وحی قرار دیا گیا ہے۔ ازروئے الفاظِ قرآنی :{وَاَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ...}(النحل:۶۸) ’’اور تیرے ربّ نے وحی کی شہد کی مکھی کی طرف‘‘۔ یہاں حیوانات کی جبلی ہدایت کے لیے وحی کا لفظ استعمال ہو رہا ہے۔ پھر بہت سے غیر نبی افراد کے لیے بھی یہ الفاظ آئے ہیں کہ اُن پر وحی کی گئی۔ حضرت مریم (سلامٌ علیہا) کے بارے میں ہمارا اجماع ہے کہ وہ نبی نہیں تھیں‘ لیکن ان پر وحی ہوئی۔ ان کے بارے میں تو پھر بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کا بہت اونچا مقام

ہے‘ خود قرآن کی رو سے ’’صِدِّیْقَۃ‘‘ ہیں‘ لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے لیے بھی وحی کا لفظ آیا ہے: {وَاَوْحَیْنَا اِلٰی اُمِّ مُوْسٰی...} (القصص:۷) ’’اور ہم نے وحی کی موسیٰ کی ماں کی طرف...‘‘ چنانچہ وحیٔ نبوت کا معاملہ تو بڑی چوٹی کی چیز ہے‘ اس سے کمتر درجے کی بہت سی چیزیں ایسی ہیں کہ جن پر لفظاً (literally) وحی کا اطلاق ہو جاتا ہے۔ وحیٔ نبوت کے سوا تمام channels آج بھی کھلے ہیں‘ جیسے الہام ہو سکتا ہے‘ کشف ہے جو اولیاء اللہ کو

ہوتا ہے' القاء ہے 'یعنی اللہ تعالیٰ کسی کے دل میں کوئی بات ڈال دیتا ہے' اسی طرح سے رؤیاء صالحہ (سچے خواب) ہیں' جن کے بارے میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((لَمْ یَبْقَ مِنَ النُّبُوَّةِ اِلَّا الْمُبَشِّرَاتُ)) قَالُوْا: وَمَا الْمُبَشِّرَاتُ؟ قَالَ: ((الرُّؤْیَا الصَّالِحَةُ)) (۱)

''بشارتوں کے سوا نبوت کی کوئی چیز باقی نہیں رہی''۔ صحابہؓ نے پوچھا: بشارتوں سے کیا مراد ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''سچا خواب۔''

صحیح مسلم میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں:

((اِنَّهٗ لَمْ یَبْقَ مِنْ مُبَشِّرَاتِ النُّبُوَّةِ اِلَّا الرُّؤْیَا الصَّالِحَةُ یَرَاهَا الْمُسْلِمُ اَوْ تُرٰی لَهٗ)) (۲)

''یقیناً بشراتِ نبوت میں سے کچھ باقی نہیں بچا سوائے سچّے خواب کے جو مسلمان دیکھتا ہے یا اُس کے لیے دیکھا جاتا ہے۔''

رسول اللہ ﷺ نے مزید فرمایا:

((اَلرُّؤْیَا الصَّالِحَةُ جُزْءٌ مِنْ سِتَّةٍ وَ اَرْبَعِیْنَ جُزْءًا مِنَ النُّبُوَّةِ)) (۳)

''سچّے خواب نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہیں۔''

کہیں آپؐ نے اس (سچّے خواب) کو نبوت کا ساٹھواں حصہ بتایا ہے' جیسے مسلم کی ایک

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب التعبیر' باب المبشرات۔

(۲) صحیح مسلم' کتاب الصلاۃ' باب النھی عن قراء ۃ القرآن فی الرکوع والسجود۔

(۳) صحیح البخاری' کتاب التعبیر' باب الرؤیا الصالحۃ جزء من ستۃ واربعین جزءً من النبوۃ۔ وصحیح مسلم' کتاب الرؤیا ۔

روایت میں الفاظ آئے ہیں:

((اَلرُّؤْیَا الصَّالِحَةُ جُزْءٌ مِنْ سَبْعِیْنَ جُزْءًا مِنَ النُّبُوَّةِ)) (۴)

''سچّے خواب نبوت کے ساٹھ حصوں میں سے ایک ہیں۔''

تو یہ سب چیزیں اب بھی جاری ہیں اور نبی ﷺ کے ساتھ بھی یہ تمام کی تمام چیزیں موجود تھیں۔ ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ نبی کا خواب بھی وحی ہے' نبی کا القاء بھی وحی ہے' نبی کا الہام بھی وحی ہے' نبی کو جو کچھ اللہ تعالیٰ دکھادیتا ہے وہ بھی وحی ہے' اور نبی کو اللہ تعالیٰ جو بصیرت عطا فرماتا ہے وہ بھی وحی ہے۔ اس لیے کہ نبی جو آسمانی ہدایت

وصول (receive) کرتا ہے اس کا کوئی ایک چینل نہیں ہے' بلکہ اس کے متعدد چینلز ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حالات و واقعات کے بارے میں کون نہیں جانتا کہ ایک خواب تھا جو انہوں نے بیٹے کو ذبح کرنے کے ضمن میں دیکھا تھا۔ قرآن حکیم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں:

{یٰبُنَیَّ اِنِّیۡۤ اَرٰی فِی الۡمَنَامِ اَنِّیۡۤ اَذۡبَحُکَ} (الصّٰفّٰت:۱۰۲)

''اے بیٹے! میں دیکھتا ہوں خواب میں کہ تجھ کو ذبح کرتا ہوں۔''

یہ کتنا سنگین معاملہ ہے کہ قتلِ ناحق بڑے گناہوں میں سب سے بڑا گناہ (اکبر الکبائر) ہے۔ اگر نبی کو اپنے خواب کے بارے میں ذرا سا بھی اشتباہ ہوتا تو کیا اتنی بڑی جرأت کی جاسکتی تھی جب تک کہ وحی باللفظ (verbal revelation) کی صورت میں واضح ہدایات نہ آجاتیں؟ اگر ذرا سا بھی اس میں کسی اشتباہ کا معاملہ ہوتا تو اس حکم پر عمل کرنا بہت غلط بات ہو جاتی۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ کو جو خواب دکھایا گیا کہ عمرہ کر رہے ہیں تو آپؐ عمرہ کرنے کے لیے چل پڑے۔ آپؐ نے اس سلسلے میں سفر کیا اور پھر صلح حدیبیہ ہوئی ۔ یہ ساری چیزیں بھی ایک خواب کی بنیاد پر ہیں۔ تو یہ تمام ذرائع ہیں جن سے نبی کو راہنمائی ملتی ہے۔ ان میں سے خاص وہ جو وحی باللفظ ہے وہ قرآن میں محفوظ (recorded) ہے۔ باقی

_____(۴) صحیح مسلم' کتاب الرؤیا۔

مختلف طریقوں سے جو رہنمائی اور علم آپؐ کو ملتا رہا ان سب کے بارے میں ایک نہایت جامع حدیث ہے ۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((اَلَا اِنِّیۡ اُوۡتِیۡتُ الۡکِتَابَ وَمِثۡلَہٗ مَعَہٗ))(۵) ''جان لو' مجھے قرآن دیا گیا ہے اور اس جیسی ہی ایک چیز اور بھی'' جو اس کے ہم وزن اور اس کے برابر ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو جو خاص بصیرت عطا فرمائی' آپؐ کو جو مشاہدات کرائے' آپؐ پر جو کچھ القاء فرمایا' جو الہام فرمایا' آپؐ کو خواب کے ذریعے جو ہدایات ملتی رہیں اور آپؐ کو جو بھی کشف ہوتا رہا' یہ تمام چیزیں نبی ﷺ کے لیے بھی قطعی ہیں جن میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں اور یہ بھی درحقیقت وحی کا حصہ ہیں۔ البتہ یہ وحی متلو نہیں ہے' یہ وحی باللفظ نہیں ہے۔

ہمارے ہاں وحی کے لیے دو اصطلاحیں مستعمل ہیں: وحیٔ متلو اور وحیٔ غیر متلو۔ وحیٔ متلو وہ ہے جس کی تلاوت کی جاتی ہے' یعنی قرآن۔ وحیٔ غیر متلو وہ ہے جس کی تلاوت نہیں ہوتی۔ دوسرے الفاظ میں انہیں وحیٔ جلی اور وحی ''خفی کہتے ہیں۔ وحیٔ جلی جو بالکل واضح ہے وہ قرآن ہے' اور دوسری وحیٔ خفی ہے' اس کو ہم

قرآن کے درجے میں نہیں رکھتے۔ البتہ وحی ہونے کے اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں' جیسا کہ شرکِ جلی اور شرکِ خفی کے بارے میں مَیں عرض کیا کرتا ہوں کہ شرک ہونے کے اعتبار سے ان میں کوئی فرق نہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ایک واضح ہے' سامنے دکھائی دینے والا شرک ہے کہ ایک شخص بُت کو سجدہ کررہا ہے جبکہ ایک ذرا اندر چھپا ہوا' ریاکاری والا شرک ہے کہ ایک انسان کسی کو خوش کرنے کے لیے نیک کام کر رہا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:((مَنْ صَلّٰی یُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَکَ' وَمَنْ صَامَ یُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَکَ' وَمَنْ تَصَدَّقَ یُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَکَ)) (مسند احمد) ''جس نے دکھاوے کے لیے نماز پڑھی وہ شرک کر چکا' جس نے دکھاوے کے لیے روزہ رکھا وہ شرک کر چکا' اور جس نے دکھاوے کے لیے صدقہ کیا وہ شرک کرچکا۔''تو شرکِ خفی اور شرکِ جلی میں شرک ہونے کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں' دونوں شرک ہیں۔ البتہ ایک ظاہر و باہر شرک ہے اور ایک چھپا ہوا شرک ہے۔ اسی طرح وحی ''خفی اور وحی ''جلی کا معاملہ ہے۔

(۵) سنن ابی داؤد' کتاب السنۃ' باب فی لزوم السنۃ۔

فتنہ انکارِ سُنّت کی بنیادیں

ہمارے ہاں انکارِ سُنّت کا فتنہ بڑا قدیم ہے۔ اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ میں جب بھی کوئی فتنہ اٹھتا ہے اس کی زد رسالت اور سُنّت پر پڑتی ہے۔آپ یہ جان کر حیران ہوں گے کہ مسیلمہ کذاب کا نعرہ یہ تھا : کَفَانَا ھِدَایَۃُ الْقُرْآنِ ''ہمیں صرف قرآن کی ہدایت ہی کافی ہے''۔ یہ اللہ اور اس کے رسول کے درمیان تفریق ہے' جس کا ذکر سورۃ النساء میں بایں الفاظ کیا گیا ہے: {یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّفَرِّقُوْا بَیْنَ اللّٰہِ وَرُسُلِہٖ} (آیت ۱۵۰) یعنی کچھ لوگوں کا وطیرہ یہ ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کرنا چاہتے ہیں۔

سورۃ النساء کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ منافقین پر جو چیزیں شاق گزرتی تھیں وہ تین تھیں:(۱) رسول اللہ ﷺ کی اطاعت' جو شخصی اطاعت بن جاتی ہے۔ قرآن تو ایک ادارہ (institution) ہے' جس میں اپنے جیسے گوشت پوست کے بنے ہوئے انسان کے سامنے سر جھکانا نہیں پڑتا جبکہ محمد ﷺ کا اللہ کا رسول ہونا ایک مخفی بات ہے' جو عالمِ غیب سے متعلق ایک شے ہے۔آپؐ نظر تو سب کو یہی آتے تھے کہ محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب ہیں۔ چنانچہ اپنے جیسے ایک انسان کے سامنے سرِ تسلیم خم کردینا کہ جو آپؐ حکم دیں گے وہ مانوں گا' یہی ان کے لیے سب سے زیادہ شاق گزرنے والی بات تھی۔ (۲)قتال فی سبیل اللہ' (۳) ہجرت یہ تین چیزیں تھیں جن کا

سورۃ النساء میں تفصیل سے ذکر ہوا ہے اور منافقین کے لیے سب سے کٹھن یہی مراحل تھے۔ بعد میں جب بھی فتنہ اٹھا' اسی بنیاد پر اُٹھا۔ خوارج کا بھی یہی نعرہ تھا: حَسْبُنَا کِتَابُ اللّٰہِ ''ہمارے لیے اللہ کی کتاب کافی ہے۔'' یعنی ہمیں صرف کتاب اللہ چاہیے اس کے سوا کچھ نہیں چاہیے' ہم تو صرف اسی کی پیروی کریں گے۔ یہ ہماری اُمّت کی تاریخ میں عظیم ترین فتنہ تھا۔ پھر اس کے بعد بھی ہماری تاریخ میں اسی بنیاد پر فتنے اٹھتے رہے ہیں۔

برعظیم پاک و ہند میں انکارِ سُنّت کا جو فتنہ اٹھا دراصل اس کی جڑیں مشرق اور مغرب کی دو تہذیبوں کا تصادم ہے۔ ایک ہماری اپنی پرانی تہذیب ہے' اس کی اپنی روایات ہیں' اس کے کچھ شعائر ہیں' اس کی کچھ باتیں ایسی ہیں جو متفق علیہ ہیں۔ جب انگریز

ہمارے ہاں آیا' اس نے ہمیں فتح کیا اور ہم پر حکمران ہوا تو وہ ایک نئی تہذیب لے کر آیا۔ چنانچہ دو تہذیبوں کا تصادم شروع ہوا اور ہمارے ہاں ابتدا ہی میں دو رائیں بن گئیں۔ ایک رائے کے سب سے بڑے قائل اور اس کو پیش کرنے والے سرسیدا حمد خان تھے۔ انہوں نے مسلمانوں سے خلوص و اخلاص کی بنا پر ان کی بہتری کے لیے یہ رائے سامنے رکھی کہ حالات کا تقاضا یہ ہے کہ ہم انگریزی پڑھیں' انگریزی علوم سیکھیں' انگریزی تہذیب اختیار کریں اور انگریزوں کے قریب ہو جائیں' بلکہ ان کے الفاظ یہاں تک نقل کیے گئے ہیں کہ ہمیں صرف چمڑی کی رنگت کے سوا (کیونکہ اس پر تو ہمارا قابو اور اختیار نہیں) ہر چیز میں انگریز ہو جانا چاہیے۔ اس کی وجہ کیا تھی؟ یہ کہ ان کے سامنے قومی مسابقت تھی کہ ہندو تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے اور اگر ہندو نے آگے بڑھ کر انگریز کے ساتھ اپنا معاملہ کر لیا تو مسلمان یہاں اچھوت بن کر رہ جائیں گے اور ان کا کوئی دنیاوی و سیاسی مستقبل نہ رہے گا۔ وہ چونکہ بنیادی طور پر قومی رہنما تھے اس لیے انہوں نے یہ تجزیہ پیش کیا۔ دوسری طرف علمائے کرام تھے جن کا اپنا ایک طرزِ عمل تھا اور وہ اس پر اَڑ گئے کہ ہم قَالَ اللّٰہُ اور قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ کے دامن سے وابستہ رہیں گے۔ ہم اپنے آپ کو اپنی روایات' اپنی تہذیب اور اپنے تمدن کے ساتھ باندھے رکھیں گے۔ دنیا بگڑتی ہے تو بگڑے' ہم کوئی خطرہ مول لینے کو تیار نہیں۔ انہیں ڈر تھا کہ مسلمان اس نئی تہذیب میں بہ نہ جائیں۔ یہاں سے وہ تصادم شروع ہوا۔

ایک غالب تہذیب تھی جو حکمرانوں کی تھی۔ حکمرانوں سے مرعوبیت ویسے ہی ہوتی ہے' لہٰذا لوگ اس نئی تہذیب کی طرف لپکے۔ پھر کچھ لوگوں نے دیکھا کہ اس سارے معاملے میں جو رکاوٹ بنتی ہے وہ ہے سُنّت رسولؐ اور حدیثِ رسولؐ۔ ان کا خیال تھا کہ قرآن مجید کی تو ہم کچھ نہ کچھ تأویل کر لیں گے' اس کے کچھ نہ کچھ معنی نئے سے نئے نکال لیں گے۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ کہا گیا کہ: {اضْرِبْ بِّعَصَاکَ الْبَحْرَ} (الشُّعراء:٦٣) ''مارو اپنا عصا سمندر پر۔'' اب ''ضَرَبَ'' کے مختلف معنی ہیں۔ اس کا معنی زمین میں چلنا پھرنا بھی ہوتا ہے اور مارنا بھی۔ اس معجزہ کے بارے میں جدید سائنسی

عقلیت پسندی کے دور میں ہم لوگوں سے یہ کیسے کہیں کہ ہم یہ مانتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا سمندر پر پڑا اور وہ پھٹ گیا؟ لہٰذا اس کی کوئی تأویل کی جائے' کوئی ایسا ترجمہ کیا جائے جو سائنس کے لیے قابلِ قبول ہو۔ اسی طرح جنات کے بارے میں ہم یہ کیسے کہہ دیں کہ ان کا بھی کوئی وجود ہے' وہ غیر مرئی (invisible) ہیں اور آگ سے بنے ہیں؟ ان کے نزدیک یہ بڑی مشکل بات تھی کہ وہ جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے سامنے یہ باتیں کہیں۔ لہٰذا ان کی ایسی تأویلات کی گئیں جو جدید مغرب زدہ اذہان کے لیے قابلِ قبول ہوں۔ حدیث کا معاملہ یہ تھا کہ اس سے ہماری تہذیبی روایات بنی تھیں اور اسی نے ہمیں زندگی کا نقشہ دیا تھا' لیکن اُس وقت یہ کہہ دیا گیا کہ اس کی زیادہ ضرورت نہیں' ہمیں تو صرف قرآن ہی کافی ہے۔

یہ فکر ہمارے ہاں رفتہ رفتہ پھیلتا چلا گیا۔ البتہ اُس وقت دو چیزیں ایسی تھیں جن کی بنا پر یہ فکر زیادہ نہیں پھیلا' صرف ہمارے ہاں ایک اونچا طبقہ تھا جس تک یہ محدود رہ گیا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ابھی مغربی تہذیب و تمدن سے ہمارا براہِ راست رابطہ بہت کم تھا۔ لوگوں کی مغرب میں آمد و رفت بہت کم تھی۔ دوسرے یہ کہ وہاں سے جو آئے ہوئے تھے وہ ہمارے حکمران تھے' جو غاصب تھے اور ہم ان کے محکوم تھے' لہٰذا فطری طور پر عوام کے دلوں میں ان کے خلاف نفرت موجود تھی۔ یہی وجہ تھی کہ کم ہی لوگ تھے جنہوں نے اس تہذیب کو اپنایا جبکہ عوام کی اکثریت اپنی تہذیب اور روایات پر قائم رہی۔

تہذیبوں کا یہ تصادم سب سے پہلے شدید ترین صورت میں ترکی میں سامنے آیا' اس لیے کہ وہ دراصل مشرق اور مغرب کے مابین پُل کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ خالدہ ادیب خانم کے زمانے سے جو مضامین لکھے گئے اور اتاترک نے جس طرح کا معاملہ کیا' یہ تہذیبِ مغرب کی بالادستی تھی۔ پھر بحیرۂ روم کے ساحل کے ساتھ واقع عرب ممالک شام' فلسطین' مصر اور مراکو اس کی زد میں آئے۔ اس کو یوں سمجھئے کہ بحیرۂ روم ایک جھیل کی مانند ہے۔ اس کے ایک طرف یورپ اور دوسری طرف یہ سارے مسلم ممالک ہیں۔ ان کی مغرب میں آمدو رفت چونکہ بہت تھی لہٰذا مغربی تہذیب کا اثر ان پر سب سے پہلے اور بہت زیادہ ہوا۔

ہمارے ہاں تو سات سمندر کا فاصلہ شمار ہوتا تھا' شاذ ہی لوگ وہاں جاتے تھے۔ زیادہ تر تو پڑھنے ہی جاتے تھے' اور جو وہاں سے واپس آتا تو اس کے بارے میں مشہور ہو جاتا کہ ''کرسٹان'' ہو گیا ہے۔ عام لوگوں کا اتنا زیادہ رابطہ نہیں تھا۔ چونکہ یہ باہر کے لوگ تھے جو آکر ہم پر حکمرانی کر رہے تھے' اس لیے ان کے ساتھ نفرت کا معاملہ بھی تھا۔

متذکرہ بالا دونوں عوامل (factors) تقسیم ہند کے قریب آکر اور آزادی کے بعد ختم ہو گئے' لہٰذا بند کھل گیا۔ اب ایک طرف تو لوگوں کی مغرب میں آمد و رفت بے پناہ ہے۔ ہماری نوجوان نسل کا ایک بڑا حصہ جو

وہاں جاتا ہے وہاں سے متأثر ہو کر آتا ہے۔ ان کے رنگ میں رنگ کر آتا ہے۔ دوسرے یہ کہ انگریز کے جانے کے بعد اس کی جگہ اب وہ دیسی انگریز حکمران ہیں جو سرسید کے قول کے مطابق صرف چمڑی کے دیسی ہیں' باقی اپنی تہذیب' اپنی تربیت ' اپنی شخصیت اور ذہنیت کے اعتبار سے بالکل یورپین ہیں۔ اب وہی ہماری ملٹری کے اعلیٰ عہدیداران ہیں' وہی ہماری سول بیوروکریسی کے سب سے اونچے ستون ہیں' لہٰذا یہاں مغربی تہذیب کی بالادستی کا معاملہ بہت تیزی کے ساتھ ہوا ہے۔ ہمارے ہاں اِس وقت جو مسئلے کھڑے ہو گئے ہیں ان کی بنیاد میں وہی تہذیبوں کا ٹکرائو ہے۔ دیت کا مسئلہ ہو' شہادت کا مسئلہ ہو یا ستر و حجاب کا مسئلہ ہو' ان کی بنیاد میں وہی نظریۂ مساواتِ مَرد و زن ہے جو یورپ سے آیا ہے۔ یہ وہی دو تہذیبوں کا ٹکرائو ہے جو آپ کو اب نظر آ رہا ہے۔ مَیں نے تو ایک خط بھی پڑھا تھا جو ''پاکستان ٹائمز'' میں شائع ہوا تھا' جس میں مکتوب نگار نے یہاں تک لکھ دیا کہ قرآن کو پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعتاً عورتوں کو ثانوی پوزیشن الاٹ کرتا ہے' لہٰذا ہمیں اجتہاد کا کوئی ایسا اصول اپنانا ہو گا جو قرآن سے بھی اوپر چلا جائے۔ آج اسلامی جمہوریہ پاکستان میں یہ بھی کہنے والے موجود ہیں۔ پھر ہمارے ایک بڑے عالم دین کا یہ بیان بھی اخبارات میں آ گیا کہ نصوص کے اندر بھی اجتہاد ہو سکتا ہے' حالانکہ وہ اہلِ حدیث مکتبِ فکر کے آدمی ہیں۔ یہ ساری چیزیں آپ گنتے جایئے۔ درحقیقت یہ وہی ''دو تہذیبی ٹکرائو اور تصادم'' ہے ۔ اس میں جو چیز بھی جہاں پر بھی رکاوٹ بنتی نظر آتی ہے' کہیں اس کے بارے میں یہ کہا جائے گا کہ فلاں چیز قرآن میں نہیں ہے' اور سُنّت کی

اہمیت ثانوی نظر آئے گی۔ کہیں اس سے بھی آگے چل کر یہ کہا جائے گا کہ کوئی حدیث معیار پر پوری نہیں اتر رہی۔

اسلامی قوانین کے مآخذ

اصولی بات یہ ہے کہ جہاں ہمارے قانون کا اوّلین منبع اور ماخذ (source) قرآن مجید ہے وہاں اس کا دوسرا ماخذ سُنّتِ رسولؐ ہے جو اپنے طور پر خود مختار (independent) ہے۔ تیسرے نمبر پر خود رسول اللہ ﷺ کے قول کے مطابق' سُنّتِ خلفاء راشدین مہدیین ہے۔

ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ہماری تاریخ کُل کی کُل تاریک نہیں ہے۔ یہ بہت روشن رہی ہے۔ پچھلی تین چار صدیاں اگر تاریکی میں گزری ہیں تو اس کے معنی یہ نہیں کہ ہم شرم اور خجالت سے اپنے سر جھکا لیں کہ شاید ہماری پوری تاریخ بالکل تاریک ہے۔ قرآن اور سُنّت رسولؐ نے جو روشنی دی تھی' خلافتِ راشدہ کا ایک عظیم نظام اُس پر چلا۔ اس کے بعد دورِ اُموی اور دورِ بنوعباس میں یہ تو ضرور ہوا کہ حکومت کی اعلیٰ ترین سطح پر دستوری نظام بدل گیا' لیکن تہذیبی روایات کا ارتقا اور ان کا تسلسل جاری رہا۔ ان اَدوار میں ہمارے جو ائمۂ دین اور محدثین گزرے ہیں ان میں سے ایک ایک چاند ستاروں کی مانند ہے۔ ہماری تاریخ کے ان افراد کی خدمات' ان کا علمی مقام و

مرتبہ اور اس پر مستزاد اِن کا تدین، تقویٰ، احتیاط اور للّٰہیت کا جو معیار ہمیں ملتا ہے، ہماری تاریخ ان چیزوں سے بنی ہے۔

سُنّت ِخلفائِ راشدین کے بعد اہل ِسُنّت کے چاروں ائمہ کا اگر کسی بات پر اجماع ہوگیا، وہ کسی چیز پر متفق ہو گئے تو یہ خود اپنی جگہ پر ایک دلیل ہے۔ درحقیقت دلیل یہ نہیں ہے کہ یہ ائمہ ٔ اربعہ کا موقف ہے، بلکہ یہ درحقیقت اُس تعامل کا مظہر ہے جو پیچھے سے چلا آرہا تھا۔ دورِ نبوت میں جو کچھ روایات بنی تھیں یہ درحقیقت اسی کا مظہر ہے۔ کیا ہم امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام مالک اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ کے بارے میں یہ گمان کر سکتے ہیں کہ وہ اپنے پاس سے کوئی چیز گھڑ کر لائے ہوں گے؟ کیا ہم ان کے بارے میں ایسا سوچ سکتے ہیں؟ معلوم یہ ہوا کہ اگر ائمہ ٔ اربعہ کا کسی بات پر اجماع ہے تو وہ بے دلیل نہیں ہے، خواہ اس کے بارے میں کوئی نص پیش نہ کی جا سکے۔

ایک بات بڑی سادہ سی ہے۔ بسا اوقات ایک سچی حقیقت بھی عدالت میں جا کر ثابت نہیں ہوتی۔ اس کے یہ معنی تو نہیں کہ وہ سچی حقیقت جھوٹی ہو گئی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث کا مفہوم ہے کہ: لوگو! کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک قطعہ زمین کے متعلق تم میں سے دو افراد کا جھگڑا ہوتا ہے اور وہ میرے پاس آتے ہیں، ان میں سے ایک زیادہ چرب زبان ہے اور وہ اپنی بات کو ثابت کر دیتا ہے اور میں اس کے حق میں فیصلہ دے دیتا ہوں، لیکن جان لو کہ اگر کوئی مجھ سے غلط فیصلہ لے گیا تو وہ آگ کا ٹکڑا لے کر گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی شے کا صحیح ہونا اور ہے جبکہ اس کا ثابت ہو جانا اور ہے۔ ان دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ قاضی شریحؒ نے اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دعویٰ خارج کر دیا تھا تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت علیؓ کو جھوٹا کہا گیا؟ قاضی کا موقف یہ تھا کہ جناب آپ کا دعویٰ بالکل سچا ہو گا مگر میری مجبوری یہ ہے کہ مجھے دو گواہ چاہئیں اور گواہی میں بیٹا اور غلام پیش نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ اگرچہ حضرت علیؓ کے گواہ آپ کے بیٹے حضرت حسنؓ اور آپؓ کے غلام تھے، لیکن ان کی گواہی قبول نہ کی گئی اور زرہ یہودی کو دے دی گئی کہ اس پر آپؓ کا دعویٰ ثابت نہیں ہوا۔ اس پر وہ یہودی ایمان لے آیا اور زرہ بھی واپس کی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دعویٰ صحیح تھا۔ بہرحال یہ ضروری نہیں کہ ہر صحیح بات ثابت بھی ہو جائے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی حدیث امام بخاریؒ یا امام مسلمؒ کے جرح و تعدیل کے معیار پر پوری نہ اترے، لیکن اس کا معنی یہ نہیں کہ وہ حدیث غلط ہے اور موضوع ہے۔ ایسے بہت سے موتی ہو سکتے ہیں جو ہمارے پاس اُن احادیث میں موجود ہوں جو ان بڑے بڑے ائمہ کے جرح و تعدیل کے معیار پر پوری نہیں اترتیں اور انہوں نے انہیں قبول نہیں کیا۔ لیکن ہم یہ جانتے ہیں کہ اگر ہمارے معاشرے میں دورِ خلافت ِراشدہ میں کسی بات پر عمل ہوا تو یقیناً وہ بات صرف ایک حدیث کے بل پر نہیں تھی، دوسرے بہت سے عوامل ہوں گے جن کی وجہ سے دورِ خلافت راشدہ میں اس پر عمل ہوا۔ چنانچہ اگر ائمہ ٔ اربعہ اس کے بعد کسی بات پر متفق ہو رہے ہیں تو

یقیناً وہ کسی دلیل پر متفق ہوئے ہوں گے‘ خواہ کوئی حدیث ِ صحیح اس سلسلے میں پیش نہ کی جا سکے۔ اس لیے میں یہ کہہ رہا ہوں کہ ائمۂ اربعہ کا اجماع از خود ایک دلیل بن

جاتا ہے۔ آپ حضرات اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیں۔

ہمارے ہاں دیت اور قانونِ شہادت وغیرہ پر جو بحثیں چھڑ گئی ہیں‘ اس ضمن میں میرا اپنا ذاتی تجزیہ یہ ہے کہ اصل میں دو چیزیں بالکل جدا ہیں‘ انہیں آپس میں گڈمڈ نہیں کرنا چاہیے۔ ایک یہ کہ کسی انسان میں انفرادی طور پر یا کسی قوم میں اجتماعی سطح پر ایک ارادہ (will) پیدا ہو جانا کہ ہمیں مسلمان جینا ہے اور مسلمان مرنا ہے۔ دوسرے‘ اس کو یہ بتانا کہ اسلام کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔ ان دونوں کو گڈمڈ نہ کیجیے۔ جب تک وہ ارادہ ہی نہیں ہے تو ان بحثوں میں پڑنے کا فائدہ؟ ایک آدمی کے اندر ابھی وہ ارادہ ہی پیدا نہیں ہوا کہ وہ اللہ کے حکموں پر چلے اور آپ اسے اللہ کا حکم بتا رہے ہیں ۔ ابھی اس کے دل میں وہ جذبہ ہی نہیں اُبھرا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی سُنّت کا اتباع کرے اور آپ اسے سُنّت ِ رسولؐ پر لیکچر دے رہے ہیں۔ اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ پہلے اجتماعی اور قومی سطح پر وہ ارادہ پیدا کریں۔ جب تک ایسا نہیں ہوتا‘ یہ بحثیں چھیڑ دینا بالکل بے کار ہے۔ اس سے لوگوں میں کنفیوژن بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ چنانچہ انقلابی طریقہ کار کے ذریعے سے پہلے ارادہ پیدا کرنا ہو گا‘ اور وہ ہو گا قرآن کی حکمت اور فلسفے سے‘ قرآن کی ہدایت اور روشنی کو عام کرنے سے۔ پھر اس ارادے کا انقلابی انداز میں ظہور ہو گا اور وہ اپنے آپ کو ثابت کرے گا کہ اس ملک میں رہنے والوں کے اندر اب یہ عزم پیدا ہو چکا ہے کہ وہ مسلمان جینا چاہتے ہیں اور مسلمان مرنا چاہتے ہیں۔ پھر یہ سارے معاملات کھلتے چلے جائیں گے۔

اصلاحی صاحب کے موقف سے اعلانِ براء ت

مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کے ساتھ میرا ایک تعلق بہت طویل عرصے تک رہا ہے کہ میں ہی ان کا spokesman اور پبلشر رہا ہوں۔ میں نے ان کا پرچہ (میثاق) بھی شائع کیا اور تفسیر تدبر ِ قرآن بھی‘ پھر لاہور میں اجتماعات بھی منعقد کروائے۔ اس کے بعد اب ان کی طرف سے حدّ ِ رجم کے بارے میں جو موقف سامنے آیا ہے تو اس سے اسی زور شور سے اعلانِ براء ت بھی کرنا ضروری ہے۔ ان کے فکر میں پہلے بھی بعض چیزیں ایسی آتی رہی تھیں کہ جن پر ہم چونکتے رہے۔ مثلاً سورۂ بنی اسرائیل کی تفسیر کرتے ہوئے معراج کو

انہوں نے کچھ دبے لفظوں میں خواب کی شکل میں پیش کیا کہ یہ ایک ’’رؤیا‘‘ تھا۔ اس کے بارے میں ہم نے کہا کہ یہ موقف درست نہیں ہے‘ لیکن اس کا معاملہ ہمارے عقائد کے ساتھ ہے‘ عمل سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ پھر یہ کہ اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ اقوال ہمیں اسلاف میں بھی مل جاتے ہیں‘ جس طرح کہ رؤیت ِ باری تعالیٰ میں اختلاف

ہے کہ معراج میں رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا یا نہیں ! یہ اختلاف صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے چلا آ رہا ہے۔ ایک طرف حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نہیں دیکھا' دوسری طرف حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ دیکھا ہے۔ تو اس میں گنجائش پیدا ہو جاتی ہے کہ کوئی شخص کوئی بات کہے' لیکن دین کے عملی پہلو کا معاملہ بہت ہی نازک اور پیچیدہ ہے۔ اس میں اہل ِ ایمان کے راستے سے ہٹ کر کوئی دوسرا راستہ نکالا جائے گا تو وہ قابلِ قبول نہ ہو گا۔ اس کے بارے میں مَیں نے آغاز میں آیت پیش کی ہے :

{وَ مَنۡ یُّشَاقِقِ الرَّسُوۡلَ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا تَبَیَّنَ لَہُ الۡہُدٰی وَ یَتَّبِعۡ غَیۡرَ سَبِیۡلِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ نُوَلِّہٖ مَا تَوَلّٰی وَ نُصۡلِہٖ جَہَنَّمَ ؕ وَ سَآءَتۡ مَصِیۡرًا ﴿۱۱۵﴾}(النّساء)

''اور جو کوئی مخالفت کرے رسولؐ کی اس کے بعد کہ اُس پر کھل چکی سیدھی راہ اور چلے سب مسلمانوں کے راستے کے خلاف تو ہم حوالہ کریں گے اُس کو اسی طرف جو اُس نے اختیار کی اور ڈالیں گے اس کو دوزخ میں' اور وہ بہت ہی بُرا ٹھکانہ ہے۔''

اہل ِ ایمان کا راستہ قرآن' سُنّت ِ رسول ﷺ' سُنّت ِ خلفائے راشدین مہدیین اور اس کے بعد ائمہ ٔ اربعہ کے اجماع سے بنا ہے۔ اہل ِ سُنّت کا راستہ متذکرہ بالا مراحل سے ہو کر گزرا ہے اور وہ ایک شاہراہ ہے۔ اس کے لیے تو یوں کہا جائے گا : ''لَیۡلُھَا کَنَھَارِھَا'' یعنی اس کی رات بھی دن کی طرح روشن ہے۔ اب اس راستے سے ہٹ کر جو بات کہی جائے گی اس سے اعلانِ براء ت پوری شدّت کے ساتھ کرنا ہو گا۔

رجم کے معاملے میں مولانا اصلاحی نے جو رائے ظاہر کی اس سے پہلے کا بھی ایک واقعہ بیان کیے دیتا ہوں۔ مولانا کی تفسیر کی دوسری جلد ابھی صرف ''میثاق'' میں چھپی تھی'

کتابی شکل میں نہیں آئی تھی کہ سورۃ النساء کی ایک آیت کی تأویل جو مولانا نے کی' اس پر بعض علماء کا اعتراض آیا۔ ان میں ایک ساہیوال کے مولانا برکات احمد خاں صاحب تھے' جو کوئی معروف عالم ِ دین نہیں تھے۔ مَیں نے مولانا اصلاحی صاحب سے عرض کیا کہ ابھی یہ کتابی شکل میں نہیں چھپی ' اس پر آپ نظر ثانی کر لیجیے۔ مولانا نے فرمایا کہ اب مَیں ہر شخص کی بات پر تو غور نہیں کر سکتا' کوئی بڑا عالم دین اگر بات کرے گا تو جواب دوں گا۔ یہ معاملہ اصل میں سورۃ النساء کی آیت ۳ سے متعلق تھا:{ وَ اِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تُقۡسِطُوۡا فِی الۡیَتٰمٰی فَانۡکِحُوۡا مَا طَابَ لَکُمۡ مِّنَ النِّسَآءِ مَثۡنٰی وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ ۚ}''اور اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم یتیم لڑکیوں کے حق میں انصاف نہ کر سکو گے تو پھر نکاح کر لو دوسری عورتوں میں سے جو تمہیں پسند ہوں' دو دو تین تین اور چار چار سے۔'' اس آیت کے بارے میں اجماعی نقطۂ نظر یہی ہے کہ اس سے مراد ہے کہ تم یتیم بچیوں سے نکاح کر کے اگر یہ سمجھتے ہو کہ ان کی طرف سے بولنے والا کوئی نہیں' ان کا کوئی بھائی یا باپ اُن کے حقوق کی نگہداشت کرنے والا موجود نہیں کہ ان کے حقوق اگر تلف کیے جا رہے ہوں تو کوئی ان کی

طرف سے کھڑا ہو‘ تو پھر یتیم بچیوں سے نکاح نہ کرو بلکہ جو دوسری عورتیں تمہیں پسند ہوں ان سے دو دو‘ تین تین‘ چار چار تک شادیاں کر لو۔ لیکن مولانا نے رائے ظاہر کی کہ یہاں ’’اُمّہات الیتٰمٰی‘‘ مراد ہیں‘ یعنی یتیموں کی مائوں سے شادیاں کر لو۔ یہ بات اجماع کے خلاف تھی۔ اُن دنوں مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے مولانا اصلاحی صاحب کے ساتھ کافی روابط تھے اور ’’مجلس دعوت و اصلاح‘‘ میں یہ حضرات شریک تھے۔ میں نے جب مفتی صاحبؒ سے یہ معاملہ عرض کیا تو انہوں نے کہا یہ تو واقعتاً بڑی گمراہی ہے۔ میں نے کہا کہ ابھی یہ بات کتابی شکل میں نہیں چھپی‘ اور اگر آپ مولانا کو قائل کر لیں گے تو اللہ تعالیٰ آپ کو جزا دے گا اور ابھی سے غلطی کی اصلاح ہو جائے گی۔ میرے بہت کہنے کے باوجود انہوں نے مولانا سے کوئی خط و کتابت نہیں کی تو مَیں اپنی جگہ یہ سمجھ کر مطمئن ہو گیا کہ مَیں نے اپنا حق ادا کر دیا اور مَیں نے دوسری جلد شائع کر دی۔ وہ مسئلہ بھی خیر اتنا بڑا نہیں تھا۔ اصل میں اس کے ساتھ ہی مولانا نے یہ لکھ دیا تھا کہ جہاں تک تعدّدِ ازدواج (polygamy) کا تعلق ہے وہ ثابت

ہے‘ اس میں کوئی اعتراض والی بات نہیں۔

اب یہ جو حدِّ رجم کا مسئلہ سامنے آیا ہے یہ یقیناً ایسی بات ہے جس میں ہماری اُمّت میں سے سوائے خوارج کے آج تک کسی نے اختلاف نہیں کیا۔ شیعہ‘ سُنّی اور اہلِ ظاہر سب اس پر متفق ہیں۔ اہلِ سُنّت کے چاروں امام‘ شیعوں میں زیدیہ ہوں یا جعفریہ سب کے سب‘ اہلِ حدیث علماء‘ اہلِ ظاہر میں امام دائود ظاہری‘ ان سب کا اجماع ہے کہ اسلام میں شادی شدہ زانی مرد اور شادی شدہ زانیہ عورت کے لیے حدِّ رجم کی سزا ہے۔ جب مولانا اصلاحی نے اس کے خلاف رائے ظاہر کی اور ایک جلیل القدر صحابی کو جن کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اس نے وہ توبہ کی ہے جو سارے مدینہ والوں پر تقسیم کر دی جائے تو ان کے لیے کافی ہو جائے گی (معاذ اللہ!) ’’غنڈہ‘‘ لکھا تو اب یہ بات ایسی تھی کہ جس سے شدّت کے ساتھ اعلانِ براء ت کرنا مجھ پر لازم تھا۔ اس لیے کہ مَیں ہی اس کا پبلشر ہوں‘ اس تفسیر کو مَیں نے چھاپا ہے۔ یقیناً مولانا کا مقام اپنا ہے لیکن اس کو چھاپ کر متعارف کرانے میں میرا بھی حصّہ ہے‘ لہٰذا میں نے اس سے اعلانِ براء ت کیا اور کہا کہ مَیں کم از کم اس معاملے میں مولانا اصلاحی صاحب کو اب منکرینِ سُنّت کی صف مَیں سمجھتا ہوں۔ یہ ایک مجمع علیہ شے ہے اور اس سے ہٹ جانا یقیناً بہت بڑی گمراہی ہے۔

پھر اصلاحی صاحب کے حلقے کے ایک نوجوان نے اس سے بھی آگے بڑھ کر چھلانگ لگانی شروع کی اور ایک غامدیہ خاتون جن کو رسول اللہ ﷺ نے رجم کیا تھا‘ ان کے بارے میں کہنا شروع کیا کہ وہ چکلہ چلاتی تھیں۔ وہ خاتون تین دفعہ آپؐ کے پاس چل کر آئی کہ مجھے پاک کر دیجیے‘ جسے آنحضور ﷺ نے واپس لوٹا دیا۔ اس سے دریافت کیا کہ: کہیں تمہیں حمل تو نہیں؟ اس نے کہا حمل تو ہے! فرمایا: جائو اس تھی جان کا کیا قصور ہے‘ جرم

ہے تو تمہارا ہے ‘لہٰذا وضع حمل کے بعد آنا۔ وہ اللہ کی بندی پھر چلی آتی ہے کہ مجھے پاک کردیجیے‘ مَیں آخرت کی سزا نہیں جھیلنا چاہتی‘ مجھے یہاں پر بڑی سے بڑی سزا منظور ہے۔ خطا کس سے نہیں ہو جاتی؟ لیکن خطا کے بعد توبہ کا یہ معاملہ کہ اللہ کی ایک بندی رجم کی سزا جھیلنے کو تیار ہے‘ اس کے بارے میں اِس قسم کے الفاظ کہے جائیں !

ایک نئے فتنے کا آغاز

جہاں تک اصلاحی صاحب کا معاملہ ہے‘ میں ان کے لیے فتنے کا لفظ استعمال نہیں کرتا۔ میں نے اس معاملے میں فقط اتنا کہا ہے کہ وہ منکرینِ سُنّت کی صف میں آ گئے ہیں‘ لیکن جس نوجوان کا آغاز یہاں سے ہو رہا ہے وہ یقیناً ایک فتنہ اٹھارہا ہے۔* اصلاحی صاحب تو عمر کے آخری دَور میں ہیں‘ ان کی خدمات کا پلڑا بہت بھاری ہے۔ ایک معاملے میں ان سے بہت بڑی لغزش ہوئی‘ اس سے ہم نے اعلانِ براء ت کر دیا۔ اس کے علاوہ ان کی پوری زندگی میں کوئی ایسی بڑی چیز نظر نہیں آتی۔ صرف یہی چند چیزیں ہیں جو میں نے عرض کر دیں۔ لیکن ایک ایسی شے جو ائمہ اربعہ کی مجمع علیہ ہے‘ خلفائے اربعہ کی مجمع علیہ ہے‘ جس کے بارے میں بخاری و مسلم کی احادیث صحیحہ موجود ہیں ‘ اس سے روگردانی کرنا یقیناً بہت بڑی گمراہی ہے‘ اور میرے سابقہ تعلق کی وجہ سے میرے ذمے یہ فرض تھا کہ اس معاملے میں اپنا موقف کھل کر سامنے رکھ دوں۔ ان کے شاگرد کا جو مسئلہ ہے اس کے بارے میں مَیں عرض کر چکا ہوں کہ میں اسے فتنہ سمجھتا ہوں۔ اس لیے کہ ایک نوجوان یہ کہے کہ ’’کلالہ‘‘ کے معنی آج تک کسی نے نہیں سمجھے ‘ صرف میں نے سمجھے ہیں اور اس کے گرد کچھ ایسے نوجوان بھی جمع ہو جائیں جو یہ مان لیں کہ ہاں اسی نے سمجھے ہیں اور وہ برملا کہے کہ ہم ایک نئی شریعت کی ترتیب کرنے والے ہیں‘ اس کے فتنہ ہونے میں کچھ شبہ نہیں۔

ایک بات جان لیجیے کہ دنیا میں جتنے بھی فتنے اٹھے‘ اسی طرح اٹھے۔ عام آدمی تو کوئی فتنہ نہیں اٹھایا کرتا۔ ایسا تو کوئی باصلاحیت آدمی ہی کرتا ہے۔ غلام احمد قادیانی نے بھی پہلے دین کی بڑی خدمت کی تھی جس کی وجہ سے اس کے گرد لوگ جمع ہو گئے تھے۔ اُس نے مناظروں میں عیسائیوں کو شکستیں دی تھیں‘ آریہ سماجیوں کو شکستیں دی تھیں تب جا کر لوگ اس کے گرویدہ ہوئے۔ اس کے بعد اُس نے ایک ایک کر کے چیزیں ان کے حلق سے

---

* واضح رہے کہ محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا یہ خطاب سینتیس (۳۷) سال پہلے کا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے یہاں جس نوجوان کا ذکر کیا ہے یہ صاحب علامہ جاوید احمد غامدی کے نام سے معروف ہوئے اور ان کا اٹھایا ہوا فتنہ اس وقت پورے عروج پر ہے۔ (مرتّب)

اتروانی شروع کر دیں ۔تو جس کو بھی کسی نئے فتنے کا احساس ہو اور جس کو اللہ تعالیٰ تنبّہ عطا فرمائے اس کا فرض ہے کہ وہ لوگوں کو اس بارے میں خبردار کرے۔

اصل میں علماء کو بحیثیت ِ مجموعی قرآن کے نام پر اٹھنے والی تحریکوں سے جو اندیشے لاحق ہیں اور ان کے بارے میں ان کا جو ایک allergic attitude ہے اس کا سبب ہی یہی ہے۔ مجھے تو اب علماء کے ساتھ ہمدردی پیدا ہو رہی ہے کہ جب بھی انہوں نے سنا کہ کوئی شخص قرآن کا نام لے کر اٹھ رہا ہے تو ایک دم ان کے کان کھڑے ہوئے کہ کہیں کوئی اور نئی مصیبت تو نہیں آنے والی ! کہیں کوئی نیا فتنہ تو نہیں اٹھنے والا؟ اس کی وجہ یہی ہے۔ غلام احمد قادیانی آنجہانی نے بھی اپنے کام کا آغاز قرآن ہی سے کیا تھا۔ اس کا ایک شعر ملاحظہ ہو : ؎

اے بے خبر بخدمت قرآں کمر ببند
زاں پیشتر کہ بانگ برآید فلاں نہ ماند !

اور: ع

قمر ہے چاند اوروں کا ‘ ہمارا چاند قرآں ہے !

یہ سب کچھ اُس نے کہا۔ پھر دیکھئے سرسید احمد خان کا اوڑھنا بچھونا قرآن تھا۔ انہوں نے پندرہ پاروں کی تفسیر لکھی جس میںساری گمراہیاں پھیلائیں۔ اہل ِقرآن اور منکرین ِ سُنّت تو معلوم ہوتا ہے قرآن کے ٹھیکیدار ہیں ۔

چونکہ قرآن کے نام پر فتنے اٹھتے رہے ہیں لہٰذا ہمیں بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ لوگ آثارِ قدیمہ کو کروڑوں روپیہ صرف کر کے محفوظ (preserve) کرتے ہیں‘ تو ہمارے لیے دین کے آثار صحابہ کرامؓ اور ائمہ ٔ دین کی آراء ہیں۔ یہ ہمارے لیے بہت قیمتی ہیں اور ان کو بڑی مضبوطی کے ساتھ تھامنے کی ضرورت ہے۔ ((عَضُّوْا عَلَیْھَا بِالنَّوَاجِذِ)) کے مصداق اگر ہم ان کو دانتوں کے ساتھ مضبوطی سے تھامیں گے تبھی اس دور کے فتنوں سے بچیں گے۔ ورنہ ایک سے ایک نیا فتنہ آتا ہے اور وہ کچھ نہ کچھ لوگوں کو دین کی طرف سے برگشتہ کر کے انہیں اصل راستے سے ہٹا کر غَیْرَ سَبِیْلِ الْمُؤْمِنِیْنَ کے

راستے پر ڈال دیتا ہے۔ ایسے فتنے اٹھانے والوں میں کچھ نہ کچھ تو ذہانت و فطانت اور صلاحیت ہوتی ہے جو لوگوں کو اصل راستے سے ہٹا کر لے جاتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی الوداعی وصیت

اب ہم ایک حدیث نبویؐ کا مطالعہ کرتے ہیں:

عَنْ عِرْبَاضِ بْنِ سَارِيَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ صَلّٰى لَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ صَلَاةَ الْفَجْرِ ثُمَّ وَعَظَنَا مَوْعِظَةً بَلِيْغَةً ذَرَفَتْ مِنْهَا الْعُيُوْنُ وَ وَجِلَتْ مِنْهَا الْقُلُوْبُ، فَقَالَ قَائِلٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ كَأَنَّهَا مَوْعِظَةُ مُوَدِّعٍ فَأَوْصِنَا، قَالَ:((أُوْصِيْكُمْ بِتَقْوَى اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَ اِنْ كَانَ عَبْدًا حَبَشِيًّا، فَاِنَّهٗ مَنْ يَعِشْ مِنْكُمْ بَعْدِيْ فَسَيَرَى اخْتِلَافًا كَثِيْرًا، فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ، عَضُّوْا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ، وَاِيَّاكُمْ وَالْمُحْدَثَاتِ فَاِنَّ كُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ وَكُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ))... وَفِيْ رِوَايَةٍ : ((وَكُلَّ ضَلَالَةٍ فِي النَّارِ)) (٦) ''حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ ہمیں فجر کی نماز پڑھائی اور اس کے بعد ہمیں ایسا پُراثر وعظ فرمایا کہ ہماری آنکھوں سے آنسو بہ نکلے اور ہمارے دل اس سے لرز گئے۔ ہم نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ ! یہ تو ایسے لگتا ہے کہ آپؐ نے کوئی الوداعی وعظ فرمایا ہے (یعنی اس انداز سے جیسے آپؐ ہم سے وداع ہو رہے ہیں یا ہمیں وداع کر رہے ہیں) تو ہمیں نصیحت کیجیے ! (یعنی اگر یہ علیحدگی کا وقت ہے اور الوداعی خطاب کا انداز ہے تو ہمیں وہ اصول دے دیجیے کہ جنہیں ہم تھام لیں) آپ ﷺ نے فرمایا: ''(سب سے پہلے تو) مَیں تمہیں وصیت کرتا ہوں اللہ کے تقویٰ کی، وہ جو العزیز ہے اور بہت جلالت شان والا ہے۔ اور (دوسری نصیحت ہے) سننے اور ماننے کی (یعنی

---

(٦) سنن الترمذی، ابواب العلم، باب ما جاء فی الاخذ بالسنة واجتناب البدع۔ وسنن ابن ماجه، المقدمة، باب اتباع سنة الخلفاء الراشدين المهديين۔ وسنن الدارمی، المقدمة، باب اتباع السنة۔ الفاظ کم وبیش سنن دارمی کے ہیں۔ وسنن ابی داؤد، کتاب السُنَّة، باب فی لزوم السُنَّة۔

اجتماعی نظم و ضبط) اگرچہ ایک حبشی غلام تمہارا امیر بنا دیا جائے۔ اس لیے کہ جو کوئی تم میں سے میرے بعد زندہ رہے گا وہ عنقریب بہت سے اختلافات دیکھے گا۔ پس تمہارے لیے میری سُنّت اور ہدایت یافتہ راست رَو خلفاء کی سُنّت کی پیروی لازم ہے۔ اسے اپنے دانتوں سے مضبوطی سے پکڑے رہنا ۔(یہ محاورہ ہے، یعنی کسی کو شدت اور مضبوطی کے ساتھ پکڑلینا) اور دیکھنا (دین میں) نئی نئی باتیں ایجاد کرنے سے بچتے رہنا، اس لیے کہ ہر نئی بات بدعت ہے، اور ہر بدعت گمراہی ہے''...اور ایک حدیث میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں: ''اور ہر گمراہی آگ میں جھونکی جانے کے قابل ہے۔''

اب مَیں دو چیزوں کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔ ایک یہ کہ خلفائے راشدین سے کیا مراد ہے ! عام طور پر

سمجھا جاتا ہے کہ خلفائے راشدین یہی خلفائے اربعہ ہیں' یعنی حضرت ابوبکر' حضرت عمر' حضرت عثمان اور حضرت علی رضوان اللہ علیہم اجمعین۔ میرے نزدیک شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اس کی جو شرح کی ہے وہ زیادہ صحیح ہے کہ یہاں دونوں خلافتیں مراد ہیں' خلافتِ علمی اور وہ خلافت جو حکومت کی سطح پر قائم ہوئی۔ اس لیے کہ یہاں الفاظ استعمال ہورہے ہیں: ((سُنَّتِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِیْنَ الْمَھْدِیِّیْنَ))اور خلافتِ راشدہ کا جو نظام بعد میں سیاسی طور پر قائم ہوا وہ نظام تو اُس وقت پردۂ غیب میں تھا۔ مراد اس سے یہ ہے کہ میرے خلفاء یا میرے بعد آنے والے وہ لوگ جو راشد ہوں' مہدی ہوں' رشد و ہدایت پر ہوں' ہدایت یافتہ ہوں۔ ان میں یقیناً چاروں خلفاء بھی شامل ہیں جو ہمارے خلفائے راشدین ہیں' ان پر تو اہلِ سُنّت کا اجماع ہو گیا' اس لیے کہ یہی وہ چار ہیں جن میں اختلاف کی کوئی بات نہیں ہوئی' لیکن اس کے بعد کا معاملہ سیاسی اعتبار سے مختلف فیہ ہے۔ بعد میں آنے والوں میں جو لوگ علمِ نبوت کے وارث بنے' یعنی علماء' ائمۂ دین' فقہاء اور محدثین' یہ بھی یقیناً محمد رسول اللہ ﷺ کے خلفاء میں سے ہیں۔ یہ خلافتِ علمیہ ہے۔ پھر خلافتِ باطنیہ ہے۔ خلافتِ ظاہری وہ ہے جس پر حکومت کا نظام ہمارے ہاں چلا ہے' البتہ ''خلافتِ راشدہ'' میں یہ تینوں ایک وحدت ہیں۔ باطنی خلافت' علمی خلافت اور سیاسی خلافت یہ تینوں جمع ہو گئی ہیں حضرت ابوبکر' حضرت عمر' حضرت عثمان اور حضرت علی رضوان اللہ علیہم اجمعین کی ذات میں۔

لیکن بعد میں پھر تقسیم ہوتی چلی گئی۔ ایک خلافت سیاسی رہ گئی' ایک خلافت علمی اور ایک خلافت باطنی۔ اس کے علاوہ روحانی خلافتوں کا جو سلسلہ ہمارے ہاں بیعت کی بنیاد پر چلا ہے اور جو ہماری ساری روایات ہیں ان میں سے کوئی بھی درحقیقت اس ڈگر سے ہٹ کر نہیں ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ بدعت محض کسی رسم کا نام نہیں۔دین میں نیا خیال ظاہر کرنا اور بالکل مجمع علیہ چیزوں کے خلاف کوئی نئی رائے دینا بھی یقیناً بدعت میں شامل ہے۔بدعت صرف عمل کا نام نہیں بلکہ نیا خیال بھی بدعت ہے' نیا نظریہ بھی بدعت ہے۔ وہ چیز جو دین کے مزاج کے ساتھ ہم آہنگ نہ ہو وہ بھی بدعت ہے۔

متذکرہ بالا آیت کے الفاظ {وَمَنْ یُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ} ''اور جو کوئی مخالفت کرے رسولؐ کی'' کا مصداق رسولؐ کے ساتھ ساتھ سُنّتِ رسولؐ بھی ہے' اور {وَیَتَّبِعْ غَیْرَ سَبِیْلِ الْمُؤْمِنِیْنَ}''اور چلے مسلمانوں کی راہ کے خلاف۔''اس ''سبیل المؤمنین'' کی وضاحت میں کر چکا ہوں کہ یہ کن ذرائع سے وجود میں آئی ہے۔ جو کوئی اس سے ہٹ کر کوئی راستہ نکالے گا' چاہے وہ کوئی رسم ہو' کوئی خیال ہو' کوئی رائے ہو وہ راستہ قابلِ قبول نہ ہو گا۔ ظاہر ہے کہ کوئی رائے اکیلی نہیں ہوتی' اس کا پورا کنبہ ہوتا ہے۔ ایک نئی رائے آئے گی تو اس کے ساتھ ملی ہوئی چیزیں اس میں شامل ہوتی چلی جائیں گی۔ چنانچہ اس نئے مکتب فکر کے روبرو ایک مرتبہ جب گفتگو ہو رہی تھی اور مَیں نے یہ بات کہی کہ آپ ایک بالکل نیا دین ایجاد کر لیں گے تو انہوں نے کہا: ''نیا دین نہیں بلکہ نئی شریعت' نئی فقہ ہم ضرور بنانا

چاہتے ہیں۔ ''بہرحال میں ان حضرات کے طرزِ عمل سے اعلانِ براء ت کرتا ہوں اور یہ بات پوری طرح واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اس معاملے میں کسی کمپرومائز کی گنجائش نہیں۔ اگر دین کے کسی معاملے میں ہم نے مداہنت کا راستہ اختیار کیا اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے مابین کوئی تفریق کرنے کی کوشش کی تو ہماری یہ ساری محنتیں اکارت چلی جائیں گی اور ان کا حاصل کچھ نہ ہو گا۔

ہم اُس قرآن کے ماننے والے ہیں جو محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوا' اور آپؐ پر صرف قرآن ہی نازل نہیں ہوا بلکہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی رہنمائی بہت سے طریقوں اور

چینلز سے کی۔ اس پر تو علماء نے کتابوں کی کتابیں لکھ دی ہیں اور بیسیوں مثالیں دی ہیں۔ مثلاً یہ جو سورۃ البقرۃ میں فرمایا گیا: {وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰي عَقِبَيْهِ ۭ} (آیت ۱۴۳) ''اور ہم نے نہیں مقرر کیا تھا وہ قبلہ جس پر کہ آپؐ تھے مگر اس لیے کہ ہم ذرا جانچ لیں کہ کون رسولؐ کی پیروی کرتا ہے اور کون اُلٹے پائوں پھر جاتا ہے۔'' غور کیجیے قرآن مجید میں کہاں ہے وہ آیت جس کی تعمیل میں رسول اللہ ﷺ نے بیت المقدس کی طرف مُنہ کر کے نماز پڑھی؟ تو معلوم ہوا کہ کوئی اور چینل ہے جس کے ذریعے آپ ﷺ کو وہ بات کہی گئی تھی' کوئی اور بصیرتِ باطنی تھی جس کے ذریعے آپؐ کو یہ ہدایت دی گئی تھی۔ اس طرح کی بیسیوں مثالیں آپ کو مل جائیں گی جن سے ثابت ہو جائے گا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کو صرف قرآن ہی نہیں مل رہا تھا' بلکہ اللہ تعالیٰ کی راہ نمائی بہت سے دوسرے چینلز سے بھی آپؐ کے پاس آرہی تھی۔ جیسا کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ((اُوْتِيْتُ الْكِتَابَ وَمِثْلَهٗ مَعَهٗ)) ''مجھے قرآن بھی دیا گیا اور اس جیسی چیز اور بھی۔'' یہی وہ چیز ہے جس نے سُنّت کی شکل میں ظہور کیا۔

سُنّت اور حدیث کا فرق

سُنّت درحقیقت کہتے ہیں سیرت' راستے اور طریقے کو۔ (السنۃ فی الاصل الطریقۃ والسیرۃ) رسول اللہ ﷺ کا جو راستہ اور طریقہ ہے اس کا علم ہمارے پاس دو واسطوں سے پہنچا ہے۔ اوّلاً تواترِ عمل اور ثانیاً حدیث کا ریکارڈ۔ ان میں سے اہم تر واسطہ یا ذریعہ اُمت کا تواترِ عمل ہے۔ نبی اکرم ﷺ کو دیکھ کر صحابہؓ نے عمل کیا' صحابہ کو دیکھ کر تابعین نے اور تابعین کو دیکھ کر تبع تابعین نے عمل کیا۔ اس طرح یہ نسلاً بعد نسلٍ دیکھ کر منتقل ہو رہا ہے۔ بالکل اسی طور سے قرآن منتقل ہوا ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے صحابہؓ نے سنا اور یاد کیا اور پھر صحابہ سے اگلوں نے سنا اور یاد کیا۔ اسی طرح یہ آگے چلتا گیا اور نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتا گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے باقاعدہ چھپوا کر اس پر دستخط کر کے اور سرٹیفکیٹ دے کر اس کے نسخے تو دنیا کے اندر نہیں بھیجے تھے۔ قرآن تو رسول اللہ ﷺ کی اپنی حیاتِ طیبہ تک مابین الدَّفَّتَین بھی جمع نہیں ہوا تھا۔ وہ تو بعد میں دورِ صدیقیؓ میں جمع ہوا۔

چنانچہ اوّل درجے میں اللہ کے رسول ﷺ کا عمل ہے جس پر اُمّت کا تواترِ عمل ہے' اور پھر ثانوی درجے میں حدیث کا ریکارڈ ہے۔ حدیث کا ریکارڈ جمع کرنے کا جب مرحلہ آیا تو بہت سی چیزیں ایسی ہو سکتی ہیں کہ جن کی وجہ سے کوئی حدیث اس معیار پر پوری نہ اتر رہی ہو۔ ہو سکتا ہے اس کا اصل راوی فوت ہو چکا ہو اور اس کی بجائے کوئی دوسرے درجے کا راوی اسے روایت کر رہا ہو۔ اس طرح کے سارے امکانات موجود ہیں۔ لیکن تواترِ عمل میں اس طرح کا کوئی خلا پیدا نہیں ہو سکتا' لہٰذا سُنّت کے علم کا زیادہ بڑا ذریعہ (source) ہمارے پاس اُمّت کا تواترِ عمل ہے' جس نے سبیل المؤمنین کی شکل اختیار کی ہے اور اصل میں اس کی اہمیت زیادہ ہے۔ اہلِ ایمان کے اِس راستے سے ہٹ کر کوئی راستہ نکالنے کی کوششیں ہر دَور میں ہوتی رہی ہیں۔ ہر دَور اور ہر زمانے کے اپنے اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ جب یونان کی منطق آئی تو بہت سے لوگوں کو بہا کر لے گئی تھی۔ ایک دَور میں جدید سائنس کے زیر اثر سرسید احمد خان اور اُن کے حلقۂ اثر نے کچھ رائیں ایجاد کر لیں۔ لیکن یہ وقتی قسم کے معاملات ہوتے ہیں۔ ہمارا جو تسلسل ہے تواترِ عمل کا اور اس سے جو سبیل المؤمنین بنی ہے اس کی پیروی ہم پر لازم ہے۔ ہم یہ عہد کرتے ہیں کہ اِن شاء اللہ قرآن مجید کی اس پوری تحریک اور دعوت کو لے کر چلیں گے اور کہیں بھی سبیل المؤمنین سے اپنا راستہ ہٹا لینے کے لیے تیار نہ ہوں گے۔ اس لیے کہ اسی میں عافیت اور حفاظت ہے۔ یہی ہمارے نزدیک قرآن کی رو سے اور سُنّتِ رسول ﷺ کے اعتبار سے صحیح راستہ ہے۔

اقول قولی هذا واستغفر الله لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات

حدیث کی اہمیت اور

اس کا مقام و مرتبہ

۲۵ مئی ۲۰۰۷ء کا خطابِ جمعہ

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ {قُلْ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَیْہِ مَا حُمِّلَ وَ عَلَیْکُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ ؕ وَ اِنْ تُطِیْعُوْہُ تَہْتَدُوْا ؕ وَ مَا عَلَی الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ ﴿۵۴﴾} (النور)

{وَ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّیْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰی رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ ﴿ ۱۲ ﴾} (التغابن) صَدَقَ اللّٰہُ الْعَظِیْمُ

شریعت اسلامی کی دو بنیادیں

سب جانتے ہیں کہ ہمارے دین اسلام اور شریعت اسلامی کی دو بنیادیں ہیں' ایک کتاب اللہ یعنی قرآن حکیم اور دوسری سُنّت رسولؐ ۔ جیسا کہ ہمارے کلمۂ طیبہ کے دو حصے ہیں: لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ اور مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ یعنی توحید اور رسالت ۔ کلمۂ شہادت جو ہمارے اسلام کی جڑ اور بنیاد ہے اس کے بھی دو حصے ہیں: اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ۔ کتاب اللہ اور سُنّت رسول اللہؐ میں فرق یہ ہے کہ کتاب اللہ وحی جلی ہے' وحی باللفظ (Verbal revelation) ہے' وحی بالمعنی نہیں ہے ۔ عیسائیوں کے ہاں وحی کے بارے میں یہ تصوّر ہے کہ وحی باللفظ

(verbal) نہیں ہوتی' بلکہ صرف ایک مفہوم منتقل کر دیا جاتا ہے ' اس مفہوم کو پھر رسول اپنی زبان میں ادا کرتا ہے۔ گویا الفاظ اللہ کے نہیں ہوتے۔ ہمارا تصوّر اس کے برعکس ہے۔ ہمارے نزدیک وحی جلی ''وحی باللفظ'' ہے' جو لفظ بلفظ اللہ کا کلام ہے۔ دوم یہ کہ وہ بالکل محفوظ ہے۔ اس کا ایک حرف تو کجا کسی ایک شوشے میں بھی کوئی تحریف نہیں ہوئی۔

اس کے مقابلے میں سُنّت کا معاملہ یہ ہے کہ وہ بھی وحی ہے' مگر وہ وحی خفی پر مبنی ہے۔ اس کا بھی اشارہ اللہ کی طرف سے ہے' لیکن یہ وحی باللفظ نہیں ہے' وحی بالمعنیٰ ہے۔ یعنی مفہوم اللہ کی طرف سے آیا ہے' لیکن الفاظ اللہ کے رسولؐ کے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ اس کی حفاظت قرآن کی طرح کی حفاظت نہیں ہے۔ اس معنی میں تو حفاظت ہے کہ تاریخ انسانی میں صرف ایک مثال ہے کہ کسی ایک شخصیت کے اقوال اور اعمال کی صداقت اور صحت کو پرکھنے کے لیے لاکھوں انسانوں کی سیرت و کردار کا جائزہ لیا گیا۔ احادیث کی جانچ پرکھ کے لیے مسلمانوں نے اسماء الرجال کا جو علم ایجاد کیا' پوری انسانی تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ اس اعتبار سے سُنّت ِرسولؐ کی واقعتاً حفاظت کی گئی ہے۔ البتہ یہ حفاظت بالواسطہ ہوئی ہے' اس معنی میں حفاظت نہیں کہ ہر شے لفظ بلفظ محفوظ ہے' بلکہ ایسا بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے ایک مجمع میں کچھ لوگوں نے باتیں سنیں' پھر انہوں نے جو روایت کی تو

بہت بڑا فرق پیدا ہو گیا۔ آج بھی آپ دیکھیں گے کہ میری کوئی بات آپ جا کر لوگوں کو بتائیں گے تو ہر شخص کے بتانے میں کچھ فرق پیدا ہو جائے گا۔ اس کی ایک بڑی مثال ''اُمُّ السُّنّۃ''یعنی حدیث جبرائیل ؑ ہے جو ''اربعین نووی'' میں دوسرے نمبر پر آئے گی۔ یہ ایک اہم اور مشہور متواتر حدیث ہے ‘لیکن مختلف راویوں نے جب اسے بیان کیا ہے تو لفظی طور پر اس میں اختلاف پیدا ہو گیا۔

یہ بھی جان لیجیے کہ سُنّت اور حدیث دو علیحدہ علیحدہ الفاظ ہیں۔ آنحضور ﷺ کا تعامل اور طرزِ عمل سُنّت کہلاتا ہے اور حدیث اس کا ایک تحریر شدہ ریکارڈ ہے۔ سُنّت کو معلوم کرنے کے دو ذرائع ہیں۔ ایک حدیث اور دوسرا اُمّت کا تواتر عمل۔ آنجناب ﷺ کو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے عمل کرتے ہوئے دیکھا تو انہوں نے آپؐ کی پیروی کی۔ صحابہ کرام کو عمل کرتے ہوئے

تابعین نے دیکھا تو وہ ان کے نقشِ قدم پر چلے ۔تو اس طرح بہت سی چیزیں تواتر کے ساتھ اُمّت میں منتقل ہو گئیں۔یہ تواترِ عمل سُنّت کا علم حاصل کرنے کا ایک اہم ذریعہ ہے ۔

عام طور پر لوگ سُنّت اور حدیث کو مترادف سمجھ لیتے ہیں‘ حالانکہ یہ دو مختلف الفاظ ہیں‘ ان کا مفہوم جدا ہے۔ یہ دونوں الفاظ ‘حدیث اور سُنّت ‘اللہ کے لیے بھی آئے ہیں اور رسول اللہ ﷺ کے لیے بھی۔ مثلاً: {سُنَّۃَ اللّٰہِ الَّتِیۡ قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلُ ۚ وَ لَنۡ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ تَبۡدِیۡلًا ﴿۲۳﴾}(الفتح) ''یہ اللہ کا دستور ہے جو پہلے سے چلا آ رہا ہے‘ اور تم اللہ کے دستور میں ہرگز کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے''۔ سورۂ فاطر میں ارشاد ہوا: {فَلَنۡ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰہِ تَبۡدِیۡلًا ۚ وَ لَنۡ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰہِ تَحۡوِیۡلًا ﴿۴۳﴾} ''پس تم اللہ کے قانون میں ہرگز کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔ اور تم اللہ کے قانون کو ہرگز ٹلتا ہوا نہیں دیکھو گے''۔ اسی طرح فرمایا: {سُنَّۃَ مَنۡ قَدۡ اَرۡسَلۡنَا قَبۡلَکَ مِنۡ رُّسُلِنَا وَ لَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحۡوِیۡلًا ﴿۷۷﴾} (الاسراء) ''یہ ہمارا طریقۂ عمل رہا ہے ان انبیاء و رُسلؑ کے بارے میں جنہیں ہم نے آپ سے پہلے بھیجا تھا۔ اور آپ ہماری سُنّت میں کوئی تغیر نہیں پائیں گے''۔ حدیث کے بارے میں سورۃ النساء میں فرمایا:{وَ مَنۡ اَصۡدَقُ مِنَ اللّٰہِ حَدِیۡثًا ﴿۸۷﴾} ''اور تم اللہ سے بڑھ کر کسی کو حدیث (بات) میں سچا نہیں پاؤ گے''۔ اسی طرح فرمایا گیا: {فَبِاَیِّ حَدِیۡثٍۭ بَعۡدَہٗ یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۵۰﴾}(المرسلٰت) ''تم اس (قرآن) کے بعد کس حدیث پر ایمان لائو گے؟'' قرآن حکیم میں رسول اللہ ﷺ کی بات کے لیے بھی حدیث کا لفظ آیا ہے : {وَ اِذۡ اَسَرَّ النَّبِیُّ اِلٰی بَعۡضِ اَزۡوَاجِہٖ حَدِیۡثًا ۚ}(التحریم:۳) ''اور (یہ واقعہ بھی یاد رکھنے کے لائق ہے) جب نبی کریم ﷺ نے رازداری سے اپنی ایک بیوی کو ایک بات بتائی''۔ ان حوالوں سے پتا چلا کہ سُنّت کا لفظ بھی سُنّت اللہ اور سُنّت الرسول دونوں کے لیے استعمال ہوا ہے اور حدیث کا لفظ بھی حدیث اللہ اور حدیث الرسول دونوں کے لیے آیا ہے۔

اصطلاح میں حدیث کسے کہتے ہیں ؟ حدیث دو طرح کی چیزوں پر مشتمل ہے۔ ایک ''اخبار'' ہے جو خبر کی

جمع ہے اور ایک ''آثار'' ہے جو اثر کی جمع ہے۔ خبر رسول اللہ ﷺ کے کسی قول' فعل یا تقریر کو کہتے ہیں۔ قول اور فعل کے بارے میں تو آپ جانتے ہیں لیکن

تقریر کے بارے میں یاد رہے کہ اصطلاح میں اس کا مفہوم ہے کہ کوئی کام آنحضور ﷺ کے سامنے کیا گیا اور آپؐ نے روکا نہیں' تو اسے آپؐ کی منظوری کی ایک سند حاصل ہو گئی۔ لہٰذا آنجنابؐ کے اقوال' افعال اور تقریر اخبار کہلاتے ہیں اور کسی صحابی کے اقوال' افعال اور تقریر آثار کہلاتے ہیں۔ اس لیے کہ گمان غالب یہی ہے کہ صحابی جو بات کہہ رہے ہیں وہ اپنی طرف سے نہیں کہہ رہے' بلکہ انہوں نے یہ بات رسول اللہ ﷺ سے سنی ہو گی او رجس پر صحابی عمل کر رہے ہیں انہوں نے اسے رسول اللہ ﷺ کو کرتے دیکھا ہو گا۔ ان اَخبار و آثار کے مجموعہ کا نام حدیث ہے۔

حدیث ِنبویؐ کے دو حصے ہیں: متن اور سند۔ متن (text)یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کیا ارشاد فرمایا۔ جبکہ سند یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے کس نے سنا' اُس سے کس نے سنا۔ یعنی آنجنابؐ سے صحابی' صحابی سے تابعی 'تابعی سے تبع تابعی' یہ روایت کہلاتی ہے' اور یہ کڑیاں (links)راوی کہلاتے ہیں۔ امام بخاریؒ جب کوئی حدیث بیان کرتے ہیں تو اپنی شخصیت سے لے کر نبی کریم ﷺ تک درمیان کی تمام کڑیاں بیان کرتے ہیں۔ اس طرح وہ ایک مستند درجے کی حدیث ہوتی ہے۔ یہ کڑیاں نبی اکرم ﷺ سے لے کر محدث تک ہونی چاہئیں۔ ہمارے ہاں علماء کے اندر بھی سند چلتی ہے ۔جو لوگ دینی علوم سے فارغ التحصیل ہیں' ان کی بھی سند ہے۔ آج دینی مدارس کے جو شیخ الحدیث ہیں انہیں بھی ائمۂ حدیث سے لے کر اپنے آپ تک پورا سلسلۂ سند معلوم ہوتا ہے۔ ان تصریحات سے اندازہ کریں کہ حدیث کی خاطر کتنی محنت ہوئی ہے اور کس قدر کوشش کی گئی ہے۔

حدیث کی سند میں جن راویوں کے نام آتے ہیں ان کے حالات کی جانچ پرکھ کی جاتی ہے۔ دیکھنا پڑتا ہے کہ کہیں کسی راوی پر جھوٹ کا الزام تو نہیں' کسی کو سوءِ حفظ کا عارضہ تو لاحق نہیں تھا۔ ہر راوی کے سیرت و کردار کو جانچا جاتا ہے۔ راویوں کے بارے میں ان معلومات کا علم ''اسماء الرجال'' کہلاتا ہے اور تاریخ ِانسانی میں صرف آنحضور ﷺ ہی کی یہ خصوصیت ہے کہ آپ کی حدیث کو جانچنے کے لیے تمام راویوں کے حالات کا بخوبی جائزہ لیا جاتا ہے۔

سند کے اعتبار سے حدیث کی چند اقسام یہ ہیں: مسند' مرفوع' مرسل' ضعیف'

موضوع۔ مسند: وہ حدیث جس کی ساری کڑیاں آپس میں ملی ہوئی ہوں' کہیں کوئی وقفہ نہ ہو' یعنی متصل ہو۔ مرفوع:وہ حدیث جو رسول اللہ ﷺ سے روایت کی جا رہی ہو۔ مرسل: وہ حدیث ہے جو ایک تابعی رسول

اللہ ﷺ سے بیان کر رہے ہوں اور یہ نہ بتا رہے ہوں کہ انہوں نے یہ حدیث کس صحابی سے سنی ہے۔ مرسل کا درجہ وہ نہیں ہے جو مرفوع کا ہے۔ ضعیف: جس میں کسی ایک راوی کا کردار معیاری نہ ہو' یا اسے سوء حفظ کا عارضہ ہو۔ اگر روایت کی کسی ایک کڑی میں بھی ان دونوں میں سے کوئی ایک بات ہو تو وہ حدیث ضعیف ہے۔ موضوع: جس روایت کے بارے میں محدثین کرام نے چھان بین کر کے یہ فیصلہ کر لیا ہو کہ یہ کوئی مَن گھڑت حدیث ہے' اس کی نسبت آنجناب ﷺ کی جانب درست نہیں ہے' اسے موضوع کہتے ہیں۔ احادیث میں جو موضوع ہیں انہیں بھی جمع کیا گیا ہے۔ ایسی کتابوں کو ''کتاب الموضوعات'' کا نام دیا جاتا ہے۔

ضعیف احادیث کے ضمن میں یہ واضح رہے کہ کسی حدیث کے ساتھ ضعیف لکھا ہو تو اس سے ہمیں خیال پیدا ہوتا ہے کہ اس کو چھوڑ دیں' یہ تو ضعیف ہے۔ حالانکہ سند کی ایک کڑی میں بھی ضعف ہو تو حدیث ضعیف کہلاتی ہے۔ ضعیف احادیث کے اندر بھی علم و حکمت کے بڑے اعلیٰ موتی ہوتے ہیں۔دیکھئے' ایک ہے کسی بات کا سچ ہونا' جبکہ ایک ہے سچ کا سچ ثابت ہوجانا۔ کتنے ہی سچ ایسے ہوتے ہیں جن کو ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ آپ نے وکلاء سے سنا ہو گا کہ خالص سچ پر کوئی ایک مقدمہ بھی نہیں جیتا جا سکتا' کچھ نہ کچھ جھوٹ اس میں شامل کرنا پڑتا ہے۔ تو سچ کا ثابت کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ آپ یہ نہ سمجھیں کہ جو سچ ثابت نہ ہو سکے وہ جھوٹ ہے ۔ چنانچہ ضعیف حدیث کمزور تو ہے 'لیکن موضوع نہیں ہے' وہ متروک نہیں ہو گی کہ اسے چھوڑ دیا جائے۔ ہاں اس سے کوئی حکم شرعی نہیں نکلے گا۔ اس سے حلت و حرمت کے احکامات اخذ نہیں کیے جائیں گے۔ اگر ہم ضعیف احادیث سے احکامات اخذ کرنا شروع کر دیں تو پھر شریعت اصل شکل میں باقی نہ رہے گی۔ ضعیف احادیث فضائل کے ضمن میں قابلِ قبول ہیں۔ ہمارے ہاں بہت سے مصنّفین اپنی کتب میں ضعیف احادیث کی صورت میں حکمت کے بڑے قیمتی موتی لائے ہیں۔

چالیس احادیث حفظ کرنے کی فضیلت

خطباتِ جمعہ کی ان نشستوں میں ہمیں ''اربعینِ نووی'' کا مطالعہ کرنا ہے ۔اس کے آغاز سے قبل ہم چالیس احادیث حفظ کرنے کی فضیلت کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اس کے رواۃ میں حضرات علی' عبداللہ بن مسعود' معاذ بن جبل' عبداللہ بن عمر' عبداللہ بن عباس' انس بن مالک' ابوالدرداء اور ابوسعید الخدری رضوان اللہ علیہم اجمعین ہیں 'جو سب جلیل القدر اور ثقہ صحابہ ہیں۔ لیکن کہیں تابعین یا تبع تابعین کی سطح پر کوئی راوی ایسا آگیا ہے جو قابلِ اعتماد نہیں' جس کا حافظہ متأثر ہے یا جس کا سیرت و کردار مشکوک ہے ' لہٰذا یہ روایت ضعیف قرار پا گئی۔ وہ حدیث یہ ہے :((مَنْ حَفِظَ عَلٰی اُمَّتِیْ اَرْبَعِیْنَ حَدِیْثًا مِنْ اَمْرِ

دِيْنِهَا بَعَثَهُ اللهُ عَزَّوَجَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيْ زُمْرَةِ الْفُقَهَاءِ وَالْعُلَمَاءِ))''جس شخص نے میری امت کی حفاظت کی خاطر دین کے معاملے میں چالیس احادیث حفظ کیں' اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے روز فقہاء اور علماء کے گروہ میں سے اٹھائے گا''۔ ایک روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں : ((بَعَثَهُ اللهُ فَقِيْهًا عَالِمًا)) ''اللہ تعالیٰ اسے فقیہہ اور عالم کی حیثیت سے اٹھائے گا''۔ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے: ((وَكُنْتُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ شَافِعًا وَّشَهِيْدًا))''اُس شخص کے حق میں قیامت کے دن میں سفارش کرنے والا اور گواہی دینے والا ہوں گا''۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے :((قِيْلَ لَهُ ادْخُلْ مِنْ اَيِّ اَبْوَابِ الْجَنَّةِ شِئْتَ))''اس سے کہا جائے گا کہ تم جنت کے جس دروازے سے چاہو داخل ہو جاؤ''۔عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت'میں ہے : ((كُتِبَ فِيْ زُمْرَةِ الْعُلَمَاءِ وَحُشِرَ فِيْ زُمْرَةِ الشُّهَدَاءِ))''اس شخص کا نام'علماء کی فہرست میں لکھ لیا جائے گا' اور وہ قیامت کے روز شہداء کے ساتھ اکٹھا کیا جائے گا''۔یہ حدیث اور اس کی مختلف روایات کو امام نوویؒ نے ''اربعینِ نووی'' کے مقدمہ میں نقل کیا ہے اور لکھا ہے کہ حفاظِ حدیث کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے اگرچہ اس کے طرق بہت زیادہ ہیں۔یہ حدیث ''کنز العمال'' میں بھی ہے۔ اس مجموعۂ احادیث میں ضعیف اور صحیح دونوں طرح کی احادیث موجود ہیں۔

حدیث کا ترجمہ کرتے ہوئے میں نے حفظ کا لفظ اس لیے برقرار رکھا ہے کہ ہمارے ہاں حفظ کا ایک عجیب تصوّر پایا جاتا ہے 'جیسے قرآن کا حافظ ہے لیکن مفہوم نہیں سمجھتا' یہ تو نام کا حافظ ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں جب کوئی حفظ کرتا تو وہ اس کے متن کے ساتھ ساتھ مفہوم کو بھی یاد کرتا 'بلکہ اس سے آگے بڑھ کر وہ اس پر عمل بھی کرتا۔ امام سیوطی رحمہ اللہ علیہ کی کتاب ''الاتقان فی علوم القرآن'' میں روایت موجود ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے جن حضرات کا خاص شغف قرآن سے تھا 'جیسے حضرت عثمان بن عفان اور حضرت عبداللہ بن مسعودرضی اللہ عنہما'وہ فرماتے ہیں کہ جب ہم نبی اکرم ﷺ سے دس آیات پڑھ لیتے تو آگے نہ بڑھتے جب تک ہمیں ان کا علم حاصل نہ ہو جاتا اور جب تک ہم اس پر عمل نہ کر لیتے۔ آپ ملاحظہ فرمائیں کہ تین چیزیں جمع ہو گئیں ! الفاظ ان کے حافظے میں محفوظ ہو گئے' علم ان کے ذہن میں آگیا اور عمل ان کی سیرت کا حصّہ بن گیا۔ یہ تین شرائط پوری ہوں گی تو کوئی حافظ کہلانے کا مستحق ہو گا۔ اب ''حفظ'' کے لفظ کو مدّ نظر رکھ کر مذکورہ بالا حدیث کا مطالعہ کریں۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے کچھ تابعین نے سوال کیا تھا کہ آنجناب کا اخلاق کیا تھا؟ تو اُمّ المؤمنین نے فرمایا تھا: كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنَ أَمَا تَقْرَأُ الْقُرْآنَ قَوْلَ اللهِ عَزَّوَجَلَّ وَإِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (مسند احمد' ح۲۳۴۶۰)''آپؐ کا اخلاق قرآن کریم تھا۔ کیا تم قرآن میں اللہ تعالیٰ کا یہ قول نہیں پڑھتے ہو: یقیناً آپؐ خلق عظیم کے حامل ہیں''۔ واضح رہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا شمار چوٹی کے فقہائے صحابہؓ میں ہوتا ہے۔ حضراتِ

تابعین جب آنحضور ﷺ کی سیرت و کردار کے بارے میں پوچھ رہے ہوں گے تو انہیں کتنی حسرت ہو گی کہ اگر ہم بھی چند سال پہلے دنیا میں آجاتے تو آنجناب ﷺ کی صحبت سے مستفید ہو جاتے۔ ؎
قسمت کی خوبی دیکھیے ٹوٹی کہاں کمند دو چار ہاتھ جبکہ لب بام رہ گیا !

قرآن وحی متلو ہے جس کی تلاوت کی جاتی ہے ‘جو الفاظ اور حروف کی شکل میں ہمارے پاس ہے اور آنجناب ﷺ قرآن مجسم تھے ‘قرآن حکیم ان کے رگ و پے میں سرایت کرگیا تھا۔ جب آپ قرآن کریم پڑھیں گے تو بہت سی سورتیں سیرت کے ابواب دکھائی

دیں گی۔ سورۃ الانفال میں غزوۂ بدر کا تذکرہ ہے۔ سورۃ آل عمران کا ایک بہت بڑا حصّہ غزوۂ اُحد پر مشتمل ہے۔ سورۃ التوبۃ کا ایک بڑا حصّہ غزوۂ تبوک سے متعلق ہے۔ لہٰذا قرآن کریم کی جملہ تعلیمات کو مجسم شکل میں دیکھنا ہو تو وہ محمد رسول اللہ ﷺ کی شخصیت ہے۔ یعنی تم قرآن حکیم پڑھو ‘ اسی کے آئینہ میں حضرت محمد ﷺ کی سیرت نظر آئے گی۔

((مَنْ حَفِظَ عَلٰی اُمَّتِیْ...))جو حدیث بیان ہوئی ہے اس پر علماء کا اتفاق ہے کہ یہ ضعیف ہے ‘لیکن اس سے اشتغال کا معاملہ دیکھیں کہ پچاس سے زائد ائمہ دین اور علماء کرام نے چالیس چالیس احادیث کے مجموعے مرتب کیے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ علیہ نے بھی چالیس احادیث کا گلدستہ تیار کیا۔

ہم جو ’’الاربعین‘‘ پڑھیں گے‘ اس کے مؤلّف امام نوویؒ ہیں‘ جن کا پورا نام یحییٰ بن شرف الدین النوویؒ ہے۔ آپ ۶۳۱ھ میں پیدا ہوئے اور ۶۷۶ھ میں فوت ہوگئے۔ گویا کل ۴۵ برس عمر پائی۔ اتنے کم عرصے میں حدیث کے سلسلے میں ان کی بڑی خدمات ہیں۔ انہوں نے صحیح مسلم کی شرح بھی لکھی۔ ’’ریاض الصالحین‘‘ امام نوویؒ ہی کا مرتب کردہ احادیث کا مجموعہ ہے جو نہایت مقبول ہے۔ اسی طرح تمام ’’أربعین‘‘ جو مرتب ہوئی ہیں‘ ان میں مقبول ترین امام نوویؒ کی اَربعین ہے۔ عربی میں کتاب کا اصل نام ’’الاربعون النوویۃ‘‘ ہے ‘ لیکن ہمارے ہاں فارسی ترکیب کی وجہ سے ’’اربعین نووی‘‘ ہے۔

عصر حاضر کے دو عظیم فتنے

اس وقت دنیا میں دو فتنے بہت بڑے ہیں اور بدقسمتی سے ان دونوں کو بڑا فروغ حاصل ہے۔ ان دونوں فتنوں کا تعلق رسول اللہ ﷺ کی شخصیت سے ہے۔ ان میں سے ایک فتنہ ختم نبوت کی مہر توڑنے والا‘ نئی نبوت کا دعوے دار ہے‘ جبکہ دوسرا فتنہ انکارِ حدیث کا ہے ۔ کچھ عرصہ پہلے ایران میں بہاء اللہ اٹھا تھا جو نبوت کا

مدّعی تھا۔ بہائی آج بھی پوری دنیا میں موجود ہیں۔ مسلمان ممالک میں ان کے دفاتر' لائبریریز اور ریڈنگ رومز ہیں۔ مغرب میں تو بہائی بہت زیادہ ہیں۔ اس کے بعد اٹھنے والا بہت بڑا فتنہ قادیانیت ہے' جسے مسلسل فروغ حاصل ہو رہا ہے ۔ سیٹلائٹ کے ذریعے سے پوری دنیا میں ان کے پروگرام نشر

ہوتے ہیں'جسے وہ اپنی صداقت کی دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں۔پوری مغربی دنیا ان کی پشت پناہی کر رہی ہے۔ اس فتنے کا سرغنہ غلام احمد قادیانی ہے۔ اس نے انگریزوں کی خوشنودی کے لیے جہاد فی سبیل اللہ کی نفی کی۔

ہندوستان میں انگریز نے محسوس کر لیا تھا کہ مسلمانوں کے اندر بغاوت کے جراثیم موجود ہیں' انہوں نے ہمیں دل سے قبول نہیں کیا' اس لیے کہ ہم نے مسلمانوں سے حکومت چھینی تھی' جبکہ ہندو تو پہلے ہی غلام تھا 'پہلے مسلمان کا غلام تھا' اب انگریز کا غلام ہو گیا۔ ان کے لیے تو معاملہ صرف آقاؤں کی تبدیلی کا تھا' جبکہ مسلمان حاکم سے محکوم بنائے گئے۔ اس لیے مسلمانوں کے اندر جذبۂ انتقام تھا' وہ اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اس کھوئے ہوئے مقام کو حاصل کرنے کے لیے مسلمانوں نے مختلف احیائی تحریکیں برپا کیں۔ حضرت سید احمد بریلویؒ کی تحریک اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے' جو اپنی اجتہادی غلطی کی وجہ سے ناکام ہو گئی۔ دُنیوی اعتبار سے اگرچہ وہ ناکام ہو گئے اور بالاکوٹ کے مقام پر شہادت پائی 'لیکن انہوں نے جہاد کا ایک صور پھونک دیا تھا ۔ چنانچہ طویل عرصہ تک اس علاقہ میں انگریزوں کے خلاف جہاد جاری رہا۔ اس کے بعد کتنے ہی علماء کرام کو پھانسی دے دی گئی اور بہت سوں کو ''کالا پانی'' بھیج دیا گیا۔

علماء کرام نے ہندوستان کو''دارالحرب'' قرار دے دیا تھا اور دارالحرب کے اندر رہتے ہوئے مسلمانوں کی یہ ذِمّہ داری ہے کہ وہ اس کو دارالاسلام بنانے کی کوشش کریں۔یہی وجہ ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز میں ہمیں ہندوستان میں ریشمی رومال کی تحریک نظر آتی ہے ۔یہ تحریک حضرت شیخ الہندؒ کی برپا کی ہوئی تھی جو چودھویں صدی کے مجدد کی حیثیت رکھتے ہیں۔یہ تحریک ایک تدبیر تھی' جو ناکامی سے دوچار ہو گئی۔ تدبیر یہ تھی کہ ایک طرف خلافت عثمانیہ سے کہا جائے کہ وہ ہندوستان پر حملہ آور ہو' دوسری طرف افغانستان کو آمادہ کیا جائے کہ وہ ہندوستان پر حملہ آور ہو اور اندر سے ہم بغاوت کر دیں'تاکہ انگریز کو ہندوستان سے اٹھا کر باہر پھینک دیں۔ خلافتِ عثمانیہ سے مدد لینے کے لیے حضرت شیخ الہندؒ خود حجاز گئے اور مدینہ منورہ میں ترک گورنر سے ملے ۔وہ آگے بھی جانا چاہتے تھے لیکن مخبری ہونے کی بنا

پر انہیں شریف حسین نے گرفتار کر کے ' چاندی کی طشتری میں رکھ کر انگریز کو پیش کر دیا' کہ یہ آپ کا باغی ہے' آپ کے خلاف سازشیں کر رہا ہے۔ اِس وقت اردن کا جو بادشاہ ہے وہ اسی شریف حسین کی نسل میں سے ہے۔ انگریز

حضرت شیخ الہندؒ کو واپس ہندوستان نہیں لائے بلکہ انہیں بحیرۂ روم (Mediterraneon Sea) کے ایک جزیرہ ''مالٹا'' میں قید میں ڈال دیا۔ بقول اقبال: ؎

اقبال کے نفس سے ہے لالے کی آگ تیز ایسے غزل سرا کو چمن سے نکال دو

آپ چار سال وہاں قید رہے۔ جب ٹی بی اپنی آخری حد کو پہنچ گئی تو پھر انہیں رہا کر دیا گیا کہ اگر یہ قید میں انتقال کر گئے تو ایک طوفان برپا ہو جائے گا۔ مسلمانوں کے دلوں میں موجزن جذبۂ جہاد کو سرد کرنے کے لیے انگریزوں نے غلام احمد قادیانی کی نبوت کا فتنہ کھڑا کیا' جس نے جہاد و قتال کو حرام قرار دینے کا اعلان کر دیا۔

عصر حاضر کا دوسرا بڑا فتنہ انکارِ حدیث کا فتنہ ہے۔ یہ فتنہ اپنی تأثیر کے اعتبار سے پہلے فتنہ سے بھی زیادہ خطرناک ہے 'کیونکہ یہ زیادہ پھیل رہا ہے۔ ختم نبوت کا مسئلہ اتنا واضح ہے کہ ہر مسلمان اس کو بآسانی سمجھتا ہے' لیکن فتنۂ انکار حدیث کا زیادہ ادراک و احساس نہیں ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ سرکاری سطح پر یہ طے ہے کہ قادیانی خواہ ربوائی (اصل قادیانی) ہوں یا لاہوری احمدی' دونوں دائرۂ اسلام سے خارج ہیں۔ اس کے مقابلہ میں انکارِ حدیث کا فتنہ اندر ہی اندر دیمک کی طرح اثر انداز ہو رہا ہے۔ یہ لوگ قرآن کریم کو ماننے اور سمجھنے کا دعویٰ تو کرتے ہیں لیکن حدیثِ نبویؐ کو مناسب مقام دینے کے لیے تیار نہیں ہیں' ان کے لیے صرف اخلاقی تعلیمات سے متعلق احادیث قابل قبول ہیں۔ حدیث شریف کو جائز مقام نہ دینے کی وجہ سے وہ قرآن حکیم کی غلط تأویلیں پیش کرتے ہیں۔ ان کا نظریہ ہے کہ اطاعتِ رسولؐ دائمی شے نہیں ہے' محمد رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی صرف اپنے زمانے کے لیے واجب الاطاعت تھی۔ قرآن کریم میں آیا ہے:

{قُلْ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَیْہِ مَا حُمِّلَ وَ عَلَیْکُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ ؕ وَ اِنْ تُطِیْعُوْہُ تَہْتَدُوْا ؕ وَ مَا عَلَی الرَّسُوْلِ

اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ ﴿۵۴﴾} (النور)

''آپ فرمایئے اطاعت کرو اللہ تعالیٰ کی اور اطاعت کرو رسول مکرم کی ۔ پھر اگر تم نے روگردانی کی تو (جان لو) رسول کے ذِمّہ اتنا ہے جو ان پر لازم کیا گیا اور تمہارے ذِمّہ ہے جو تم پر لازم کیا گیا' اور اگر تم اطاعت کرو گے تو ہدایت پاجاؤ گے۔ اور نہیں ہے ہمارے رسول کے ذِمّہ بجز اس کے کہ وہ صاف صاف پیغام دے رہے ہیں۔''

اسی طرح سورۃ التغابن میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

{وَ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّیْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰی رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ ﴿ ۱۲ ﴾}

''اور اطاعت کرو اللہ تعالیٰ کی اور اطاعت کرو رسول مکرم کی' پھر اگر تم نے روگردانی کی تو ہمارے رسول کے ذِمّہ فقط کھول کرپیغام پہنچانا ہے۔''

لیکن منکرینِ سُنّت کے نزدیک رسول اللہ ﷺ صرف اپنے دور کی حد تک ''مرکزِ ملّت'' ہونے کی حیثیت سے مطاع تھے اور ان کا حکم مانا جانا ضروری تھا۔ آئندہ مسلمانوں کا جو امیر یا حاکم ہو گا' وہ مرکز ملّت ہو گا اور اس حیثیت سے اس کی اطاعت فرض ہو گی۔ یہ فتنہ بڑی تیزی کے ساتھ پھیل رہا ہے۔ شریعت کی بہت ساری پابندیاں انہوں نے حدیث کو مناسب مقام نہ دینے کی وجہ سے نظر انداز کر دی ہیں۔ جیسے ان کے نزدیک پردے کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ تو ایک خاص دور کا کلچر تھا۔ اسی طرح قرآن کریم کی اور بہت ساری غلط تشریحات کر رہے ہیں' ترجمہ غلط کر رہے ہیں۔عام آدمی اور جدید تعلیم یافتہ لوگ عربی سے ناواقف ہوتے ہیں' لہٰذا وہ نہیں محسوس کرسکتے کہ ترجمہ غلط کیا جا رہا ہے۔ قادیانیوں نے بھی قرآن کریم کے ترجمہ میں تحریف کی۔ آخر وہی آیتیں ہیں جنہیں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے لے کر ہمارے دور کے علماء کرام تک تمام لوگ پڑھتے آئے ہیں' لیکن یہ لوگ ایسی غلط تأویلیں پیش کرتے ہیں کہ عقل کو بھی اپیل نہیں کرتیں۔ انسان کی یہ کمزوری ہے کہ جب وہ کسی مسئلہ میں کسی شخص سے متأثر ہو جاتا ہے تو اس کی ہر بات کو صحیح سمجھنا شروع کر دیتا ہے۔

ان لوگوں کی چند تأویلیں ملاحظہ ہوں۔ قرآن کریم میں آیا ہے کہ چور مرد ہو یا عورت' ان کے ہاتھ کاٹ دو۔ یہ کہتے ہیں کہ بالفعل ہاتھ کاٹنا مراد نہیں ہے' یہ تو مولویوں نے خواہ مخواہ غلط بات سمجھی ہے' یہ تو بڑا وحشیانہ فعل ہے' ہاتھ کاٹ دینا تو ایک محاورہ ہے۔ جیسے کبھی والدین اپنے بیٹے سے کہتے ہیں کہ تم نے تو ہمارے ہاتھ کاٹ دیے۔ یعنی کسی معاملہ میں تم نے کوئی ایسی بات کر دی ہے کہ اب ہمارے پاس کچھ نہیں رہا' کوئی چارۂ کار نہیں' تم نے ہمیں بے بس کر دیا ہے۔ گویا تم نے ہمارے ہاتھ کاٹ دیے ہیں۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ ایسا خوشحال معاشرہ پیدا کردو کہ کسی کو چوری کی ضرورت ہی نہ ہو' بس یہ ہے ہاتھ کاٹ دینا۔ حالانکہ قرآن مجید اس کے بعد کہتا ہے: {جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ۭ} (المائدۃ:۳۸)''بدلہ دینے کے لیے جو انہوں نے کیا (اور) عبرت ناک سزا اللہ کی طرف سے''۔ اب آپ سوچیں کہ مثالی نظام قائم کر دینا کوئی سزا ہے یا کوئی عبرت کی بات ہے؟

عجیب بات ہے کہ پنجاب نے دو غلام احمد پیدا کیے۔ ایک غلام احمد قادیانی' دوسرا غلام احمد پرویز۔ پہلے نے مہر ختم نبوت کو توڑا اور دوسرے نے حدیث اور سُنّتِ رسول ﷺ کو شریعت کی مستقل بنیاد ہونے کی حیثیت سے چیلنج کر دیا۔ جیسے قادیانیوں کو مغرب کی آشیر باد حاصل ہے ایسے ہی حدیث کی قدر و قیمت کو گھٹانے والے لوگوں کو بھی ان کی پشت پناہی حاصل ہے۔ کیونکہ تہذیبوں کے تصادم کے حوالے وہ اسلامی تہذیب کو ختم کرنے کے درپے ہیں اور اسلامی تہذیب و ثقافت کا انحصار اکثر و بیشتر حدیث و سُنّت پر ہے۔ رینڈ کارپوریشن کی

سفارشات میں شامل تھا کہ ایسے جدید تعلیم یافتہ لوگ جو اسلام کی ایسی تعبیریں کریں جو ہماری تہذیب کے ساتھ مماثل ہوں ان کی پشت پناہی کی جائے اور خاص طور پر انہیں الیکٹرانک میڈیا پر آنے کا بھرپور موقع دیا جائے۔ اور آج پاکستان میں بڑے پیمانے پر یہی ہو رہا ہے۔ اس اعتبار سے آج زیادہ ضرورت ہے کہ آپ حدیث نبویؐ کا مطالعہ کریں' تاکہ اس کی عظمت ہمارے دلوں میں جاگزیں ہو جائے اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ محبت کا ایک رشتہ مضبوط ہو جائے۔

أقول قولی هذا واستغفر اللّٰہَ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلماتoo

---

۲۷ جولائی ۲۰۰۷ء کا خطابِ جمعہ

بانی تنظیم اسلامی و مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ علیہ نے ۰۸-۲۰۰۷ء کے دوران اپنے خطاباتِ جمعہ میں امام یحییٰ بن شرف الدین النووی رحمہ اللہ علیہ کے شہرۂ آفاق مجموعہ احادیث ''اربعینِ نوویؒ'' کا سلسلہ وار مطالعہ کرایا تھا۔ اس سلسلہ کے ابتدائی خطابات ترتیب و تسوید کے بعد یثاق (جنوری تا ستمبر۲۰۰۸ء) میں شائع کیے گئے تھے' جن میں سے چار خطابات کو ''اسلام' ایمان اور احسان: حدیث جبریلؑ کی روشنی میں'' کے عنوان سے کتاب کی شکل دے دی گئی ہے۔پیش نظر خطاب ''اربعینِ نوویؒ'' کی تیسری حدیث کے مطالعہ پر مشتمل ہے' جس کی ترتیب و تسوید کی سعادت حافظ محمد زاہد نے حاصل کی ہے۔ (ادارہ)

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ {وَ مَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰہَ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ ۙ حُنَفَآءَ وَ یُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَ یُؤْتُوا الزَّکٰوۃَ وَ ذٰلِکَ دِیْنُ الْقَیِّمَۃِ ؕ﴿۵﴾} (الْبَیِّنَۃ)

عَنْ اَبِیْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رضی اللہ عنہما قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ یَقُوْلُ :

((بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ: شَھَادَۃِ اَنْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰہِ' وَاِقَامِ الصَّلَاۃِ' وَاِیْتَاءِ الزَّکَاۃِ' وَحَجِّ

الْبَيْتِ، وَصَوْمِ رَمَضَانَ)) (۱)

ابو عبد الرحمن ،سیدنا عبد اللہ بن عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما سے روایت ہے ،کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا:

(۱) صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب بنی الاسلام علی خمس۔وصحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان ارکان الاسلام

''اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے: گواہی دینا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں اور محمد (ﷺ) اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں، نماز قائم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا، بیت اللہ کا حج کرنا اور رمضان المبارک کے روزے رکھنا۔''

معزز سامعین کرام!

آج جو حدیث ہمارے زیر مطالعہ ہے ،جس کا متن اور اردو ترجمہ میں نے آپ کے سامنے بیان کیا، یہ متفق علیہ ہے، یعنی اس کی صحت پر امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ دونوں کا اتفاق ہے اور ایسی حدیث مجموعۂ احادیث میں سب سے زیادہ مستند اور صحت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہوتی ہے ---- ہمارے ہاں کتب احادیث کے حوالے سے ''صحاح ستّہ'' کی اصطلاح بہت معروف ہے ،یعنی چھ ایسے مجموعہ ہائے احادیث (صحیح البخاری، صحیح مسلم، سنن الترمذی، سنن ابی داؤد، سنن ابن ماجہ اور سنن النسائی) جو صحیح احادیث پر مشتمل ہیں --- اِن صحاح ستّہ میں بھی بخاری و مسلم کا درجہ سب سے بلند ہے اور ان دونوں کو ''صحیحین'' بھی کہا جاتا ہے۔ پھر وہ حدیث جس پر امام بخاری و مسلم دونوں متفق ہو جائیں تو وہ روایت اور سند کے اعتبار سے قرآنِ کریم کے بہت قریب پہنچ جاتی ہے۔ گویا وہ قرآن کی طرح قطعی الثبوت ہوتی ہے اور اس پر ہم اتنا یقین کر سکتے ہیں جتنا قرآنی آیات پر کرتے ہیں۔

زیر مطالعہ حدیث کا مضمون بعینہٖ وہ ہے جو حدیث جبریل میں بیان ہوا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ حدیث جبریل ''اُمُّ السُّنّۃ'' کہلاتی ہے ۔ یعنی احادیث کے مجموعے میں اس کا وہی مقام ہے جو قرآن مجید میں سورۃ الفاتحہ کا ہے۔ سیّدنا جبرائیل علیہ السلام نے جب آپ ﷺ سے سوال کیا: ((اَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِسْلَامِ)) یعنی مجھے اسلام کے بارے میں بتایئے (کہ اسلام کیا ہے؟) تو اس کے جواب میں محمد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اَلْاِسْلَامُ اَنْ تَشْهَدَ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ، وَتُقِيْمَ الصَّلَاةَ، وَتُؤْتِيَ الزَّكَاةَ، وَتَصُوْمَ رَمَضَانَ، وَتَحُجَّ الْبَيْتَ اِنِ اسْتَطَعْتَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا))

''اسلام یہ ہے کہ تُو گواہی دے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں ‘اور تُو نماز قائم کرے‘ زکوٰۃ ادا کرے‘ رمضان المبارک کے روزے رکھے اور بیت اللہ کا حج کرے اگر تجھے اس کے لیے سفر کی استطاعت ہو۔''

ارکانِ اسلام ‘کُل اسلام نہیں !

ان دو احادیث کا مضمون تقریباً ایک جیسا ہی ہے ۔ فرق صرف اتنا ہے کہ حدیث جبریل میں یہ مضمون حدیث کا ایک جزو ہے جبکہ یہ مکمل (independent) حدیث ہے۔ جہاں تک اس حدیث کے مشمولات (contents)کا تعلق ہے ان پر حدیث جبریل میں تفصیل سے گفتگو ہو چکی ہے‘ البتہ زیر مطالعہ حدیث کا آغاز جس جملے سے ہو رہا ہے : ''بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ''(اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے) وہ انتہائی اہم اور غور طلب ہے۔ اس حدیث مبارکہ (جس میں ارکانِ اسلام کو بیان کیا گیا ہے) کے بارے میں لوگوں کو ایک غلط فہمی اور مغالطہ ہوا ہے کہ انہوں نے ارکانِ اسلام ہی کو اسلام کی مکمل تعبیر سمجھ لیا ہے۔ حالانکہ حدیث کا پہلا جملہ ہی اس تصوّر کی نفی کرتا ہے اور واضح کرتا ہے کہ اسلام کی بنیاد ان چیزوں پر ہے ۔ اب یہ بالکل بدیہی امر ہے کہ بنیاد اور شے ہے اور عمارت اور شے ۔ لہٰذا یہ ارکانِ اسلام ہیں مکمل اسلام نہیں‘ جبکہ آج انہی ارکانِ خمسہ کو کل کا کل اسلام قرار دے دیا گیا ہے ۔ اس تصوّر سے ایک بہت بڑی حقیقت نظر انداز ہو جاتی ہے اور یہ عام مغالطہ ہے جو لوگوں کو اس حدیث کے حوالے سے ہوا ہے۔

یہ حدیث بہت مشہور ہے اور اکثر مساجد میں کبھی اس حدیث کے حوالے سے بڑے بڑے چارٹ لٹکے ہوئے ہوتے تھے‘ جس میں ایک مسجد کی محراب کی سی شکل بنا کر اور اس میں پانچ ستون دکھا کر ارکانِ اسلام کا ایک نقشہ پیش کیا جاتا تھا ۔

تخلیقِ انسانی کا مقصد : عبادتِ ربّ

قرآن مجید میں تخلیق انسانی کا مقصد عبادتِ ربّ قرار دیا گیا ہے ۔ ارشادِ ربانی ہے:

{وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ ﴿ ۵۶ ﴾}(الذّٰریٰت)

''میں نے جنوں اور انسانوں کو نہیں پیدا کیا مگر صرف اس لیے کہ میری بندگی اور پرستش کریں۔''

لہٰذا مقصدِ تخلیقِ انسانیت عبادتِ الٰہی ہے اور جمیع انبیاء کرام علیہم السلام اسی کی دعوت دیتے رہے ہیں۔ قرآن مجید کی مکی سورتوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ہود‘ حضرت صالح‘

حضرت ابراہیم ‘ حضرت موسیٰ ‘حضرت عیسیٰ الغرض تمام انبیاء و رسل علیہم السلام کی دعوت ’’عبادتِ رب‘‘کی دعوت تھی: {قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ}(ھود:۵۰) ’’اے میری قوم ! عبادت کرو اللہ کی جس کے سوا تمہارا کوئی پروردگار نہیں‘‘۔ تمام انبیاء کرامؑ کی طرح نبی آخر الزماں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی دعوت بھی ’’عبادتِ ربّ‘‘ ہی کی دعوت تھی:{یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ وَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۲۱﴾ } (البقرۃ)’’اے لوگو ! اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں اور تم سے پہلوں کو پیدا کیا‘ تاکہ تم بچ سکو‘‘۔ نبی اکرم ﷺ کی دعوت اور سابقہ رسولوں کی دعوت میں ایک بنیادی فرق ہے کہ سابقہ انبیاء و رُسل علیہم السلام کا صیغۂ خطاب ’’یٰقَوْمِ‘‘ (اے میری قوم کے لوگو !) ہوتا تھا‘ اس لیے کہ وہ کسی خاص علاقے اور کسی خاص قوم کی طرف مبعوث کیے جاتے تھے ‘جبکہ نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کی دعوت کا صیغۂ خطاب تھا: ’’یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ‘‘(اے لوگو !) اس لیے کہ آپ ﷺ کی دعوت عالمگیر اور آفاقی ہے یعنی پوری نوع انسانی کے لیے ہے --- اس فرق کے باوجود سابقہ تمام انبیاء ورُسل علیہم السلام اور نبی آخر الزماں ﷺ کی دعوت ایک ہی ہے‘ یعنی عبادتِ ربّ کی دعوت۔

عبادت کا جامع مفہوم

اب یہ سمجھنا ضروری ہے کہ ’’عبادت‘‘ کا مفہوم کیا ہے۔ لفظ عبادت عبد سے نکلا ہے‘ عبد غلام کو کہتے ہیں اور غلام آقا کی ملکیت ہوتا ہے‘ صرف ملازم نہیں ہوتا۔ ملازم تو چند گھنٹوں یا کسی خاص ڈیوٹی کے لیے ہوتا ہے اور اس کام کو کرنے کے بعد وہ آزاد ہے‘ جو چاہے کرے‘ جہاں چاہے جائے۔ مثلاً کسی کو آپ نے اپنا ڈرائیور رکھا ہے تو وہ آپ کا کھانا تو نہیں پکائے گا۔ اسی طرح اگر کسی کو آپ نے خانساماں رکھا ہے تو وہ آپ کا ٹائلٹ صاف نہیں کرے گا۔ اگر آپ اسے کہیں گے بھی تو وہ صاف کہے گا کہ یہ میری ذمہ داری نہیں ہے‘ میں اس کام کے لیے آپ کا ملازم نہیں ہوں۔ جبکہ غلام کی حیثیت ایسی نہیں ہوتی ۔ غلام کو ہمہ تن‘ ہمہ وقت اور ہمہ وجوہ اپنے آقا کی اطاعت کرنا ہوتی ہے۔اس کی اپنی کوئی مرضی نہیں ہوتی اور نہ اس کی کوئی ملکیت ہوتی ہے۔ وہ کسی چیز کا مالک کیا بنے گا وہ تو خود مملوک

ہے۔ آقا اسے جہاں سونے کو کہے گا ‘ وہاں سونا ہو گا اور جہاں اور جس وقت جانے کو کہے گا جانا ہو گا۔ اس کا اپنا کوئی ارادہ ہے نہ پروگرام اور نہ ہی کوئی لائحۂ عمل‘ بلکہ وہ تو آقا کے اشارۂ ابرو پر چلے گا۔ یہ ہے عبادت کا مفہوم‘ کہ اللہ (جو ہمارا آقا ہے) کی اطاعت میں عبدیت (غلامی) کا تصوّر ہر وقت ذہن میں نقش رہے۔ اسی کو فارسی میں بندگی کہا جاتا ہے۔ شیخ سعدیؒ کا مشہور شعر ہے: ؎

زندگی آمد برائے بندگی زندگی بے بندگی شرمندگی !

یعنی ہمیں زندگی فقط بندگی کے لیے ملی ہے ‘اگر بندگی نہیں کریں گے تو یہ شرمندگی ہی شرمندگی ہو گی--- پچھلے زمانے میں ایسیا شعار بھی مساجد میں لکھے ہوتے تھے۔

یہاں غلامی اور عبادت کا فرق بھی ذہن نشین رہے کہ غلام جو آقا کی اطاعت کر رہا ہے وہ مجبوری سے کر رہا ہے ‘کیونکہ اس نے اُسے خرید رکھا ہے ‘وہ اس کا مالک ہے اور اس نے اس کی قیمت ادا کی ہے ۔ لیکن سمجھ لیجیے کہ یہ بھی عبادت نہیں ہے۔ عبادت میں کرنا تو وہی ہے جو ربّ تعالیٰ کی منشا ہے ‘لیکن مجبور ہو کر نہیں بلکہ محبت الٰہی کے جذبۂ مستانہ سے سرشار ہو کر اپنی جبین نیاز کو بارگاہِ الٰہی میں اس ادا سے رکھنا کہ جسم ظاہری کے روئیں روئیں سے انا عبدک‘ انا عبدک کی صدائے حق بلند ہو۔ اسی لیے میں نے عبادت کے مفہوم میں بندگی کے ساتھ ’’پرستش‘‘ کا لفظ بھی شامل کیا تھا‘ اس لیے کہ پرستش ہوتی ہی محبت کے ساتھ ہے۔ مثلاً اگر آپ دولت کے پرستار ہیں تو آپ کے دل میں دولت کی محبت ہے‘ وطن پرست ہیں‘ قوم پرست ہیں‘ نفس پرست ہیں تو یقیناً ان کی محبت آپ کے دل میں موجود ہے۔ لہٰذا جب بندگی اس جذبۂ اُلفت میں ڈوب کر کی جائے گی تو وہ عبادت کا مقام حاصل کرے گی ۔

ایک بات سمجھ لیجیے کہ ہماری عبادت کا اس مقام و مرتبہ تک پہنچنا انتہائی مشکل کام ہے‘ لہٰذا اس ضمن میں صحیح طرزِ عمل یہ ہوگا کہ آپ طے کر لیں کہ مجھے چلنا اسی راستے پر ہے۔پھر اس راہ میں نشیب و فراز آئیں گے‘ کہیں قدم ڈگمگائیں گے‘ کہیں جذبات کا غلبہ ہو گا‘ کبھی نا امیدی ہی نا امیدی چھائے گی اور کسی جگہ اُمید کی کرن نظر آئے گی ‘مگر آپ کو بندگی اور پرستش کے راستے پر مسلسل چلتے رہنا ہے۔ اگر کہیں قدم پھسل گیا تو وہیں کیچڑ میں پڑے

نہیں رہنا‘ کبھی بھی کسی گناہ پر مصر نہیں ہونا اور ڈیرہ ڈال کر نہیں بیٹھنا۔ جب بھی کوئی ایسی لغزش سرزد ہو جائے تو فوراً توبہ کر کے بخشوانا ہے‘ ورنہ ایک ہی گناہ تباہی اور ہلاکت کے لیے کافی ہے۔یہ ہے عبادت کا جامع مفہوم !

ارکان اسلام کی اہمیت

(۱) اقامتِ صلوٰۃ:

عبادت کے اس اعلیٰ مرتبہ کو آسانی سے پانے اور اللہ کی بندگی اور پرستش کے جذبہ کو تازہ رکھنے کے لیے چار عبادات فرض کر دی گئی ہیں جن کا ذکر زیر مطالعہ حدیث میں ہوا ہے ۔یہ چاروں اسلام کے ارکان اور اسلام کی عمارت کے چار ستون ہیں۔ان میں سب سے مقدّم اور اہم نماز ہے۔نماز کو دن میں پانچ مرتبہ فرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ انسان اپنے مقصدِ تخلیق ’’عبادتِ رب‘‘ کو نہ بھولے۔اس لیے کہ نماز کی ہر رکعت میں سورۃ الفاتحہ پڑھی جاتی ہے اور اس

سورۃ کی سات آیات (انہیں ''سبع مثانی'' یعنی بار بار پڑھی جانے والی آیات بھی کہا جاتا ہے)میں مرکزی اور چوٹی کی آیت چوتھی ہے:{اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ ؕ ﴿۴﴾ }چونکہ اس آیت میں ''نَعۡبُدُ'' اور ''نَسۡتَعِیۡنُ'' فعل مضارع کے صیغے ہیں اور عربی زبان میں فعل مضارع حال اور مستقبل دونوں کو cover کرتا ہے' اس لیے اس آیت کا ترجمہ یوں ہوگا: '' اے اللہ ! ہم تیری ہی بندگی و پرستش کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے' اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں اور مانگتے رہیں گے''۔یہ قول و قرار دن میں پانچ مرتبہ نماز کی ہر رکعت میں دہرایا جائے۔ حفیظ جالندھری نے کیا خوب کہا ہے:؎

سرکشی نے کر دیے دھندلے نقوشِ بندگی
آئو سجدے میں گریں لوحِ جبیں تازہ کریں !

تو انہی نقوشِ بندگی کو تازہ رکھنے کے لیے اوّلین اور اہم ترین ذریعہ نماز ہے۔

(۲) صیامِ رمضان

:دوسرے یہ کہ آپ کے ساتھ نفسِ حیوانی لگا ہوا ہے 'جس کے تقاضے بھی حیوانی ہیں ۔ان تقاضوں میں سے سب سے اہم دو چیزیں ہیں: (۱) خوراک (۲)جنسی جذبۂ شہوت۔ زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے خوراک ضروری ہے' ورنہ مرجائیں

گے 'اور نسل انسانی کی بقا کے لیے جذبہ شہوت یعنی شادی بیاہ ضروری ہے 'ورنہ نسل ختم ہوجائے گی۔ لیکن یہ دونوں حیوانی داعیے (animal instincts) اتنے طاقتور ہیں کہ جب اندر سے اُبھرتے ہیں تو اندھے بہرے ہوتے ہیں ۔ انہیں صرف اس سے غرض ہوتی ہے کہ کسی طرح ان کی تسکین ہونی چاہیے۔بھوک لگتی ہے تو پیٹ کچھ کھانے کو مانگتا ہے۔ اسے اس سے غرض نہیں کہ جو چیز اس میں ڈالی جارہی ہے وہ حلال ہے یا حرام ' بس اس کی تو بھوک مٹنی چاہیے۔ اسی طرح جب جذبۂ شہوت بھڑک اٹھے تو وہ اپنی تسکین چاہتا ہے' جائز راستے سے ہو یا ناجائز راستے سے۔

یوں سمجھئے کہ ہمارا یہ حیوانی وجود گھوڑے کی مانند ہے اور ہمارا روحانی وجود یعنی وجودِ حقیقی اس پر سوار ہے ۔اگر گھوڑا منہ زور ہے اور سوار کمزور ہے تو سوار گھوڑے کے رحم و کرم پر ہے'وہ جہاں چاہے اُسے پٹخ دے گا'جس کھائی میں چاہے اسے گرا دے گا۔ چنانچہ اس پر سواری کے لیے ضروری ہے کہ اس روحانی وجود کو طاقتور بنایا جائے'اس کی خودی اور انا کو مضبوط کیا جائے تاکہ یہ بھوک اور شہوت کی شدت کو برداشت کر سکے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے روزہ فرض کر دیا گیا کہ سارا دن بھوکے اورپیاسے رہو' چاہے سخت گرمی ہی کیوں نہ ہو۔ طلوعِ فجر

کے بعد سے غروبِ آفتاب تک کھانے پینے کی ہر جائز چیز بھی آپ پر حرام ہے۔ اپنی منکوحہ بیوی سے بھی روزہ کی حالت میں تعلق قائم کرنا حرام ہے۔ اس منہ زور گھوڑے کو لگام دینے کے اس عمل کو تقویٰ سے تعبیر کیا گیا ہے' یعنی بچ بچ کر چلتے رہو اور حیوانی وجود پر مکمل کنٹرول حاصل کرو' اسے آزاد مت چھوڑو!

(۳) ایتائے زکوٰۃ

:یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انسان مال سے بہت زیادہ محبت کرتا ہے۔ قرآن مجید کے الفاظ ہیں:{وَ اِنَّہٗ لِحُبِّ الْخَیْرِ لَشَدِیْدٌ ۝ ۸ }(العٰدیٰت)''بلاشبہ وہ (انسان) مال کی محبت میں بہت سخت ہے''۔ دُنیا میں زندگی بسر کرنے کے لیے سامانِ زندگی تو ضرور چاہیے اور یہ پیسے سے حاصل ہوتا ہے' لہٰذا کسی حد تک اس کی ضرورت ہے' لیکن انسان اس سے بہت آگے بڑھ کر دولت پرست اور مال کا پجاری بن جاتا ہے۔ انسان اس کی محبت میں اندھا ہو جاتا ہے اور حلال و حرام کی پروا کیے بغیر صبح و شام مال جمع کرنے کی فکر

میں رہتا ہے' بلکہ اس کے لیے ظلم اور غصب کا راستہ اختیار کرنے سے بھی نہیں کتراتا۔ اس طرزِ عمل سے روکنے کے لیے اسلام نے زکوٰۃ کا نظام نافذ کیا کہ دوسروں کو اللہ کے لیے دیتے رہنے کی عادت ڈالو' زیادہ سے زیادہ راہِ خدا میں خرچ کرو۔ لوگ صرف زکوٰۃ کی ادائیگی ہی کافی سمجھتے ہیں' حالانکہ حدیث میں ہے:

((اِنَّ فِی الْمَالِ لَحَقًّا سِوَی الزَّکٰوۃِ)) (۲)

''تمہارے مال میں (غریبوں کے لیے) زکوٰۃ کے علاوہ بھی حق ہے۔''

اس کو فقہی اصطلاح میں ''صدقاتِ نافلہ'' کہتے ہیں۔ زکوٰۃ چونکہ فرض ہے اس لیے وہ تو علی الاعلان دی جائے گی' جبکہ صدقاتِ نافلہ رازداری اور خفیہ طریقے سے دیے جائیں گے۔ ایک ہاتھ سے دیا جائے تو دوسرے ہاتھ تک کو خبر نہ ہو' اس کا ڈھنڈورا نہ پیٹا جائے۔ اسلامی ریاست میں اموالِ ظاہرہ پر زکوٰۃ حکومت وصول کرتی ہے اور اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ ہر ایک کو انفرادی طور پر ادا کرنی ہوتی ہے۔

(۴) حج بیت اللہ

:ارکانِ اسلام میں آخری رکن حج ہے' اس میں مذکورہ تینوں عبادات کی حکمتیں جمع کر دی گئی ہیں۔ ذکر الٰہی بھی ہے کہ بآوازِ بلند تلبیہ پڑھا جاتا ہے' طواف کے دوران بھی اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے' پھر شعائر اللہ کی زیارت ہے' بیت اللہ کو صرف دیکھنا بھی باعثِ اجر و ثواب ہے۔ اسی طرح احرام میں روزے جیسی کچھ پابندیاں عائد کی گئی ہیں کہ چاہے بیوی ساتھ ہے پھر بھی تعلق زن و شو قائم نہیں ہو سکتا۔ پھر یہ کہ مال بھی خرچ ہوتا ہے' حج کے لیے ایک خطیر رقم درکار ہوتی ہے۔ گویا تمام عبادات میں جامع ترین عبادت حج ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس کا حج اللہ کے ہاں قبول ہو جائے وہ اس طرح گناہوں سے پاک ہو جاتا ہے جس طرح آج ہی اس کی ماں نے اسے جنا ہے۔

یہ بات بھی ملحوظِ خاطر رہے کہ حج کے مذکورہ فوائد تبھی حاصل ہوں گے جب وہ حج حلال کمائی سے کیا گیا ہو حرام سے نہیں ‘وہاں احرام کی ساری پابندیوں کا لحاظ رکھا ہو اور حج کے سارے اعمال بڑی عمدگی اور اعلیٰ اسلوب کے ساتھ ادا کیے ہوں۔اس کے ساتھ حج کے

دوران کوئی بے حیائی اور گناہ کا کام بھی نہ کیا ہو‘جس کے بارے میں قرآن نے فرمایا:

{اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَ لَا فُسُوْقَ ۙ وَ لَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ؕ} (البقرۃ:۱۹۷)

’’حج کے مہینے معروف ہیں۔تو جس نے اپنے اوپر لازم کرلیا ان مہینوں میں حج کو تو (اس کو خبردار رہنا چاہیے کہ)دورانِ حج نہ تو شہوت کی کوئی بات کرے‘نہ فسق و فجور کی اور نہ لڑائی جھگڑے کی۔‘‘

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ حَجَّ لِلّٰهِ فَلَمْ يَرْفُثْ وَلَمْ يَفْسُقْ رَجَعَ كَيَوْمٍ وَلَدَتْهُ اُمُّهُ))(۳)

’’جو شخص اللہ کے لیے حج کرے اور اس میں بے حیائی کی بات نہ بولے اور گناہ کا کام نہ کرے تو وہ لوٹ کر آتا ہے (اور گناہوں سے اس طرح پاک ہوتا ہے) گویا اس کی ماں نے اس کو آج ہی جنا ہے۔‘‘

بندگیٔ ربّ‘ خطا اور توبہ

یہ ارکانِ خمسہ بنیاد ہیں اور اس بنیاد پر استوار ہونے والی عمارت اسلام ہے‘جس کا ماقبل تفصیل سے تذکرہ ہوا ہے‘جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہمہ وقت‘ ہمہ تن‘ ہمہ جہت اللہ کی اطاعت‘ محبت کے انتہائی جذبے سے سرشار ہو کر لی جائے۔ ہاں کبھی غلطی ہو سکتی ہے‘ خطا ہو سکتی ہے تو خالص توبہ کرو‘اللہ معاف کردے گا - خالص توبہ کی تین شرائط ہیں جن کے بغیر توبہ ‘توبہ نہیں۔ایک شرط یہ ہے کہ انسان اس فعل کو عملاً چھوڑ کر عملِ صالح کی روش اختیار کرے۔دوسری یہ کہ دل میں پکا ارادہ کرلے کہ آئندہ یہ کام نہیں کروں گا۔تیسری اور لازمی شرط یہ ہے کہ انسان کو اپنے کیے پر حقیقی پچھتاوا اور شرمندگی ہو کہ میں یہ کیا کر بیٹھا ہوں‘یہ مجھ سے کیا ہوگیا ہے۔توبہ کی اصل حقیقت یہی ہے کہ انسان کے دل میں اپنی غلطی پر ندامت پیدا ہوجائے۔اس بات کو علامہ اقبال نے اپنے عنفوانِ شباب میں ایک شعر میں نہایت خوبصورتی سے بیان کیا جسے داغ دہلوی نے بہت پسند کیا اور اس پر داد دی کہ

(۳) صحیح البخاری، کتاب الحج، باب فضل الحج المبرور۔ وصحیح مسلم، کتاب الحج، باب فی فضل الحج والعمرۃ ویوم عرفۃ۔ واللفظ للبخاری۔

میاں اس عمر میں یہ شعر! ؎
موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے میرے عرقِ انفعال کے!

انفعال کہتے ہیں پشیمانی اور شرمندگی کو۔عام طور پر جب کسی انسان پر پشیمانی اور شرمندگی طاری ہوتی ہے تو پیشانی پر پسینہ آجاتا ہے۔علامہ اقبال ان قطروں کی اہمیت اُجاگر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اللہ کی نگاہ میں ان قطروں کی اتنی وقعت ہے کہ اللہ نے ان کو موتیوں کی طرح چن لیا ہے۔
واقعہ یہ ہے کہ انسان فطری طور پر خطاکار ہے۔حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:
((کُلُّ بَنِیْ آدَمَ خَطَّاءٌ وَخَیْرُ الْخَطَّائِیْنَ التَّوَّابُوْنَ)) (۴)
''تمام بنی آدم بہت خطاکار ہیں، لیکن ان خطاکاروں میں بہتر وہ ہیں جو بار بار توبہ کرنے والے ہیں۔''
یعنی اگر وقتی جذبات سے مغلوب ہو کر یا کسی جذباتی سیلاب کی رو میں بہہ کر یا ماحول کے اثرات کی وجہ سے آپ سے کوئی غلطی سرزد ہوگئی ہے تو فوراً واپس لوٹیں اور بارگاہِ الٰہی میں توبہ کریں تو اللہ یقیناً معاف فرما دے گا۔سورۃ النساء میں تو یہاں تک فرمادیا گیا کہ اللہ پر توبہ قبول کرنا واجب ہے۔فرمایا:
{اِنَّمَا التَّوْبَۃُ عَلَی اللّٰہِ لِلَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَہَالَۃٍ ثُمَّ یَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِیْبٍ فَاُولٰٓئِکَ یَتُوْبُ اللّٰہُ عَلَیْہِمْ} (النساء:۱۷)
''اللہ کے ذمے ہے توبہ قبول کرنا ایسے لوگوں کی جو جہالت اور نادانی میں کوئی غلط حرکت کر بیٹھتے ہیں اور پھر جلد ہی توبہ کرلیتے ہیں، پس یہی ہیں جن کی توبہ اللہ قبول فرمائے گا۔''

(۴) سنن ابن ماجہ، کتاب الزھد، باب ذکر التوبۃ۔ وسنن الترمذی، کتاب صفۃ القیامۃ والرقائق والورع۔

کلمۂ شہادت' اسلام میں داخلے کی بنیاد

اس حدیث میں جو ارکانِ خمسہ بیان ہوئے ہیں ان میں پہلا رکن کلمۂ شہادت اسلام میں داخلے کی بنیاد ہے 'جبکہ باقی ارکانِ اربعہ (نماز'زکوٰۃ'روزہ اور حج)'جو اسلام کے ارکان اور چوٹی کے اعمال ہیں'ان پر عمل نہ کرنے کی بنیاد پر کوئی شخص کافر قرار نہیں پائے گا' البتہ ان میں سے کسی کے انکار پر کافر ہوجائے گا -- مختلف فقہاء کے نزدیک تارکِ صلوٰۃ کو تعزیر کے طور پر جسمانی سزا دی جائے گی' اسے قید کیا جائے گا اور اسے توبہ پر مجبور کیا جائے گا۔ بعض فقہاء کا موقف ہے کہ اسے قتل بھی کیا جا سکتا ہے' اس لیے کہ ایک حدیث میں الفاظ آئے ہیں:

((بَيْنَ الرَّجُلِ وَبَيْنَ الشِّرْكِ وَالْكُفْرِ تَرْكُ الصَّلَاةِ))(۵)

''بندے اور کفر و شرک کے مابین نماز کا معاملہ حائل ہے۔''

لیکن یہ قتل کرنا بھی تعزیراً ہو گا' اُسے مرتد سمجھتے ہوئے نہیں۔ جیسے شادی شدہ زانی پر حد جاری کر کے اسے رجم کے ذریعے قتل تو کیا جائے گا' لیکن اسے مرتد سمجھتے ہوئے نہیں۔

دراصل اسلام میں داخل ہونے یا شامل رہنے کے لیے بنیاد صرف ایک چیز بنتی ہے اور وہ کلمۂ شہادت ہے۔چنانچہ کوئی شخص ہمارے سامنے آکر کہتا ہے:''اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ''تو ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ مسلمان نہیں ہے۔ اگرچہ قرائن موجود ہوں اور حالات یہ گواہی دے رہے ہوں کہ اُس نے دل سے کلمہ نہیں پڑھا تب بھی ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ مسلمان نہیں ہے۔

ایک جنگ میں حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما نے ایک ایسے ہی شخص کی جان لے لی تھی۔ حضرت اسامہؓ کی کفار کے لشکر میں سے ایک شخص سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ وہ شخص حضرت اسامہؓ کی تلوار کی زد میں تھا کہ اُس نے کلمۂ شہادت پڑھ لیا۔ حضرت اسامہؓ نے سمجھا کہ یہ جان بچانے کا حیلہ کر رہا ہے 'لہٰذا اس پر تلوار چلا دی اور سر قلم کر دیا۔ بعد میں اُسامہؓ جب رسول اللہ ﷺ کے سامنے پیش ہوئے تو آپؐ نے انتہائی ناراضگی کا اظہار فرمایا۔ رسول

---

(۵) صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب بیان اطلاق اسم الکفر علی من ترک الصلاۃ۔ ترمذی کی روایت میں الفاظ ہیں:

((بَيْنَ الْكُفْرِ وَالْإِيْمَانِ تَرْكُ الصَّلَاةِ))

اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اے اسامہ! اُس وقت تم کیا کرو گے جب قیامت کے دن یہ کلمۂ شہادت تمہارے خلاف گواہی دینے کے لیے آئے گا!''

قرآن کریم میں بھی ارشاد فرمایا گیا ہے کہ جو شخص اپنے اسلام کا اظہار کرے تو اسے یہ مت کہو کہ تم مؤمن نہیں ہو! سورۃ النساء کی آیت ۹۴ میں ارشاد ہوا:

{یٰٓاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِذَا ضَرَبۡتُمۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ فَتَبَیَّنُوۡا وَ لَا تَقُوۡلُوۡا لِمَنۡ اَلۡقٰۤی اِلَیۡکُمُ السَّلٰمَ لَسۡتَ مُؤۡمِنًا ۚ}

''اے اہلِ ایمان! جب تم اللہ کی راہ میں نکلو تو تحقیق کر لیا کرو اور کسی ایسے شخص کو جو تمہارے سامنے سلامتی پیش کرے (تمہیں سلام کہے یا اپنا اسلام پیش کرے) یہ نہ کہو کہ تم مؤمن نہیں ہو۔''

یہ بات حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کردہ حدیث جبریل سے بھی ثابت ہوتی ہے۔ اِن کی روایت میں ہے کہ جب جبرائیل ؑ نے کہا: حَدِّثْنِیْ بِالْاِسْلَامِ ''مجھے اسلام کے بارے میں بتایئے'' تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((اَلْاِسْلَامُ اَنْ تُسْلِمَ وَجْھَکَ لِلّٰہِ)) ''اسلام یہ ہے کہ تو اپنے چہرے کو اللہ کے سامنے جھکا دے (سرِ تسلیم خم کردے)''۔ یہ لفظ اسلام کے ساتھ معنوی مناسبت رکھتا ہے' اس لیے کہ اسلام کے لغوی معنی ہی اطاعت قبول کر لینا (to surrender) ہے۔

''عباداتِ اربعہ'' میں سے دو چیزوں (نماز اور زکوٰۃ) کا ذکر سورۃ التوبہ کی ابتدائی آیات میں بھی آیا ہے۔ اس اعلانِ عام کے بعد کہ مشرکینِ عرب کو صرف چار مہینوں کی مہلت ہے' ارشاد ہوا:

{فَاِذَا انۡسَلَخَ الۡاَشۡہُرُ الۡحُرُمُ فَاقۡتُلُوا الۡمُشۡرِکِیۡنَ حَیۡثُ وَجَدۡتُّمُوۡہُمۡ وَ خُذُوۡہُمۡ وَ احۡصُرُوۡہُمۡ وَ اقۡعُدُوۡا لَہُمۡ کُلَّ مَرۡصَدٍ ۚ فَاِنۡ تَابُوۡا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ فَخَلُّوۡا سَبِیۡلَہُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۵﴾} (التوبۃ)

''جب عزت کے مہینے گزر جائیں تو مشرکوں کو جہاں پاؤ قتل کردو' اور ان کو پکڑ لو اور گھیر لو' اور ہر گھات کی جگہ ان کی تاک میں بیٹھو۔ پھر اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز قائم

کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو ان کی راہ چھوڑ دو۔ بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔''

عبادت اور عبادات میں فرق

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام میں داخلے کی بنیاد کلمہ شہادت ہے اور اس کا عملی اظہار ''عباداتِ اربعہ'' سے ہوگا اور ان کی حقیقت اور روح ''عبادتِ رب'' ہے۔

''عبادت'' اور ''عبادات'' کا فرق سورۃ البینہ کی اس آیت میں بھی واضح کیا گیا ہے جو خطاب کے شروع میں تلاوت

لی گئی:

{وَ مَآ اُمِرُوۡۤا اِلَّا لِیَعۡبُدُوا اللّٰہَ مُخۡلِصِیۡنَ لَہُ الدِّیۡنَ ۙ حُنَفَآءَ وَ یُقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَ یُؤۡتُوا الزَّکٰوۃَ وَ ذٰلِکَ دِیۡنُ الۡقَیِّمَۃِ ﴿۵﴾} (البینۃ)

''اور انہیں نہیں حکم ہوا تھا مگر اس بات کا کہ اللہ کی یکسو ہو کر عبادت کریں اسی کے لیے اپنی اطاعت کو خالص کرتے ہوئے ‘اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں‘ اور یہی ہے ہمیشہ کا قائم دین۔''

یعنی دین ان چیزوں پر قائم ہے۔ اس آیت میں عبادت‘ نماز‘ زکوٰۃ تینوں کے درمیان ''واؤ'' آرہی ہے۔عربی گرامر میں اس کو واوِ عطف کہتے ہیں اور عطف دو چیزوں کے درمیان مغائرت ثابت کرتا ہے ‘یعنی پہلی چیز اور ہے دوسری اور ہے۔ جیسے ہم اردو میں کہتے ہیں: ''قلم وپینسل''۔اس مرکب میں قلم اور شے ہے اور پینسل اور شے ۔ اسی طرح محولہ بالا آیت میں عبادت اور شے ہے ‘نماز و زکوٰۃ اور چیزیں ہیں۔ تو معلوم ہوا کہ اصل عبادت کچھ اور ہے اور یہ عبادات (ارکانِ اسلام) اس کو سہارا (support) دینے کے لیے ہیں۔ اگر آپ نے صرف ستون کھڑے کر لیے اور ان کے اوپر چھت ہی نہیں ڈالی تو ان ستونوں کا فائدہ؟ آج ہمارے ذہنوں سے یہ بات نکل چکی ہے کہ ان ستونوں کے اوپر اسلام اور عبادت کی چھت بھی ضروری ہے -- ''عبادت'' اور ''عبادات'' کا یہ تصوّر اگر عام ہوجائے تو واقعہ یہ ہے کہ اُمت کی بہت بڑی اصلاح ہوجائے گی۔ورنہ ان عبادات کی حیثیت صرف رسومات (rituals)کی رہ جاتی ہے۔ جیسے اقبال نے کہا تھا ع

رہ گئی رسم اذاں روحِ بلالی نہ رہی !

موجودہ دور میں یہ رسومات تو بہت بڑے پیمانے پر ہورہی ہیں ۔تقریباً ہر سال حج کی ادائیگی کے لیے مکّہ میں پچیس ‘تیس لاکھ لوگ جمع ہوتے ہیں ‘جبکہ رمضان کے آخری

عشرہ میں یہ تعداد اس سے بھی بڑھ جاتی ہے ‘لیکن اس کا دنیا پر ماشہ بھر بھی کوئی اثر نہیں ہوتا۔ دنیا جس رنگ میں چل رہی ہے ویسے ہی چلی جا رہی ہے۔ دنیا کے ہر کونے میں عالی شان مساجد تعمیر ہورہی ہیں لیکن نماز کی ادائیگی صرف رسومات کی حد تک رہ گئی ہے ۔

آج کل ہمارا حال وہ ہو چکا ہے جو رسول اللہ ﷺ کی ایک بہت ہی لرزا دینی والی حدیث میں بیان ہوا ہے ۔حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((یُوشِکُ اَنْ یَّاْتِیَ عَلَی النَّاسِ زَمَانٌ)) ''اندیشہ ہے کہ لوگوں پر ایک زمانہ ایسا بھی آ جائے گا'' ((لَایَبْقٰی مِنَ الْاِسْلَامِ اِلَّا اسْمُہٗ)) ''کہ اسلام میں سے

سوائے اُس کے نام کے کچھ نہیں بچے گا ''((وَلَایَبْقٰی مِنَ الْقُرْآنِ اِلَّا رَسْمُہٗ))''اور قرآن میں سے بھی سوائے اُس کے رسم الخط کے کچھ نہیں بچے گا''۔یعنی قرآن کی صرف تحریر بچ جائے گی اور قرآن کا نظام دنیا میں کہیں نظر نہیں آئے گا۔((مَسَاجِدُھُمْ عَامِرَۃٌ وَھِیَ خَرَابٌ مِنَ الْھُدٰی))''ان کی مسجدیں آباد تو بہت ہوں گی لیکن ہدایت سے خالی ہوں گی''۔ معاذ اللہ'

ثم معاذ اللہ ! اور چوتھی بات سخت ترین ہے: ((عُلَمَاءُھُمْ شَرُّ مَنْ تَحْتَ اَدِیْمِ السَّمَاءِ)) ''ان کے علماء آسمان کی چھت کے نیچے بدترین مخلوق ہوں گے''۔((مِنْ عِنْدِھِمْ تَخْرُجُ الْفِتْنَۃُ وَفِیْھِمْ تَعُوْدُ))(٦)''انہی میں سے فتنے برآمد ہوں گے اور انہی میں لوٹ جائیں گے''۔یعنی فتنہ انگیزی اور فتنہ پروری کے سوا ان کے پاس کچھ نہیں ہو گا۔ محمد رسول اللہ ﷺ نے یہ بدترین زمانے کی پیشین گوئی کی ہے جس کے آثار ہم آج چشم سر سے دیکھ رہے ہیں۔

موجودہ دور میں علاماتِ قیامت کا ظہور

حدیث جبریل میں بھی علاماتِ قیامت میں سے دو کا تذکرہ تھا اور وہ بھی آج ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں۔حدیث جبریل میں علاماتِ قیامت کے بارے میں پوچھے گئے سوال کے جواب میں آپ ﷺ نے فرمایا تھا: ((اَنْ تَلِدَ الْاَمَۃُ رَبَّتَھَا)) ''(جب تم دیکھو) کہ لونڈی اپنی مالکہ کو جنے''۔اکثر محدثین کے نزدیک اس کا مفہوم یہ ہے کہ اولاد

(٦) رواہ البیھقی شعب الایمان،راوی:حضرت علی رضی اللہ عنہ

سرکش ہو جائے گی۔ آج ہمارے ارد گرد کتنے ہی ایسے بدبخت ہیں جو اپنے والدین کو اذیتیں دیتے ہیں ،ان کو گالیاں دیتے ہیں۔دوسری علامت یہ بیان فرمائی : ((وَاَنْ تَرَی الْحُفَاۃَ الْعُرَاۃَ الْعَالَۃَ رِعَاءَ الشَّاءِ یَتَطَاوَلُوْنَ فِی الْبُنْیَانِ)) ''اور یہ کہ تم دیکھو گے کہ ننگے پائوں ،ننگے بدن ،محتاج ،بکریوں کو چرانے والے اونچی اونچی عمارتیں بنانے میں ایک دوسرے کا مقابلہ کریں گے''۔یہ صورتِ حال آج ہمارے سامنے ہے۔ دبئی کہاں سے کہاں پہنچا ہوا ہے ! سو سال پہلے یہاں کھانے کے لیے کچھ نہیں تھا ،پہننے کے لیے کپڑے نہیں تھے ،پائوں میں جوتے نہیں ہوتے تھے۔ پورے عرب کا یہی معاملہ تھا۔حج میں قربانی کا سب سے بڑا مصرف یہ سمجھا جاتا تھا کہ انہیں کچھ کھانے کو مل جائے اور یہ لوگ تگ و دو کر کے گوشت اکٹھا کرتے اور خشک کر کے سال بھر کھاتے تھے۔ تقریباً ستر اَسّی برس سے یہ صورتِ حال مکمل طور پر تبدیل ہو گئی ہے ،جب سے تیل دریافت ہوا ہے ،ورنہ اس سے پہلے یہ مشرقی ساحل جہاں آج دبئی اور ابوظبی جیسے شہر آباد ہیں ،یہاں فقط جھونپڑیوں پر مشتمل بستیاں تھیں اور ان کا بکریاں چرانے اور مچھلیاں پکڑنے کے علاوہ کوئی کام نہیں ہوتا تھا۔اب یہ خوشحالی اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ دنیا کا پہلا سیون سٹار ہوٹل دبئی میں تعمیر ہوا ہے۔

(۷)

عباداتِ اربعہ : روحانی ارتقاء کا ذریعہ

اب یہاں دو باتیں انتہائی اہم ہیں ۔ ایک یہ کہ حدیث زیر مطالعہ میں مذکور چار عبادات نماز' روزہ' حج اورزکوٰۃ نہ صرف ارکانِ اسلام ہیں بلکہ انسان کی روحانی ترقی کا ذریعہ بھی یہی ہیں۔ یہ محض قانونی شرط پوری کرنے والی چیزیں نہیں ہیں۔ اگر نماز میں خشوع و خضوع پیدا ہو جائے تو یہ ''معراج المؤمنین'' کا مرتبہ حاصل کر لیتی ہے۔ اگر روزہ پورے اہتمام سے رکھا جائے کہ آدمی جھوٹ' فحش گوئی اور لہو و لعب سے مکمل اجتناب کرے اور اسے اپنے نفس پر مکمل کنٹرول حاصل ہو جائے تو یہ روحانی ترقی کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ اسی طرح زکوٰۃ اور صدقات کا معاملہ ہے کہ اگر آدمی انفاقِ مال کے سبب دولت کی پرستش سے آزاد ہو جائے تو یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ قرآن حکیم میں انفاق کا اعلیٰ

---

(۷) بعد ازاں دبئی میں ''برج خلیفہ'' کی تعمیر بھی ہوئی' جو دنیا کی بلندترین عمارت ہے۔ (مرتب)

ترین درجہ یہ بیان کیا گیا ہے : {وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ قُلِ الْعَفْوَ ۭ} (البقرۃ:۲۱۹) ''اور یہ آپؐ سے پوچھتے ہیں کہ (اللہ کی راہ میں) کیا کچھ خرچ کریں؟ کہہ دیجیے کہ جو بھی زائد از ضرورت ہو''۔یعنی اپنی ضرورت اور گزر اوقات کے لیے رکھ لو 'باقی راہِ خدا میں دے دو۔

اس مسئلہ میں تھوڑی سی باریکی ہے 'کہیں کوئی مغالطہ نہ ہوجائے۔ واضح رہے کہ روپیہ پیسہ اپنے پاس رکھنا حرام نہیں ہے 'بس شرط یہ ہے کہ حلال ذریعے سے کمایا گیا ہو۔ البتہ اعلیٰ روحانیت یہ ہے کہ اس میں سے صرف اپنی ضروریات کی حد تک اپنا حق سمجھو اور باقی اللہ کی راہ میں دے دو۔ تمہاری ضروریات سے زائد مال محروین و مساکین کا ہے۔ اللہ نے ان کے مال کو تمہارے حصے میں ڈال کر تمہارا امتحان لیا ہے ۔ تمہیں آزمایا جا رہا ہے کہ تم ان کو لوٹا کر سبکدوش ہوجاتے ہو یا ان کے مال پر غاصبانہ قبضہ جما کر بیٹھے رہتے ہو۔ یہ اسلام کی اخلاقی اور روحانی تعلیم ہے 'ورنہ تمہارے لیے اس کا رکھنا جائز ہے ' حرام نہیں ہے۔ زکوٰۃ کے بارے میں کوئی اختیار نہیں ہے ' وہ تو زبردستی لے لی جائے گی اور زکوٰۃ کے بعد جو باقی بچتا ہے اس میں تمہیں اختیار ہے ۔ تم اسے اپنے پاس بھی رکھ سکتے ہو اور یہ وراثت کے طور پر تمہاری اولاد کو منتقل بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر روحانی ترقی چاہتے ہو تو ضرورت سے زائد مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کردو۔ تمہارے روحانی ارتقاء کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تمہارا مال ہے اور یہی روح کے لیے سب سے بڑی گندگی ہے۔ یہاں یہ بھی نوٹ کر لیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی پوری زندگی اسی

سطح پر گزاری ہے اور لبھی بھی زکوٰۃ ادا نہیں کی۔ میں جب یہ کہا کرتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ نے پوری زندگی زکوٰۃ نہیں دی تو لوگ اس پر چونک جاتے ہیں کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ ارکانِ اسلام میں سے ایک رکن کو ادا نہ کریں --- زکوٰۃ کا سوال تو تب پیدا ہوتا ہے جب آپؐ کچھ بچا کر رکھتے اور صاحب نصاب ہوتے۔ جب آپ ﷺ نے اپنے پاس کچھ رکھا ہی نہیں تو زکوٰۃ کاہے کی؟

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا ایک خاص طبقہ جنہیں فقراءِ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کہا جاتا ہے' انہوں نے اسی روحانی و اخلاقی سطح پر زندگی گزاری ہے ۔ان کے سرخیل حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ تھے۔

تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا یہ طرزِ عمل نہیں تھا۔ فقراءِ صحابہؓ کے علاوہ باقی صحابہ کاروبار بھی کرتے تھے ' دولت رکھتے بھی تھے اور اللہ کی راہ میں دیتے بھی تھے۔ البتہ یہ صحابہ بھی ہر وقت آمادہ رہتے تھے کہ جب بھی مطالبہ آئے گا تو سارا مال پیش کر دیں گے۔ چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے غزوۂ تبوک کے موقع پر اپنا سب کچھ لا کر دے دیا ۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ہر موقع پر اپنا وافر مال اللہ کی راہ میں خرچ کیا۔ حضرت ابوبکر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کا شمار فقراء صحابہ میں تو نہیں ہے' لیکن آمادگی ہر وقت تھی کہ یہ زائد مال امانت ہے' جب بھی وقت آئے گا' حاضر کردیں گے۔ چنانچہ یہ عبادات اللہ تعالیٰ کے راستے میں روحانی ترقی کی منزلیں اور سیڑھیاں ہیں۔ انہی سے ہو کر گزریں گے تو روحانی ارتقاء حاصل ہو گا۔

آپ کی نماز دل کی حضوری اور خشوع و خضوع کے ساتھ ہونی چاہیے۔ اگر آپ نے بس نماز پڑھ لی تو فقہی اعتبار سے فرض ادا ہو گیا' لیکن اگر خشوع و خضوع اور حضورِ قلب کے ساتھ نماز پڑھی تو اس سے اعلیٰ درجے کی روحانی ترقی بھی حاصل ہو گی ۔ حدیث میں آتا ہے کہ سجدہ کرو تو یوں محسوس کرو گویا اپنے ربّ کے قدموں میں سر رکھ دیا ہے ۔نماز میں اس کیفیت کے ساتھ قرآن مجید کی تلاوت کرو کہ جو بھی رحمت والی آیت آئے تو فوراً اللہ سے رحمت کا سوال کرو اور عذاب والی آیت آئے تو فوراً اللہ کے عذاب سے معافی طلب کرو۔ نماز تو ایک طرح کا ڈائیلاگ ہونا چاہیے جیسے حدیث میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:''میں نے صلوٰۃ کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان نصف نصف تقسیم کر دیا ہے...'' علامہ اقبال نے اسے انائے کبیر(The Infinite Ego) اور انائے صغیر (The finite ego)کا مکالمہ قرار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی انانیت کبریٰ کا بیان سورۂ طٰہٰ میں بایں الفاظ ہوا ہے:

{اِنَّنِیۡۤ اَنَا اللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعۡبُدۡنِیۡ ۙ وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکۡرِیۡ ﴿۱۴﴾}

''بے شک میں ہی اللہ ہوں' میرے سوا کوئی معبود نہیں' تو میری ہی عبادت کرو' اور میری یاد کے لیے نماز قائم کرو۔''

اس کیفیت کے ساتھ نماز پڑھی جائے تو وہ یقیناً روحانی ارتقاء کا باعث ہے۔ نماز وہی ہے' لیکن ادائیگی کی کیفیت کی وجہ سے نماز نماز میں فرق ہے۔

عباداتِ اربعہ: اسلامی تہذیب و تمدن کی بنیاد

اس ضمن میں آخری بات یہ عرض کروں گا کہ یہ جو چار عبادات زیر مطالعہ حدیث میں بیان ہوئی ہیں' اس دنیا میں اسلامی معاشرے کی تنظیم کی بنیاد بن جاتی ہیں۔ اقامتِ صلوٰۃ' ایتائے زکوٰۃ' صومِ رمضان اور حج بیت اللہ اسلامی شعائر ہیں اور اسلامی تہذیب و تمدن کی علامات ہیں۔ ان سے دنیا میں اسلامی تہذیب کا ڈھانچہ وجود میں آتا ہے۔ مساجد اسلامی شعائر میں سے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اتنی جامع مساجد نہیں ہونی چاہئیں جتنی ہم نے بنا لی ہیں۔ مساجد اسلامی تمدن کی علامات بتمام و کمال تب بنیں گی جب اسلامی ریاست قائم ہو گی اور دارالحکومت کی جامع مسجد میں سربراہِ ریاست امام ہو گا۔ اسی طرح صوبائی دارالحکومت کی جامع مسجد میں گورنر خطبہ دے گا' اور اگر کسی چھوٹے علاقے کی مسجد ہے تو وہاں بھی اس علاقے کا سب سے بڑا انتظامی آفیسر حکومت کی اجازت سے خطبہ دے گا۔ یہ تو ہم نے ایک ایک محلے میں تین تین جامع مساجد بنا لی ہیں' ایک اہل حدیث کی' ایک بریلوی کی' ایک دیوبندی کی اور پھر لائوڈ سپیکر کے ذریعے ایک دوسرے سے بلند آوازی کے ساتھ مقابلے ہو رہے ہیں۔ بہرحال اس سب کے باوجود مساجد کا وجود غنیمت ہے جن سے دین کا ایک ڈھانچہ قائم ہوتا ہے۔

اسلامی تہذیب و تمدن میں مسجد معاشرت کی تنظیم کی بنیاد ہے' بایں معنی کہ ایک علاقے میں پنج وقتہ نماز ہو رہی ہے' لوگ جمع ہوتے ہیں' پھر جب کوئی نمازی نہیں آتا تو لوگوں کو تشویش ہونی چاہیے کہ آج فلاں صاحب نہیں آئے' آئو چل کر پتا کریں۔ ان مساجد کو تو معاشرتی رابطے (social contact) کا ذریعہ بننا چاہیے۔ یہ نہیں کہ نماز کے لیے آئے' نہ کسی کو دیکھا نہ کسی سے کچھ پوچھا' نہ کسی کی کوئی مزاج پرسی کی' بس سلام پھیرا اور چلے گئے۔ نبی اکرم ﷺ تو نماز کے بعد مسجد میں بیٹھ جاتے تھے اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے مختلف موضوعات پر گفتگو فرماتے تھے۔ دراصل ہمارے ہاں مسجد کا نظام ان ہی چیزوں پر مبنی ہے۔

آپ کو معلوم ہے کہ حج دنیا کا سب سے بڑا اجتماع ہے جو اس اُمّت کی آفاقیت کا آج بھی سب سے بڑا مظہر ہے۔ اگرچہ آج اس کی روح موجود نہیں رہی' صرف ڈھانچہ رہ گیا ہے'

لیکن پھر بھی یہ مسلمانوں کی آفاقیت کا ایک بہت بڑا نشان ہے ع ''کھنڈر بتا رہے ہیں عمارت عظیم تھی!'' امریکہ کا بہت بڑا مسلم لیڈر مالکوم ایکس (Malcolm X) جب حج کے لیے گیا تھا تو بیت اللہ کا منظر دیکھ کر اس کی آنکھیں

کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں اور وہ بے اختیار پکار اٹھا تھا کہ میں نے دنیا بھر میں کہیں ایسا منظر نہیں دیکھا کہ کالے ‘ گورے ‘ پیلے ‘ لال ‘ الغرض ہر رنگ و تہذیب کے لوگ سب ایک جگہ پر ہیں اور اتنا امن ہے کہ کوئی جھگڑا نہیں ‘ کوئی لڑائی نہیں ‘ کوئی فساد نہیں۔

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ زیر مطالعہ حدیث تین حوالوں سے بہت اہمیت کی حامل ہے: (۱) یہ حدیث ’’عبادت‘‘ اور ’’عبادات‘‘ کے تعلق کو واضح کرنے والی ہے۔ (۲) اس حدیث میں جن چار عبادات کا تذکرہ ہے وہ ارکانِ اسلام ہونے کے ساتھ ساتھ انسان کی روحانی ترقی کا زینہ بھی ہیں۔ (۳) یہی چار عبادات اسلام کے شعائر اور مظاہر بن کر معاشرے کی تنظیم کی بنیاد فراہم کرتی ہیں۔

اقول قولی هذا واستغفر الله لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات

* * *

عمل میں نیت کی اہمیت

اور قرآن و حدیث میں ربط و تعلق

یکم جون ۲۰۰۷ء کا خطابِ جمعہ

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ {لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْہَکُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ وَ لٰکِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلٰٓئِکَۃِ وَ الْکِتٰبِ وَ النَّبِیّٖنَ ۚ} (البقرۃ:۱۷۷)

عَنْ اَمِیْرِ الْمُؤْمِنِیْنَ اَبِیْ حَفْصٍ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رضی اللہ عنہ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ یَقُوْلُ:

((اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ وَاِنَّمَا لِکُلِّ امْرِئٍ مَا نَوٰی ' فَمَنْ کَانَتْ ھِجْرَتُہٗ اِلَی اللہِ وَرَسُوْلِہٖ فَھِجْرَتُہٗ اِلَی اللہِ وَرَسُوْلِہٖ ' وَمَنْ کَانَتْ ھِجْرَتُہٗ لِدُنْیَا یُصِیْبُھَا اَوِامْرَاَۃٍ یَنْکِحُھَا فَھِجْرَتُہٗ اِلٰی مَا ھَاجَرَ اِلَیْہِ)) (متفقٌ علیہ)

آج ہم اللہ کا نام لے کر خطاباتِ جمعہ میں ''اربعین ِ نوویؒ '' کے سلسلہ وار مطالعہ کا آغاز کر رہے ہیں۔ اس سے پہلے میں نے بطور تمہید ''حدیث کی اہمیت اور اس کا مقام و مرتبہ'' کے موضوع پر خطاب کیا تھا۔ آج ہم ''اربعین ِ نوویؒ '' کی پہلی حدیث کا مطالعہ کریں گے۔ اس حدیث مبارکہ سے پہلے میں نے خطبہ میں سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۷۷ کا ابتدائی حصّہ بھی پڑھا' تاکہ واضح ہو جائے کہ قرآن اور حدیث میں کتنا گہرا ربط ہے۔ یہ دونوں دراصل ایک ہی سکّے کے دو رُخ یا بالفاظِ دیگر ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔ قرآن مجید میں جو بات بڑے شاہانہ اندازِ خطاب میں آتی ہے احادیث میں وہ بات نہایت شاندار الفاظ میں آتی ہے تاکہ اس کی پوری طرح وضاحت ہو سکے۔ جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہے :

{وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْھِمْ}(النحل:۴۴)
''اور ہم نے آپ پر یہ الذکر (قرآن مجید) نازل فرمایا 'تاکہ آپ لوگوں کے لیے واضح کریں جو اُن کی طرف نازل کیا گیا ہے۔''
قرآن کریم اصل میں لوگوں کی ہدایت کے لیے تھا جو آنحضور ﷺ کے پاس امانت تھا۔ اس لیے آپؐ کے ذریعے لوگوں کے لیے اس کی وضاحت ضروری تھی۔
سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۷۷ کو میں نے ''آیۃ البِر'' کا عنوان دیا ہے۔ معانی اور علم و حکمت کے اعتبار سے یہ قرآن مجید کی عظیم ترین اور طویل ترین آیات میں سے ہے۔ اس میں یہ بات واضح کی گئی ہے کہ عام طور پر لوگوں کے ذہنوں میں نیکی کا جو تصوّر ہے وہ عمل کے محض ظاہری پہلو کے اعتبار سے ہے کہ یہ نیکی کا بہت بڑا کام ہے۔ اس لیے کہ اس نیک عمل کے پیچھے جو محرک ہوتا ہے وہ انہیں معلوم نہیں ہو سکتا' یا محض گمان کی حد تک ہوتا ہے' جبکہ گمان بھی یقین کی حد تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہمارا نیکی کا یہ تصوّر رفتہ رفتہ صرف ظاہر تک محدود ہو جاتا ہے' باطن کی طرف توجہ نہیں رہتی۔
دراصل ہر عمل کے دو پہلو ہوتے ہیں' ایک اس کا ظاہر ہوتا ہے اور دوسرا باطن۔ یعنی باطن میں عمل کا محرک کیا ہے اور ظاہر میں عمل کی شکل کیا ہے۔ اگرچہ ظاہر بھی اپنی جگہ اہم ہے' اس لیے کہ ع
''لطافت بے کثافت جلوہ آرا ہو نہیں سکتی''

کے مصداق کسی لطیف شے کو واضح ہونے کے لیے کوئی کثیف شے درکار ہوتی ہے ۔ لیکن اصل شے ‘جس پر زیادہ زور ہونا چاہیے ‘وہ اس کا باطن ہے‘ یعنی اس کی نیت۔ چنانچہ قرآن مجید میں فرمایا گیا: ’’نیکی یہی نہیں ہے کہ تم اپنے چہرے مشرق اور مغرب کی طرف کر لو‘ بلکہ نیکی حقیقت میں اس کی ہے جو اللہ پر ‘روزِ قیامت پر‘ فرشتوں پر‘ کتاب پر اور سب نبیوں پر ایمان لایا۔‘‘

یہ آیت مبارکہ ہمارے مرتب کردہ مطالعہ قرآن حکیم کے منتخب نصاب کا درس نمبر۲ ہے‘ جس پر میں نے متعدد بار مفصل دروس دیے ہیں۔ اس وقت یہ بات سمجھانی مقصود ہے کہ ایمان سے نیکی کا کیا تعلق ہے۔ ایمان درحقیقت کسی عمل کے محرک کو معیّن کرتا ہے۔ نیکی

اللہ کی نگاہ میں صرف وہ عمل ہو گا جو صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے کیا جائے اور جس کی جزا صرف آخرت میں مطلوب ہو۔ اگر دنیا میں اس کی جزا مطلوب ہے تو یہ ایک دھندا اور کاروبار ہے‘ نیکی ہرگز نہیں ہے۔ کاروبار کرنا اپنی جگہ جائز ہے ‘لیکن وہ کاروبار کی شکل میں ہو۔ یہ چیز نہایت خطرناک اور گمراہ کن ہے کہ نیکی کا لبادہ اوڑھ کر اسے کاروبار کا ذریعہ بنایا جائے۔

مذکورہ بالا آیت میں ایمان باللہ کے بعد دیگر ایمانیات میں ایمان بالرسالت کا ذکر بھی ہے۔ درحقیقت ہمیں نبوت و رسالت کے ذریعے سے نیکی کا ایک ماڈل ملتا ہے کہ نیکی کے مختلف اعمال کسی شخصیت میں ایک توازن کے ساتھ آئیں۔ ورنہ بسا اوقات نیکی ہی کا جذبہ حدِّ اعتدال سے تجاوز کر کے بدی کا راستہ کھول دیتا ہے ۔چنانچہ نیکی ہی کا جذبہ تھا جس نے دنیا میں رہبانیت کی شکل اختیار کی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

{وَرَہۡبَانِیَّۃَۨ ابۡتَدَعُوۡہَا مَا کَتَبۡنٰہَا عَلَیۡہِمۡ} (الحدید:۲۷)

’’یہ رہبانیت تو خود انہوں نے (حضرت عیسیٰ ؑ کے پیروکاروں نے) ایجاد کی‘ ہم نے تو یہ ان کے اوپر فرض نہیں کی تھی۔‘‘

اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَا رَھْبَانِیَّۃَ فِی الْاِسْلَامِ)) (۱)

’’دینِ اسلام میں رہبانیت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔‘‘

یہ بات ظاہر ہے کہ رہبانیت اختیار کرنے والے یہ کام کرتے تو نیکی کے جذبے سے ہیں‘ لیکن وہاں نیکی غیر معتدل اور غیر متوازن ہو جاتی ہے۔ توازن کے ساتھ نیکی کا ایک مکمل مجسمہ محمد رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ مبارک ہے جو ہمارے لیے اُسوۂ حسنہ ہے ۔ لیکن محرکاتِ عمل کا تعلق ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ سے ہے۔ نیکی اسی لیے کی

جائے کہ اللہ تعالیٰ راضی ہو جائے' اس سے صرف آخرت کی جزا اور اُخروی نجات مقصود ہو۔

اس حقیقت کو نبی اکرم ﷺ نے اس حدیث کے اندر سادہ انداز میں بیان فرمایا۔ اس حدیث کے بارے میں یہ بات جان لیں کہ اکثر محدثین کرامؒ نے جو مجموعے مرتب

(۱) مراسیل ابی داؤد' ح ۲۸۷۔ وفتح الباری لابن حجر ۹/۱۳۔ وسلسلۃ الاحادیث الصحیحۃ للالبانی ۴/۳۸۷۔

کیے ہیں ان میں سب سے پہلے اس حدیث کا ذکر کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ محدثین کرامؒ بھی تو جمع و تدوین حدیث کی صورت میں ایک عمل اور ایک جدّوجُہد کر رہے تھے۔ آنحضور ﷺ کی احادیث کی جمع و تدوین بہت بڑی نیکی تھی' اس پر جرح و تعدیل کا کام بہت محنت طلب تھا' جس میں بڑے خطرات تھے کہ کسی ایسے شخص کی روایت قبول نہ کر لی جائے جو جھوٹ بولتا ہو اور جھوٹی احادیث گھڑتا ہو' مبادا اُمّت میں فتنہ پیدا ہو جائے۔ یہ ایک بڑی محنت طلب اور مشقت طلب جدّوجُہد تھی اور اس میں اصل شے ان کے نزدیک نیت کا معاملہ تھا' اسی لیے وہ اس حدیث کو پہلے لائے ہیں کہ اللہ کرے اس مجموعے کے مرتب کرنے میں ہماری نیت میں سوائے اللہ کی رضا اور آخرت کی جزا کے اور کوئی شے شامل نہ ہو۔

اب ہم اس حدیث کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اس حدیث کے راوی امیر المؤمنین ابو حفص عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ ہیں۔ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی تھیں' چنانچہ ابو حفص حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی کنیت ہے۔ حدیث ہے: عَنْ اَمِیْرِ الْمُؤْمِنِیْنَ اَبِیْ حَفْصٍ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رضی اللہ عنہ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ یَقُوْلُ "امیر المؤمنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' وہ فرماتے ہیں کہ میں نے خود سنا اللہ کے رسول ﷺ کو فرماتے ہوئے "۔ (اصل میں بعض اوقات روایت شروع ہو جاتی ہے "عَنْ فُلَانٍ" سے کہ فلاں صاحب سے روایت کیا گیا۔ اب یہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ ان صاحب نے یہ خود آنحضور ﷺ سے سنا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انہوں نے کسی صحابی سے سنا ہو' وہ خود براہِ راست سامع نہ ہوں۔ لہٰذا جب "عَنْ" سے بات شروع ہو تو کافی نہ ہو گی۔ یہاں فرمایا گیا: قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ یَقُوْلُ "فرماتے ہیں: میں نے خود رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا") ۔ اب آگے حدیث کا متن ہے: ((اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ)) "بے شک اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہے"۔ یہاں عام آدمی سمجھے گا کہ "عمل" کا لفظ عام ہے اور نیکی اور بدی دونوں کے لیے مستعمل

ہے۔ لیکن یہ مغالطہ ہے۔ عربی زبان میں جو دو الفاظ ''عمل'' اور ''فعل'' اور ان کی جمع ''اعمال'' اور ''افعال'' ہیں' ان کے استعمال میں فرق ہے۔ اس ضمن میں قرآن و حدیث سے جو وضاحت ہوتی ہے وہ یہ کہ'

'عمل'' کہتے ہیں اس کام کو جس میں مشقت ہوتی ہو 'جو محنت طلب ہو' جس کے بعد انسان تکان محسوس کرے۔ اسی لیے قرآن مجید میں آیا ہے :{عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ﴿۳﴾ تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً ﴿۴﴾ } (الغاشیۃ) ''بعض چہروں پر قیامت کے دن تکان طاری ہوگی 'وہ لوگ ہوں گے تپتی ہوئی آگ کے اندر''۔یہاں حدیث مبارکہ میں گفتگو نیکی کے بارے میں ہو رہی ہے' برائی کے کام کی بات نہیں ہو رہی کہ آپ کر تو معصیت کا کام رہے ہیں لیکن نیت آپ کی نیک ہے۔ قرآن و حدیث کے بعض مقامات اس حقیقت کو ثابت کرتے ہیں۔ لہٰذا یہاں اعمال کا اطلاق معصیت اور گناہ کے کاموں پر نہیں ہوگا' بلکہ نیک اور بھلے کاموں پر ہو گا۔

آگے فرمایا: ((وَاِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَا نَوٰى)) ''اور ہر شخص کو وہی ملے گا جس کی اس نے نیت کی ہوگی''۔ عمل کا ظاہر کچھ بھی ہو' لیکن اللہ کی نگاہ میں اصل شے اس کام کے پیچھے انسان کی نیت ہے۔ عرفِ عام میں اسے یوں سمجھئے کہ جب الیکشن کا دَور آنے والا ہو تو اب وہ چودھری اور سرمایہ دار جو اپنے محل میں ٹکا رہتا ہے' اب گلیوں میں نکلتا ہے' غریبوں سے بغل گیر ہوتا ہے' میلے کچیلے بچوں کو گود میں اٹھاتا اور انہیں پیار کرتا ہے۔ اب اس کا فیصلہ سب دیکھنے والے کر لیتے ہیں کہ وہ کس لیے ایسا کر رہا ہے۔یہ کوئی حقیقی شفقت و محبت نہیں ہے' جو کہ نیکی کے کام ہیں' بلکہ یہ تو ووٹ لینے کا ایک دھندہ ہے۔یہ تو ایسی حرکات ہیں جو ہمیں نظر آرہی ہیں اور جن کے بارے میں ہم خود فیصلہ کرسکتے ہیں' لیکن بعض چیزیں ہمارے مشاہدے سے بالکل مخفی ہوتی ہیں۔ اس کے لیے انسان کے اندر خود احتسابی ہونی چاہیے کہ میں کیا کر رہا ہوں 'کس لیے کر رہا ہوں' کہیں میری نیت میں کوئی فساد تو پیدا نہیں ہو گیا' کہیں مجھ پر شیطان تو حملہ آور نہیں ہو گیا۔ لہٰذا جو نیت ہو گی وہی ملے گا ' صرف عمل کے ظاہری پہلو سے جزا نہیں ملے گی۔ کسی نے بڑی فائونڈیشن بنا دی ہو اور اس سے لوگوں کو بہت خیر پہنچ رہا ہو' لیکن آپ کو کیا معلوم کہ اس کے پیچھے اس کی نیت کیا ہے ۔آیا سرکار دربار میں رسائی حاصل کرنا اور انکم ٹیکس میں ہیرا پھیری اس کا مقصد ہے یا اللہ کی رضاپیش نظر ہے' یہ صرف اللہ جانتا ہے ۔ دنیا میں ہم کہیں گے کہ نیکی کا کام ہے' بڑا اچھا کام ہے 'لیکن اللہ تعالیٰ کے ہاں اس شخص کا سارا معاملہ نیت کے حوالے سے طے ہو گا۔

اب اس کے لیے آنحضور ﷺ نے ایک مثال دی: ((فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهٗ اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَهِجْرَتُهٗ اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ)) ''پس جس شخص کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہوئی' تو اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسولؐ ہی کے حساب میں شمار ہوگی۔''

ہجرت یہ تھی کہ اہلِ ایمان کو حکم ہو گیا تھا کہ مکہ مکرمہ کو چھوڑو اور مدینہ منورہ پہنچو۔ اہل و عیال کو چھوڑنا پڑے تو مکّہ مکرمہ کے بھیڑیوں کے رحم و کرم پر چھوڑو۔ اسی طرح جو اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے قبائل میں مسلمان تھے انہیں بھی حکم تھا کہ اپنے قبیلوں کو چھوڑو اور مدینہ منورہ چلے آئو۔ تمام اہلِ ایمان کو مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کر جانے کے حکم کی وجہ میں نے اپنی کتاب ''منہجِ انقلابِ نبویؐ'' میں پورے دلائل کے ساتھ بیان کی ہے کہ اب رسول اللہ ﷺ کی جدّوجُہد میں وہ دَور آرہا تھا جس میں کفر کے ساتھ براہِ راست تصادم ہونا تھا' لہٰذا ضرورت تھی کہ پوری قوت ایک مرکز پر جمع ہو جائے' کیونکہ اگر قوت منتشر ہے' کچھ لوگ یہاں ہیں کچھ وہاں ہیں تو کوئی مؤثر اقدام نہیں کیا جا سکتا' لہٰذا یہ ہجرت فرض تھی ۔ اس سے پہلے حبشہ کی طرف دو ہجرتیں ہوئیں تھیں جو کہ رضاکارانہ تھیں' ان میں صرف اجازت دی گئی تھی کہ اگر یہاں کی سختیاں نہیں جھیلی جا رہی ہیں اور صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا ہے تو حبشہ میں جا کر پناہ گزیں ہو جائو۔ اس لیے کہ وہاں ایک عادل' نیک اور اچھا بادشاہ ہے۔ لیکن مدینہ منورہ کی طرف ہجرت فرض تھی' کیونکہ یہ رسول اللہ ﷺ کی انقلابی جدّوجُہد کے اندر ایک اہم قدم کی حیثیت رکھتی تھی۔

اب دیکھیں ہجرت کا ظاہر تو یہ ہے کہ کوئی شخص مکہ مکرمہ چھوڑ کر مدینہ منورہ آگیا ہے' اسے ہم مہاجر ہی کہیں گے' لیکن اس کی ہجرت کا اصل سبب کیا ہے؟ اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان ' اُن کی محبت اور ان کے حکم کی پیروی ہے یا کوئی اور مقصد ہے؟ یہ اللہ جانتا ہے۔ اس سلسلے میں رسول اللہ ﷺ نے دو مثالیں بیان فرمائی ہیں: ((فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ لِدُنْيَا يُصِيبُهَا)) ''اور جس کی ہجرت ہوئی دنیا کے حصول کے لیے تاکہ دنیا حاصل کرے'' ((اَوِامْرَأَةٍ يَنْكِحُهَا)) ''یا کسی عورت سے نکاح کی خاطر ہجرت کی'' ((فَهِجْرَتُهُ اِلٰى مَا هَاجَرَ اِلَيْهِ)) ''تو اس کی ہجرت اسی چیز کے لیے شمار ہو گی جس کے لیے اس نے ہجرت

کی''۔ اس بات کو سادہ سی مثال سے سمجھیں کہ مکہ مکرمہ میں کوئی مسلمان دکانداری کر رہا تھا یا کوئی اور کام کر رہا تھا' جیسے حضرت خباب رضی اللہ عنہ لوہار تھے' تو اس کے ایمان لانے کے بعد کفار تو اُس سے کوئی کام نہیں کرواتے ہوں گے' کیونکہ اہلِ ایمان اور کفار کے مابین کشیدگی پیدا ہو چکی تھی اور صرف اہلِ ایمان ہی اس سے کام کرواتے ہوں گے' اور اب وہ تو مدینہ منورہ چلے گئے۔ تو ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص اپنے گاہکوں کی خاطر مدینہ منورہ ہجرت کر گیا ہو۔ یہ باریک بات ہے جو صرف اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے' کوئی دوسرا شخص کسی پر کوئی حکم نہیں لگا سکتا۔ اللہ تعالیٰ تو اپنے علم کامل کے حساب سے اپنے رسول ﷺ کو بتا رہا ہے اور آپ ﷺ ہمیں بتا رہے ہیں ۔ یا فرض کریں کوئی صاحب کسی خاتون سے نکاح کے خواہش مند تھے' وہ خاتون ہجرت کر کے مدینہ منورہ چلی گئیں تو اب یہ بھی کچے دھاگے سے بندھے وہاں پہنچ گئے۔ اب یہ بھی ہجرت تو کر رہے ہیں' لیکن ان کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کے لیے شمار نہیں ہوگی' بلکہ اس خاتون کے عشق اور محبت کے زمرے میں آئے گی۔ کہتے ہیں کہ ایک صاحب کو ''مہاجر

اُمّ قیس'' کہا جاتا تھا' یعنی انہوں نے اُمّ قیس کے لیے ہجرت کی تھی۔

بہرحال اللہ کے ہاں کسی بھی عمل کا دار و مدار نیت پر ہو گا اور دنیا میں ہم نیتوں کے بارے میں فیصلہ نہیں کر سکتے۔ کسی کی نیت پر شک کرنا اور حملہ کرنا جائز نہیں ہے۔ ہمیں کیا معلوم کہ دلوں کا حال کیا ہے۔ دلوں کا حال تو صرف اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔ وہ ''عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ'' ہے۔ حدیثِ نبویؐ ہے:

((اِنَّ اللہَ لَایَنْظُرُ اِلٰی صُوَرِکُمْ وَاَمْوَالِکُمْ وَلٰکِنْ یَنْظُرُ اِلٰی قُلُوْبِکُمْ وَاَعْمَالِکُمْ))(۲)

''بے شک اللہ تمہاری صورتوں اور مالوں کو نہیں دیکھتا' بلکہ وہ تمہارے دلوں اور تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے۔''

اگر عمل صحیح اور نیک ہے اور دل میں اس کے لیے جو محرک اور جذبہ ہے وہ بھی صحیح ہے تو

---

(۲) صحیح مسلم' کتاب البر والصلۃ والآداب' باب تحریم ظلم المسلم وخذلہ...

ایسا عمل اللہ کے ہاں مقبول ہوگا۔ اب اسی حوالے سے چند احادیث دیکھیں کہ یہ بات رسول اللہ ﷺ نے کس انتہا تک پہنچائی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ صَلّٰی یُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَکَ' وَمَنْ صَامَ یُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَکَ' وَمَنْ تَصَدَّقَ یُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَکَ))(۳)

''جس نے دکھاوے کے لیے نماز پڑھی اس نے شرک کیا' اور جس نے دکھاوے کے لیے روزہ رکھا اس نے شرک کیا' اور جس نے ریاکاری کے لیے صدقہ و خیرات کیا اس نے بھی شرک کیا۔''

اب دیکھیں نماز اگرچہ نیکی کا بہت بڑا کام اور ارکانِ اسلام میں سے رکن اعظم ہے' ایسے ہی روزہ اسلام کا عظیم رکن ہے اور صدقہ وخیرات بہت عظیم کارِ خیر ہیں' لیکن اس کے باوجود اگر یہ کام رضائے الٰہی کے بجائے ریاکاری' اپنی دین داری کا رعب گانٹھنے یا کسی اور مقصد کے لیے ہیں تو شرک کے زمرے میں آئیں گے اور شرک سے بڑا اور گھناؤنا گناہ اور کوئی نہیں ہے۔ سورۃ النساء میں دو مقامات پر فرمایا گیا: {اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآئُ} (آیات ۴۸ و ۱۱۶) ''بے شک اللہ تعالیٰ اسے ہرگز نہیں بخشے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے' ہاں اس سے کم تر گناہ جس کو چاہے گا معاف فرما دے گا۔''

شرک دو طرح کا ہے۔ ایک شرکِ جلی ہے اور دوسرا شرکِ خفی۔ شرکِ جلی وہ ہے جو نظر آ رہا ہو کہ شرک ہو رہا ہے۔ مثلاً بُت یا کسی قبر کو سجدہ کیا جا رہا ہے' جبکہ شرکِ خفی دل میں ہوتا ہے۔ مثلاً آپ نماز میں سجدہ کر رہے ہوں اور آپ کو یہ محسوس ہو کہ کوئی آپ کو دیکھ رہا ہے تو آپ سجدہ ذرا لمبا کر دیں تو یہ شرکِ خفی ہے۔ اس کا تجزیہ آپ آسانی سے کر سکتے ہیں' مثلاً آپ پہلے پانچ سیکنڈ کا سجدہ کر رہے تھے اور اب دس سیکنڈ کا سجدہ کیا ہے تو یہ

اضافی پانچ سیکنڈ کس کے لیے لگے ہیں؟ پانچ سیکنڈ تو اللہ کے لیے ہو گئے لیکن دوسرے پانچ کس کے لیے؟ گویا ایک سجدے کے دو مسجود ہو گئے ۔ ایک مسجود اللہ کی ذات ہوئی اور ایک مسجود وہ لوگ ہوئے جنہیں دکھایا جا رہا ہے ۔

_____(۳) مسند احمد' ح ۱۶۵۱۷ ۔

اس سلسلے میں رسول اللہ ﷺ کی دعوت اور تربیت سے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں جس حد تک باریک بینی آگئی تھی اس کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ایک واقعہ سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ایک موقع پر عین حالت ِجنگ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ایک شخص سے دوبدو مقابلہ ہوا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کافر کو زیر کر لیا اور اس کے سینے پر سوار ہوگئے۔ اب اسے خنجر گھونپنے ہی والے تھے کہ اس نے نیچے پڑے ہوئے بھی آپؓ کے منہ پر تھوک دیا۔ (جیسے انگریزی میں کہا جاتا ہے : To add insult to injury) حضرت علیؓ نے اس کی اس حرکت کے بعد اسے چھوڑ دیا اور فوراً اس کے سینے سے نیچے اتر آئے۔ وہ بہت حیران ہوا کہ انہوں نے مجھے کیوں چھوڑ دیا ہے جبکہ میں نے ان کی توہین بھی کی ہے ! اس کے استفسار پر حضرت علیؓ فرمانے لگے :دیکھو ! میری تم سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں ہے ئیں تمہیں صرف اللہ کے لیے قتل کر رہا تھا' لیکن اب اگر میں تمہیں قتل کرتا جبکہ تم نے میری توہین کی ہے' تو میری نیت میں میرے نفس کا انتقام بھی شامل ہوجاتا۔ ذرا غور کیجیے کہ جنگ کا معاملہ ہو'جوجذبات کی انتہائی گرمی کا وقت ہوتا ہے' مرو یا مارو کی کیفیت ہوتی ہے' اس حالت میں بھی انسان کی نگاہ دل اور نیت پر ہو' یہ رسول اللہ ﷺ کی تربیت کا ہی کمال تھا۔

یہ مضمون قرآن مجید میں بڑی حسین تمثیلوں کے پیرائے میں تین جگہ آیا ہے۔ ایک مقام سورۃ النور کا پانچواں رکوع ہے جو قرآن مجید کے بڑے اہم مقامات میں سے ہے جس میں حکمت کے بڑے بڑے موتی ہیں۔یہاں تین قسم کے لوگوں کا ذکر ہے۔ پہلے مؤمن صادق کی مثال بیان ہوئی ہے اور اس کے ایمان کی جھلک بھی دکھائی گئی ہے کہ اُس کا باطن نورِ ایمان سے منور ہوتا ہے اور ظاہر اعمالِ صالحہ سے مزین ہوتا ہے۔ مؤمن کے دل میں جو نورِ ایمان ہوتا ہے یہ دو نوروں کے امتزاج سے بنتا ہے' ایک نورِ فطرت اور دوسرا نورِ وحی ۔ چنانچہ فرمایا گیا: {نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ } (النور:۳۵) ''یہ روشنی پر روشنی ہے''۔ (اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ ''اے اللہ ! ہمیں ان میں شامل فرما !'')پھر ایک دوسری مثال' جو ہمارے موضوع سے متعلق ہے' ایسے شخص کی دی گئی جس میں ایمان تو نہیں ہے لیکن ظاہری طو رپر کچھ نیک اعمال ہیں' مثلاً غریبوں' مسکینوں کو کھانا کھلانا۔ ایسے شخص کو قیامت کے دن 'بعث بعد

الموت کے وقت یاد آئے گا کہ میں نے تو بہت نیکیاں کی تھیں' ان کا کچھ تو اجر مجھے ملنا چاہیے۔ ایسے شخص کی تمثیل یوں بیان کی گئی: {وَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اَعۡمَالُہُمۡ کَسَرَابٍۭ بِقِیۡعَۃٍ یَّحۡسَبُہُ الظَّمۡاٰنُ مَآءً ؕ} ''اور جن لوگوں نے کفر کیا (جنہوں نے اللہ اور آخرت کو نہیں مانا) ان کے اعمال (ان کی نیکیاں) سراب کی مانند ہیں جسے پیاسا پانی سمجھتا ہے''۔ جیسے کہ صحرا میں دور سے پانی نظر آتا ہے' حالانکہ پانی نہیں ہوتا۔ اب پیاسا آدمی دوڑتا ہوا اُس کی طرف جا رہا ہے یہاں تک کہ تھک جاتا ہے' اب بھاگا نہیں جاتا تو گھسٹتا ہوا جا رہا ہے۔ {حَتّٰۤی اِذَا جَآءَہٗ لَمۡ یَجِدۡہُ شَیۡئًا} ''یہاں تک کہ جب اس کے پاس پہنچتا ہے تو اسے کچھ نہیں پاتا''۔{وَّ وَجَدَ اللّٰہَ عِنۡدَہٗ فَوَفّٰىہُ حِسَابَہٗ ؕ وَ اللّٰہُ سَرِیۡعُ الۡحِسَابِ ﴿۳۹﴾} (النور) ''اور وہ وہاں اللہ کو پائے گا جو اسے اس کا حساب پورا پورا عطا کرے گا۔ اور اللہ کو حساب لیتے دیر نہیں لگتی''۔ تمہارے اعمال میں نیت غلط تھی' لہٰذا تمہاری نیکیاں سراب کی مانند ہیں۔ انسان اپنے آپ کو سہارا دیتا ہے کہ وہ بڑے نیک اعمال کر رہا ہے' لیکن اگر اس میں خلوصِ نیت نہیں ہے' یعنی اللہ کی رضا اور آخرت کی جزا پیش نظر نہیں ہے تو وہ کوئی نیکی نہیں ہے۔

تیسری قسم کے وہ لوگ ہیں کہ جن کے دل میں تاریکی ہی تاریکی ہے اور عمل میں کوئی جھوٹ موٹ کی نیکی کی روشنی بھی نہیں' یہ خالص نفس پرست اور خالص مفاد پرست لوگ ہیں۔ ان کے متعلق کہا گیا ہے :{اَوۡ کَظُلُمٰتٍ فِیۡ بَحۡرٍ لُّجِّیٍّ یَّغۡشٰہُ مَوۡجٌ مِّنۡ فَوۡقِہٖ مَوۡجٌ مِّنۡ فَوۡقِہٖ سَحَابٌ ؕ ظُلُمٰتٌۢ بَعۡضُہَا فَوۡقَ بَعۡضٍ ؕ}(آیت ۴۰) ''یا پھر (اس کی مثال ایسی ہے) جیسے ایک گہرے سمندر میں اندھیرا' کہ اوپر ایک موج چھائی ہوئی ہے' اس پر ایک اور موج اور اس کے اوپر بادل۔ تاریکی پر تاریکی مسلط ہے۔''

دوسرا مقام سورۂ ابراہیم کی آیت ۱۸ ہے :

{مَثَلُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِرَبِّہِمۡ اَعۡمَالُہُمۡ کَرَمَادِۣ اشۡتَدَّتۡ بِہِ الرِّیۡحُ فِیۡ یَوۡمٍ عَاصِفٍ ؕ لَا یَقۡدِرُوۡنَ مِمَّا کَسَبُوۡا عَلٰی شَیۡءٍ ؕ ذٰلِکَ ہُوَ الضَّلٰلُ الۡبَعِیۡدُ ﴿۱۸﴾}

''جن لوگوں نے اپنے ربّ سے کفر کیا ہے ان کے اعمال (جو ظاہر میں نیکیاں نظر آتی ہیں) کی مثال اس راکھ کی سی ہے جسے ایک طوفانی دن کی آندھی نے اڑا دیا ہو۔ وہ اپنے کیے پر کچھ بھی اختیار نہیں رکھتے (اس کا کچھ بھی پھل نہ پائیں گے)۔ یہی پرلے درجے کی گمراہی ہے۔''

یہ نیکیاں اس لیے قابلِ قبول نہیں کہ یہ ایمان کے محرک سے خالی' محض دکھلاوے کی نیکیاں ہیں۔

اس سلسلے کا آخری مقام سورۃ الفرقان کی آیت ۲۳ ہے جس میں ایک عجیب نقشہ کھینچا گیا ہے۔ فرمایا: {وَ قَدِمۡنَاۤ اِلٰی مَا عَمِلُوۡا مِنۡ عَمَلٍ فَجَعَلۡنٰہُ ہَبَآءً مَّنۡثُوۡرًا ﴿۲۳﴾} ''پھر ہم پہنچے ان کے کاموں پر جو انہوں نے کیے تھے اور انہیں بنا ڈالا اڑتی ہوئی خاک''۔ یہاں کُفّار کا ذکر ہو رہا ہے کہ انہوں نے اپنے خیال میں بڑے بڑے اعمال کیے ہوئے تھے' غریبوں کو کھانے کھلائے تھے۔ جیسا کہ ابوجہل نے کہا تھا جب اس سے پوچھا گیا تھا کہ کیا تمہارے خیال

میں محمد(ﷺ) جھوٹ بول رہے ہیں جو یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ اُن کے پاس وحی آتی ہے' وہ اللہ کے نبی ہیں؟ اس نے جواب میں کہا کہ آپ(ﷺ) نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ پوچھا گیا تو پھر مانتے کیوں نہیں ہو؟ اس نے کہا: ہمارے اور بنوہاشم کے مابین ایک مسابقت اور مقابلہ چل رہا تھا' انہوں نے غریبوں کو کھانے کھلائے تو ہم نے ان سے بڑھ کر کھلائے۔ انہوں نے حاجیوں کی خدمت کی تو ہم نے ان سے بڑھ کر خدمت کی۔ تو ابھی تک ہم ان کے کندھے سے کندھا ملا کر آ رہے ہیں۔ اب اگر ہم بنوہاشم کے ایک فرد محمد (ﷺ) کی نبوت مان لیں تو ہم تو ہمیشہ کے لیے غلام ہو جائیں گے ! یہ ہمیں گوارا نہیں ہے۔دیکھئے اِن کفار کے اندر بھی نیکی کا ایک تصوّر اور نیکیوں میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کا جذبہ پایا جاتا ہے' تاکہ زیادہ شہرت ہو جائے' زیادہ تعریف ہو' ان کی سخاوت کے زیادہ ڈنکے بجیں۔مذکورہ بالا آیت میں ''مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ''میں جو نکرہ کا استعمال ہوا ہے تو یہ تفخیم کے لیے ہے۔ یعنی ہم آگے بڑھ کر اُن کے بڑے بڑے اعمال کو گرد و غبار میں ملا دیں گے۔ بات سمجھانے کے لیے بلاتشبیہہ عرض کر رہا ہوں کہ جیسے ایک فٹ بال کھیلنے والا دوڑ کر آتا ہے' پھر بال کو ہٹ لگاتا ہے' اسی طریقے سے {قَدِمْنَا اِلٰی مَا

عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ} ''ہم ان کے اعمال کی طرف بڑھیں گے'' {فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا ﴿۲۳﴾} ''تو ہم اسے کر دیں گے گرد و غبار پھیلا ہوا''۔ گویا وہ اعمال کیا تھے' محض گرد و غبار اور راکھ تھی جو منتشر ہو گئی۔

دیکھئے کس قدر خوبصورت تمثیلیں بیان ہوئی ہیں۔ یہ فصاحت و بلاغت کی معراج ہیں۔ جیسے کہا جاتا ہے:'' كَلَامُ الْمُلُوكِ مُلُوكُ الْكَلَامِ'' کہ بادشاہوں کا کلام' کلاموں کا بادشاہ ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں یہ تینوں تمثیلیں ریاکارانہ نیکی کے لیے بیان ہوئی ہیں۔ان سب کے لیے سادہ ترین تشریح' تفسیر اور تبیین رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث ((اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ...))ہے۔ اور میں آپ کے سامنے یہی بات پیش کرنا چاہتا ہوں کہ قرآن اور حدیث کا باہمی رشتہ کیا ہے۔

ہماری آج کی اس گفتگو سے ایک اور اہم مسئلہ بھی حل ہو رہا ہے ۔ ہمارے نوجوان پوچھتے ہیں کہ کفار جو اتنے بڑے بڑے نیکی کے کام کرتے ہیں تو کیا انہیں کوئی اجر و ثواب نہیں ملے گا؟ جیسے ہندو پن (کار خیر) کے کام کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر گنگا رام ایک ہندو تھا' اس نے بہت بڑا ہسپتال بنایا۔ یا جیسے یورپ اور امریکہ میں رہنے والے انگریز اور عیسائی فلاح و بہبود کے بڑے بڑے ادارے قائم کرتے ہیں' اور نیکی کے بڑے بڑے کام کرتے ہیں۔ تو کیا اللہ کے ہاں ایسے لوگوں کے اعمال کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوگی؟دیکھئے یہ لوگ اللہ ' اس کے رسول اور آخرت کو نہیں مانتے تو پھر لازماً کوئی اور محرک ہے جس کی وجہ سے یہ لوگ نیکی کے کام کرتے ہیں۔ اس کے ذریعے لازماً کوئی ریاکاری' شہرت یا سرکار دربار میں رسائی وغیرہ مقصود ہو گی۔ کوئی نہ کوئی نیت تو ہو گی' کیونکہ کوئی عمل نیت اور

مقصد کے بغیر نہیں ہوتا۔

کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ ایک شخص رسول کو نہیں مانتا لیکن اللہ اور آخرت کو مانتا ہے' لہٰذا اس کے اعمال قابل قبول ہونے چاہئیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ایسا شخص رسول کو کیوں نہیں مانتا؟ ایک ایسے شخص کا معاملہ تو علیحدہ ہے جس تک رسول کی دعوت نہیں پہنچی۔ ایسا شخص اگر توحید پر قائم ہو اور آخرت کو مانتا ہو تو اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کے اعمال قبول ہوسکتے ہیں'

کیونکہ رسالت کا پیغام اس تک پہنچا ہی نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں آپؐ کا پیغام تو صرف عرب کی حدود تک پہنچا تھا' یا آپ ﷺ نے جو خطوط لکھے تو وہ صرف بادشاہوں کو لکھے تھے' عوام تک تو نہیں گئے تھے۔ یا پھر جن علاقوں کو مسلمانوں نے فتح کیا تو وہاں کے لوگوں نے اسلام کو سمجھا' اسلام کو دیکھا' مسلمانوں کو دیکھا اور اسلام کی برکات کو دیکھا' لیکن جہاں مسلمان نہیں گئے وہاں اسلام کی تعلیمات نہیں پہنچیں۔ مثلاً چین میں رہنے والوں تک تو یہ پیغام نہیں پہنچا تھا' لہٰذا وہ مستثنیٰ ہوں گے 'ان سے توحید پر معاملہ ہو گا۔

البتہ جن لوگوں تک رسالت کا پیغام پہنچ گیا 'یہاں تک کہ اتنی بات بھی پہنچ گئی کہ محمد(ﷺ)نام کے ایک شخص گزرے ہیں جنہوں نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے ' تو وہ شخص تحقیق کر کے رسالت پر ایمان کا مکلف ٹھہرے گا۔ اور اگر وہ کوئی حق پرست ہو گا تو لازماً تحقیق کرے گا' بیٹھا نہیں رہے گا۔ اگر وہ حق کا طلب گار اور جویا ہے تو اس صورت میں لازماً اللہ اسے منزل تک پہنچا دے گا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :{وَ الَّذِیۡنَ جَاہَدُوۡا فِیۡنَا لَنَہۡدِیَنَّہُمۡ سُبُلَنَا ؕ}(العنکبوت:٦٩) ''اور جن لوگوں نے ہمارے راستے میں جدّوجُہد کی ہم انہیں لازماً اپنے (ہدایت کے) راستے دکھائیں گے''۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے تلاشِ حق میں کتنی محنت اور جدّوجُہد کی ہے۔ مجھے تو بسا اوقات ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی شخصیت ہر لحاظ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ایک شبیہہ (Replica)ہے۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ فارس میں پیدا ہوئے' باپ آتش کدے کا پجاری یا ذِمّہ دار تھا۔ ان کے دل میں یہ بات آئی کہ یہ کیا تماشا ہے کہ آگ ہم خود جلائیں' ایندھن ہم ڈالیں تو آگ جلے' پھر اسی آگ کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو جائیں ! آپ نے بغاوت کی کہ میں ایک اللہ کو مانوں گا۔ جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اُن کے باپ نے گھر سے نکال دیا تھا اور کہا تھا:{لَئِنۡ لَّمۡ تَنۡتَہِ لَاَرۡجُمَنَّکَ وَ اہۡجُرۡنِیۡ مَلِیًّا ﴿۴۶﴾} (مریم) ''اگر تم باز نہ آئے تو میں تمہیں سنگسار کر دوں گا اور مجھ سے ایک مدّت کے لیے دُور ہو جاؤ''۔ ایسے ہی حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کو بھی ان کے باپ نے گھر سے نکال دیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام عراق کے شہر ''اُر''میں پیدا ہوئے۔ جیسے انہوں نے عراق سے شام کی طرف

ہجرت کی ایسے ہی حضرت سلمان فارسیؓ نے ایران سے عراق کی طرف ہجرت کی۔ عراق سے متصل شام ہے اور ایران سے متصل عراق ہے ۔ وہاں جا کر انہوں نے عیسائیت اختیار کر لی۔ اس لیے کہ اُس وقت تک عیسائیت ہی ''اسلام'' تھا' کیونکہ آنجناب ﷺ کی ابھی تک بعثت نہیں ہوئی تھی۔ جب تک رسول اللہ ﷺ کی بعثت نہیں ہوئی حضرت مسیح علیہ السلام ہی کا دَورِ نبوت و رسالت جاری رہا۔ لہٰذا وہ عیسائی ہو گئے۔ اب وہ تعلیم و تربیت حاصل کرنے کے لیے عیسائی راہبین کے پاس گئے۔پہلے ایک کے پاس آئے اور تعلیم و تربیت حاصل کرتے رہے۔ اس کے انتقال کا وقت آیا تو فرمایا کہ میری تو ابھی تسلی اور اطمینان نہیں ہوا' میری طلب علم کی سیری ابھی نہیں ہوئی۔ اس نے مشورہ دیا کہ اچھا اب فلاں راہب کے پاس چلے جائو۔ وہاں پہنچ گئے' وہاں زیر تعلیم و تربیت رہے۔ اس کی بھی رحلت کا وقت آگیا تو آپؓ نے اس سے بھی یہی کہا کہ میرے علم کی تشنگی ابھی باقی ہے۔ تب اس نے کہا کہ میرا علم مجھے بتا رہا ہے کہ جنوب کی طرف کھجوروں کی سرزمین میں نبی آخر الزمان(ﷺ) کا ظہور ہونے والا ہے۔

عیسائیوں میں رسول اللہ ﷺ کے دَور میں بڑے حق پرست اور حق کا علم رکھنے والے لوگ موجود تھے ۔وہ سائمن (شمعون) کے پیروکار تھے اور موحدین تھے' جبکہ آج کی عیسائیت گمراہ ہو چکی ہے۔ آج کی عیسائیت پال ازم ہے۔ یہ سب سینٹ پال کے پیروکار ہیں' جس نے تثلیث ایجاد کی اور شریعتِ موسوی کو ساقط کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ کے عہد میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکار موجود تھے۔ آپ جانتے ہیں کہ بحیرہ راہب نے آنحضور ﷺ کو بچپن میں پہچان لیا تھا جب آپ ﷺ اپنے چچا ابوطالب کے ساتھ ایک قافلے کے ساتھ گئے۔ اس راہب نے آپؐ کو پہچان کر ابوطالب سے کہا تھا کہ اس کی حفاظت کرنا' کہیں یہودی ان کو پہچان کر قتل نہ کر دیں۔ ایسے ہی ایک عیسائی راہب نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے کہا تھا کہ جائو ! میرا علم بتا رہا ہے کہ نبی آخر الزماں (ﷺ) کا ظہور اب قریب ہے اور وہ ہو گا جنوب کی طرف کھجوروں کی سرزمین میں ۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے رختِ سفر باندھا اور ایک قافلے میں شریک ہو گئے جو مدینہ منورہ کی طرف

جا رہا تھا۔ راستے میں ڈاکوئوں نے قافلے کو لوٹ لیا اور ان کو گرفتار کر کے غلام بنا کر بیچ دیا۔ مدینہ منورہ کے ایک یہودی نے انہیں خریدا۔ چنانچہ یوں آپؓ مدینہ منورہ پہنچ گئے ۔ یہ طلبِ صادق کا نتیجہ ہے ۔ اب آگے مکہ مکرمہ نہیں جا سکتے' لیکن آپؓ سن رہے ہیں کہ مکہ میں ایک شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے' لیکن جائیں کیسے ! پائوں میں غلامی کی بیڑیاں پڑی ہوئی ہیں۔ یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ ہجرت فرما کر خود تشریف لے آئے۔ گویا یہاں کنواں چل کر پیاسے کے پاس آگیا۔ اب آپؓ اپنے مالک سے کچھ کھجوریں حاصل کر کے رسول اللہ ﷺ کے پاس پہنچ گئے۔ آپ ﷺ نے پوچھا : ''یہ کیا ہے؟'' حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یہ آپ کے لیے صدقہ لایا

ہوں۔ آپؐ نے فرمایا: ''میں صدقہ نہیں لیتا' یہ غریبوں کا حق ہے''۔ یہ بات اس راہب نے آپؐ کو بتائی تھی کہ یہ ان کی نشانی ہو گی کہ صدقہ قبول نہیں کریں گے' ہدیہ قبول کر لیں گے۔ کچھ دنوں کے بعد حضرت سلمانؓ دوبارہ کھجوریں لے کر آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ آپ ﷺ نے پوچھا یہ کیا ہے؟ فرمایا یہ ہدیہ ہے۔ آپؐ نے ہدیہ قبول کر لیا۔ اب آپؐ ایمان لے آئے۔

غور فرمائیں کہ ایک انسان میں اگر طلب حق ہے تو وہ اس کے لیے کیا کیا مشقتیں جھیلتا ہے! لہٰذا اگر کسی شخص تک محمد رسول اللہ ﷺ کا پیغام پہنچ چکے اور پھر وہ ایمان نہ لائے تو یا تو وہ عصبیت جاہلی کے اندر اور اپنے زعم میں مبتلا ہے یا اس کے اندر طلبِ صادق اور طلبِ حق موجود نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے تمام اعمال میں خلوص اور اخلاص کی روح پھونکے اور ہر عمل میں اپنی رضا اور آخرت کی فلاح پیش نظر رکھنے کی توفیق بخشے۔

اَقول قولی ھٰذا واستغفر اللّٰہَ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلماتoo

سورۃ البقرۃ کی آیت ۶۲ کی آڑ میں

اعوذ باللہ من الشَّیطٰن الرَّجیم ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

{اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِیْنَ ہَادُوْا وَ النَّصٰرٰی وَ الصّٰبِـُٔیْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَلَہُمْ اَجْرُہُمْ عِنْدَ رَبِّہِمْ ۚ وَ لَا خَوْفٌ عَلَیْہِمْ وَ لَا ہُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴿ ۶۲ ﴾} (البقرۃ)

تمہید

قرآن حکیم کے بالکل آغاز میں مکی اور مدنی سورتوں کا جو پہلا گروپ ہے اس میں مکی سورت صرف سورۃ الفاتحہ ہے‘ جو اگرچہ قامت میں تو بہت مختصر ہے لیکن قیمت میں بہت گراں قدر ہے۔ اس کے بعد چار سورتیں مدنی ہیں‘ ان میں پہلی سورۃ البقرۃ ہے جو قرآن حکیم کی طویل ترین سورتوں میں سے ایک ہے۔ اس میں دو مضامین کی لڑیاں تسلسل کے ساتھ چلتی ہیں۔ ایک تو اہلِ کتاب یعنی یہود و نصاریٰ دونوں پر اتمامِ حُجّت‘ اس لیے کہ مکی قرآن میں اصل مخاطب مشرکینِ عرب تھے اور ان پر دعوت کا حق ادا کر کے ہر طرح سے اتمامِ حُجّت ہو چکا تھا۔ اگرچہ مکی دَور کے آخری حصّہ میں جو سورتیں نازل ہوئیں ان میں اہلِ کتاب کی طرف بھی حوالہ تھا‘ چنانچہ سورۃ الاعراف میں نمایاں طور پر روئے سخن اہلِ کتاب کی طرف ہے‘ لیکن ان سے اصل خطاب نبی اکرم ﷺ کی مدینہ تشریف آوری کے بعد شروع ہوا ہے۔ لہٰذا ان چار سورتوں (البقرۃ تا المائدۃ) کا مسلسل ایک مضمون ہے‘ یعنی اہلِ کتاب کو دعوت‘ ان پر اتمامِ حُجّت اور ساتھ ہی ملامت۔ اللہ کے دین اور اس کی عطا کردہ نعمت کے ساتھ ان کا جو طرزِ عمل رہا‘ اس کی بنا پر ان پر فردِ جرم عائد کی گئی ہے۔

سورۃ البقرۃ میں جو دوسرا مضمون تسلسل کے ساتھ چلتا ہے ‘جس کا نقطہ آغاز سورۃ البقرۃ اور نقطہ عروج سورۃ المائدۃ ہے‘ وہ شریعتِ محمدی علی صاحبہا الصلاۃ والسلام ہے۔ مکی سورتوں میں ایمان کے مضامین بیان ہوئے ہیں یا پھر انبیاء و رُسل علیہم السلام کے حالات جو بہت ہی تکرار کے ساتھ آئے ہیں۔ ان میں بنیادی انسانی اخلاقیات کا مضمون بھی آیا ہے ‘لیکن شرعی احکامات اصلاً مدینہ منورہ ہی میں آئے ہیں جہاں ان کی تنفیذ ہو سکتی تھی۔ چنانچہ سورۃ البقرۃ سے ان کا آغاز ہوا اور سورۃ المائدۃ میں تکمیل ہوئی۔

اب سورۃ البقرۃ جو ہمارے زیر مطالعہ ہے‘ اس کے بارے میں چند باتیں نوٹ کر لیں۔ ترتیبِ نزولی کے اعتبار سے ہجرت کے بعد نازل ہونے والی یہ پہلی سورۃ ہے‘ اگرچہ اس کا نزول اس طور سے نہیں ہوا ہے کہ پوری سورۃ ایک بار نازل ہو گئی ہو۔ حجم کے لحاظ سے یہ قرآن مجید کی عظیم ترین سورۃ ہے اور اس کی عظمت صرف حجم کے لحاظ سے ہی نہیں‘ بعض دیگر اعتبارات سے بھی ہے۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے حضور نبی اکرم ﷺ کا فرمانِ مبارک نقل کیا ہے‘ جسے جامع ترمذی میں روایت کیا گیا ہے کہ ’’ہر شے کی ایک چوٹی ہوتی ہے اور قرآن حکیم کی چوٹی سورۃ البقرۃ ہے‘‘۔ یہ سورۂ مبارکہ وقفے وقفے سے تھوڑی تھوڑی آیات کی شکل میں ہجرت کے بعد سے لے کر غزوۂ بدر کے متصلاً قبل تک نازل ہوئی۔ اگرچہ غزوۂ بدر سے قبل سورۃ البقرۃ کے علاوہ سورۂ محمد(ﷺ) بھی نازل ہوئی ہے‘ جس کا دوسرا نام سورۃ القتال ہے‘ لیکن اکثر و بیشتر وہ آیات جو ہجرت کے بعد سے لے کر غزوۂ بدر تک نازل ہوئی ہیں‘ اس سورۂ مبارکہ میں جمع کی گئی ہیں‘ اگرچہ چند ایک مستثنیات ہیں۔ سود یعنی ربا

سے متعلق آخری آیات سن ۹ ہجری میں نازل ہوئی تھیں لیکن انہیں اس سورۃ میں شامل کیا گیا ہے۔ اسی طرح اس سورۂ مبارکہ کی آخری دو آیات زمین پر نہیں بلکہ معراج میں اُمّت کے لیے تحفہ کے طور پر عطا ہوئی ہیں۔

اس سورۃ کے مضامین کے تجزیہ کے ضمن میں مَیں نے اسے ''سُورۃُ الاُمَّتَین'' کا نام دیا ہے' یعنی یہ دو اُمتوں کی سورۃ ہے' اس میں سابقہ اُمّت بنی اسرائیل اور موجودہ اُمّتِ مسلمہ' دونوں سے خطاب ہے۔ چنانچہ نمایاں طور پر اس کے دو حصے ہیں' جو تقریباً مساوی

ہیں' گو آیات کی تعداد میں قدرے فرق ہے۔ پہلے حصے میں ۱۵۲ آیات اور ۱۸ رکوع ہیں جبکہ دوسرے حصے میں ۱۳۴ آیات اور ۲۲ رکوع ہیں۔ گویا پہلا حصّہ آیات کے اعتبار سے بھاری ہے جبکہ نصف ثانی میں رکوعوں کی تعداد زیادہ ہے۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ یہ سورۃ تقریباً دو برابر حصوں میں منقسم ہے۔ سورۃ الفاتحہ کے بارے میں تو ایک حدیث قدسی کی رو سے اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں کہ ((قَسَمْتُ الصَّلَاۃَ بَیْنِیْ وَبَیْنَ عَبْدِیْ نِصْفَیْنِ))(۱) ''میں نے نماز (مراد سورۃ الفاتحہ) کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان دو برابر حصوں میں تقسیم کر لیا ہے''۔ اسی کا عکس یا پرتو سورۃ البقرۃ ہے جو سورۃ الفاتحہ کے فوراً بعد شروع ہو رہی ہے اور اسے بھی اللہ نے دو برابر برابر حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

پہلے حصّہ میں اصل روئے سخن بنی اسرائیل کی طرف ہے' جبکہ دوسرے حصّہ میں تمام تر خطاب اُمّت مِحمد(علی صاحبھا الصلوۃ والسلام) سے ہے۔ اس کی مزید تقسیم کے بارے میں میں ''قرآن حکیم کی سورتوں کے مضامین کا اجمالی تجزیہ'' نامی کتاب میں لکھ بھی چکا ہوں' یعنی پہلے حصّہ میں ایک عمودی تقسیم ہے کہ پہلے ۴' پھر ۱۰ اور اس کے بعد پھر ۴' کل ۱۸ رکوع۔ اور چار ہی مضامین کی لڑیاں نصف ثانی میں چلتی ہیں جو آپس میں بٹی ہوئی ہیں۔ یہ گویا افقی (horizontal) تقسیم ہو گی۔ یعنی ایک تو شریعت کے احکام جو اوّلاً عقائد و ایمانیات اور ثانیاً عبادات و معاملات اور اوامر و نواہی وغیرہ پر مشتمل ہیں' دوسرے اللہ کی راہ میں جہاد جس کی دو شاخیں جہاد بالمال یعنی انفاق فی سبیل اللہ اور جہاد بالنفس یعنی قتال فی سبیل اللہ ہیں۔ یہ چار لڑیاں ہیں جو نصف ثانی میں چلتی ہیں اور آپس میں بٹی ہوئی نظر آتی ہیں۔ وہاں آپ ان مضامین کو رکوعوں میں تقسیم نہیں کر سکتے' کیونکہ یہ لڑیاں مسلسل چلتی ہیں' مگر آپس میں بٹی ہونے کی وجہ سے پہلے ایک مضمون آئے گا' پھر دوسرا' تیسرا' چوتھا اور پھر پہلا۔ جیسے چار مختلف رنگ کی ڈوریاں ہوں' انہیں اگر رسّی کی شکل میں بٹ دیا جائے تو ایک طرف سے دیکھنے پر چاروں رنگ کٹے پھٹے نظر آئیں گے لیکن رسّی کو کھول دیا جائے تو ہر ڈوری مسلسل نظر آئے گی۔ اس طرح چار مضامین کی ڈوریاں اگرچہ اپنی جگہ مسلسل ہیں لیکن چونکہ انہیں بٹ

دیا گیا ہے ‘اس لیے ان میں تسلسل دکھائی نہیں دیتا ‘حالانکہ معنوی تسلسل موجود ہے۔

جہاں تک پہلے حصّہ کا تعلق ہے اس کے پہلے چار رکوع تمہیدی اور آخری چار رکوع تحویلی ہیں ‘جبکہ درمیان کے دَس رکوعوں میں براہِ راست بنی اسرائیل سے خطاب ہے۔ پہلے چار رکوعوں میں سے ابتدائی دو رکوعوں میں تین قسم کے انسانوں کی تقسیم ہے ‘یعنی وہ جنہوں نے قرآن حکیم سے صحیح استفادہ کیا‘ اس پر ایمان لائے‘ اس سے انہوں نے اپنے قلوب و اَذہان کو بھی منور کیا اور اپنے سیرت و کردار کو بھی مزین کیا۔ دوسرے وہ جو تکبّر‘ ضد اور حسد کی بنا پر اس کے انکار اور کفر پر اَڑ گئے اور تیسرے وہ جو بین بین رہے اور جن کی زیادہ تفصیل دوسرے رکوع میں آئی ہے ‘اس لیے کہ یہ تیسرا طبقہ ہی تھا جو ہجرت کے بعد مدینہ میں نمایاں طور پر سامنے آیا‘ مکہ مکرمہ میں یہ تیسرا طبقہ موجود نہیں تھا‘ اگر تھا بھی تو نہ ہونے کے برابر۔ بعد کے دو رکوعوں میں قرآن کی دعوت اور قرآن کا بنیادی فلسفہ بیان ہوا ہے‘گویا مکی قرآن کا لب ِلباب ہے جو سورۃ البقرہ کے تیسرے اور چوتھے رکوع میں ہے۔ دعوت کے اعتبار سے تیسرا اور فلسفہ و حکمت کے اعتبار سے چوتھا رکوع اہم ہے ۔یہ چاروں رکوع تمہیدی ہیں۔

اس کے بعد بنی اسرائیل سے خطاب شروع ہوتا ہے۔ان دس رکوعوں میں جو تقسیم ہے وہ بعد میں بیان کی جائے گی۔ ان کے بعد چار رکوع تحویلی ہیں‘ یعنی جن میں تحویل ِ قبلہ کا حکم ہے‘ اور تحویل ِ قبلہ دراصل اس بات کی علامت تھی کہ سابقہ اُمّت ِ مسلمہ کو‘ جس کا مرکز یروشلم رہا‘ معزول کر کے اب ایک نئی اُمّت ‘ اُمّت ِ محمد (علی صاحبھا الصلو والسلام)کی تاسیس ہوئی ہے‘ جس کا مرکز بیت اللہ ہے۔ گویا سابقہ اُمّت ِ مسلمہ بنی اسرائیل کو ‘جسے دو ہزار سال تک اللہ کی نمائندہ اُمّت ہونے کا شرف حاصل رہا‘ اب اس منصب سے معزول کیا جا رہا ہے ‘اور ایک نئی اُمّت‘ جو محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت کی بنیاد پر وجود میں آئی ہے‘ اب اسے اس روئے ارضی پر اس مقام پر فائز کیا جا رہا ہے اور یہ مقام اسے اب تاقیامِ قیامت حاصل رہے گا۔

سورۃ البقرہ کے پندرہویں اور سولہویں رکوع میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت کو نمایاں کیا گیا ہے ‘اس لیے کہ خانۂ کعبہ جسے اس نئی اُمّت کا مرکز بنایا جا رہا ہے‘ کی تعمیر

حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام نے کی تھی ۔ان کے بعد ۱۷ اور ۱۸‘ دو رکوع تحویل ِ قبلہ سے متعلق ہیں۔

اب درمیان کے دس رکوع (۵ تا ۱۴) جن میں بنی اسرائیل سے خطاب ہے ‘ان میں جو اہم نکتہ ہے اسے اچھی طرح سمجھنے کے لیے اس حصّہ کو بھی دو حصوں میں تقسیم کر لیں۔ پہلے (پانچویں) رکوع کی ۷ آیات بنی اسرائیل کو محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے کی پُرزور دعوت پر مشتمل ہیں۔ بنی اسرائیل سے خطاب کے ذیل میں یہ سات آیات گویا بمنزلہ ’’فاتحہ‘‘ کے ہیں۔ سورۃ الفاتحہ کی بھی سات آیات ہیں ‘اسی طرح بنی اسرائیل کو دعوت

کے ضمن میں یہ سات آیات بہت ہی اہم ہیں۔ اس کے بعد بقیہ ۹رکوعوں (٦ تا ١٤) کے شروع اور اختتام پر بھی دو دو آیات بالکل انہی معنوں میں ہیں۔ چھٹے رکوع اور پھر پندرہویں رکوع کی پہلی آیت کا آغاز انہی الفاظ میں ہوا ہے جو پانچویں رکوع کے آغاز میں آئے ہیں' یعنی {یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ}

چھٹے رکوع کی پہلی دو آیات اور پندرہویں رکوع کی پہلی دو آیات گویا ریاضی کے بریکٹس کے مانند ہیں اور اس طرح یہ ۹رکوع بریکٹس کے اندر شمار ہوں گے۔ بریکٹس کے اندر کا تمام تر حصّہ بنی اسرائیل کی ملامت پر مشتمل ہے 'جس میں ان کے جرائم اور ان پر عائد فردِ جرم کا تذکرہ ہے۔ چنانچہ ریاضی کے اصول کی رو سے بریکٹس کے اندر کے ۹ رکوع (٦ تا ١٤) شروع کے رکوع نمبر ۵ کی سات آیات کے تابع تصوّر ہوں گے۔ یہ باتیں یہاں اس لیے دہرائی جا رہی ہیں تاکہ زیر بحث آیات کے سمجھنے میں آسانی ہو۔

ایک بات مزید نوٹ کر لیجئے کہ اس سے قبل ہم چھٹے اور ساتویں رکوع کا مطالعہ مکمل کر چکے ہیں 'جن میں بنی اسرائیل کی تاریخ کے بہت سے واقعات کا تذکرہ ہوا ہے اور ان کے طرزِ عمل کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔ ان دو رکوعوں میں ایک اعتبار سے مضمون مکمل ہو گیا ہے' اس لیے کہ چھٹا رکوع شروع ہو رہا ہے {یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ} کے الفاظ سے اور ساتواں رکوع ختم ہو رہا ہے ان الفاظ پر: {وَ ضُرِبَتۡ عَلَیۡہِمُ الذِّلَّۃُ وَ الۡمَسۡکَنَۃُ ۔۔۔}(الآیۃ)۔چنانچہ یہاں کوئی عقیدہ والی

بات نہیں آئی ہے ۔البتہ اب ہم جس حصّہ کا آغاز کر رہے ہیں اس میں فکری اور نظریاتی باتیں بھی شامل ہیں' یعنی حالات و واقعات کا تجزیہ اور ان کی تہہ میں جو فکری اور نظریاتی غلطیاں کارفرما تھیں' اور ان کے عقائد میں جو کجی پیدا ہو گئی تھی اس کا بیان ہے' اور یہ حصّہ اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ اس میں حکمت قرآنی کے بہت بڑے خزانوں پر مشتمل بہت قیمتی آیات شامل ہیں۔ اور یہ درحقیقت موجودہ اُمّتِ مسلمہ کے لیے بھی ایک پیشگی تنبیہہ ہے کہ سابقہ اُمّتِ مسلمہ جن غلط نظریات' عقائد' خیالات اور طرزِ عمل کی بنا پر اس انجامِ بد کو پہنچی ہے تم بھی کہیں اسی کو اختیار نہ کر لینا' کیونکہ ظاہر ہے غلط اعمال و افعال' غلط عقائد و نظریات کا ہی نتیجہ ہوتے ہیں۔ انسانی شخصیت کے یہ دو پہلو ہیں' ایک عقائد و نظریات اور دوسرے اعمال و افعال' جن کے درمیان گہرا رشتہ ہے ۔اگر کسی شخص سے غلط اعمال سرزد ہوتے ہیں تو یقیناً ان کے پیچھے اس شخص کے غلط افکار و نظریات ہیں۔ تو ان حصوں میں آپ دیکھیں گے کہ نہ صرف واقعاتی طور پر تجزیہ کیا جا رہا ہے بلکہ ان کی تہہ میں جو فکری گمراہی ہے اس کی نشاندہی بھی کی جا رہی ہے۔ یہ گویا ایک عالمی سچائی اور ابدی حقیقت ہے جو بتائی جا رہی ہے۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں جو متفق علیہ ہے' نبی کریم ﷺ نے بتا دیا تھا کہ اے مسلمانو! تمہارے اندر بھی وہ خرابیاں پیدا ہوں گی جو پہلی اُمتوں میں پیدا ہوئیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

((لَتَتَّبِعُنَّ سَنَنَ مَنْ قَبْلَكُمْ شِبْرًا بِشِبْرٍ وَّذِرَاعًا بِذِرَاعٍ ، حَتّٰى لَوْ سَلَكُوْا جُحْرَ ضَبٍّ لَسَلَكْتُمُوْهُ)) قُلْنَا: يَا رَسُوْلَ اللهِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصَارٰى؟ قَالَ : ((فَمَنْ !))

''اے مسلمانو ! تم بھی لازماً اتباع کرو گے انہی لوگوں کے طریقہ کا جو تم سے پہلے تھے' بالشت کے ساتھ بالشت اور ہاتھ کے ساتھ ہاتھ (جیسا کہ محاورہ ہے کہ تم انہی کے نقش قدم پر چلو گے) حتیٰ کہ وہ اگر کسی گوہ کے بِل میں گھسے تھے تو تم بھی گھسو گے'' ۔ صحابیؓ کہتے ہیں کہ ہم نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ ! کیا یہود و نصاریٰ؟'' (یعنی کیا آپ کی مراد یہود و نصاریٰ ہیں کہ ان کے اندر جو اعتقادی اور عملی خرابیاں تھیں وہ ہمارے اندر بھی آ جائیں گی؟) آپ ﷺ نے فرمایا: ''اور کون؟''

گویا یہ ایک پیشگی تنبیہہ تو ہے ہی' ستم ظریفی کہیے کہ واقعہ بھی یہی ہے کہ وہی نظری

واعتقادی گمراہیاں' وہی عملی خرابیاں' جو وہاں تھیں' یہاں بھی آئی ہیں۔ بہرحال جہاں تک تنبیہہ اور نشاندہی کا تعلق ہے ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اس کا حق ادا کر دیا ہے۔

آیت ِقرآنی سے غلط استدلال

اس تمہید کے بعد اب ہم اس حصّہ کا باقاعدہ مطالعہ کرتے ہیں ۔

{اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِيْنَ هَادُوْا وَ النَّصٰرٰى وَ الصّٰبِـُٔوْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿ ٦٢ ﴾}

سورۃ البقرۃ کے آٹھویں رکوع کی اس پہلی آیت کو خاصی controversial اور مغالطہ آمیز بنا دیا گیا ہے۔ پہلے بھی جب کبھی اس طرح کا فتنہ اٹھا ہو گا تو اس آیت کا حوالہ دیا گیا ہو گا۔ آیت زیر مطالعہ اور سورۃ المائدۃ کی آیت ٦٩ کے حوالہ سے ایک بہت بڑا فتنہ ''وحدتِ ادیان'' کھڑا کیا گیا تھا۔

فرمایا :{اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا} ''یقیناً یقیناً وہ لوگ جو مسلمان بنے۔'' میں نے یہاں ''جو ایمان لائے'' ترجمہ نہیں کیا' اس لیے کہ اہل ِ ایمان سے مراد مسلمان ہیں' چاہے وہ حقیقت میں مؤمن ہوں یا منافق۔ جو صرف قانونی مسلمان ہوتے ہیں قرآن ان سے بھی ''اے ایمان والو'' کہہ کر خطاب کرتا ہے' اس لیے کہ قانونی ایمان تو انہیں بہرحال حاصل ہے۔ چنانچہ سورۃ النساء کی آیت ١٣٦ ملاحظہ ہو:

{يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ الْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَ الْكِتٰبِ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ}

''اے ایمان کے دعوے دارو ! ایمان لاؤ (جیسا کہ ایمان لانے کا حق ہے) اللہ پر' اللہ کے رسولوں پر' اور اُس کتاب پر جو اُس نے اپنے بندے (ﷺ) پر نازل کی اور اس کتاب پر بھی جو اُس نے پہلے نازل کی۔''

تو آیت زیر مطالعہ کا ترجمہ یوں ہو گا:

''یقیناً جو لوگ مسلمان ہوئے' اور وہ جو یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صابی' جو بھی

ایمان لایا اللہ پر اور پچھلے دن پر اور جس نے بھی نیک عمل کیے' تو اُن کا اجر ان کے ربّ کے پاس محفوظ ہے' نہ ان کے لیے کوئی خوف ہے اور نہ وہ کسی حزن سے دوچار ہوں گے۔''

یہ اس آیۂ مبارکہ کا لفظی ترجمہ ہوا۔ یہ بات کئی دفعہ واضح کی جا چکی ہے کہ اہم مضامین قرآن حکیم میں کم از کم دو بار ضرور آتے ہیں' لہٰذا اس آیت کی ہم معنی آیت سورۃ المائدۃ کی آیت ۶۹ ہے جس کے الفاظ بعینہٖ وہی ہیں جو سورۃ البقرۃ کی مذکورہ بالا آیت کے ہیں' البتہ ترتیب میں معمولی سی تبدیلی ہے۔ سورۃ البقرہ میں نصاریٰ پہلے اور صابی بعد میں ہے' وہاں صابی پہلے اور نصاریٰ بعد میں ہے' باقی الفاظ جوں کے توں یہی ہیں۔

اگر قرآن حکیم میں سیاق و سباق اور دیگر مقامات پر جو باتیں آئی ہیں ان سب کو نظر انداز کر دیا جائے اور صرف کسی ایک مقام یا آیت کو توجہ کا مرکز بنا کر اس سے اپنا ایک فلسفہ اخذ کرنے کی کوشش کی جائے تو ان الفاظ سے یہ مغالطہ ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص خواہ یہودی ہو' نصرانی ہو' صابی ہو' چاہے مسلمان ہو' جو کوئی بھی ایمان رکھتا ہو اللہ پر' یومِ آخر پر اور نیک عمل کرتا ہو تو اس کی نجات یقینی ہے۔ یعنی اس آیت کی رو سے رسالت پر ایمان لازم نہیں آتا۔ گویا محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانا نجات کے لیے شرط لازم نہیں۔ اسے ''وحدتِ ادیان'' کا نام دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے نبوت و رسالت پر ایمان سے جو فرق آتا ہے وہ شریعت کا ہے۔ شریعتِ موسوی حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے سے متعلق ہے' شریعتِ محمدی کا محمد ﷺ پر ایمان لانے پر انحصار ہے۔ چنانچہ اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ شریعت بھی غیر ضروری ہے' اللہ پر اور آخرت پر ایمان اور نیک عمل نجات کے لیے کافی ہے! کوئی شخص نماز پڑھتا ہے یا نہیں پڑھتا' کیسے پڑھتا ہے وغیرہ' یہ ثانوی چیزیں ہیں' نجات کے لیے ان کی کوئی خاص اہمیت نہیں!

یہ فتنہ ہمارے ہاں تین حوالوں سے آیا ہے۔ اوّلاً: تصوف میں ہمہ اوست کا تصوّر۔ اگر یہ اصل شکل میں ہو تو پھر کسی مذہب' شریعت یا عبادت کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی۔ جیسا کہ مشہور مصرعہ ہے: ''مسجد' مندر ہکڑو نور''۔ یعنی مسجد اور مندر میں ایک ہی نور ہے۔ گویا جو

بتوں کو پوجتے ہیں وہ بھی اسی ہستیٔ باری تعالیٰ کو پوجنے والے ہیں' بت تو محض ایک ذریعہ ہیں' اپنی توجہ مرتکز رکھنے کے لیے بتوں کو ذریعہ بنایا گیا ہے' ورنہ پوجا تو کسی اور ہستی یا ہستیوں کی کی جاتی ہے۔

ثانیاً: اکبر اعظم کا ''دینِ الٰہی'' کا فتنہ۔ یہ دونوں فتنے خاص طور پر ہندوستان میں ایک ہی وقت میں

اُبھرے ہیں۔ اکبر اگرچہ اَن پڑھ تھا' مگر نہایت ذہین انسان تھا' اسے یہ محسوس ہو گیا تھا کہ مختلف مذاہب اور قومیتوں کی ہندوستان میں یہ جو کھچڑی پکی ہوئی ہے یہ اس کی عظمت اور ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے' لوگوں میں یکجہتی نہیں ہے اور وہ ایک قوم نہیں بن پاتے' لہٰذا ان مذاہب کے ظاہری فرق و تفاوت کو ختم کر کے ایک ہی مذہب بنا دیا جائے' تاکہ آپس کی کھٹ پٹ کم ہو اور سیاسی اعتبار سے ہندوستان ایک عظیم ملک کی شکل اختیار کر سکے۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے اس نے ''دینِ الٰہی'' ایجاد کیا' جس کے لیے اُس نے قرآن حکیم کا بھی سہارا لیا۔ ابوالفضل اور فیضی جیسے علماء اسے یہ پٹی پڑھانے کے لیے موجود تھے۔

قرآن مجید میں دو جگہ یہ مضمون آیا ہے (سورۃ السجدہ اور سورۃ الحج میں) کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو تدبیرِ کائنات ہو رہی ہے' اس میں ہمارا ایک ہزار سال اللہ کے ایک دن کی حیثیت رکھتا ہے۔ اکبر کا کہنا تھا کہ اب دینِ محمدیؐ کو ایک ہزار سال پورے ہو گئے ہیں' محمد ﷺ کا لایا ہوا دین ایک ہزار سال کے لیے تھا' لہٰذا اب وہ ختم ہو گیا اور اگلے ہزار سال کے لیے میرے ایجاد کردہ دینِ الٰہی پر عمل کیا جائے۔ اسی حوالے سے اسے ''الف ثانی'' یعنی دوسرا ہزار سالہ دَور کا نام دیا گیا۔ یہ واقعتاً بہت زبردست فتنہ تھا' لیکن اللہ تعالیٰ نے چونکہ اپنے دین کی حفاظت کی ذِمّہ داری لے رکھی ہے' یہ آخری دین ہے' اب کوئی نبی تو آئے گا نہیں' البتہ مجددین کا سلسلہ جاری ہے' چنانچہ اللہ تعالیٰ نے شیخ احمد سرہندی رحمہ اللہ علیہ سے ہند میں سرمایۂ ملّت کی نگہبانی کا کام لیا۔ اسی لیے انہیں ''مجددِ الفِ ثانی'' کہا جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ملّت اسلامیہ کے جداگانہ تشخص' شریعت کی اہمیت اور اتباعِ سُنّت کا مقام اجاگر کرنا حضرت مجدد الف ثانیؒ کا بہت بڑا کارنامہ ہے' جس کا یہ نتیجہ تھا کہ اکبر کی موت کے ساتھ ہی دینِ الٰہی کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

یہ فتنہ گزشتہ صدی میں ہندو مفکرین نے دوبارہ وحدتِ ادیان کے نام سے اٹھایا۔ اس کے لیے برہمو سماج کا تصوّر پیش کیا گیا' جسے گاندھی نے سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کیا اور ہندوستان میں مختلف مذاہب کے پیروکاروں کو ایک پلیٹ فارم پر لانے کی کوشش کی تاکہ ایک متحدہ ہندوستانی قوم وجود میں آئے۔ موجودہ دور میں یہ فتنہ سیکولرزم کی شکل میں پیش کیا گیا ہے' یعنی یہ تصوّر کہ مذہب انسان کا انفرادی معاملہ ہے' اجتماعی نظام میں اس کا عمل دخل نہیں ہونا چاہیے' ہر ایک کو یہ آزادی حاصل ہے کہ جس مذہب کی چاہے پیروی کرے' جو چاہے عقیدہ رکھے' جس طرح چاہے عبادت کرے' البتہ سیاسی' معاشرتی اور معاشی زندگی کے اصول طے کرنا لوگوں کی آزاد مرضی پر منحصر ہے۔ گویا جو بات دینِ الٰہی یا وحدتِ ادیان کے نام سے پیش کی جاتی رہی ہے' اسے جدید انداز میں سیکولرزم کا نام دیا گیا ہے۔ چنانچہ اس نظریہ کو تقویت فراہم کرنے کے لیے قرآن مجید کی مذکورہ بالا آیت کا ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جانا پہلی مرتبہ نہیں ہے۔

اس تمام نظریہ کی نفی کے لیے پانچویں رکوع کی وہ آیات موجود ہیں جن میں یہود کو محمد ﷺ پر ایمان لانے کی پُرزور دعوت دی گئی ہے اور جو بعد کے دس رکوعوں میں شامل آیات کے لیے ایک مشترک عنوان (common factor) کے طور پر لائی گئی ہیں۔

''وحدتِ اَدیان'' کا قرآنی تصوّر

وحدتِ ادیان کا مذکورہ بالا نظریہ یقیناً پرلے درجے کی گمراہی ہے' تاہم ''وحدتِ ادیان'' کا جو تصوّر ہمیں قرآن حکیم سے ملتا ہے وہ یہ ہے کہ تمام انبیاء و رُسل علیہم السلام کی دعوت دین اسلام ہی کی دعوت تھی۔ اس طرح کہ تمام ادیان اصلاً ایک ہیں' دنیا میں جتنے بھی ادیان ہیں ان کا origin ایک ہے۔ ظاہر ہے تمام انسان حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں اور حضرت آدم ؑ اللہ کے نبی تھے' چنانچہ دنیا میں جتنے بھی انبیاء و رسل آئے ہیں وہ یقیناً دین اسلام ہی کے حامل تھے۔ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام پر جو لوگ ایمان لائے تھے وہ بلاشبہ دین حق کے پیروکار تھے۔ مثلاً سورۂ یونس کی آیت ۱۹ میں فرمایا گیا:

{وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا ۭ}

''اور نہیں تھے تمام انسان مگر ایک اُمّت' پھر انہوں نے باہم اختلاف کیا۔''

یعنی ابتداءً سارے انسان ایک ہی اُمّت تھے' بعد میں انہوں نے مختلف عقیدے اور مسلک بنا لیے۔

یہی مضمون اسی سورۃ البقرۃ میں مزید نکھر کر سامنے آتا ہے۔ فرمایا:

{كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۠ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۪ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۭ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۚ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ۭ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۲۱۳﴾}

''ابتدا میں سب لوگ ایک ہی طریقے پر تھے۔ (پھر یہ حالت نہ رہی اور اختلافات رونما ہوئے۔) تب اللہ نے نبی بھیجے جو (راست روی پر) بشارت دینے والے اور (کج روی کے نتائج سے) خبردار کرنے والے تھے' اور ان کے ساتھ کتابِ برحق نازل کی تاکہ (حق کے بارے میں) لوگوں کے درمیان جو اختلافات رونما ہو گئے تھے ان کا فیصلہ کرے (اور ان اختلافات کے رونما ہونے کی وجہ یہ نہ تھی کہ ابتدا میں لوگوں کو حق بتایا نہیں گیا تھا۔ نہیں!) اس میں اختلاف تو ان ہی لوگوں نے کیا جنہیں حق کا علم دیا جا چکا تھا' انہوں نے روشن ہدایات پا لینے کے بعد محض اس لیے حق چھوڑ کر مختلف طریقے نکالے کہ وہ آپس میں زیادتی کرنا چاہتے تھے۔ پس جو لوگ (انبیاء علیہم السلام پر) ایمان لائے انہیں اللہ نے اپنے اِذن سے اس حق کا راستہ دکھایا جس میں انہوں نے اختلاف کیا تھا۔ اور اللہ جسے چاہتا ہے راہِ راست دکھا دیتا ہے۔''

چنانچہ یہ اختلاف اندھیرے میں نہیں ہوتا' باہم ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے ہوتا ہے' انسان جان بوجھ کر ٹھوکر کھاتا ہے' ایک دوسرے پر سبقت اور بالادستی حاصل کرنے کی خاطر حق سے اعراض کرتے ہوئے غلط راستے اختیار کرتا ہے' ورنہ یہ بات نہیں کہ حق نظر نہیں آتا۔ ابوجہل مانتا تھا کہ محمد ﷺ جھوٹ نہیں بولتے 'لیکن خاندانی اور

کُروہی رقابت آڑے آتی تھی۔

شروع میں تمام انسان ایک تھے اور ایک ہی دین تھا۔یہودیت' نصرانیت اور صابیت کا تعلق چونکہ اسی علاقے سے تھا جہاں قرآن حکیم نازل ہو رہا تھا اور اس لیے بھی کہ ان کا تعلق حضرت ابراہیم علیہ الصلوۃ والسلام سے تھا لہٰذا قرآن حکیم میں ان کا ذکر ہے 'ورنہ دنیا کے دیگر مذاہب بھی اصلاً اسلام ہی تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد تو انہی کی نسل سے تمام انبیاء آئے ہیں' لیکن ان سے قبل حضرت نوح علیہ السلام کی نسل سے بھی تو یقیناً انبیاء ہوں گے جن کے پیروکار دنیا میں رہے ہوں گے۔ یہ الگ بات ہے کہ اب ان کا اصل دین سے دُور کا تعلق بھی باقی نہیں رہ گیا' تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیا کے تمام مذاہب دین اسلام ہی کی بگڑی ہوئی شکلیں ہیں۔

وحدت کی انسانی خواہش اور اللہ تعالیٰ کی حکمتِ تخلیق

میرے نزدیک وحدتِ ادیان کی خواہش کا ابھرنا ایک فطری امر ہے' کیونکہ کوئی بھی انسان ایک دوسرے کے ساتھ مسلسل کشاکش یا محاذ آرائی کی حالت میں رہنا پسند نہیں کرتا' خاص طور پر آج کی دنیا میں اس خواہش نے شدت اختیار کر لی ہے' اس لیے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی کے نتیجہ میں مختلف خطوں کے درمیان فاصلے بالکل کم ہو کر رہ گئے ہیں' دنیا سکڑ کر ایک عالمی گائوں (global village) کی شکل اختیار کر گئی ہے 'اور یہ جو تفرقات ہیں' خصوصاً مذہب کی بنیاد پر' ان میں بڑی شدت ہوتی ہے۔ گویا یہ خواہش تو طبعی ہے' انسان مل جل کر امن و سکون کے ساتھ زندگی بسر کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ گاہے سیاسی ضرورت اور گاہے روحانی و مذہبی تقاضے کے طور پر مختلف اوقات میں یہ فلسفہ سامنے آتا رہا ہے 'لیکن ہمارے لیے اصل بات یہ ہے کہ قرآن حکیم اس بارے میں کیا کہتا ہے۔ قرآن حکیم کی رو سے بات بالکل دوسری ہے' اللہ کا اپنا الگ اصول اور تقاضا ہے' نہ کہ جو ہم چاہتے ہیں وہی اللہ کا بھی مقصد اور مدّعا ہے۔ فرمایا:

{وَ لَوۡ شَآءَ اللّٰہُ لَجَعَلَہُمۡ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً وَّ لٰکِنۡ یُّدۡخِلُ مَنۡ یَّشَآءُ فِیۡ رَحۡمَتِہٖ ؕ وَ الظّٰلِمُوۡنَ مَا لَہُمۡ مِّنۡ وَّلِیٍّ وَّ لَا نَصِیۡرٍ ﴿۸﴾}(الشوریٰ)

''اگر اللہ چاہتا تو ان سب کو ایک ہی اُمّت بنا دیتا' مگر وہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل کرتا ہے 'اور ظالموں کا نہ کوئی ولی ہے نہ مددگار۔''

اللہ چاہتا تو تمام انسانوں کو ایک اُمّت بنا دیتا' سب حقیقی مسلمان ہوتے' اللہ کے لیے یہ کوئی مشکل نہیں تھا' لیکن اللہ کے پیش نظر یہ ہے ہی نہیں' اللہ نے تو انسان کو امتحان اور آزمائش کے لیے پیدا کیا ہے' اس لیے جو انسان اللہ کے بتائے ہوئے راستہ پر چلنے کی کوشش کرے گا صرف اسی کو جنت میں داخلہ ملے گا' یہ نہیں کہ سب کے لیے جنّت تیار کر رکھی ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو انبیائِ کرامؑ اور کتابیں بھیجنے کی کیا ضرورت تھی' ایک ہی طرح سب انسانوں کو نیک بنا دیا جاتا۔ مزید فرمایا:

{وَ لَوۡ شَآءَ اللّٰہُ لَجَعَلَکُمۡ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً وَّ لٰکِنۡ یُّضِلُّ مَنۡ یَّشَآءُ وَیَہۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ} (النحل:۹۳)

''اگر اللہ کی مشیت یہ ہوتی (کہ تم میں کوئی اختلاف نہ ہو) تو وہ تم سب کو ایک ہی اُمّت بنا دیتا' مگر وہ جسے چاہتا ہے گمراہی میں ڈالتا ہے اور جسے چاہتا ہے راہِ راست دکھا دیتا ہے۔''

دونوں آیات میں تقریباً ایک جیسے الفاظ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی حکمتِ تخلیق ہی یہ ہے۔ یہ دُنیوی زندگی ایک آزمائش ہے' یہاں ایک درجہ بندی ہو کر رہنی ہے اور اس کی بنیاد یہی ہے کہ جو نیکی کا طلبگار ہو گا اللہ اسے ہدایت دے گا اور جو گمراہی کی روش اختیار کرے گا اسے گمراہی ملے گی۔ سورۂ ہود کی آیات ۱۱۸' ۱۱۹ ملاحظہ ہوں:

{وَ لَوۡ شَآءَ رَبُّکَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً وَّ لَا یَزَالُوۡنَ مُخۡتَلِفِیۡنَ ﴿۱۱۸﴾ اِلَّا مَنۡ رَّحِمَ رَبُّکَ ؕ وَ لِذٰلِکَ خَلَقَہُمۡ ؕ}

''اور اگر تیرا ربّ چاہتا تو تمام انسانوں کو ایک ہی اُمّت بنا دیتا' مگر اب تو وہ مختلف طریقوں پر ہی چلتے رہیں گے۔ سوائے ان کے جن پر تیرے ربّ کی رحمت ہے (وہ بے راہ رویوں سے بچتے رہیں گے) اور اسی (آزادیٔ انتخاب و اختیار اور امتحان) کے لیے تو اللہ نے انہیں پیدا کیا تھا۔''

آخری طور پر یہ مضمون سورۃ المائدہ میں آیا ہے جو مدنی سورہ ہے' پہلی تینوں مکی

سورتیں تھیں۔ فرمایا:

{ وَ لَوۡ شَآءَ اللّٰہُ لَجَعَلَکُمۡ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً وَّ لٰکِنۡ لِّیَبۡلُوَکُمۡ فِیۡ مَاۤ اٰتٰىکُمۡ فَاسۡتَبِقُوا الۡخَیۡرٰتِ ؕ اِلَی اللّٰہِ مَرۡجِعُکُمۡ جَمِیۡعًا فَیُنَبِّئُکُمۡ بِمَا کُنۡتُمۡ فِیۡہِ تَخۡتَلِفُوۡنَ ﴿۴۸﴾ }

''اور اگر اللہ چاہتا تو تمہیں ایک اُمّت بھی بنا سکتا تھا' لیکن اس نے یہ اس لیے کیا کہ جو کچھ اس نے تم لوگوں کو دیا ہے اس میں تمہاری آزمائش کرے' لہٰذا بھلائیوں میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرو۔ آخر کار تم سب کو اللہ ہی کی طرف جانا ہے' پھر وہ تمہیں اصل حقیقت بتا دے گا جس میں تم اختلاف کرتے رہے ہو۔''

لہٰذا اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ ہمیں یہ بات خواہ کتنی ہی بھلی نظر آئے اور کتنی ہی وقتی تقاضوں پر مبنی محسوس ہو‘ لیکن تمام انسانوں کا ایک اُمّت ہونا اللہ تعالیٰ کے مقصدِ تخلیق کے منافی ہے۔ یہاں تو سیدھی سیدھی بات ہے کہ جو حق ہے اس کا بول بالا کرو‘ اس پر جمے رہو‘ ڈٹے رہو‘ محض رواداری‘ یکجہتی یا کوئی اتحاد پیدا کرنے کے لیے لچک دکھانا اور کچھ give and take کرنا حق سے انحراف اور مداہنت ہے۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ کو فرمایا گیا:

{فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ ۝ ۸ ۝ وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ ۝ ۹ ۝ } (القلم)

’’آپ ان جھٹلانے والوں کے دباؤ میں ہرگز نہ آئیں ۔یہ تو چاہتے ہیں کہ آپ کچھ ڈھیلے پڑیں تو یہ بھی (آپ کی مخالفت میں) کچھ نرمی اختیار کر لیں۔‘‘

وہ تو چاہتے ہیں کہ آپؐ مداہنت کریں ‘لیکن آپؐ ہرگز ان کی باتوں پر توجہ نہ دیجیے اور اس پر ڈٹے رہیے جس کا آپ کو حکم دیا گیا ہے۔

اس کا تعلق اس حدیث سے بھی جڑتا ہے جس میں فرمایا گیا کہ ((بَدَأَ الْاِسْلَامُ غَرِيْبًا)) اسلام کا آغاز اس حال میں ہوا تھا کہ غریب یعنی اجنبی تھا۔جاننے پہچاننے والے کم تھے۔ پھر اسے غلبہ حاصل ہوا اور جسے غلبہ حاصل ہو اُس کے سبھی دوست ہوتے ہیں۔ فرمایا: ((وَسَيَعُوْدُ غَرِيْبًا كَمَا بَدَأَ)) اسلام عنقریب ایسا ہی ہو جائے گا جیسا شروع میں اجنبی تھا۔ مسلمان اگرچہ بہت ہوں گے‘ مگر اسلام غریب ہو گا۔ آج دنیا میں ڈیڑھ ارب کے لگ بھگ مسلمان ہیں‘ لیکن اسلام کہاں ہے؟ چنانچہ اسلام کے مطابق کوئی شخص زندگی

گزارنا چاہے گا تو وہ معاشرے میں اجنبی ہو کر رہ جائے گا۔ آپ اس کا فیصلہ کر لیں تو آپ کے قریب کوئی نہیں آئے گا‘ لوگوں کو آپ کے ساتھ رشتہ داری پسند نہیں ہو گی‘ آپ کو دقیانوسی اور رجعت پسند شمار کیا جائے گا۔ تو فرمایا: ((فَطُوْبٰى لِلْغُرَبَاءِ))پس مبارکباد ہے ان لوگوں کو جو خود اجنبی بننا گوارا کر لیں لیکن اسلام کا دامن نہ چھوڑیں۔ (مسلم‘ بروایت ابوہریرہؓ)

میثاق النّبیین

اب اس سلسلہ میں ایک اور دلیل نوٹ کیجئے اور وہ ہے ’’میثاق النّبیّن‘‘:

{وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَاۤ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَ لَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَ اَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ ؕ قَالُوْۤا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَ اَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝ ۸۱ ۝ } (آلِ عمران)

’’ذرا یاد کرو جب اللہ نے تمام نبیوں سے یہ عہد لیا تھا کہ جو کچھ میں نے تمہیں کتاب اور حکمت سے عطا کیا ہے‘ پھر تمہارے پاس وہ رسول آئے جو اس کی تصدیق کرنے والا ہو جو تمہارے پاس ہے تو تم کو لازماً اس پر

ایمان لانا ہو گا اور لازماً اس کی مدد کرنی ہو گی۔ فرمایا کہ کیا تم نے اقرار کیا اور اس شرط پر میرا عہد قبول کیا؟ انہوں نے کہا: ہاں ہم اقرار کرتے ہیں۔ اللہ نے فرمایا: تو اب گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں۔''

اللہ تعالیٰ نے تمام نبیوں سے ایک عہد لیا تھا' جیسا کہ میثاقِ الست تھا جو تمام انسانوں سے لیا گیا تھا اور جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسانوں کے جسمانی وجود سے بہت پہلے ارواحِ انسانی پیدا کی گئی تھیں۔ اسی طرح انبیاء کرام علیہم السلام کی ارواح سے یہ عہد لیا گیا تھا کہ جب میں تم میں سے کسی کو کتاب اور حکمت دوں گا اور اس کے بعد کوئی اور نبی آئے گا جو تصدیق کرے گا اس کی جو اس سے پہلے انبیاء کو دیا گیا تھا تو تم لازماً اس پر ایمان لاؤ گے اور لازماً اس کی مدد کرو گے۔ مطلب یہ کہ ایک نبی آئے' اللہ نے انہیں کتاب دی' حکمت سے

نوازا' ان کے جو پیروکار ہیں وہ ایک اُمّت بن گئے' اب ان کے بعد ایک اور نبی آ گئے' تو سابقہ انبیاء ؑ کے پیروکاروں پر لازم ہے کہ نئے آنے والے نبی پر ایمان لائیں اور ان کے دست و بازو بنیں۔ اللہ تعالیٰ نے آخر میں سوال کیا: کیا تم نے اقرار کیا اور میرے اس عہد اور میثاق کو قبول کیا ؟ تو انہوں نے کہا: ہم نے اقرار کیا۔ فرمایا: گواہ رہنا' اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ رہوں گا۔ ہر نبی کے ذریعے سے اس کی اُمّت سے جب اللہ نے یہ عہد لیا ہے تو یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ بس نجات کے لیے اپنے اپنے نبی پر ایمان رکھنا کافی ہو جائے گا ! یہ تصوّر اس آیہ مبارکہ کی قطعی نفی ہے۔

بنی اسرائیل کا اللہ تعالیٰ سے عہد

خاص طور پر بنی اسرائیل کا جو عہد تھا اس کو بھی نوٹ کر لیجئے۔ سورۃ البقرہ کے پانچویں رکوع میں بنی اسرائیل سے جو کہا جا رہا ہے کہ {وَ اَوۡفُوۡا بِعَہۡدِیۡۤ اُوۡفِ بِعَہۡدِکُمۡ ۚ} ''تم میرا عہد پورا کرو تاکہ میں تم سے اپنا عہد پورا کروں'' وہ کون سا خصوصی عہد تھا جو بنی اسرائیل سے ہوا ہے؟ اس ضمن میں سورۃ الاعراف کی آیات ۱۵۶ تا ۱۵۸ بہت اہم ہیں۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے گرفت آئی اور حضرت موسیٰؑ اپنی قوم کے چیدہ افراد کو لے کر کوہ طور پر گئے تو وہاں انہوں نے درخواست پیش کی تھی کہ: {وَ اکۡتُبۡ لَنَا فِیۡ ہٰذِہِ الدُّنۡیَا حَسَنَۃً وَّ فِی الۡاٰخِرَۃِ اِنَّا ہُدۡنَاۤ اِلَیۡکَ ؕ} ''اے ربّ ! ہمارے لیے اس دنیا اور آخرت کی زندگی میں خیر اور بھلائی مقدر کر دے' ہم تیری ہی جناب میں رجوع کرتے ہیں''۔ اس لفظ (ھُدۡنَا) کو نوٹ کیجئے' اس لیے کہ اس لفظ کا یہود کے ساتھ بھی تعلق ہے' یعنی لوٹنا' رجوع کرنا' پلٹنا۔

{قَالَ عَذَابِیۡۤ اُصِیۡبُ بِہٖ مَنۡ اَشَآءُ ۚ وَ رَحۡمَتِیۡ وَسِعَتۡ کُلَّ شَیۡءٍ ؕ فَسَاَکۡتُبُہَا لِلَّذِیۡنَ یَتَّقُوۡنَ وَ یُؤۡتُوۡنَ الزَّکٰوۃَ وَ الَّذِیۡنَ ہُمۡ بِاٰیٰتِنَا یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱۵۶﴾ اَلَّذِیۡنَ یَتَّبِعُوۡنَ الرَّسُوۡلَ النَّبِیَّ الۡاُمِّیَّ الَّذِیۡ یَجِدُوۡنَہٗ مَکۡتُوۡبًا عِنۡدَہُمۡ فِی التَّوۡرٰىۃِ وَ الۡاِنۡجِیۡلِ ۫ یَاۡمُرُہُمۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَ یَنۡہٰىہُمۡ عَنِ الۡمُنۡکَرِ وَ یُحِلُّ لَہُمُ الطَّیِّبٰتِ وَ یُحَرِّمُ عَلَیۡہِمُ الۡخَبٰٓئِثَ

وَ یَضَعُ عَنۡہُمۡ اِصۡرَہُمۡ وَ الۡاَغۡلٰلَ الَّتِیۡ کَانَتۡ عَلَیۡہِمۡ ؕ فَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِہٖ وَ عَزَّرُوۡہُ وَ نَصَرُوۡہُ وَ اتَّبَعُوا النُّوۡرَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ مَعَہٗ ۙ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ﴿۱۵۷﴾٪} (الاعراف)

''(اللہ تعالیٰ نے جواب میں) فرمایا: جہاں تک میرے عذاب کا تعلق ہے وہ تو میں دوں گا جس کو چاہوں گا ‘مگر میری رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے۔ (یعنی میری یہ رحمت سب کے لیے عام ہے‘ ہر شے کا وجود میری رحمت کا ہی مرہونِ منت ہے) لیکن میری خاص رحمت ان لوگوں کے لیے ہے جو تقویٰ کی روش اختیار کریں گے‘ زکوٰۃ ادا کریں گے اور ہماری آیات پر ایمان لائیں گے ۔اور وہ لوگ جو اتباع کریں گے اس پیغمبر‘ نبی امی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا جس کا ذکر وہ موجود پائیں گے اپنے ہاں (پیشین گوئی کے طور پر) تورات اور انجیل دونوں میں لکھا ہوا۔ وہ انہیں نیکیوں کا حکم دے گا‘ بدی سے روکے گا‘ تمام پاکیزہ چیزوں کو ان کے لیے حلال ٹھہرائے گا اور ناپاک و نجس چیزوں کو حرام قرار دے گا ‘اور ان پر پڑے ہوئے ناروا بوجھ ان سے اتارے گا اور انہیں ان بندشوں سے نجات دلائے گا جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے۔ لہٰذا جو لوگ اُس ؐپر ایمان لائیں گے‘ اُس کی تعظیم کریں گے‘ اُس کی مدد کریں گے اور اُس نور کا اتباع کریں گے جو اُس ؐکے ساتھ نازل کیا جائے گا‘ وہی لوگ فلاح پائیں گے۔''

بنی اسرائیل سے یہ عہد محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے لیے لیا گیا تھا۔ چنانچہ اگلی آیت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا:

{قُلۡ یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ اِنِّیۡ رَسُوۡلُ اللّٰہِ اِلَیۡکُمۡ جَمِیۡعَا الَّذِیۡ لَہٗ مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ۚ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ یُحۡیٖ وَ یُمِیۡتُ ۪ فَاٰمِنُوۡا بِاللّٰہِ وَ رَسُوۡلِہِ النَّبِیِّ الۡاُمِّیِّ الَّذِیۡ یُؤۡمِنُ بِاللّٰہِ وَ کَلِمٰتِہٖ وَ اتَّبِعُوۡہُ لَعَلَّکُمۡ تَہۡتَدُوۡنَ ﴿۱۵۸﴾}

''(اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ! ڈنکے کی چوٹ) کہیے کہ اے لوگو ! میں تم سب کے لیے اس اللہ کا رسول ہوں جس کی بادشاہی تمام زمین و آسمان پر ہے‘ اُس کے سوا کوئی معبود نہیں ‘ وہی زندگی اور موت دینے والا ہے‘ پس ایمان لائو اُس نبی اُمی رسول پر جو اللہ

اور اُس کے ارشادات پر ایمان رکھتا ہے (اللہ کی تمام سابقہ کتابوں پر ایمان رکھتا ہے) تاکہ تم فلاح سے ہمکنار ہو۔''

قرآن حکیم کی متذکرہ بالا آیات کی روشنی میں درج ذیل نتائج حاصل ہوتے ہیں:

۱) سیاق و سباق سے ہٹ کر صرف کسی ایک آیت سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا نجات کی شرط لازم نہیں ہے‘ محض کجی اور گمراہی ہے۔

۲) انبیاء کرام علیہم السلام سے لیے گئے عہد کی رو سے ہر نئے آنے والے نبی پر ایمان لانا لازم تھا۔

۳)بنی اسرائیل سے خاص طور پر یہ عہد لیا گیا تھا کہ وہ نبی آخر الزماں‘ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں گے۔

زیر مطالعہ آیت کا اصل مفہوم

اب ذرا اس آیت زیر مطالعہ کے الفاظ پر بھی غور کر لیں۔

{اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا} ''یقیناً وہ لوگ جو ایمان لائے'' مراد مسلمان ہیں۔ ہمیں درحقیقت یہ دیکھنا ہے کہ یہ آیت کس مقصد اور مفہوم میں یہاں آئی ہے۔ تمام انسانوں اور اُمتوں کا ایک مشترک روگ یہ ہے کہ وہ کسی ملّت یا اُمّت میں شامل ہونے کے بعد اس زعم میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ان کی نجات کا انحصار صرف اس اُمّت میں شمولیت پر ہے' حالانکہ اُمّت میں شامل ہونا اخروی نجات کی قطعاً ضمانت نہیں ہے' کیونکہ اُخروی نجات کے لیے اپنا ذاتی ایمان اور نیک عمل کا ہونا لازم ہے۔ یہ تصوّر کہ ''چونکہ تیرے محبوب کی اُمّت سے ہیں' لہٰذا جنت ہمارا حق ہے'' عمل خواہ کچھ بھی ہو' ایک باطل تصوّر ہے۔ یہ مغالطہ بنی اسرائیل کو ہوا اور ہر ایک کو ہو جاتا ہے' حالانکہ ایک شخص اللہ کے نبی ﷺ کے ساتھ مل کر دشمن کے ساتھ جنگ کرتے ہوئے شہید ہوجاتا ہے' لوگ کہتے ہیں کہ سیدھا جنت میں گیا' لیکن نبی ﷺ فرماتے ہیں: میں نے اسے جہنم میں دیکھا ہے' اس لیے کہ زخموں کی تاب نہ لا کر اس نے خودکشی کر لی تھی جو حرام ہے۔

نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا: کوئی شخص اپنی شجاعت اور بہادری کے اظہار کے لیے جنگ کرتا ہے' کوئی حمیت ِ جاہلی کی وجہ سے' کسی خاص قبیلہ سے خاندانی دشمنی کی بنا پر'

کوئی مالِ غنیمت کی طلب میں' ان میں سے کون مجاہد فی سبیل اللہ شمار ہو گا؟ فرمایا: کوئی بھی نہیں' بلکہ ((مَنۡ قَاتَلَ لِتَکُوۡنَ کَلِمَۃُ اللہِ ھِیَ الۡعُلۡیَا فَھُوَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللہِ))(۲) یعنی جہاد فی سبیل اللہ صرف اور صرف اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے ہو گا۔ میں نے اپنی کتاب ''سابقہ اور موجودہ مسلمان اُمتوں کا ماضی' حال اور مستقبل'' میں وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ دنیا میں قوموں پر جو عذاب آتا ہے وہ اجتماعی ہوتا ہے' لہٰذا اس میں گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے۔ ازروئے الفاظِ قرآنی:{وَ اتَّقُوۡا فِتۡنَۃً لَّا تُصِیۡبَنَّ الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا مِنۡکُمۡ خَآصَّۃً} (الانفال:۲۵) ''ڈرو اُس عذاب سے جو صرف ظالموں کو اپنی لپیٹ میں نہیں لے گا''۔ لیکن اس کے بالکل برعکس آخرت کا معاملہ فرداً فرداً ہو گا۔ یعنی دنیا میں اجتماعی مگر آخرت میں انفرادی معاملہ ہو گا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک اُمّت ِ موسوی ہی اُمّت مسلمہ تھی' مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آنے کے بعد یہود کے لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانا لازم تھا۔ اسی طرح محمد رسول اللہ ﷺ کی آمد تک حضرت عیسیٰ ؑ کے ماننے والے اُمّت ِ مسلمہ تھے' جبکہ اس کے بعد محمد ﷺ پر ایمان لانا شرطِ لازم ہے۔ البتہ نجاتِ اُخروی کا انحصار نہ حضرت موسیٰ ؑ یا حضرت عیسیٰ ؑ کی اُمّت میں ہونے پر تھا اور نہ اب اُمّت ِ محمدؐ میں ہونے پر ہے۔ لہٰذا مذکورہ آیت سے جن مضامین کا آغاز ہو رہا ہے ان کا تعلق انہی غلط نظریات اور تصوّرات کی نفی سے ہے۔ اس کے بعد وہ مضامین ہیں جن کا تعلق اہل ِ یہود پر تاریخی حوالہ سے ان کی

واقعاتی غلطیوں کی بنا پر عائد کردہ فرد جرم سے ہے۔
{اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا} کے بعد فرمایا: {وَالَّذِیۡنَ هَادُوۡا} اب دیکھئے یہاں لفظ بنی اسرائیل نہیں آیا' بلکہ الَّذِیۡنَ هَادُوۡا آیا ہے' اور یہ وہ الفاظ ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دین حق پر ہونے کی بنیاد پر استعمال کیے تھے {اِنَّا هُدۡنَا اِلَیۡکَ}۔ اگرچہ یہودیوں نے

_____(۲) صحیح البخاری' کتاب الجهاد والسیر'باب من قاتل لتکون کلمة اللهِ هی العلیا۔ و صحیح مسلم' کتاب الامارة'باب من قاتل لتکون کلمة الله هی العلیا فهو فی سبیل اللهِ۔

اپنے لیے حضرت یعقوب علیہ السلام کے چوتھے بیٹے یہودا کی نسل سے ہونے کو بنیاد بنایا ہے۔ یہی نام عیسائیوں کے ایک فرقہ کا بھی ہے''یہوواز وٹنیسز'' (JEHOVAS WITNESSES)'یہوا اللہ کے نام کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ بہرحال یہ جو مسلک بنا' اس میں صرف بنی اسرائیل ہی نہیں' ان کے طور طریقوں کی پیروی کرنے والے دوسرے لوگ بھی شامل ہیں۔ اس لیے یہاں لفظ بنی اسرائیل نہیں آیا۔

اس کے بعد {وَالنَّصٰرٰی} یہ لفظ {نَحۡنُ اَنۡصَارُ اللّٰهِ} سے ماخوذ ہے۔ اگرچہ ایک دوسری نسبت بھی ہے جو ناصرہ یا نصران نام کے ایک قصبہ کے حوالہ سے ہے' یہ قصبہ بیت المقدس سے ۷۰ میل شمال میں بحیرۂ روم کے ساحل سے ۲۰ میل کے فاصلہ پر تھا اور اب بھی موجود ہے۔ اسے نضارت بھی کہتے ہیں اور اسی کی نسبت سے حضرت عیسیٰؑ کو مسیح ناصری (Jesus of Nazaret) کہا جاتا ہے۔ اس لیے کہ حضرت مریم کا تعلق اسی قصبہ سے تھا' لیکن قرآن مجید کی رو سے لفظ نصاریٰ کا تعلق ''انصار اللہ'' سے ہے۔ ''نصاریٰ'' حضرت مسیحؑ کے خلیفہ برحق پیٹر یا شمعون کے پیروکار تھے جو حضرت عیسیٰ ؑ کے اصل دین پر تھے اور وہ بہت عرصہ تک ''نضارین ''بھی کہلاتے رہے۔ سینٹ پال' جو عیسیٰ ؑ کی زندگی میں ان کا شدید دشمن تھا' بعد میں اس نے کہا کہ مجھے رؤیاء ہوا ہے اور میں نے حضرت مسیحؑ کا دین اختیار کر لیا ہے۔ حضرت عیسیٰ ؑ کے دین میں ساری تبدیلیاں اسی کی پیدا کردہ ہیں اور اس کے ایجاد کردہ دین کو ماننے والے اب عیسائی (Christians) کہلاتے ہیں۔ قرآن مجید میں ہمیشہ لفظ نصاریٰ (Nazaren) آیا ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کو ماننے والے اصل وہ تھے' لہٰذا قرآن صرف ان کا نام لے رہا ہے اور اس حوالہ سے یہ آیت نازل ہو رہی ہے' یعنی جو ان میں شامل تھا وہ اپنے ایمان اور عمل کے ناطے پائے گا' جو پائے گا۔ ظاہر بات ہے جب ان سب کا الگ الگ نام لے کر کہا جارہا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اُس وقت جو اصل دین کے پیروکار تھے ان کا یہ معاملہ ہے۔ ان میں کچھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ماننے والے تھے اور کچھ

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ‘جبکہ ہم حضرت موسیٰ‘ حضرت عیسیٰ ؑ اور حضرت محمد ﷺ سب کے ماننے والے ہیں۔ چونکہ یہ چیز مشترک تھی اس لیے صرف ایمان اور

نیک اعمال کی بات کی گئی ہے۔

صابئین کے بارے میں ہمارے ہاں بہت سے اقوال اور آراء پائی جاتی ہیں۔ اب چونکہ اس نام سے دنیا میں کوئی فرقہ موجود نہیں ہے‘ لہٰذا اختلافِ رائے کا ہونا غیر معمولی بات نہیں‘ البتہ ایک بات یقینی ہے کہ یہ بھی اہل ِ کتاب میں سے تھے کیونکہ ان کا تذکرہ یہود و نصاریٰ کے ساتھ کیے جانے کا مطلب ہی یہ ہے۔ نیز حضرت عمر اور عبداللہ بن عباس (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کا قول بھی یہی ہے اور امام ابوحنیفہ ؒ کا فتویٰ بھی یہی ہے کہ یہ اہل کتاب ہیں اور ان کا ذبیحہ کھانا جائز ہے۔ ان کے بارے میں دو آراء زیادہ نمایاں ہیں‘ ایک یہ کہ یہ اپنے آپ کو حضرت یحییٰ علیہ السلام کی اُمّت کہتے تھے اور نزولِ اسلام کے وقت یہ لوگ ایران اور شام کی سرحد پر کہیں کہیں موجود بھی تھے۔ لیکن میرے نزدیک دوسری رائے زیادہ قرین قیاس ہے‘ وہ یہ کہ یہ لوگ براہ ِراست حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اپنے آپ کو منسوب کرتے تھے‘ اس لیے کہ اس آیت میں حضرت محمد ﷺ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اُمتوں کا نام آیا ہے اور ان اولوالعزم پیغمبروں میں حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی شامل ہیں‘ جن کا تعلق اسی علاقہ سے تھا ‘تو ان کے ساتھ بھی کچھ لوگ رہے ہوں گے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے تو اپنے آپ کو منسوب کرتے رہے لیکن ان کے بعد دوسرے کسی پیغمبر پر ایمان نہ لائے۔ آپ کو معلوم ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ایک نسل حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی چلی ہے جو حجاز میں آباد تھی ۔اس نسل میں اڑھائی ہزار سال تک کوئی نبی اور رسول نہیں آئے ‘لہٰذا یہ کہتے تھے کہ ہم حنیفی یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے ہیں‘ گو ان کے پاس نہ کوئی صحیفہ تھا نہ شریعت ‘اور وہ بدترین شرک میں مبتلا تھے‘ لیکن آخر اللہ کی رحمت جوش میں آئی اور انہی میں آخری نبی حضرت محمدرسول اللہ ﷺ مبعوث ہوئے۔ دوسری شاخ حضرت اسحاق علیہ السلام سے ہے ‘جس میں دراصل انبیاء و رسل کا تسلسل رہا ‘اگرچہ حضرت یوسف علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے درمیان معلوم ہوتا ہے کہ یہ سلسلہ منقطع رہا ہے اوراس دوران اس نسل میں بھی کوئی نبی نہیں ہوا‘ لیکن پھر حضرت موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کے درمیان دوبارہ یہ سلسلہ تسلسل کے ساتھ جاری رہا ہے۔ نسل انسانی کا یہ چودہ سو سالہ عرصہ اس لحاظ سے بڑا عجیب ہے کہ اس میں نبوت کا تار کہیں ٹوٹا ہی

نہیں۔ چنانچہ بخاری و مسلم میں نبی کریم ﷺ کی ایک مشہور حدیث ہے :

((کَانَتْ بَنُوْ اِسْرَاءِیْلَ تَسُوْسُھُمُ الْاَنْبِیَاءُ‘ کُلَّمَا ھَلَکَ نَبِیٌّ خَلَفَہٗ نَبِیٌّ))

''بنی اسرائیل کی قیادت ہمیشہ انبیاء کے پاس رہی ہے‘جب بھی ایک نبی فوت ہوجاتا تو اس کی جگہ دوسرا نبی موجود ہوتا۔''

بلکہ اس سنہری زنجیر کے آغاز میں اور آخر میں‘بیک وقت دو دو نبی موجود تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ حضرت ہارون علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ حضرت یحییٰ علیہ السلام ۔ بہرحال یہ تو ایک بہت ہی غیر معمولی واقعہ ہے ‘لیکن آپ کو معلوم ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ایک تیسری بیوی بھی تھیں اور ان سے اولاد بھی ہوئی ہے جو بنی قنتورہ کہلاتی تھی۔ ان میں سے ایک شاخ کا تو ہمیں معلوم ہے‘ جس میں مدین یا مدیان ان کے ایک بیٹے تھے جن کی نسل میں حضرت شعیب علیہ السلام کی بعثت ہوئی ہے ‘ لیکن ان کی دوسری اولاد بھی اسی علاقہ میں کہیں آباد تھی۔ اس میں یا تو آگے کوئی نبی نہیں آئے‘ یا پھر قرآن میں ان کا تذکرہ نہیں ہے‘ اور اگر ان میں کوئی نبی نہیں آئے تو ان میں جو لوگ رہے وہ میرے نزدیک صابئین ہیں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرتے رہے۔ اور وہی علاقہ ہے عراق اور شام کا جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد آباد رہی۔ اسی علاقہ میں حضرت یعقوب بن اسحٰق علیہما السلام کی نسل مصر سے واپس آنے کے بعد رہی ہے‘ فلسطین میں ان کی حکومت بھی قائم ہو گئی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تیسری بیوی کی نسل سے جو لوگ تھے وہ ذرا ہٹ کر شام اور عراق کے سرحدی علاقوں میں آباد ہو گئے۔

بہرحال اس آیت کا اصل مفہوم اس طرح ہے: ''یقیناً وہ لوگ جو اسلام لائے اور وہ جو یہودی ہوئے ‘اور وہ جو نصرانی ہوئے اور جو صابی رہے‘ ان میں سے جو بھی ایمان لایا اللہ پر اور یومِ آخر پر (یعنی اپنے اپنے وقت میں ‘اپنے اپنے دَور میں) اور اس نے عملِ صالح کی روش اختیار کی تو اللہ کے ہاں ان کا اجر محفوظ ہے‘ ان کے لیے نہ کوئی خوف ہے‘ نہ حزن ۔''

جب تک حضرت مسیح علیہ السلام نہیں آئے‘ یہ دَور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا رہا‘ اس میں جو یہودی یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پیروکار تھے اگر ان کا اللہ اور آخرت پر ایمان تھا ۔ اسی

طرح حضرت مسیح علیہ السلام کے دور میں جو بھی اللہ پر‘ حضرت مسیح ؑ پر اور آخرت پر ایمان رکھتا تھا اور اس کا عمل درست تھاتواس کے لیے کوئی خوف و حزن نہیں اور اللہ کے ہاں ان کا اجر محفوظ ہے۔ گویا انبیاء کرام علیہم السلام کے ساتھ صرف منسوب ہونا نجات کی ضمانت نہیں ہے ‘بلکہ اپنے اپنے نبیوں اور رسولوں کے ساتھ ساتھ اللہ اور آخرت پر ایمان‘ جس کے نتیجے میں عمل درست ہو جائے‘ لازم ہے۔ یعنی اصل بنائے نجات اللہ اور آخرت پر ایمان اور عمل صالح ہے‘ محض کسی گروہ‘ اُمّت یا شخصیت کے ساتھ وابستگی نجات کی ضمانت نہیں۔

قرآن حکیم سے ہمارے حجاب

کے اسباب

رمضان المبارک (۱۴۲۴ھ) کی ۲۷ویں شب 'قرآن اکیڈمی لاہور

اعوذ باللہ من الشَّیطٰن الرَّجیم ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ {وَ قَالُوْا قُلُوْبُنَا فِیْٓ اَکِنَّۃٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَیْہِ وَ فِیْٓ اٰذَانِنَا وَقْرٌ وَّ مِنْۢ بَیْنِنَا وَ بَیْنِکَ حِجَابٌ فَاعْمَلْ اِنَّنَا عٰمِلُوْنَ ﴿۵﴾} (حٰمٓ السّجدۃ)

{وَ اِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَیْنَکَ وَ بَیْنَ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَۃِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا ﴿۴۵﴾ وَّ جَعَلْنَا عَلٰی قُلُوْبِہِمْ اَکِنَّۃً اَنْ یَّفْقَہُوْہُ وَ فِیْٓ اٰذَانِہِمْ وَقْرًا} (بنی اسرائیل:۴۵'۴۶)

تلاوتِ آیات اور ادعیہ ٔ ماثورہ کے بعد:

آج میں خاص طور پر اس مسئلے پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں کہ کیا وجہ ہے کہ ہم پر قرآن کی تاثیر کارگر نہیں؟ قرآن سن کر ہمارے دلوں پر اثر کیوں نہیں ہوتا؟ کیا ہمارے اور قرآن کے مابین کوئی حجاب حائل ہے؟ سورۂ فُصّلت (حٰمٓ السجدۃ) میں کفارِ مکہ کا قول نقل ہوا ہے: {وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِیْٓ اَکِنَّۃٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَیْہِ} ''اور انہوں نے (اللہ کے رسول ﷺ سے) کہا: (اے محمد'!) ہمارے دل پردوں اور غلافوں میں بند ہیں' اُن چیزوں کے اعتبار سے جن کی طرف آپ ہمیں بلا رہے ہیں'' {وَفِیْٓ اٰذَانِنَا وَقْرٌ} ''اور ہمارے کانوں میں بوجھ ہے'' یعنی آپ کی بات ہمارے کانوں میں اترتی نہیں۔ {وَمِنْۢ بَیْنِنَا وَبَیْنِکَ حِجَابٌ} ''اور ہمارے اور تمہارے درمیان پردہ حائل ہے'' {فَاعْمَلْ اِنَّنَا عٰمِلُوْنَ ﴿۵﴾}''پس تم جو چاہو کر لو' ہم اپنی سی کوشش کر رہے ہیں''۔ مطلب یہ ہے کہ آپؐ کی بات کارگر نہیں ہوگی۔ خود اللہ تعالیٰ نے سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا:

{وَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَیْنَکَ وَبَیْنَ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ

بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا ﴿۴۵﴾ }

''اور(اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم !) جب آپ قرآن پڑھ کر سناتے ہیں تو ہم آپ کے اور اِن لوگوں کے درمیان جو قیامت پر ایمان نہیں رکھتے ' ایک غیر مرئی پردہ حائل کردیتے ہیں۔''

اور فرمایا:

{وَّ جَعَلْنَا عَلٰی قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَ فِيْۤ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ؕ }

''اور اُن کے دلوں کے اوپر پردے حائل کر دیتے ہیں کہ اسے سمجھ نہ پائیں اور ان کے کانوں کے اندر ثقل اور بوجھ پیدا کر دیتے ہیں۔''

ہمارے لیے لمحہ فکریہ ہے کہ کہیں آج اُمّت ِ مسلمہ ان آیات کی مصداق تو نہیں بن گئی ہے (معاذ اللہ) 'کیونکہ قرآن کی اثر انگیزی کے بارے میں تو کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔بے شمار واقعات ہیں کہ کئی لوگ وفد کی صورت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ اس وفد کو جب قرآن سنایا گیا تو اُن کی آنکھوں سے آنسوئوں کی ندیاں بہہ نکلیں۔ قرآن کی تاثیر کا یہ عالم سورۃ المائدۃ میں بایں الفاظ بیان ہوا ہے :

{وَ اِذَا سَمِعُوْا مَاۤ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰۤى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۸۳﴾ }

''جب وہ اس کلام کو سنتے ہیں جو رسول پر اترا ہے تو تم دیکھتے ہو کہ حق شناسی کے اثر سے ان کی آنکھیں آنسوئوں سے تر ہو جاتی ہیں۔ وہ بول اٹھتے ہیں کہ پروردگار ! ہم ایمان لائے ' پس تو ہمیں گواہی دینے والوں میں لکھ لے۔''

اسی طرح ایک وفد حبشہ سے آیا تھا ' اس کا تذکرہ سورۃ القصص میں موجود ہے :

{وَاِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِهٖۤ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَاۤ...} (آیت ۵۳)

''اور جب اُن پر (قرآن کی آیات) تلاوت کی گئیں تو وہ کہنے لگے کہ ہم ایمان لائے کہ یہ ہمارے ربّ کی طرف سے حق ہے...''

جِنّات کے بارے میں بھی آیا ہے کہ وہ ایک مرتبہ ہی قرآن سن کر ایمان لے آئے :

{فَقَالُوْۤا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا ۙ﴿ ۱ ﴾ يَّهْدِيْۤ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ ؕ}(الجن: ۱'۲)

''... تو وہ کہنے لگے کہ ہم نے ایک خوبصورت قرآن سنا ہے ' جو ہدایت کی طرف راہنمائی کرتا ہے ' پس ہم اس پر ایمان لے آئے ہیں۔''

صرف یہی نہیں کہ ایمان لائے ہوں بلکہ قرآن کے داعی اور مبلغ بھی بن گئے اور اپنی قوم سے جا کر کہا: {يٰقَوْمَنَاۤ

اَجِیْبُوْا دَاعِیَ اللّٰہِ وَاٰمِنُوْا بِہٖ...} (الاحقاف: ۳۱) ''اے ہماری قوم! اللہ کی طرف پکارنے والے کی پکار پر لبیک کہو اور اس پر ایمان لائو...''

قرآن کے پس منظر میں جانے کے اسباب

ایک طرف قرآن کی تاثیر کا یہ عالم ہے اور ایک طرف ہم ہیں کہ قرآن سے متاثر نہیں ہوتے۔ اس کا سبب کیا ہے؟ اس موضوع پر میرا ایک چھ صفحات پر مشتمل مختصر اور جامع مضمون میری کتاب ''دعوت رجوع الی القرآن کا منظر و پس منظر'' میں ''قرآنِ حکیم قرنِ اوّل میں اور اس کے بعد'' کے عنوان سے شامل ہے۔ اس میں میں نے یہ بات بیان کی ہے کہ اسلام جب ایک تحریک کے دَور میں تھا' اُس وقت تحریک کو دعوت' جہاد اور قتال کے مراحل درپیش تھے' ابھی ریاست کی شکل نہیں بنی تھی' اس لیے اس مرحلے میں زیادہ زور ایمان اور قرآن پر تھا۔ لیکن جب اسلام نے ریاست کی شکل اختیار کر لی اور اسلامی حکومت قائم ہو گئی تو اب قانون اور اسلام کی اہمیت زیادہ ہو گئی ۔ چنانچہ ایک Natural shift of emphasis ہوا ہے' کیونکہ دعوت اور تحریک کے دَور میں ترجیحات کچھ اور ہوتی ہیں اور جب ایک اسلامی ریاست وجود میں آجاتی ہے تو تقاضے بدل جاتے ہیں۔ اس لیے کہ ریاست کا ایک حدود اربعہ ہوتا ہے' دفاع ہوتا ہے' قانون ہوتا ہے' یہ طے کرنا ہوتا ہے کہ کون مسلمان ہے' کون نہیں ہے؟ کس کے کیا حقوق ہیں؟ شہریت کے کیا لوازم ہیں؟ ان مسائل پر توجہ کے باعث یہ بالکل قدرتی امر تھا کہ قرآن خود بخود ایک درجہ پس منظر میں چلا گیا۔ ہم نے پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم کا ایک مضمون بھی شائع کیا تھا جس میں انہوں نے قرآن مجید کے پس منظر میں جانے کے بہت سے اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی بیان کیا ہے کہ

ہمارے ہاں بادشاہوں' جاگیرداروں اور سرمایہ داروں نے شعوری طور پر کوشش کی ہے کہ قوم کی توجہ قرآن سے ہٹ جائے۔ اس لیے کہ قرآن تو اُن کی مذمت کرتا ہے اور مستضعفین کی حمایت کرتا ہے۔ جیسے ارشادِ ہوا:

{وَیۡلٌ لِّکُلِّ ہُمَزَۃٍ لُّمَزَۃِۣ ﴿۱﴾ الَّذِیۡ جَمَعَ مَالًا وَّ عَدَّدَہٗ ﴿۲﴾ کَلَّا لَیُنۡۢبَذَنَّ فِی الۡحُطَمَۃِ ﴿۴﴾} (الہُمزۃ)

''بڑی خرابی ہے ہر اس شخص کے لیے جو لوگوں کے عیب چنتا ہے اور طعنے دیتا رہتا ہے جس نے مال جمع کیا اور اسے گن گن کر رکھا۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال اسے ہمیشگی عطا کر دے گا۔ ہرگز نہیں' وہ شخص تو چکنا چور کر دینے والی جگہ میں پھینک دیا جائے گا۔''

اس لیے انہوں نے چاہا کہ لوگ صرف قرآن کی تلاوت کر لیا کریں' اسے سمجھا نہ کریں۔ سمجھیں

گے تو ہماری تصویر سامنے آجائے گی' ہمارے خلاف ردِّ عمل پیدا ہو گا اور لوگ ہمارے خلاف کھڑے ہو جائیں گے۔ لہٰذا قرآن کو پس منظر میں جانے دو' بلکہ اس کو بالفعل پس منظر میں لے جانے کی کوشش کرو اور ان کی توجہ کسی اور شے پر لگا دو۔ انہیں تصوف کے راستے پر لگا دو' کسی علمی جدّوجُہد میں لگا دو' لیکن قرآن سے دُور رکھو۔ اس کی تائید ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے' یہ صحیح بخاری کی حدیث ہے' جس کے راوی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں' وہ فرماتے ہیں:

((حَفِظْتُ مِنْ رَسُوْلِ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وِعَائَیْنِ' اَمَّا اَحَدُھُمَا فَبَثَثْتُہٗ فِیْکُمْ' وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَلَوْ بَثَثْتُہٗ لَقُطِعَ ھٰذَا الْبُلْعُوْمُ)) (۱)

''میں نے رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ سے علم کے دو برتن بھر لیے تھے' ایک برتن میں سے تو میں نے تمہارے مابین خوب علم تقسیم کر دیا (عام کر دیا' تمہیں پڑھا دیا' سکھا دیا) لیکن اگر میں دوسرے برتن کے علم کو عام کروں تو میری یہ گردن اڑا دی جائے گی۔''

اسلام کا ایک علم عبادات کا علم ہے۔ یعنی وضو کا علم کہ وضو کیسے کیا جاتا ہے' وضو کیسے ٹوٹتا ہے' نواقض وضو کیا ہیں۔ اور طہارت کا علم کہ غسل کی حاجت کب ہوتی ہے' غسل کی شرائط کیا ہیں' غسل کے لوازم کیا ہیں' اس کے فرائض کیا ہیں۔ پھر نماز وںکے قواعد و ضوابط ہیں۔ پھر یہ کہ

(۱) صحیح البخاری' کتاب العلم' باب حفظ العلم' حدیث ۱۱۷

کون سا پانی پاک اور کون سا ناپاک ہوتا ہے ۔یہ عبادات کا علم آج بھی خوب عام ہوتا ہے۔ سعودی عرب کے ٹیلی ویژن سے اس علم کے مسائل پر بڑے بڑے پروگرام چلتے رہتے ہیں۔ جبکہ علم کی ایک دوسری قسم یہ ہے کہ اسلامی ریاست کیسی ہوتی ہے؟ اسلام کا نظامِ حکومت کیسا ہوتا ہے؟ اسلام میں سرمایہ داری کا کیا مقام ہے؟ اسلام میں جاگیرداری کا بھی کوئی مقام ہے یا نہیں؟ کیا بیت المال بادشاہوں کی ذاتی جاگیر ہوتی ہے؟ اہل علم کی ایک رائے کے مطابق حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا اشارہ بعض ان احادیث کی طرف ہے جو سیاست و خلافت سے متعلق تھیں۔ ان روایات کے بارے میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر میں یہ روایات بیان کروں گا تو اسے برداشت نہیں کیا جائے گا اور میری یہ گردن کاٹ دی جائے گی ۔چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ ہماری حدیث کی کتابیں عبادات کے علم سے تو بھری پڑی ہیں' ان میں کتاب الطہارۃ' کتاب المیاہ' کتاب الصلاۃ' کتاب الصوم' کتاب الحج'

عبادات کے یہ سارے معاملات موجود ہیں‘ لیکن کچھ معاملات جس قدر تفصیل سے ہونے چاہئیں اس تفصیل سے موجود نہیں۔ بعینہٖ اسی حوالے سے قرآن مجید کو بھی پیچھے دھکیلا گیا ہے۔

اب آیئے موجودہ حالات کی طرف کہ آج قرآن کے پس منظر میں جانے کی صورت کیا ہے ! ایک تو وہ لوگ ہیں جو قرآن کو سمجھتے نہیں‘ صرف ثواب حاصل کرنے کے لیے پڑھتے ہیں۔ عجمی لوگ اکثر و بیشتر تو وہی ہیں جو قرآن کو سمجھتے ہی نہیں اور اس کے لیے ان کے پاس سب سے بڑی دلیل ’’ثواب‘‘ کی ہے‘ کیونکہ ان کے ہاں وہ حدیثیں عام کر دی گئی ہیں کہ ایک حرف پڑھو گے تو دس نیکیاں لکھی جائیں گی۔ چنانچہ انہیں سمجھنے سے سروکار نہیں ہے‘ کیونکہ ان کے نزدیک صرف پڑھنا اور تلاوت کرنا اصل ہے۔ یہ صحیح حدیث ہے جس میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ قرآن حکیم کے ہر حرف کی تلاوت پر دس نیکیوں کا ثواب حاصل ہوتا ہے۔ اور ’’الٓمٓ‘‘ کو ایک حرف نہ سمجھنا‘ ’’الف‘‘ ایک حرف ہے ’’لام‘‘ ایک حرف ہے ’’مِیْم‘‘ ایک حرف ہے۔ گویا تم نے ’’الٓمٓ‘‘ پڑھا تو تیس نیکیاں تمہارے حساب میں درج ہو گئیں۔ حدیثِ نبویؐ سر آنکھوں پر‘ میں اس حدیث کی نفی نہیں کرتا‘ لیکن اس طرف بھی توجّہ کی ضرورت ہے کہ آیاتِ قرآنی کو نہ سمجھنے سے کوئی debit (نقصان یا

گناہ) بھی ہوتا ہے یا نہیں ! کریڈٹ (credit) تو ہم گنتے جا رہے ہیں کہ ہم نے اتنا ثواب حاصل کر لیا‘ ختم قرآن کر لیا۔ لوگ گنتی کرتے ہیں کہ ہم نے رمضان میں اور اعتکاف میں اتنے قرآن ختم کر لیے۔ آپ ڈھیروں کریڈٹ تو جمع کر رہے ہیں‘ لیکن قرآن کو نہ سمجھنے کا کوئی debit بھی ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ اس طرزِ عمل کی وجہ سے ساتھ ساتھ آپ کا کریڈٹ ختم ہو رہا ہو اور debit بڑھ رہا ہو؟ میں نے ۱۹۶۸ء میں جب ’’مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق‘‘ کے عنوان سے کتاب لکھی تھی‘ جو کہ مسجد خضراء سمن آباد میں کی گئی تقریروں پر مبنی ہے‘ تو کچھ عرصے بعد ۱۹۷۰ء کا پورا رمضان المبارک میں نے مدینہ منورہ میں گزارا۔ آخری عشرے میں مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ وہاں مسجد نبویؐ میں اعتکاف کے لیے آ گئے۔ میں نے اپنا یہ کتابچہ ان کو دیا کہ مولانا صاحب ! میں اس کو بڑے پیمانے پر عام کرنا چاہتا ہوں‘ آپ اس کو دیکھ لیجیے‘ اگر کہیں کوئی غلطی ہوئی ہے تو نشاندہی کر دیں تاکہ اس کی اصلاح ہو جائے اور میں اس کو بڑے پیمانے پر شائع کر سکوں۔ انہوں نے حالتِ اعتکاف میں وہ کتابچہ پڑھا اور ایک جگہ اصلاح کی۔ اس کتابچے میں میں نے قرآن مجید کے تیسرے حق ’’تذکر و تدبر‘‘ کے ضمن میں لکھا تھا :

’’... بغیر فہم کے مجرد تلاوت کا جواز ایسے لوگوں کے لیے تو ہے جو پڑھنے لکھنے سے بالکل محروم رہ گئے ہوں اور اب تعلیم کی عمر سے بھی گزر چکے ہوں۔ ایسے لوگ اگر ٹوٹے پھوٹے طریق پر تلاوت کر لیں تو بھی بہت غنیمت ہے اور اس کا ثواب انہیں ضرور ملے گا۔ بلکہ ایک ایسا اَن پڑھ شخص جو ناظرہ بھی نہ پڑھ سکتا ہو اور اب اس کے لیے اس کا سیکھنا بھی ممکن نہ ہو‘ اگر اس یقین کے ساتھ کہ قرآن اللہ کا کلام ہے‘ اسے کھول کر بیٹھتا ہے

اور محبت و عقیدت اور احترام و تعظیم کے ساتھ اس کی سطور پر محض انگلی پھیرتا رہتا ہے تو اس کے لیے اس کا یہ عمل بھی یقیناً موجب ثواب و برکت ہو گا' لیکن پڑھے لکھے لوگ جنہوں نے تعلیم پر زندگیوں کا اچھا بھلا عرصہ صرف کردیا ہو اور دنیا کے بہت سے علوم و فنون حاصل کیے ہوں' مادری ہی نہیں غیر ملکی زبانیں بھی سیکھی ہوں ' اگر قرآن مجید کو بغیر سمجھے پڑھیں تو عین ممکن ہے کہ وہ قرآن مجید کی تحقیر و توہین اور تمسخر و استہزاء کے مجرم گردانے جائیں۔ ایسے لوگوں کو تلاوتِ

قرآن کا کوئی ثواب نہیں ملے گا ...''

انہوں نے یہ اصلاح تجویز کی کہ :

''...اگر قرآن کو بغیر سمجھے پڑھیں تو عین ممکن ہے کہ وہ قرآن کی تحقیر و توہین اور تمسخر و استہزاء کے مجرم کُردانے جائیں اور اس اعراض عن القرآن کی سزا تلاوت کے ثواب سے بڑھ جائے...''

مولانا مرحوم کا مشورہ بہت عمدہ تھا۔ اس سے مضمون اور نکھر گیا۔ کیونکہ یہ اعراض ہی تو ہے کہ ایم اے کیا' پی ایچ ڈی کی' فزکس اور کیمسٹری میں سپیشلائزیشن کیا' اتنے عرصے تک پڑھتے رہے 'لیکن اتنی عربی نہ سیکھ سکے کہ قرآن کا مفہوم براہِ راست سمجھ سکیں۔ ایسے لوگوں کے پاس روزِ محشر کیا دلیل ہو گی' کیا عذر ہو گا؟ جیسے اقبال نے کہا ہے ؎

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے !

آپ تصوّر کریں کہ حشر کی گھڑی قائم ہو چکی ہے' اللہ تعالیٰ آپ سے پوچھ رہا ہے کہ تم نے عربی کیوں نہیں سیکھی تھی اور قرآن کیوں نہیں سمجھا تھا؟تو آپ کے پاس کیا جواب ہو گا؟ ظاہر ہے کوئی جواب نہیں ہو گا اور اس اعراض عن القرآن کی سزا کے طور پر سارا ثواب صاف ہو جائے گا اور گرفت بڑھتی چلی جائے گی۔

یہاں تک عجمی لوگوں کا معاملہ تو سمجھ میں آگیا کہ عربی نہ سیکھی لہٰذا قرآن سمجھ میں نہ آیا' لیکن آج عربوں کو کیا ہوا؟ قرآن تو اُن کی زبان میں نازل ہوا ہے' ان پر قرآن کی تاثیر کیوں ظاہر نہیں ہو رہی؟ یہ وہ سوال ہے جس کے جواب سے مسئلہ آپ کے سامنے پوری طرح نکھر کر سامنے آجائے گا۔ کیونکہ اگر قرآن اور ہمارے درمیان صرف عربی زبان کا حجاب ہے تو قرآن کی تاثیر آج عربوں پر کیوں نہیں ہے؟ تاثیر ہوتی تو آج وہاں یقیناً اسلام کا نظامِ عدل و قسط قائم ہوتا' اسلام کا بول بالا ہوتا۔ لیکن صورتِ واقعہ یہ ہے کہ آج مغربی تہذیب میں جس قدر عرب غرق ہیں ہم

نہیں ہیں۔ شمالی افریقہ کے پورے ساحل پر دینی اور اخلاقی اعتبار سے بدترین قومیں آباد ہیں' جن کی زبان عربی ہے۔ الجزائر' تیونس اور

لیبیا کے رہنے والوں کی تو اپنی زبان عربی ہے' لیکن ان پر قرآن کا کوئی اثر نہیں ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ یہ وہ اہم نکتہ ہے جسے میں بیان کرنا چاہتا ہوں۔

مکّی قرآن سے ہمارے حجابات

پیش نظر مسئلے کا میں نے تجزیہ کیا تو پہلی بات یہ سامنے آئی کہ ہم قرآن حکیم کے ایک بڑے حصے کو اپنے سے غیر متعلق (irrelevent) سمجھتے ہیں۔

پہلا حجاب :

ہم مکی قرآن پڑھتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ساری باتیں کفر اور کفار کی ہو رہی ہیں' جبکہ ہم مسلمان ہیں' اپنے تئیں پکے مؤمن ہیں' ہمارا اس سے کیا سروکار؟ وہ ساری بحثیں ہم غیر متعلق سمجھتے ہیں کہ یہ تو دیوی دیوتاؤں کے شرک کی باتیں ہو رہی ہیں۔ لات و عزیٰ سے بھلا ہمارا کیا سروکار؟ ہم ان کے پوجنے والے نہیں۔ اس لیے یہ ساری بحثیں ہم سے غیر متعلقہ قرار پاتی ہیں۔ اسی طرح قصص النّبیین ہمارے لیے ''اساطیر الاوّلین''کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے بارے میں ہمارا طرزِ عمل یہ ہے کہ وہ بہت اچھے لوگ تھے' وہ نبی تھے' ہم غیر نبی ہیں۔ اس لیے انبیاء کا تذکرہ ہمارے لیے غیر متعلق ہے۔ انباء الرسل اس لیے غیر متعلقہ ہیں کہ اب کوئی رسول نہیں آئے گا' اس لیے کسی قوم پر عذابِ ہلاکت بھی نہیں آ سکتا' کیونکہ خود اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:{وَ مَا کُنَّا مُعَذِّبِیْنَ حَتّٰی نَبْعَثَ رَسُوْلًا ﴿۱۵﴾} (بنی اسرائیل) ''ہم جب تک رسول نہ بھیجیں ہمارا عذاب نہیں آسکتا''۔ نہ اب رسول آئے گا' نہ عذاب آئے گا۔ چنانچہ یہ قصے بھی محض تاریخی حیثیت کے حامل ہیں' ان کا عملی طور پر کوئی تعلق ہم سے نہیں۔ ہاں کہیں اخلاق کی بات آگئی' سچ بولنے کی تاکید آگئی' جھوٹ کی مذمت آگئی تو اسے ہم نے سمجھا کہ اس کا کوئی تعلق ہم سے ہے۔ اس کے علاوہ یہ جو پورا مکی قرآن ہے اس کے متعلق ہم اس مغالطے میں مبتلا ہیں کہ اس کا ہم سے کوئی تعلق سرے سے ہے ہی نہیں۔

دوسرا حجاب:

ایمانیات کی بحث کو بھی ہم اپنے سے متعلق نہیں سمجھتے' حالانکہ ہمارے پاس حقیقی

ایمان نہیں ہے۔ جو کچھ ہے وہ ایک موروثی عقیدہ (Racial Creed) ہے' اس کے ساتھ یقین کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ صرف قانونی ایمان ہے' جو آج اکثریت کو حاصل ہے۔ لیکن قانونی ایمان کی آخرت میں کوئی حیثیت نہیں' وہاں انسان کو حقیقی ایمان کے اعتبار سے پرکھا جائے گا۔ اس لیے مکی قرآن میں ایمان کی بحثیں سمجھنا بھی ضروری ہیں' جن میں ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ کے دلائل دیے گئے ہیں۔ لیکن ہمارا یہ زعم کہ ہم توصاحب ِایمان ہیں' ہمارے اور قرآن کی ان طویل بحثوں کے درمیان حجاب بن گیا ہے۔

تیسرا حجاب:

نزولِ قرآن کے وقت شرک کی جو صورتیں موجود تھیں آج ان کے علاوہ بھی شرک کی بہت سی شکلیں ہیں جن میں ہم مبتلا ہیں۔ مثلاً سیاسی شرک۔ نفس پرستی کا شرک تو خود قرآن میں بیان ہوا ہے :{اَفَرَءَیۡتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـہَہٗ ہَوٰىہُ}(الجاثیۃ:۲۳) ''(اے نبی ﷺ !) کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہشاتِ نفس کو اپنا معبود بنا لیا ہے؟'' لیکن ہم خود کو شرک سے بالکلیہ بری سمجھتے ہیں۔ حالانکہ مسلمانوں کا سوادِ اعظم آج بھی اسی دیوی دیوتاؤں اور بت پرستی والے شرکِ قدیم میں مبتلا ہے۔ غور کیجیے یہ مزاروں پر کیا ہورہا ہے؟ اس میں اور بت پرستی میں کیا فرق ہے؟ صرف ایک چیز کی کسر ہے کہ مورتی سامنے نہیں بنی ہوتی۔ اگر قومِ نوح نے اپنے اولیاء اللہ ''وَدّ ' سُوَاع ' یَغُوث ' یَعُوق ' نَسْر'' کے مجسمے تراش لیے تھے تو کیا یہ سب کچھ ہم اپنے اولیاء اللہ کے ساتھ نہیں کررہے؟ ان سے ''شَیْئًا لِلّٰہِ'' کہہ کر مانگتے نہیں ہیں؟ ان سے یہ نہیں کہتے کہ اَغِثْنِیْ ''میری فریاد سنئے اور میری مدد کیجیے ! ''کیا ہمارا یہ عقیدہ نہیں ہے کہ وہ ہمیں اللہ سے چھڑا لینے والے ہیں؟ جیسے کفار و مشرکین کہا کرتے تھے: {ہٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنۡدَ اللّٰہِ ؕ} (یونس:۱۸)''یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہوں گے'' ۔کیا ہمارے عوام کی عظیم اکثریت اس توہماتی شرک میں مبتلا نہیں ہے؟ کیا ہمارے ایلیٹ کلاس کے لوگ' ٹاپ کلاس کے قائد داتا دربار پر حاضری نہیں دیتے؟ اس سے کس شرک کی تائید ہوتی ہے؟ کوئی مہم (campaign) شروع کرنی ہو تو داتا دربار پر حاضری دیتے ہیں۔ کوئی فائل کھل گئی ہے تو داتا دربار پر چادر

چڑھارہے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں اُس زمانے کا جو شرک بیان ہوا ہے وہ شرک آج بھی ہمارے ہاں جوں کا توں موجود ہے۔

ایک اور بات بہت ڈرتے ڈرتے کہہ رہا ہوں کہ اللہ کے رسولوں کے ساتھ جو گستاخیاں ہوئیں کہ کسی کو خدا کا بیٹا بنا دیا گیا' کسی کو کچھ اور بنا دیا گیا' کیا ہم محمد رسول اللہ ﷺ کے ساتھ وہی کچھ نہیں کر رہے؟ ''سرورِ دو عالم'' اور ''شہنشاہِ دو عالم'' کے کیا معانی ہیں؟ یہ شان تو صرف اللہ کی ہے۔ قرآن تو کہتا ہے : {وَّ لَا یُشۡرِکُ فِیۡ حُکۡمِہٖۤ اَحَدًا

﴿ ٢٦ ﴾ }(الکہف) اور {وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ شَرِیْکٌ فِی الْمُلْکِ}(بنی اسرائیل:۱۱۱) یعنی اللہ کی بادشاہی میں اس کا کوئی شریک نہیں۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں مَیں تو بندہ ہوں' غلام ہوں۔ آپؐ غلاموں کی طرح اکڑوں بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے۔ آپؐ فرماتے ہیں کہ عبدیت میرے سر کا تاج ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: {سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ...} (بنی اسرائیل:۱) ''پاک ہے وہ ذات جو راتوں رات اپنے بندے (محمد ﷺ) کو لے گئی...'' {اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِہِ الْکِتٰبَ} (الکہف:۱) ''تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے اپنے بندے (محمد ﷺ) پر کتاب (قرآن) نازل کی''۔ {تَبٰرَکَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِہٖ} (الفرقان:۱) ''بہت بابرکت ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے (محمد ﷺ) پر فرقان (قرآن مجید) اُتارا''۔ اور آج ہم نے حضور ﷺ کو کیا بنا لیا ہے؟ یہ غور کرنے کی باتیں ہیں۔ حضور ﷺ کا اپنا عالم تو یہ تھا کہ آپؐ دعا مانگا کرتے تھے: ((اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ عَبْدُکَ وَابْنُ عَبْدِکَ وَابْنُ اَمَتِکَ)) کہ اے اللہ ! میں تیرا بندہ ہوں ' میرا باپ بھی تیرا ادنیٰ غلام تھا' اور میری ماں بھی تیری ادنیٰ کنیز' ادنیٰ لونڈی تھی ((فِیْ قَبْضَتِکَ)) میرا پورا وجود تیرے قبضۂ قدرت میں ہے ((نَاصِیَتِیْ بِیَدِکَ)) میری پیشانی تیرے ہاتھ میں ہے ((مَاضٍ فِیَّ حُکْمُکَ)) میرے پورے وجود میں تیرا حکم جاری و ساری ہے ((عَدْلٌ فِیَّ قَضَاءُکَ))(۲) میرے بارے میں جو فیصلہ تو کرے گا وہ عدل ہو گا۔ حضور ﷺ کے

---

(۲) صحیح ابن حبان' ح ۹۷۲۔ الترغیب والترھیب للمنذری :۳/۵۷ راوی: عبد اللہ بن مسعودؓ۔

ہاں عبدیت و عجز کا یہ عالم ہے۔ قرآن میں آتا ہے: {اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ} (یوسف:۴۰ و ۶۷) ''بادشاہی اللہ کے سوا کسی کی نہیں''۔ حضرت دائود ں بھی خلیفہ تھے۔ جب اسلامی ریاست کی تشکیل ہو گئی تو حضرت محمد رسول اللہ ﷺ بھی خلیفہ تھے ۔ یعنی آپؐ اللہ کے خلیفہ تھے' اللہ کے بندے تھے' اللہ کے رسول تھے۔ کلمۂ شہادت میں بھی آپؐ کی عبدیت کا اقرار ہے: ''اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ''۔ یہ تو ایک لفظ ہے ''سرورِ دو عالم'' جس کی طرف شاید کسی کا خیال بھی نہ گیا ہو' لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہم نے کسی گمراہی کو چھوڑا نہیں۔

اسی طرح کُفّار کا ذکر ہو تو ہم سمجھتے ہیں کہ یہ تو پچھلوں کی باتیں ہیں۔ یہ ابوجہل کا مسئلہ ہے' یہ ابولہب کا تذکرہ ہے' اس کا ہم سے کیا سروکار! حالانکہ ہمیں ان کے کفر اور طرزِ عمل سے بچانے کے لیے اُن کا ذکر قرآن میں آیا ہے۔

مدنی قرآن سے ہمارے حجابات

پہلا حجاب:

اب مدنی قرآن کی طرف آیئے ! اس میں نفاق کے بارے میں کتنی مفصل بحثیں ہیں۔ کیا کسی نے کبھی سوچا کہ مجھ سے اس بحث کا کیا تعلق ہے' جبکہ ان بحثوں پر پوری پوری سورتیں (المنافقون' التوبۃ اور النساء) موجود ہیں۔ سورۃ التوبہ اور سورۃ النساء میں تو نفاق کی طویل ترین بحثیں آئی ہیں۔ لیکن ہم تو بزعمِ خود مؤمن ہیں' اس لیے یہ ہم سے متعلق نہیں ہیں۔جبکہ نفاق وہ روگ اور وہ بیماری ہے جس سے اپنے آپ کو محفوظ نہیں سمجھنا چاہیے۔ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ علیہ نے نفاق کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا: ((مَا خَافَہٗ اِلَّا مُؤْمِنٌ وَلَا اَمِنَہٗ اِلَّا مُنَافِقٌ))یعنی نفاق کا صرف مؤمن اندیشہ رکھتا ہے کہ کہیں میں منافق تو نہیں ہو گیا اور صرف منافق ہی اس سے اپنے آپ کو محفوظ و مامون سمجھتا ہے کہ نفاق کا مجھ سے کیا سروکار؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی یہ شان ہے کہ ان کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمر ہوتا' اور جس راستے سے عمر چلتا

ہے شیطان اس راستے سے کنی کترا جاتا ہے۔ اسی طرح فرمایا کہ ہر نبی کی اُمّت میں محدثین ہوتے ہیں جن سے اللہ کلام کرتا ہے اور میری اُمّت کا محدث عمرؓ ہے۔ لیکن اس عمرؓ کا یہ حال ہے کہ ایک بار حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے کہنے لگے جنہیں حضور ﷺ نے منافقین کے نام بتا دیے تھے کہ ''اے حذیفہؓ ! میں تمہیں اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کہیں میرا نام تو منافقوں کی فہرست میں نہیں ہے؟'' ظاہر بات ہے نفاق کی بحثیں تو وہ شخص پڑھے گا کہ جو اُس سے بچنا چاہے گا' اور جانے گا کہ یہ مجھ سے متعلق ہیں' اس لیے میں اس کا ایک ایک لفظ پڑھوں' اپنے اندر جھانکوں' اپنا جائزہ لوں۔ مجھے یہ شعر بہت عمدہ لگتا ہے ؎

جانِ جملہ علم ہا این ست و ایں تا بہ دانی من کیم دریومِ دیں !

یعنی پورے علم کا خلاصہ اور جان یہ معلوم ہو جانا ہے کہ قیامت کے دن میں کہاں کھڑا ہوں گا؟ مؤمنین صادقین کی صف میں یا منافقین کی صف میں؟ پل صراط پر اوندھا پڑا ہوں گا یا سلامتی سے گزر جاؤں گا؟

دوسرا حجاب :

اسی طرح جہاد اور قتال کو فرضِ کفایہ سمجھتے ہوئے ہم ان بحثوں سے لاتعلق ہو جاتے ہیں کہ یہ فرضِ عین تو

نہیں ہے۔ بس بات ختم ہوئی۔ چنانچہ اب قتال کے واقعات تو ہمارے نزدیک غزوۂ بدر' غزوۂ اُحد اور غزوۂ احزاب کی تاریخ کی حیثیت رکھتے ہیں' ہمارا اُن سے کوئی عملی تعلق نہیں۔ ہم سوچتے ہیں کہ نماز' روزہ' حج اور زکوٰۃ فرض ہے' جہاد تو ہم پر فرض نہیں ہے۔ اس لیے یہ ساری بحثیں ہم سے غیر متعلق ہو گئیں۔ بس پڑھو اور ثواب لے لو!

تیسرا حجاب:

چونکہ اسلامی ریاست قائم نہیں ہے لہٰذا شریعت کے اجتماعی احکام بھی ہم سے غیر متعلق ہو گئے' کیونکہ انفرادی حیثیت سے ان پر عمل کا کوئی سوال ہی نہیں۔ میں چور کا ہاتھ نہیں کاٹ سکتا' میں زانی کو سنگسار نہیں کر سکتا۔ لہٰذا یہ حصہ بھی ہم سے غیر متعلق ٹھہرا' اور ہماری چھٹی ہو گئی کہ ہم سے اس کا کوئی تعلق ہی نہیں۔ یہ ساری چیزیں ہمارے اور قرآن کے مابین حجاب بن گئی ہیں۔ مدنی قرآن میں سے صرف عبادات' نماز' طہارت' وضو' تیمم اور

روزے کا ہم سے تعلق ہے۔ چنانچہ پورے مکی قرآن میں سے صرف اخلاقی تعلیمات اور پورے مدنی قرآن میں سے عبادات' یہ دو چیزیں ہیں جن کو ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ہم سے متعلق ہیں اور ان کا ہم سے کوئی تعلق ہے۔ باقی مباحث کے بارے میں اگرچہ ہم زبان سے نہیں کہتے کہ یہ اساطیر الاوّلین ہیں' لیکن ہمارا طرزِ عمل ظاہر کرتا ہے کہ اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ پچھلوں کے قصے اور کہانیاں ہیں' سابقہ اقوام کی تاریخ ہے۔ نوح سے لے کر موسیٰ تک کے حالات جو کہ بار بار بیان ہو رہے ہیں' ان کا ہم سے کیا تعلق ہے؟ جب یہ حجابات ہمارے اور قرآن کے مابین ہوں گے تو قرآن کی تاثیر کیسے ہو گی؟ جو قرآن کو سمجھتے ہی نہیں ان کو چھوڑیے' اہل عجم کا معاملہ الگ ہے' میں تو عربوں کی بات کر رہا ہوں کہ ان حجابات میں وہ بھی مبتلا ہیں

چوتھا حجاب:

یہ وہ حجاب ہے جو اہل علم لوگوں کی کوتاہی کے باعث پیدا ہوا ہے۔ اقبالؔ نے ایک لفظ استعمال کیا ہے ''عذابِ دانشِ حاضر''۔ فرمایا ؎

عذابِ دانش حاضر سے باخبر ہوں میں
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثل خلیل

اقبال کہہ رہے ہیں کہ انہوں نے ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۰ء تک جدید فلسفہ پڑھا ہے' جدید تہذیب اور جدید افکار و نظریات کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ یہ عذابِ دانش حاضر ہے۔ اس عذابِ دانش حاضر کا اثر پورے عالم اسلام میں اتنا

کُہرا ہے کہ عالم اسلام کے بڑے بڑے ذہین لوگ (The Intelligentsia of the Muslim World) اس عذاب میں مبتلا ہیں اور کہیں اس کا توڑ نہیں کیا جا رہا۔ فتویٰ دے دینا کہ فلاں شے حرام ہے' یہ اور بات ہے' لیکن فکری سطح پر اس کا توڑ اور دلیل سے اس کو ردّ کرنا بہت ضروری ہے۔ یہ کام اُمّت کے اہلِ علم کا ہے جو کبھی ابن تیمیہ اور غزالی رحمہما اللہ نے کیا تھا۔ اُس وقت یونان کا فلسفہ و فکر اور تصوّف اسلام کے لیے چیلنج بن کر آیا تھا اور ان ساری چیزوں کا حملہ اُس وقت بھی عالمِ اسلام پر ہوا تھا۔ لیکن یہ دو عظیم شخصیات اٹھیں اور انہوں نے اس کا جادو تار تار

کر کے رکھ دیا کہ اس میں کچھ نہیں رکھا' یہ محض سراب ہے۔ ابن تیمیہؒ نے ''اَلرَّدُّ عَلَی الْمَنْطَقِیِّیْنَ'' کے ذریعے ''لوہا لوہے کو کاٹتا ہے'' کے مصداق ان کی منطق (logic) ردّ کر کے دکھا دی کہ یہ منطق خود اپنے اصولوں سے ختم ہوتی ہے۔ امام غزالیؒ نے ''تَھَافَتُ الْفلاسفۃ'' کے ذریعے واضح کر دیا کہ یہ سب فلسفے بے بنیاد ہیں۔ موجودہ دَور میں سوائے علامہ اقبال کی شخصیت کے کسی نے اس فکری حملے کا مقابلہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اعلیٰ علمی و فکری سطح پر یہ اُمّت ِمسلمہ کی بہت بڑی کوتاہی ہے۔ حالانکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ دانش حاضر پر کاری ضرب لگائی جائے۔

اس سے بھی آگے بڑھ کر وہ چیزیں جو قرآن کی حقانیت کا ثبوت ہیں' ان کو بھی ہم نے ایک طرف رکھ دیا کہ ان سے ہمارا کوئی سروکار ہی نہیں۔ یہ سائنسی اکتشافات دراصل قرآن کی حقانیت کا ثبوت ہیں۔ سورۂ حٰمٓ السجدۃ میں فرمایا گیا:

{سَنُرِیْھِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَفِیْٓ اَنْفُسِھِمْ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَھُمْ اَنَّہُ الْحَقُّ ط} (آیت ۵۳)

''ہم ان کو اس کائنات میں اور خود اُن کے وجود میں نشانیاں دکھاتے چلے جائیں گے (اور ہماری نشانیاں ان پر منکشف ہوتی چلی جائیں گی) یہاں تک کہ ان پر واضح ہو جائے گا کہ یہ قرآن حق ہے۔''

ایک سے ایک بڑھ کر سائنس کے انکشافات ہوں گے' جو یہ ثابت کریں گے کہ یہ قرآن حق ہے۔ قرآن نے یہ بات چودہ سو برس پہلے کہی ہے' لیکن ہمارے علماء نے سائنس کا دروازہ اپنے لیے بند کر رکھا ہے اور خود کو ''قَالَ اللّٰہُ وَقَالَ الرَّسُوْلُ'' تک محدود کر لیا ہے۔ بلکہ قرآن بھی نہیں' ان کے نزدیک تو اصل چیز فقہ ہے' کیونکہ اس سے فتوے دینے ہیں۔ حدیث میں بھی زیادہ ذوق و شوق اہلحدیث حضرات کا ہے' ورنہ حنفی کے لیے تو فقہ کافی ہے اور اہلحدیث کے لیے حدیث بہت کافی ہے' جبکہ قرآن کی طرف توجہ کم ہے' ان کے ہاں بھی اور ان کے ہاں بھی۔ سائنس کے حوالے سے ہمارے علماء کے ہاں اس قدر جمود طاری ہے کہ ابھی تک زمین کے ساکن ہونے اور سورج کے زمین کے گرد گھومنے کے نظریات پر قائم

ہیں۔ حالانکہ اس ضمن میں صحیح رُخ یہ ہے‘ جس میں اللہ تعالیٰ نے مجھے انشراح عطا فرمایا ہے‘ کہ جہاں تک دین کا عملی پہلو ہے اس میں پیچھے اسلاف کی طرف جائیں۔ پیچھے ائمہ مجتہدین تک‘ مزید پیچھے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین تک اور مزید پیچھے اپنے آپ کو محمدرسول اللہ ﷺ کے قدموں میں ڈال دیں۔دین کے عملی پہلو میں آپ کو آگے نہیں جانا‘ زمانے کے ساتھ نہیں جانا۔ کیونکہ عملی اعتبار سے دین محمدرسول اللہ ﷺ پر کامل ہو گیا۔ عمل میں آنحضور ﷺ سے جو ثابت ہو وہ سر آنکھوں پر۔ ع

’’بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست !‘‘

حلال‘ حرام‘ واجب‘ فرض‘ شریعت کے احکام‘ جو دین کا عملی پہلو ہے‘ ان کے لیے پیچھے جائو ع

’’دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو !‘‘

البتہ حکمت‘ سائنس‘ تجرباتی علوم میں آگے سے آگے جانا چاہیے۔ قربان جایئے اللہ کے رسول ﷺ پر کہ ’’تأبیر نخل‘‘ کے معاملے میں کس قدر سادگی سے ایسا اصول بتا دیا۔ حضور ﷺ چونکہ مکہ میں رہے تھے‘ وہاں زراعت تھی ہی نہیں ‘ لہٰذا زراعت سے آپ کو کوئی دلچسپی تھی نہ اس کے اصولوں سے کوئی واقفیت تھی۔ مدینہ کے لوگ زراعت پیشہ تھے‘ انہیں اپنے تجربے سے معلوم تھا کہ کھجور کے نر اور مادہ پھول علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں‘ انہیں قریب لے آیا جائے تو پھر fertilization زیادہ ہوتی ہے‘ لہٰذا پھل زیادہ ہو گا۔ حضور ﷺ نے یہ دیکھا تو آپؐ کو عجیب لگا کہ یہ لوگ کیا کرتے ہیں‘ فطرت اپنی نگہداشت خود کر سکتی ہے‘ یہ قدرت کے معاملات میں مداخلت نہ کریں تو شاید بہتر ہو۔ آپؐ نے روکا بھی نہیں‘ بلکہ فرمایا: ((لَوْ لَمْ تَفْعَلُوْا لَصَلَحَ)) کہ اگر تم لوگ یہ کام نہ کرو تو شاید بہتر ہو ! صحابہؓ کے لیے آپؐ کا یہ کہنا بھی حکم کے درجے میں تھا۔ چنانچہ انہوں نے یہ عمل نہیں کیا ‘ لیکن اس سال فصل کم ہو گئی۔ اب وہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ حضور ! آپؐ نے ایسے فرمایا تھا ‘ لہٰذا ہم نے تأبیر نخل نہیں کی‘ لیکن اس سے فصل کم ہو گئی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ دیکھو میں تمہیں یہ چیزیں سکھانے نہیں آیا ((اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاَمْرِ دُنْیَاکُمْ))(۳) کہ اپنے دنیوی معاملات تم مجھ سے بہتر جانتے ہو۔ یہ کتنا

_____(۳) صحیح مسلم‘ ح:۲۳۶۳۔ مسند احمد‘ ح:۲۴۹۶۴۔ عن عائشۃ رضی اللہ عنہا۔

بڑا اصول ہے۔ اسی طرح ہمارے سائنسی علوم تجرباتی علوم ہیں۔ قرآن سائنس پڑھانے نہیں آیا۔ یہ تو انسان کے لیے راہِ ہدایت لے کر آیا ہے۔ لیکن اس میں کچھ ایسے حقائق بھی بیان ہوئے ہیں کہ سائنس کے میدان میں جب کسی حقیقت کی طرف انسان کی رسائی ہوتی ہے اور وہ بات قرآن میں بھی آئی ہو تو اس سے قرآن کی حقانیت مبرہن ہو جاتی ہے۔ قرآن ایمبریالوجی‘ زوآلوجی‘ باٹنی‘ اسٹرونومی یا جیالوجی پڑھانے نہیں آیا۔ البتہ آیاتِ قرآنی میں اُن کے حوالہ جات موجود ہیں‘ اور اگر وہ سائنس کے حوالے سے ثابت ہو جاتے ہیں تو معلوم ہوا کہ وہ قرآنِ مجید کی حقانیت کا ایک ثبوت ہیں‘ جیسا کہ خود قرآن نے دعویٰ کیا ہے: {سَنُرِیۡہِمۡ اٰیٰتِنَا فِی الۡاٰفَاقِ وَ فِیۡۤ اَنۡفُسِہِمۡ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَہُمۡ اَنَّہُ الۡحَقُّ ؕ} کہ ہم انہیں اپنی آیات دکھائیں گے آفاق میں بھی اور اَنفس میں بھی‘ بڑی سے بڑی آیات ظاہر ہوتی جائیں گی‘ نئی سے نئی نشانیاں سامنے آئیں گی‘ جس سے یہ بات مبرہن سے مبرہن تر ہوتی چلی جائے گی کہ یہ قرآن مجید حق ہے۔

اسی فقدان (deficiency) کے باعث ایک پڑھا لکھا آدمی جب قرآن پڑھتا یا سنتا ہے‘ اور قرآن مجید کی جو بھی تشریح عام علماء کرتے ہیں اس کے درمیان وہ اتنا خلا (gap) محسوس کرتا ہے کہ قرآن اس پر اثر ہی نہیں کرتا۔

راہِ عمل

یہ اسباب ہیں جن کی وجہ سے ہم اس وقت قرآن مجید کی تاثیر سے محجوب ہو کر رہ گئے ہیں۔ اور اب جبکہ بیماری کا پتہ چل گیا ہے تو اِن حجابات سے نکلنے کے لیے ہمیں عمل کی شاہراہ پر آنا ہو گا۔ اس کے لیے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے ایمان کی حقیقت کو سمجھیں کہ ہم جس ایمان کے حامل ہیں اس کی حیثیت صرف موروثی عقیدے کی ہے اور یہ ایمان صرف ایمان باللسان ہے۔ جیسے سورۃ الحجرات میں ہے: {قَالَتِ الۡاَعۡرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلۡ لَّمۡ تُؤۡمِنُوۡا وَ لٰکِنۡ قُوۡلُوۡۤا اَسۡلَمۡنَا ...}(آیت ۱۴) ’’یہ دیہاتی کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے‘ (اے نبی ﷺ!) ان سے کہہ دیجیے کہ تم ہرگز ایمان نہیں لائے

ہو‘ بلکہ یوں کہو کہ ہم نے فرماں برداری قبول کر لی ہے...‘‘ جبکہ ایمانِ مطلوب تو تصدیق بالقلب والا ایمان ہے۔ یہ ایمان کہاں سے ملے گا؟ یہ صرف اور صرف قرآن سے ملے گا۔ لہٰذا قرآن مجید کے ان حصوں کو پڑھنا ہو گا‘ ان پر غور کرنا ہو گا‘ انہیں اچھی طرح گہرائی میں سمجھنا ہو گا‘ ان مقامات پر اپنے ہائی پاور لینز فوکس کرنے ہوں گے جہاں ایمان سے متعلق مباحث آئے ہیں۔

اسی طرح ہم شرک سے بچے ہوئے نہیں ہیں۔ سورۂ یوسف کی آیت ۱۰۶ کے الفاظ ہیں :{وَمَا یُؤْمِنُ اَکْثَرُہُمْ بِاللّٰہِ اِلَّا وَ ہُمْ مُّشْرِکُوْنَ ﴿ ۱۰۶ ﴾} ''ان کی اکثریت اللہ پر ایمان نہیں رکھتی مگر کسی نہ کسی نوع کے شرک کے ساتھ''۔ شرک سے تو بچا تھا اللہ کا بندہ ابراہیم علیہ السلام اور قرآن میں سب سے بڑی سند اُسے یہی دی جاتی ہے کہ {وَمَا کَانَ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ﴿ ۱۳۵ ﴾}(البقرۃ)''اور وہ (ابراہیم علیہ السلام) مشرکوں میں سے نہ تھا۔'' شرک سے بچنا آسان کام نہیں ہے۔ لہٰذا شرک کے مباحث پر غور و فکر کے ذریعے قدم قدم پر شرک سے بچنے کے لیے اللہ سے توفیق طلب کی جائے۔

قرآن کی دعوت

اب چونکہ عمل کی راہ ہموار ہو چکی ہے اس لیے مختصراً لفاظ میں قرآن کی دعوت سامنے رکھ رہا ہوں تاکہ معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ ہم سے کیا چاہتا ہے۔ تاہم آج میں ایک اور ترتیب سے بات آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں۔ اس لیے کہ ع ''اِک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں'' کے مصداق بے شک بات ایک ہی ہو لیکن ذرا ترتیب بدلے تو یہ اسلوب قرآن سے مطابقت رکھتا ہے۔ سب سے پہلے دیکھتے ہیں کہ قرآن کی پوری دعوت کو اگر ایک لفظ میں بیان کرنا ہو تو وہ کیا ہے ؟ وہ ہے ''عبادتِ ربّ''۔ چنانچہ فرمایا :{یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمُ} (البقرۃ:۲۱)''اے لوگو! اپنے ربّ کی بندگی کرو''۔ {وَ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ ﴿ ۵۶ ﴾} (الذّٰریٰت) ''اور ہم نے جنوں اور انسانوں کو صرف اپنی بندگی کے لیے پیدا کیا''۔ رسولوں کی دعوت تھی :{یٰقَوْمِ اعْبُدُوا

اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ} (ھود:۵۰) ''اے میری قوم ! اللہ کی بندگی کرو' تمہارا کوئی معبود اُس کے سوا نہیں''۔ لیکن اس عبادت کے لیے شرط ہے {مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ}(البیّنۃ:۵)کہ اس کے لیے اپنی اطاعت کو خالص کر لو' ورنہ وہ عبادت اللہ کے ہاں منظور نہیں' قبول نہیں۔ اس بندگی کا جوہر دعا ہے ۔جیسا کہ احادیث میں آیا ہے : ((اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَۃِ))(۴) اور ((اَلدُّعَاءُ ھُوَ الْعِبَادَۃُ))(۵) یہ دعا بھی {مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ} ہو تو بندگی ہے۔

اب اگر کوئی شخص ایسی جگہ رہتا ہے جہاں اللہ کا دین غالب ہے تو اس کی عبادت (اللہ کی بندگی) سو فیصد ہو سکتی ہے' اجتماعی زندگی میں بھی اور انفرادی زندگی میں بھی لیکن اگر طاغوت غالب ہے اور غیر اسلامی نظام قائم ہے تو اب {مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ} کا تقاضا پورا کرنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ یہ جو انفرادی زندگی میں جزوی عبادت کر رہا

ہے اور باقی اجتماعی معاملات میں بندگیٔ ربّ نہیں کر رہا اس کا کُفّارہ ادا کرے اور اس نظام کو بدلنے کے لیے تن من دھن وقف کر دے۔ اگر یہ کریں گے تو عبادت قبول ہو گی' ورنہ نہیں۔ گویا ایک لفظ ''عبادت'' کے اندر پورے قرآن کی دعوت موجود ہے' جس کی وضاحت قرآن میں یوں آئی ہے :{وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۙ حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ...}(البیّنۃ:۵) ''اور اُن کو اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ اللہ کی بندگی کریں' اپنے دین کو اس کے لیے خالص کر کے' بالکل یکسو ہو کر' اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں...'' یعنی اپنی عبادت اور پرستش کو جب اللہ کے لیے خالص کرتے ہوئے کرو گے تب اگر نماز پڑھو گے اور زکوٰۃ دو گے تو وہ قبول ہو گی' ورنہ نہیں۔ گویا شرطِ اوّل یہ ہے۔

اب ایک اور انداز سے دیکھتے ہیں کہ کیا قرآن کی دعوت دو الفاظ میں بھی آئی ہے؟ سورۃ الحدید (آیت ۷)میں ارشاد ہوا:

---

(۴) سنن الترمذی' ابواب الدعوات' ح:۳۳۷۱ ۔ راوی : انس بن مالک رضی اللہ عنہ

(۵) سنن الترمذی :ابواب الدعوات' ح:۳۳۱۸۔ راوی : نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ

{اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ؕ}

یہاں دو الفاظ آئے ہیں ''اٰمِنُوْا ''اور ''اَنْفِقُوْا''کہ ''ایمان لائو اللہ پر اور اس کے رسول پر اور کھپا دو 'صرف کر دو اُس میں سے جو کچھ بھی ہم نے تمہیں دیا ہے''۔ یعنی تم اپنا جسم' اپنی طاقت' ذہانت' صلاحیت' قوت' وقت' سب اللہ کے لیے کھپا دو۔

یا قرآن میں دو لفظ اور آتے ہیں : ''اٰمِنُوْا '' اور ''جَاهِدُوْا''۔ کل دین ان دو الفاظ میں آگیا ہے۔ فرمایا :

{اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ } (الحُجُرات:۱۵)

''مؤمن تو بس وہی ہیں جو ایمان لائے اللہ پر اور اُس کے رسولؐ پر' پھر شک میں نہ پڑے اور انہوں نے اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ جہاد کیا اللہ کی راہ میں۔''

سورۃ الصف میں فرمایا:

{يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۱۰﴾ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ

بِاَمۡوَالِکُمۡ وَ اَنۡفُسِکُمۡ ؕ}

''اے ایمان والو! کیا میں بتائوں تم کو وہ تجارت جو تمہیں دردناک عذاب سے بچا دے؟ تم ایمان لائو اللہ اور اس کے رسولؐ پر' اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے۔''

یہاں جہاد سے مراد بھی اپنی جان اور مال کو کھپا دینا ہے۔ اس طرح ''ایمان اور جہاد'' اور ''ایمان اور انفاق'' دو دو الفاظ میں کل دعوت آگئی ہے۔

اس سے آگے چلئے' چار چار الفاظ میں بھی دعوت دی گئی۔ سب سے پہلے سورۃ العصر کو لیجیے:

{وَ الۡعَصۡرِ ۙ﴿۱﴾ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ ۙ﴿۲﴾ اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ تَوَاصَوۡا بِالۡحَقِّ ۬ۙ وَ تَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ ٪﴿۳﴾}

''زمانے کی قسم ہے! تمام انسان گھاٹے اور خسارے میں ہیں' سوائے ان کے جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے اور ایک دوسرے کو حق کی وصیت کی اور

ایک دوسرے کو صبر کی وصیت کی۔''

سورۃ الحج میں ارشاد ہوا:

{یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا ارۡکَعُوۡا وَ اسۡجُدُوۡا وَ اعۡبُدُوۡا رَبَّکُمۡ وَ افۡعَلُوا الۡخَیۡرَ لَعَلَّکُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ ﴿۷۷﴾}

''اے اہلِ ایمان! رکوع کرو' سجدہ کرو' اور اپنے ربّ کی بندگی کرو اور اچھے کام کرو تاکہ تم فلاح پائو۔''

سورۃ الاعراف میں رسول اللہ ﷺ کے بارے میں آیا ہے:

{فَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِهٖ وَ عَزَّرُوۡهُ وَ نَصَرُوۡهُ وَ اتَّبَعُوا النُّوۡرَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ مَعَهٗ ۙ اُولٰٓئِکَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ﴿۱۵۷﴾ ٪}

''پس جو لوگ آپؐ پر ایمان لائیں گے' آپؐ کا احترام اور تعظیم کریں گے' آپؐ کی مدد کریں گے اور جو نور آپؐ کے ساتھ نازل کیا جائے گا اس کی پیروی کریں گے وہ ہوں گے فلاح پانے والے۔''

سورۂ آلِ عمران کی آخری آیت کے الفاظ ہیں:

{یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اصۡبِرُوۡا وَ صَابِرُوۡا وَ رَابِطُوۡا ۟ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّکُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ ﴿۲۰۰﴾ ٪}

''اے اہلِ ایمان! صبر کرو اور صبر میں (اپنے مدمقابل دشمنوں سے) بازی لے جائو (وہ بھی صبر کر رہے ہیں اپنے معبودانِ باطل کے لیے' اپنے نظامِ باطل کے لیے' اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے' تم ان سے صبر میں بڑھ جائو) اور باہم مربوط رہو (ایک منظم جماعت کی شکل میں جڑے رہو)' اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو تاکہ تم فلاح پائو۔''

اس کے علاوہ قرآن مجید میں لمبی لمبی بحثیں بھی آئی ہیں' مثلاً سورۃ التغابن' سورۃ الحدید' سورۃ الصف' سورۃ الحجرات

اور سورۃ الحج کے آخری حصے میں قرآن کی دِعوت کھول کربیان کر دی گئی ہے تاکہ کوئی کہہ نہ سکے کہ بات واضح نہیں ہوئی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: {مَا فَرَّطۡنَا فِی الۡکِتٰبِ مِنۡ شَیۡءٍ}(الانعام:۳۸)''ہم نے اس قرآن میں کوئی کمی نہیں رکھی ہے''کہ جس کی وجہ سے تم کہہ سکو کہ بات واضح نہیں ہے۔ اب جبکہ ہر شے واضح ہو گئی

ہے تو{فَبِاَیِّ حَدِیۡثٍۭ بَعۡدَہٗ یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۵۰﴾} (المُرسلٰت)کے مصداق اس قرآن کے بعد اب وہ کس بات پر ایمان لائیں گے ؟آخر انہیں کس چیز کا انتظار ہے؟قرآن کی آیات ہمیں پکار پکار کر مخاطب کر رہی ہیں:

{اَلَمۡ یَاۡنِ لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡ تَخۡشَعَ قُلُوۡبُہُمۡ لِذِکۡرِ اللّٰہِ وَ مَا نَزَلَ مِنَ الۡحَقِّ ۙ...}(الحدید:۱۶)

''کیا ابھی وقت نہیں آیا اہلِ ایمان کے لیے کہ ان کے دل جھک جائیں اللہ کی یاد میں اور جو کچھ حق میں سے نازل ہو چکا ہے اس کے سامنے... !''

یہ تاخیر' یہ تعویق کس لیے ؟کہ یہ کر لیں' وہ کر لیں' اس کے بعد سوچیں گے' یہ مَیں ذرا اِس ذمہ داری سے فارغ ہو لوں۔ ع ''کارِ دنیا کسے تمام نہ کرد!'' دنیا کا کام تو کبھی ختم ہوتا ہی نہیں' اور جب آدمی دنیا سے چلا جاتا ہے تو دنیا میں کوئی کمی نہیں آتی' حالانکہ آدمی سمجھتا ہے کہ میرے بغیر تو یہ کام چل ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ چلا جاتا ہے اور کام چلتا رہتا ہے۔ ؎

یہ چمن یونہی رہے گا اور ہزاروں جانور
اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اُڑ جائیں گے !

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمینoo

بَدۡءُ الۡاِسۡلام میں اسلام کی دو عظیم ترین حقیقتیں

قرآنِ حکیم اور جہاد فی سبیل اللہ

قرآن: منبع و سرچشمۂ ایمان ویقین، جہاد: ایمانِ حقیقی کا مظہرِ اَتم

واقعہ یہ ہے کہ ''بَدءُ الاسلام'' میں دین کی اصل اساسی اور بنیادی حقیقتیں دو ہی تھیں ---- ایک قرآنِ حکیم جسے نبی اکرم ﷺ کی انقلابی جِدّوجُہد کے ضمن میں ''آلۂ انقلاب'' کی حیثیت حاصل ہے۔ بقول مولانا حالیؔ ؎

اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا　　اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

اور دوسری جہاد فی سبیل اللہ، جو جامع عنوان ہے آپ ﷺ کی اِس جدّوجُہد کے مختلف مدارج و مراحل کا۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ قرآن مجید ہی کی گرج اور کڑک تھی جس نے نیند کے ماتوں کو جگایا اور خوابِ خرگوش کے مزے لوٹنے والوں کو بیدار کیا۔ چنانچہ {وَ الۡعَصۡرِ ۙ﴿۱﴾ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ ۙ﴿۲﴾} اور {اِقۡتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُہُمۡ وَ ہُمۡ فِیۡ غَفۡلَۃٍ مُّعۡرِضُوۡنَ ۚ﴿۱﴾} کی چونکا دینے والی صدائیں اور {اَلۡقَارِعَۃُ ۙ﴿۱﴾ مَا الۡقَارِعَۃُ ۚ﴿۲﴾ وَ مَاۤ اَدۡرٰىکَ مَا الۡقَارِعَۃُ ۙ﴿۳﴾} اور {اَلۡحَآقَّۃُ ۙ﴿۱﴾ مَا الۡحَآقَّۃُ ۚ﴿۲﴾ وَ مَاۤ اَدۡرٰىکَ مَا الۡحَآقَّۃُ ؕ﴿۳﴾} کی بیدار کن ندائیں ہی تھیں جنہوں نے پورے عرب میں ہلچل مچا دی اور {عَمَّ یَتَسَآءَلُوۡنَ ۚ﴿۱﴾ عَنِ النَّبَاِ الۡعَظِیۡمِ ۙ﴿۲﴾ الَّذِیۡ ہُمۡ فِیۡہِ مُخۡتَلِفُوۡنَ ؕ﴿۳﴾} کی کیفیت پیدا کر دی۔ بقول مولانا حالیؔ ؎

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادیؐ　　عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی

پھر ---- اِسی کی آیاتِ بیّنات تھیں جنہوں نے {ہُوَ الَّذِیۡ یُنَزِّلُ عَلٰی عَبۡدِہٖۤ اٰیٰتٍۭ

بَیِّنٰتٍ لِّیُخۡرِجَکُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوۡرِ ؕ} (الحدید:۹) کے مصداق انسانوں کو شرک، الحاد، مادّہ پرستی، حب عاجلہ اور حیوانیتِ محضہ کے {ظُلُمٰتٌۢ بَعۡضُہَا فَوۡقَ بَعۡضٍ ؕ}(۱) ایسے مہیب اور ہولناک اندھیروں سے نکال کر ایمان اور یقین کی

روشنی سے بہرہ ور فرمایا۔ چنانچہ وہ ایک طرف عرفانِ الٰہی اور محبتِ خداوندی سے سرشار یعنی مست بادۂ الست ہو گئے اور دوسری طرف دنیا و ما فیہا ان کی نگاہوں میں مچھر کے پر سے بھی حقیر تر ہو گئے اور وہ کلیۃً طالبِ عقبیٰ بن گئے۔

مزید برآں -- وہی تھا جو {مَوۡعِظَۃٌ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ}(۲) بھی بن کر آیا اور {شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوۡرِ ۙ}(۳) بھی۔ چنانچہ اُسی کے ذریعے لوگوں کا تزکیۂ نفس بھی ہوا اور تصفیۂ قلب و تجلیۂ روح بھی ! گویا انذار ہو یا تبشیر، تبلیغ ہو یا تذکیر، موعظت ہو یا نصیحت، تعلیم ہو یا تربیت، تزکیہ ہو یا تصفیہ، تجلیہ ہو یا تنویر ---- الغرض تطہیر ہو یا تعمیر محمد رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ کا پورا عملِ دعوت و اصلاح قرآن مجید ہی کے گرد گھومتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں ایک نہ دو، پورے چار مقامات پر آنحضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ کے منہجِ انقلاب کو جن اساسی اصطلاحات کے ذریعے واضح کیا گیا ہے اُن کا اوّل و آخر خود قرآن مجید ہی ہے۔ بفحوائے الفاظِ قرآنی:

{یَتۡلُوۡا عَلَیۡہِمۡ اٰیٰتِہٖ وَ یُزَکِّیۡہِمۡ وَ یُعَلِّمُہُمُ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَۃَ}(الجمعۃ: ۲)

''سناتا ہے انہیں اُس کی آیات اور پاک کرتا ہے ان کو اور سکھاتا ہے انہیں کتاب اور حکمت۔''

قرآن کا کارنامہ ایک جملے میں بیان کیجیے تو یہ ہے کہ اس نے صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے دلوں میں ایمان پیدا کر دیا اور توحید، معاد اور رسالت پر یقینِ محکم کی کیفیت پیدا کر دی۔ لیکن اس سے اُس ہمہ گیر تبدیلی کا اندازہ نہیں ہوتا جو قرآنِ حکیم کے بدولت اُن کی زندگیوں میں برپا ہو گئی تھی، اس لیے کہ قرآن نے اُن کا فکر بدلا، سوچ بدلی،

---

(۱) ''اندھیرے ہی اندھیرے ہیں ایک دوسرے کے اوپر!'' (النور: ۴۰)

(۲) ''تمہارے رب کی طرف سے نصیحت''

(۳) ''سینوں کے امراض کے لیے شفاء'' (یونس: ۵۷)

نقطۂ نظر بدلا، اَقدار بدلیں، عزائم بدلے، امنگیں بدلیں، شوق بدلے، دل چسپیاں بدلیں، خوف بدلے، اُمیدیں بدلیں، اخلاق بدلے، کردار بدلے، خلوت بدلی، جلوت بدلی، انفرادیت بدلی، اجتماعیت بدلی، دن بدلا، رات بدلی، حتیٰ کہ {تُبَدَّلُ الۡاَرۡضُ غَیۡرَ الۡاَرۡضِ وَ السَّمٰوٰتُ}(۴) کے مصداق آسمان بدلا، زمین بدلی، الغرض پوری کائنات بدل کر رکھ دی -- اور اس پوری تبدیلی کا ذریعہ اور آلہ ہیں قرآنِ حکیم کی آیاتِ بینات ! بقول علامہ اقبالؒ:

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است ایں کتابے نیست چیزے دیگر است ! (۵)

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود ! (۶)

تبدیلی اگر حقیقی اور واقعی ہو تو اُس کی کوکھ سے لازماً تصادم اور کشمکش جنم لیتے ہیں' جن کے مراحل تبدیلی کی نوعیت اور مقدار کی نسبت سے کم و بیش ہو سکتے ہیں۔ ایمان نے جو تبدیلی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں پیدا کی اُس نے جس تصادم اور کشمکش کو جنم دیا اُس کے جملہ مدارج و مراحل کا جامع عنوان ہے ''جہاد فی سبیل اللہ''۔ اس تصادم اور کشمکش کا اوّلین ظہور انسانوں کی اپنی شخصیت کے داخلی میدانِ کارزار میں ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ ''مجاھدہ مع النفس'' کو ''افضل الجہاد'' قرار دیا گیا۔(۷) پھر جب ایمان اشخاص کے باطن میں اس طرح راسخ اور مستولی ہو گیا کہ ریب اور تشکک کے کانٹے نکل

---

(۴) (جس دن) زمین بدل دی جائے گی اس زمین کے سوا (کسی اور شکل میں) اور آسمانوں کو بھی (بدل دیا جائے گا)'' (ابراہیم:۴۸)

(۵) (اس کتاب کے بارے میں) جو بات میرے دل میں پوشیدہ ہے اسے اعلانیہ ہی کہہ دوں؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب نہیں کچھ اور ہی شے ہے!

(٦) (یہ کتاب حکیم) جب کسی کے باطن میں سرایت کر جاتی ہے تو اس کے اندر ایک انقلاب برپا ہو جاتا ہے' اور جب کسی کے اندر کی دنیا بدل جاتی ہے تو اس کے لیے پوری دنیا ہی انقلاب کی زد میں آجاتی ہے!

(۷) حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((اَفْضَلُ الْجِهَادِ اَنْ تُجَاهِدَ نَفْسَكَ وَهَوَاكَ فِيْ ذَاتِ اللهِ تَعَالٰى)) ''افضل جہاد یہ ہے کہ تم اپنے نفس اور اپنی خواہشات کو اللہ تعالیٰ کا مطیع بنانے کے لیے ان کے خلاف جہاد کرو۔'' (سلسلۃ الاحادیث الصحیحۃ للالبانی:۱۴۹٦)

گئے تو اب اُسی جہاد و مجاہدہ کا ظہور عالمِ خارجی میں ظالموں' سرکشوں اور خدا کے باغیوں سے کشمکش اور تصادم کی صورت میں ہوا' جس کا مقصد قرار پایا ''تکبیر ربّ''(۸) یعنی اللہ تعالیٰ کی کبریائی کا اقرار و اعلان اور اُس کی حاکمیت مطلقہ کا بالفعل قیام و نفاذ تاکہ ''اُس (اللہ تعالیٰ) کی مرضی جیسے آسمان پر پوری ہوتی ہے زمین پر بھی ہو!''(۹) ----اور اس کی آخری منزل ہے ''قتال فی سبیل اللہ'' جس کا منتہائے مقصود معین ہوا اِن الفاظ میں کہ:

{وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ}(الانفال:۳۹)

''اور جنگ کرتے رہو ان سے یہاں تک کہ 'فتنہ' بالکل فرو ہو جائے اور اطاعت کلیۃً اللہ ہی کی ہونے

لگے !''

ایمان ویقین اور جہاد و قتال کا یہی وہ لزومِ باہمی ہے جس کو نہایت واضح اور واشگاف اَلفاظ میں بیان کیا گیا قرآنِ حکیم کی اس آیۂ مبارکہ میں:

{اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَ جٰہَدُوْا بِاَمْوَالِہِمْ وَ اَنْفُسِہِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ؕ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الصّٰدِقُوْنَ ﴿ ۱۵ ﴾} (الحجرات)

''مؤمن تو بس وہی ہیں جو ایمان لائے اللہ پر اور اُس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ' پھر شک میں نہ پڑے اور جہاد کرتے رہے اللہ کی راہ میں اور کھپاتے رہے اس میں اپنے اموال اور اپنی جانیں۔ حقیقت میں یہی ہیں سچے !''

واضح رہے کہ اس آیۂ مبارکہ کے اوّل و آخر 'حصر' کا اسلوب بھی ہے اور آیۂ ماقبل میں ''حقیقی ایمان'' اور ''قانونی اسلام'' کے مابین فرق و امتیاز کا مضمون بھی۔ گویا مؤمن ِصادق کی جامع و مانع تعریف قرآنِ حکیم کی کسی ایک آیت میں مطلوب ہو تو وہ یہی آیت ہے۔

_____(۸) الفاظِ قرآنی کی رو سے {وَ رَبَّکَ فَکَبِّرْ ﴿۳﴾} (المدثر) اور بقول اقبال ؒ:

یا وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات

وہ مذہب ِمردانِ خودآگاہ و خدا مست یہ مذہب ُملا و جمادات و نباتات

(۹) سیدنا مسیح علیہ السلام کے الفاظ

الغرض قرآن کے اصل حاصل ہیں ایمان اور یقین' اور اُن کا لازمی نتیجہ ہیں جہاد اور قتال۔ ان میں سے ایمان و یقین اصلاً ایک معنوی حقیقت اور داخلی کیفیت کا نام ہیں' چنانچہ عالم ِخارجی میں اسلام کی دو عظیم ترین اور نمایاں ترین حقیقتیں ہیں قرآن اور جہاد۔ یہی وجہ ہے کہ یہ دونوں ایمانِ حقیقی کی مستقل علامتوں (symbols) کی حیثیت رکھتے ہیں اور مردِ مؤمن کی شخصیت کا جو ہیولیٰ تخیل اور تصوّر میں اُبھرتا ہے اُس کے ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے ہاتھ میں تلوار لازمی و لابدی ہیں !

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ اور خلافت ِراشدہ کے دوران اسلام کی ''نشأۃ ِاولیٰ'' یا غلبۂ دین ِحق کا دورِ اوّل بلا شائبہ ریب و شک نتیجہ تھا صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے تعلق ِقرآن اور جذبۂ جہاد کا۔ لیکن یہ بھی ایک ایسی تاریخی حقیقت ہے جس سے انکار ممکن نہیں کہ جیسے ہی اسلام نے ایک مملکت اور سلطنت کی صورت اختیار کی' ان دونوں کی حیثیت ثانوی ہو کر رہ گئی۔ اور ایسا ہونا ایک حد تک منطقی اور فطری بھی تھا۔ اس لیے کہ ایک طرف تو کسی مملکت یا سلطنت میں اوّلین و اہم ترین مسئلہ شہریت کا ہوتا ہے جو ایک خالص قانونی

مسئلہ ہے' جس میں تمام تر بحث انسان کے ''ظاہر'' سے ہوتی ہے' باطن سے کوئی سروکار ہی نہیں ہوتا۔ گویا بقول علامہ اقبال ع ''بندوں کو گنا کرتے ہیں 'تولا نہیں کرتے !'' ----مزید برآں اس کا اصل موضوع نظم و نسق اور امن و امان کا ہوتا ہے جس کے اعتبار سے بنیادی اہمیت قانون اور ضابطے کو حاصل ہوتی ہے نہ کہ مکارمِ اَخلاق یا مواعظ حِسنہ کو۔ حتیٰ کہ اس اعتبار سے قصاص عفو پر مقدم ہوجاتا ہے ---- اور دوسری طرف سلطنتوں اور مملکتوں کو' خواہ وہ اصولی اور نظریاتی ہی ہوں' اصل سروکار اپنی حفاظت ومدافعت سے ہوتا ہے۔ اصولوں اور نظریات کی تبلیغ و اشاعت ہوتی بھی ہے تو ثانوی درجے میں اور حکومتوں کی مصلحتوں کے تابع رہ کر۔

یہی وجہ ہے کہ جب اسلام مملکت اور سلطنت کے دور میں داخل ہوا تو اصل زور (emphasis) ایمان کے بجائے اسلام پر' یقین کے بجائے اقرار اور شہادت پر اور باطن سے بڑھ کر ظاہر پر ہو گیا۔ نتیجتاً قرآنِ حکیم کے بھی منبع ِ ایمان اور سرچشمۂ یقین ہونے کی حیثیت مؤخر اور نگاہوں سے اوجھل ہوتی چلی گئی اور کتابِ قانون اور یکے از

ادلۂ اربعہ(۱۰) ہونے کی حیثیت مقدم اور مرکزِ توجّہ بنتی چلی گئی۔ اور پھر جیسے جیسے مملکت اور سلطنت کے تقاضے پھیلتے گئے اور قانون کی عمل داری وسیع ہوتی گئی' قرآن مجید تو ''چار میں کے ایک'' کی حیثیت میں پس منظر میں ''گم''(۱۱) ہوتا چلا گیا اور توجّہات حدیث اور فقہ پر مرتکز ہو کر رہ گئیں(۱۲)۔ ستم بالائے ستم یہ کہ علم اور حکمت کے میدان میں جو خلا اس طرح پیدا ہوا اُسے پر کرنے کے لیے مصر و یونان کی جانب سے فلسفہ و منطق کی آندھیاں آئیں۔ نتیجتاً پورا عالمِ اسلام ارسطو کی منطق اور نو افلاطونی تصوف کی آماجگاہ بن کر رہ گیا۔ یہاں تک کہ فلسفہ و اصولِ اخلاق کے لیے بھی مسلمانوں کو اغیار کے سامنے کاسۂ گدائی پیش کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا(۱۳) ۔رفتہ رفتہ صورت یہ ہو گئی کہ قرآن نہ منبع ایمان رہا نہ سرچشمۂ یقین اور نہ مخزنِ اخلاق رہا نہ معدنِ حکمت -- بلکہ صرف ایک ایسی ''کتابِ مقدس'' بن کر رہ گیا جس کے الفاظ یا تو حصولِ برکت اور ایصالِ ثواب کا ذریعہ بن سکتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ تعویذ گنڈے اور جھاڑ پھونک کے کام آسکتے ہیں(۱۴)۔ اور اس طرح آنحضور ﷺ کی وہ

---

(۱۰) اصولِ شریعت چار ہیں: (ا)قرآن' (ب) سنت رسول ﷺ' (ج) قیاس' (د) اجماع۔ انہیں ''اَدِلّہ اَرْبَعہ ''کہا جاتا ہے۔(۱۱) حضرت اکبرؔ کا بہت پیارا شعر ہے: صوم ہے ایمان سے ' ایمان غائب صوم گم قوم ہے قرآن سے' قرآن رخصت قوم گم !(۱۲) چنانچہ اصولِ حدیث اور اصولِ فقہ پر تو بے شمار تصانیف ملتی ہیں' لیکن اصولِ تفسیر کے موضوع پر چودہ سو سال میں کل دو رسالے ملتے ہیں۔ ایک امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ علیہ کا رسالہ ''اصولِ تفسیر'' اور دوسرا امام الہند شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ علیہ کا رسالہ ''الفوز الکبیر''۔

(۱۳) اسی کا مرثیہ کہا مولانا رومؒ نے ان الفاظ میں ؎
چند خوانی حکمت یونانیاں حکمت قرآنیہ را ہم بخواں ! (تم کب تک یونانیوں کا فلسفہ پڑھتے رہوگے؟ کبھی حکمت قرآنی اور حکمت ایمانی بھی تو پڑھو !)
(۱۴) ایک تیسرا مصرف قرآن کا وہ ہے جو علامہ اقبالؒ نے اس شعر میں بیان کیا: ؎
بآیاتش ترا کارے جزیں نیست کہ از یاسین او آساں بمیری (اے مسلمان ! تجھے اس قرآن کی آیات سے اب اس کے سوا اور کوئی سروکار نہیں رہا کہ اس کی سورۂ یٰسین کے ذریعے موت کو آسان کرلے۔)

پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہوئی کہ ایک زمانہ وہ آئے گا کہ: ((لَایَبْقٰی مِنَ الْاِسْلَامِ اِلَّا اسْمُہٗ وَلَایَبْقٰی مِنَ الْقُرْآنِ اِلَّا رَسْمُہٗ)) (مشکوٰۃ : کتاب العلم) ''اسلام میں سے سوائے اُس کے نام کے اور کچھ باقی نہ رہے گا اور قرآن میں سے سوائے صورتِ الفاظ کے اور کچھ نہ بچے گا۔''

بعینہٖ یہی معاملہ ''جہاد'' کے ساتھ بھی ہوا۔ جب اصل زور ایمان پر نہ رہا بلکہ اسلام پر ہو گیا تو جہاد بھی، جو ایمانِ حقیقی کا رُکنِ رکین تھا، خود بخود نگاہوں سے اوجھل ہوتا چلا گیا اور ساری توجّہ ارکانِ اسلام پر مرتکز ہو گئی، جن کی فہرست میں جہاد سرے سے شامل ہی نہیں ہے۔ گویا جہاد پر ظلم قرآن سے بھی بڑھ کر ہوا۔ اس لیے کہ قرآن تو خواہ ''چار میں کے ایک'' کی حیثیت ہی سے سہی بہرحال شریعت کے اصولِ اربعہ میں شامل تو ہے، جہاد تو نہ صرف یہ کہ اسلام کے ارکانِ خمسہ میں شامل نہیں بلکہ نظامِ فقہ میں بھی اِس کی حیثیت فرضِ عین کی نہیں صرف فرضِ کفایہ کی ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ جہاد کا تصوّر بھی مسخ ہو گیا اور اس شجرۂ طیبہ کی شاخوں کو جڑ اور تنے سے جدا کر کے ہر ایک کو مختلف رنگ دے دیا گیا۔ چنانچہ ایک طرف جہاد مع النفس کا رُخ اعمال اور معاملات کی منجدھار سے پرے ہی پرے اَذکار و اَوراد اور نفسیاتی ریاضتوں اور ورزشوں کی راہِ یسیر (short cut) کے جانب موڑ دیا گیا اور دوسری طرف جہاد کو قتال کے ہم معنی قرار دے کر اس کا مقصد مملکت کی سرحدوں کے تحفظ و دفاع اور بس چلے تو توسیع کے سوا کچھ نہ رہا۔ رہا شرک و ظلم، کفر و فسق اور زُور و منکر کی ہر صورت کے ساتھ مسلسل کشمکش اور تصادم اور حق و صداقت کے پرچار، نیکی اور راست بازی کی ترویج، کلمۂ توحید کی نشر و اشاعت اور دینِ حق کے غلبہ و

اقامت کے لیے پیہم جدّوجُہد اور اس کے لیے سمع وطاعت کے اصول پر مبنی نظامِ جماعت کے قیام کا معاملہ ---- گویا فی الجملہ اِحقاقِ حق اور اِبطالِ باطل کی منظم سعی جو ہر مؤمن کے لیے فرضِ عین کا درجہ رکھتی ہے ' وہ یا تو سرے سے خارج از بحث ہو گئی یا زیادہ سے زیادہ ایک اضافی نیکی قرار پا کر رہ گئی ' اور اس سے بالا ہی بالا اور ورے ہی ورے اسلام وایمان اور تقویٰ و احسان کے جملہ مراحل طے پانے لگے !

اللہ اللہ ! کوئی فرق سا فرق ہے اور تفاوت سا تفاوت ! ع

''ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا''

(۱۵) کے مصداق کجا وہ کیفیت کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جذبۂ جہاد سے سرشار' بیک زبان' رجزیہ انداز میں یہ شعر پڑھ رہے ہیں:

نَحْنُ الَّذِیْنَ بَایَعُوا مُحَمَّدًا
عَلَی الْجِھَادِ مَا بَقِیْنَا اَبَدًا(۱۶)
(صحیح البخاری)

کجا یہ حال کہ چودھویں صدی ہجری کے ایک متنبی اور اُس کی ذُرّیت ِ صلبی و معنوی نے تو جہاد بالسیف کو باقاعدہ منسوخ ہی قرار دے دیا۔ مسلمانوں کی عظیم اکثریت کا حال بھی عملاً کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ ع

''کہ رہوارِ یقینِ ما بصحرائے گماں گم شد!''(۱۷)

* * *

(۱۵) فاصلے کی دوری تو دیکھو کہ کہاں سے کہاں نکل گئے !

(۱۶) ہم وہ لوگ ہیں جنہوں نے محمد ﷺ کے ہاتھ پر جہاد کی بیعت کر رکھی ہے اور اب یہ جہاد جاری رہے گا جب تک ہماری جان میں جان ہے۔

(۱۷) ہمارے یقین کا گھوڑا گمان کے صحرا میں گم ہوگیا ہے !

کلمۂ طیّبہ اور کلمۂ خبیثہ

قرآن حکیم کی دو انتہائی جامع تمثیلیں

نحمدہٗ ونصلی علٰی رَسولہِ الکریم ... امّا بَعد:

فاعوذ باللہ من الشَّیطٰنِ الرَّجیم ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ{اَلَمْ تَرَ کَیْفَ ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا کَلِمَۃً طَیِّبَۃً کَشَجَرَۃٍ طَیِّبَۃٍ اَصْلُہَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُہَا فِی السَّمَآءِ ﴿۲۴﴾ تُؤْتِیْٓ اُکُلَہَا کُلَّ حِیْنٍ بِاِذْنِ رَبِّہَا ؕ وَیَضْرِبُ اللّٰہُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّہُمْ یَتَذَکَّرُوْنَ ﴿۲۵﴾ وَ مَثَلُ کَلِمَۃٍ خَبِیْثَۃٍ کَشَجَرَۃٍ خَبِیْثَۃِ ِ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَہَا مِنْ قَرَارٍ ﴿۲۶﴾ یُثَبِّتُ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَ فِی الْاٰخِرَۃِ ۚ وَیُضِلُّ اللّٰہُ الظّٰلِمِیْنَ ۙ وَ یَفْعَلُ اللّٰہُ مَا یَشَآءُ ﴿۲۷﴾ } (ابرٰھیم)...صدق اللہ العظیم

''کیا تم نے غور نہیں کیا کیسے مثال بیان فرمائی اللہ نے کلمۂ طیبہ کی ایک ایسے شجرۂ طیبہ کے مانند جس کی جڑ مضبوطی سے جمی ہوئی ہو ' اور اُس کی شاخیں آسمان کو چھو رہی ہوں اور وہ اپنا پھل اپنے ربّ کے حکم سے ہمیشہ بھرپور دیتا ہو۔ اور اللہ لوگوں کے لیے ایسی تمثیلیں بیان کرتا ہے تاکہ وہ یاد دہانی حاصل کر سکیں۔ اور کلمۂ خبیثہ کی مثال ایک شجرۂ خبیثہ کی سی ہے جو زمین کے اوپر ہی سے اکھاڑ لیا جائے اور اسے کوئی ثبات حاصل نہ ہو۔ اللہ اہل ایمان کو قولِ ثابت کے ذریعے دنیا میں بھی ثبات عطا فرماتا ہے اور آخرت میں بھی۔ اور اللہ بے راہ کر دیتا ہے ظلم کرنے والوں کو' اور اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔''

یہ ایک جانی پہچانی حقیقت ہے کہ آسمانی کتابوں میں تمثیلات بکثرت بیان ہوئی ہیں'

اس لیے کہ ان کے مخاطب تمام انسان ہوتے ہیں جن میں اکثریت ان عوام الناس کی ہوتی ہے جو اعلیٰ علمی حقائق کو علمی انداز ِبیان اور فنی اصطلاحات کے حوالے سے تو نہیں سمجھ سکتے' ہاں اگر انہیں عام فہم تشبیہوں اور تمثیلوں کے ذریعے بات سمجھائی جائے تو سمجھ لیتے ہیں۔ اسی لیے ان تشبیہوں اور تمثیلوں کا ان کے تمام مشاہدات سے ماخوذ ہونا ضروری ہے۔ تورات میں تمثیلیں بہت کم ملتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ تمام تر احکام و شرائع ہی کا مجموعہ ہے 'یعنی صرف کتاب و شریعت پر مشتمل ہے۔ اس کے برعکس انجیل میں تمثیلیں نہایت کثرت سے وارد ہوئی ہیں۔

اس لیے کہ وہ کُل کی کُل حکمت اور معرفت پر مشتمل ہے ‘اور ظاہر ہے کہ تمثیل کی ضرورت ایسے ہی اعلیٰ اور لطیف علمی حقائق کی وضاحت کے لیے پیش آتی ہے۔قرآن چونکہ مجموعہ ہے دلائل و براہین‘ احکام و شرائع اور حکمت و معرفت سب کا‘ لہٰذا اس میں تمثیلات کی کثرت اتنی تو نہیں ہے جتنی انجیل میں ہے‘ لیکن جتنی تمثیلیں بھی اس میں وارد ہوئی ہیں وہ سب ہی فصاحت و بلاغت کی معراج کی مصداق ہیں۔ ان ہی میں سے دو تمثیلیں یہ ہیں جو ان آیاتِ مبارکہ میں بیان ہوئیں ۔ ایک مثال ہے کلمۂ طیبہ یعنی کلمۂ توحید کی۔ اور دوسری مثال ہے کلمۂ خبیثہ یعنی کلماتِ شرکیہ کی۔ ! !

کلمۂ طیبہ یا کلمۂ توحید کی مثال ایک ایسے مثمر درخت کی ہے جس کی جڑیں بھی مضبوط ہوں اور زمین کی گہرائی میں اُتری ہوئی ہوں ‘اور شاخیں بھی نہ صرف یہ کہ خوب پھیلی ہوئی ہوں بلکہ بلند بھی اتنی ہوں گویا کہ آسمان کو چھو رہی ہوں۔ واضح رہے کہ ان دونوں چیزوں کا تعلق درخت کی غذا سے ہے۔ درخت ایک جانب تو زمین سے غذا حاصل کرتا ہے جس کے لیے جڑوں کا مضبوطی کے ساتھ جمے ہونا اور زمین میں گہرا اترے ہونا ضروری ہے۔ دوسری جانب وہ فضا سے بھی غذا حاصل کرتا ہے جس کے لیے اُس کی شاخوں کا چاروں طرف خوب پھیلے ہونا بھی لازمی ہے اور زیادہ سے زیادہ بلند ہونا بھی ‘تاکہ وہ تنازع للبقاء کے اصول کے تحت آس پاس کے درختوں سے بلند تر ہو کر بلاروک ٹوک فضا سے غذا حاصل کر سکے۔ ان ہی دونوں چیزوں پر دار و مدار ہے اس کے پھل دینے کا۔ غذا اگر وافر بھی مل رہی ہو اور اعلیٰ سے اعلیٰ اور عمدہ سے عمدہ بھی مل رہی ہو تو ظاہر ہے کہ پھل بھی اچھے سے اچھا اور ہر موسم پر

پورا اور بھرپور آئے گا۔

بالکل یہی مثال کلمۂ توحید کی بھی ہے۔ اس کے تغذیہ و تقویت کا معاملہ بھی دو اطراف سے متعلق ہے۔ ایک فطرتِ انسانی سے جو صالح زمین سے مشابہ ہے اور جس کی گہرائیوں میں توحید کے صاف ستھرے سوتے بہہ رہے ہوں‘ جہاں سے توحید فی العقیدہ‘ توحید فی العمل اور توحید فی الطلب سب کو غذا ملتی ہے۔ دوسرے آفاقی آیات و شواہد سے‘ جن پر غور و فکر سے عقلِ انسانی توحیدِ تخلیق اور توحیدِ تدبیر کا سراغ پاتی ہے۔ ان دونوں کو قرآن مجید نے نہایت جامعیت و اختصار کے ساتھ تو ایک آیت میں اس طرح جمع کیا کہ:

{سَنُرِیۡہِمۡ اٰیٰتِنَا فِی الۡاٰفَاقِ وَ فِیۡۤ اَنۡفُسِہِمۡ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَہُمۡ اَنَّہُ الۡحَقُّ ؕ}(حٰمٓ السجدۃ:۵۳)

’’ہم عنقریب دکھائیں گے انہیں اپنی آیات آفاق میں بھی اور خود ان کے نفوس میں بھی ‘یہاں تک کہ یہ بات بالکل کھل جائے گی کہ حق وہی ہے !‘‘

اور علیحدہ علیحدہ ان اسالیب میں بیان کیا کہ کہیں تو اپنے من میں ڈوب کر سراغِ زندگی پانے کی تلقین فرمائی‘ ازروئے

الفاظ قرآنی:{وَ فِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ ؕ اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ ﴿۲۱﴾} (الذّٰریٰت)اور چونکہ اس کی صلاحیت و استعداد کم ہی لوگوں میں ہوتی ہے ‘لہٰذا یہ مضمون قرآن میں نسبتاً کم ملے گا آیاتِ آفاقی پر دعوتِ تعقل و تفکر کے مقابلے میں‘ جس کا نہایت کثرت سے اعادہ ہوا ہے ‘بالخصوص مکی سورتوں میں‘ اور جس کا نہایت جامع خلاصہ ہے سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۶۴ میں ‘جسے ’’آیت الآیات‘‘ قرار دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

{اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ اخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَ النَّہَارِ وَ الۡفُلۡکِ الَّتِیۡ تَجۡرِیۡ فِی الۡبَحۡرِ بِمَا یَنۡفَعُ النَّاسَ وَ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ مَّآءٍ فَاَحۡیَا بِہِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِہَا وَ بَثَّ فِیۡہَا مِنۡ کُلِّ دَآبَّۃٍ ۪ وَّ تَصۡرِیۡفِ الرِّیٰحِ وَ السَّحَابِ الۡمُسَخَّرِ بَیۡنَ السَّمَآءِ وَ الۡاَرۡضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۶۴﴾}

’’یقیناً آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں‘ اور رات اور دن کے اُلٹ پھیر میں‘ اور اُس کشتی میں جو لوگوں کی ضرورت کی چیزیں لے کر دریا میں چلتی ہے‘ اور اُس پانی میں جسے اللہ نے آسمان سے برسایا اور اُس کے ذریعے زمین کو اُس کے مردہ ہوجانے کے بعد زندہ کیا‘ اور پھیلا دیے اُس میں ہر نوع کے جاندار‘ اور ہوائوں کے چلانے میں اور اُس بادل میں کہ جو آسمان اور زمین کے مابین مامور ہے‘ نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیں!‘‘

الغرض توحید کا شجرۂ طیّبہ بھرپور غذا حاصل کرتا ہے فطرتِ انسانی کی زمین سے بھی اور آیاتِ آفاقی میں غور و فکر سے بھی‘ اور پھر بھرپور پھل لاتا ہے اخلاقِ حسنہ‘ اعمالِ صالحہ اور اعلیٰ سیرت و کردار کا۔ جن کے نمونے ملتے ہیں: انبیاء و صدیقین‘ شہداء و صلحاء اور اتقیاء و ابرار کی سیرتوں اور شخصیتوں میں‘ جو اصل میں ثمرِ طیّب ہیں توحید کے کلمۂ طیّبہ ہی کے شجرۂ طیّبہ کا۔

اس کے برعکس معاملہ ہے مشرکانہ اوہام و عقائد کا‘ کہ اُن کے لیے نہ فطرت انسانی میں کوئی جڑ بنیاد موجود ہے‘ نہ ہی اس وسیع و عریض کائنات کے کسی گوشے سے انہیں کوئی تائید حاصل ہوتی ہے۔ گویا ان کی مثال اس جھاڑ جھنکاڑ کی سی ہے جو زمین پر ایسے ہی پھیل گیا ہو کہ نہ اس کی جڑیں گہرائی میں اتری ہوئی ہوں نہ شاخیں فضا میں بلند ہوں۔ چنانچہ اس میں نہ پھول لگتے ہیں نہ پھل‘ نہ اُس کا کوئی ایسا سایہ ہوتا ہے جس کے تلے کوئی تھکاماندہ مسافر کسی وقت استراحت کرلے‘ نہ کسی کو کوئی غذا کا سامان ہی اُس سے حاصل ہوتا ہو۔ پھر یہ کہ اسے کوئی ثبات و قرار بھی حاصل نہیں‘ جہاں کسی نے ذرا سا ہاتھ لگایا اُس کی جڑیں زمین سے فوراً جدا ہو گئیں‘ جیسے کہیں اوپر ہی رکھی ہوئی تھیں۔ جبکہ اس کے برعکس ہے معاملہ کلمۂ توحید کے شجرۂ طیبّہ کا کہ اسے زمین سے اکھاڑنا آسان نہیں ہوتا۔ گویا جو لوگ فی الواقعہ توحید پر کاربند ہوں اور عقیدۂ توحید ان کے رگ و پے میں واقعتاً سرایت کر گیا ہو ‘ان کو دنیا میں نہ کسی طرح ہراساں کیا جا سکتا ہے نہ خوف زدہ‘ اور نہ رنجیدہ نہ غمگین‘ اس لیے کہ توحید کا تو اصل ہی خوف اور غم

دونوں سے نجات ہے۔ ازروئے الفاظِ قرآنی:
{اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْہِمْ وَ لَا ہُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾} (یونس)

''آگاہ ہو جائو کہ اللہ کے حقیقی دوستوں کے لیے نہ کوئی خوف ہے اور نہ ہی وہ غم و اندوہ سے دوچار ہونے والے ہیں۔''

اسی حقیقت کو یہاں ان الفاظ میں بیان فرمایا کہ:

{یُثَبِّتُ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَ فِی الْاٰخِرَۃِ} (ابرٰھیم:۲۷)

''اللہ توحید کے قولِ ثابت کے ذریعے اہلِ ایمان کو دنیا میں بھی ثبات و استقلال عطا فرماتا ہے اور آخرت میں بھی۔''

واضح رہے کہ یہی لفظ ''تثبیت'' سورۃ الانفال میں وارد ہوا ہے' جہاں مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کی مدد کے لیے فرشتوں کو بھیجا اس حکم کے ساتھ کہ {فَثَبِّتُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا} ''قدم جما دو اہلِ ایمان کے!'' گویا توحید کے کلمۂ طیبہ کی بنا پر جیسے اہلِ ایمان کے قدم اس دنیا میں معرکۂ حق و باطل میں جمے رہتے ہیں' ایسے ہی میدانِ حشر میں بھی پورے سکون و ثبات کے ساتھ جمے رہیں گے' اور پھر جنت میں وہ پھلیں پھولیں گے اپنے ربّ کی رحمتوں اور شفقتوں کے سائے میں۔ اور اس کے برعکس ہے معاملہ مشرکین کا جن کے ضمن میں فرمایا: {وَ یُضِلُّ اللّٰہُ الظّٰلِمِیْنَ ۚ} واضح رہے کہ ظلم سے قرآن مجید میں اکثر و بیشتر ''شرک'' مراد ہوتا ہے' ازروئے الفاظِ قرآنی: {اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ ﴿۱۳﴾} (لقمٰن) ''یقیناً شرک بہت بڑا ظلم ہے!'' اب ظاہر ہے کہ مشرک کو بھی جس طرح حیاتِ مادّی کے لیے پانی اور ہوا کی ضرورت ہے' اسی طرح ضمیر کے اطمینان کے لیے جھوٹ موٹ کی کسی نہ کسی نیکی کا سہارا ضروری ہے۔ چنانچہ کچھ نہ کچھ الٹی سیدھی اور جھوٹی سچی نیکیاں وہ بھی اپنے نامۂ اعمال میں جمع کراتے ہیں۔ لیکن ان کے یہ اعمال نتیجہ خیز اور بارآور نہیں ہوتے' اس لیے کہ اُن کی پشت پر توحید یا اخلاص موجود نہیں ہوتا۔ چنانچہ ایسی تمام نیکیاں رائیگاں جاتی ہیں' جیسے کہ اسی سورۂ مبارکہ کی آیت ۱۸ میں تمثیل بیان ہو چکی ہے کہ:
{مَثَلُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِرَبِّہِمْ اَعْمَالُہُمْ کَرَمَادِ ۨ اشْتَدَّتْ بِہِ الرِّیْحُ فِیْ یَوْمٍ عَاصِفٍ ؕ لَا یَقْدِرُوْنَ مِمَّا کَسَبُوْا عَلٰی شَیْءٍ ؕ ذٰلِکَ ہُوَ

الضَّلٰلُ الْبَعِیْدُ ﴿۱۸﴾} (ابرٰھیم)

''اُن لوگوں کے اعمال کی مثال جنہوں نے اپنے ربّ کا کفر کیا' ایسے ہے جیسے راکھ جس پر کسی آندھی والے دن تیز ہوا چلے۔ چنانچہ جو کمائی (بزعم خویش) انہوں نے کی ہوگی اس میں سے ان کے پلّے کچھ بھی نہ پڑ

سکے گا۔ (ظاہر ہے کہ) یہی گمراہی کی انتہا ہے!''

اس اہم مضمون کے لیے ایسی ہی فصیح و بلیغ تمثیل وہ بھی ہے جو سورۃ النور میں وارد ہوئی:

{وَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اَعۡمَالُہُمۡ کَسَرَابٍۭ بِقِیۡعَۃٍ یَّحۡسَبُہُ الظَّمۡاٰنُ مَآءً ؕ حَتّٰۤی اِذَا جَآءَہٗ لَمۡ یَجِدۡہُ شَیۡئًا وَّ وَجَدَ اللّٰہَ عِنۡدَہٗ فَوَفّٰىہُ حِسَابَہٗ ؕ وَ اللّٰہُ سَرِیۡعُ الۡحِسَابِ ﴿۳۹﴾} (النور)

''اور جن لوگوں نے کفر کی روش اختیار کی' اُن کے اعمال (یعنی نیکیاں) اس سراب کے مانند ہیں جو کسی چٹیل میدان میں ہو' اور جسے پیاسا پانی سمجھ رہا ہو۔ لیکن جب وہ وہاں پہنچے تو اسے کچھ بھی نہ پائے' بلکہ وہ پائے وہاں اللہ کو جو اس کا حساب چکا دے۔ اور اللہ کو حساب چکاتے دیر نہیں لگتی!''

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس دردناک انجام سے بچائے اور توحید کی دولت سے سرفراز فرمائے اور خلوص و اخلاص کی نعمت مرحمت فرمائے۔ آمین یاربّ العالمین oo

اقول قولی هذا واستغفر الله لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمین

کیا نظامِ باطل میں

اطاعتِ رسول ﷺ ممکن ہے؟

تنظیم اسلامی کراچی کے زیر اہتمام ۱۹۹۳ء کے دوران طیبہ مسجد گلشن اقبال' کراچی میں امیر تنظیم اسلامی اور داعی تحریک خلافت پاکستان ڈاکٹر اسرار احمد نے ''کیا نظامِ باطل میں اطاعتِ رسول ﷺ ممکن ہے؟'' کے عنوان سے خصوصی خطاب فرمایا تھا۔ آسٹریلیا میں مقیم ہمارے ایک دوست علی حفاظت نے اس خطاب کی اہمیت کی طرف توجّہ دلائی۔ چنانچہ قرآن اکیڈمی لاہور' شعبہ مطبوعات کے ادارتی معاون حافظ محمد زاہد کی ترتیب و تسوید کے بعد یہ اہم خطاب قارئین کے لیے مضمون کی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اعوذ باللہ من الشَّیطٰن الرَّجیم - بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ{قُلْ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَیْہِ مَا حُمِّلَ وَ عَلَیْکُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ ؕ وَ اِنْ تُطِیْعُوْہُ تَہْتَدُوْا ؕ وَ مَا عَلَی الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ ﴿ ۵۴ ﴾ وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّہُمْ فِی الْاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِہِمْ ۪ وَ لَیُمَکِّنَنَّ لَہُمْ دِیْنَہُمُ الَّذِی ارْتَضٰی لَہُمْ وَ لَیُبَدِّلَنَّہُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِہِمْ اَمْنًا ؕ یَعْبُدُوْنَنِیْ لَا یُشْرِکُوْنَ بِیْ شَیْـًٔا ؕ وَ مَنْ کَفَرَ بَعْدَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿ ۵۵ ﴾ وَ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿ ۵۶ ﴾ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مُعْجِزِیْنَ فِی الْاَرْضِ ۚ وَ مَاْوٰىہُمُ النَّارُ ؕ وَ لَبِئْسَ الْمَصِیْرُ ﴿ ۵۷ ﴾ }(النور)

معزز سامعین کرام !

سورۃ النور کے ساتویں رکوع کی چار آیات جو میں نے آپ کے سامنے تلاوت کی ہیں' آج انہی کا درس دینا مطلوب ہے۔ آغاز ہی میں اپنی نیت اور ارادے کی تصحیح کر لیجیے۔ اس لیے کہ قرآن حکیم کا سننا اور پڑھنا اس نیت کے ساتھ ہونا چاہیے کہ جو بات سامنے آئے اور دل اُس پر یہ گواہی بھی دے دے کہ قرآن کا معنی و مفہوم اور اس کی مراد و منشا یہی ہے تو پھر اس پر عمل کی کوشش ضرور کریں گے ۔اگر یہ نیت اور ارادہ پہلے سے موجود نہ ہو تو پھر قرآن کا پڑھنا اور سننا صرف ایک ذہنی ورزش یا' اللہ معاف کرے' اس سے بھی آگے بڑھ کر ذہنی عیاشی بن سکتا ہے۔قرآن حکیم کے بارے میں حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے : ((اَلْقُرآنُ حُجَّۃٌ لَکَ اَوْ عَلَیْکَ))(۱) ''قرآن تمہارے حق میں دلیل ہے یا تمہارے خلاف''۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر آپ نے قرآن کو سنا' پڑھا' سمجھا اور پھر اس پر عمل بھی کیا تو یہ قرآن آپ کے حق میں دلیل بن گیا------- دلیل راستہ دکھانے والی شے کو بھی کہتے ہیں' گویا یہ قرآن دنیا میں بھی آپ کو راستہ دکھائے گا اور آخرت میں بھی یہ آپ کے حق میں شفاعت کرے گا۔ قرآن کی شفاعت کا ذکر بھی حدیث نبویؐ میں آیا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:((اَلصِّیَامُ وَالْقُرآنُ یَشْفَعَانِ لِلْعَبْدِ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ' یَقُوْلُ الصِّیَامُ : اَیْ رَبِّ اِنِّیْ مَنَعْتُہُ الطَّعَامَ وَالشَّھَوَاتِ بِالنَّھَارِ فَشَفِّعْنِیْ فِیْہِ ' وَیَقُوْلُ الْقُرآنُ : مَنَعْتُہُ النَّوْمَ بِاللَّیْلِ فَشَفِّعْنِیْ فِیْہِ ' فَیُشَفَّعَانِ))(۲)

''روزہ اور قرآن دونوں قیامت کے دن بندے کی سفارش کریں گے۔ روزہ عرض کرے گا: اے میرے پروردگار ! میں نے اس بندے کو دن کے اوقات میں کھانے پینے اور نفس کی خواہش کو پورا کرنے سے روکے رکھا تھا' آج میری سفارش اس کے حق میں قبول فرما۔ اور قرآن کہے گا :میں نے اس کو رات کے سونے اور

(۱) صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ،باب فضل الوضوء۔وسنن الترمذی،ابواب الدعوات، باب منہ۔
(۲) رواہ البیھقی فی شعب الایمان۔و مسند احمد: ح ۶۳۳۷۔

آرام کرنے سے روکے رکھا تھا،آج میری سفارش اس کے حق میں قبول فرما۔ چنانچہ (روزہ اور قرآن) دونوں کی سفارش (اس بندہ کے حق میں) قبول فرمائی جائے گی۔''

الغرض اگر ہم قرآن سمجھیں، پڑھیں اور اس پر عمل کریں تو قرآن ہمارے لیے دنیا میں دلیل راہ اور آخرت میں شافع بنے گا اور اگر ہم قرآن کو صرف پڑھیں اور سنیں، لیکن اس پر عمل نہ کریں تو یہ قرآن ہمارے خلاف استغاثہ لے کر کھڑا ہو جائے گا کہ پروردگار! اس نے مجھے پڑھا بھی، سمجھا بھی، لیکن پھر عمل نہیں کیا۔گویا یہ پڑھنا، سننا اور سمجھنا بجائے مفید ہونے کے الٹا نقصان دہ ہو جائے گا ،بایں طور کہ ہمارے خلاف اللہ کے ہاں ایک گواہی اور بڑھ جائے گی۔

ایک تو یہ ہے کہ انسان یہ کہہ سکے کہ پروردگار مجھے معلوم نہیں اور جن کے ذمے مجھ تک پہنچانا تھا انہوں نے نہیں پہنچایا، تو کسی درجے میں یہ اس کا عذر ہو گا۔ لیکن اگر بات پہنچ بھی گئی اور پھر بھی عمل نہ کیا تو یہ عذر بھی ختم ہو گیا اور اب یہ قرآن ہمارے خلاف استغاثہ لے کر کھڑا ہو جائے گا۔ یہ بات آغاز ہی میں اس لیے بیان کر دی گئی ہے تاکہ درسِ قرآن کی اس محفل میں جنہیں بھی اللہ نے شرکت کی توفیق عطا فرمائی ہے، جو اپنے معمولات میں سے وقت نکال کر آئے ہیں اور جنہوں نے اپنی مصروفیاتِ زندگی میں سے وقت کا کچھ حصّہ اس مجلس کے لیے فارغ کیا ہے ،ان کے لیے اس مجلس میں شرکت حقیقتاً مفید ہو، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ چنانچہ اپنے دل میں ایک عزم کر لیں، پختہ ارادہ کر لیں کہ آج جو بات بھی ہمارے سامنے آئے گی ہم اس پر ضرور عمل کریں گے۔

اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡل

اب ان آیات کا مطالعہ کرتے ہیں۔پہلی آیت میں فرمایا:{قُلۡ}''(اے نبی ﷺ) آپ کہہ دیجیے''۔ یہاں خطاب آنحضور ﷺ سے ہے۔{اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ ۚ}''اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی''۔{فَاِنۡ تَوَلَّوۡا}''پھر اگر تم روگردانی کرتے ہو''{فَاِنَّمَا عَلَیۡہِ مَا حُمِّلَ}''تو (سن لو کہ) انّ

کے ذِمّہ صرف وہی ہے جو بوجھ ان پر ڈالا گیا ہے''۔یعنی محمد رسول اللہ ﷺ کی ذِمّہ داری ربّ العالمین کا پیغام تم تک پہنچانے کی تھی اور آپ اپنی یہ ذِمّہ داری ادا کر کے بریٔ الذِمّہ ہو گئے۔{وَ عَلَیۡکُمۡ مَّا حُمِّلۡتُمۡ ؕ}''اور تم پر وہ بوجھ ہے

جو تم پر ڈالا گیا ہے''۔یعنی تم اپنی ذِمّہ داریوں کے لیے مسئول ہو گے اور تمہیں اِن کے بارے میں جواب دہی کرنی پڑے گی۔ اس ضمن میں نبی اکرم ﷺ کا یہ فرمان ضرور یاد رکھنا چاہیے: ((اَلَا کُلُّکُمْ رَاعٍ وَکُلُّکُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِہٖ)) (۳) ''سن لو! ہر شخص نگران ہے اور ہر شخص سے اس کی رعیت کے بارے میں پوچھا جائے گا۔''

{وَ اِنْ تُطِیْعُوْهُ تَهْتَدُوْا ؕ} ''اور اگر تم ان کی اطاعت کرو گے تب ہی تم ہدایت یافتہ ہو گے''۔یہاں ہدایت کے دونوں مفہوم ذہن میں رکھیے۔ہدایت کا ایک معنی تو راستہ دکھانا ہے اور راستہ دکھانے والے تو آپ ﷺ ہی ہیں' لہٰذا رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کرو گے تو سیدھے راستے پر چلو گے۔ جبکہ ہدایت کا دوسرا مفہوم ہے منزلِ مقصود تک پہنچادینا۔ اس اعتبار سے آیت کے اس ٹکڑے کا مفہوم یہ ہوگا کہ اگر نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کی پیروی کرو گے اوران کا حکم مانو گے تبھی اپنی منزلِ مراد کو پہنچ سکو گے اور تمہیں اُخروی کامیابی نصیب ہو گی جو بندۂ مؤمن کا اصل مقصود اور نصب العین ہے۔ اس کے برعکس اگر رسول کی اطاعت نہیں ہو گی تو گویا ان دونوں چیزوں سے محروم رہو گے۔

آیت کے آخر میں فرمایا:{ وَمَا عَلَی الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ ﴿ ۵۴ ﴾ }''اور نہیں ہے رسول پر (کوئی ذِمّہ داری) مگر صاف صاف پہنچا دینا''۔رسول ایلچی اورپیغامبر ہیں'یعنی اللہ کاپیغام پہنچانا ان کی ذِمّہ داری ہے۔ اگر انہوں نے یہ ذِمّہ داری ادا کر دی تو وہ بری ہو گئے اور جن تک اللہ کے احکام پہنچ گئے وہ مسئول ہوں گے۔ اب ان کے ذمے اس ابدی ہدایت کو لوگوں تک پہنچانا ہے اور پہنچا نا بھی ایسا ہوناچاہیے کہ کوئی اشتباہ اور ابہام نہ رہے' اور بات اس طور پر واضح اور مبرہن ہو جائے جیسے ہم کہتے ہیں :دودھ کا دودھ پانی کا

_____(۳) صحیح البخاری'کتاب الجمعہ'باب الجمعۃ فی المقری والمدن-وصحیح مسلم' کتاب الامارۃ'باب فضیلۃ الامام العادل وعقوبۃ الجائر...

پانی ہوجانا------- اَلْمُبِیْنُ یہاں اَلْبَلٰغ کی صفت ہے۔ اَبَانَ یُبِیْنُ کا معنی ہے ظاہر کرنا' واضح کرنا۔ اور اسی کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ جدا کرنا' ممیز کرنا' علیحدہ علیحدہ کر دینا (to discrete)۔ طلاق بائن کو بھی ''بائن'' اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ شوہر اوربیوی کے درمیان مکمل جدائی کرادیتی ہے۔

اطاعتِ رسول ﷺ اور اس کی اہمیت

اس آیہ مبارکہ کے مضامین کا شمار قرآن مجید کے بہت اہم مضامین میں ہوتا ہے اوراطاعت رسول کا مضمون تو قرآن مجید میں سینکڑوں مرتبہ آیا ہے۔ لیکن یہاں اطاعت رسولؐ کا ایک خاص مفہوم ہے اوریہ

اگلی آیت کے لیے بطور تمہید کے ہے۔ اس حوالے سے میں چاہتا ہوں کہ اس آیت کے مضامین کو تفصیل سے تجزیہ کر کے سمجھ لیجیے۔

پہلی بات اس آیت میں یہ فرمائی گئی :{اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ}یعنی اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی۔ یہ تو گویا دو اور دو چار کی طرح بالکل سیدھی بات ہے کہ اللہ کو مانا ہے تو اس کا حکم بھی مانو' رسول کو مانا ہے تو ان کے فرمودات کے سامنے سر تسلیم خم بھی کرو۔ اگر یہ نہیں کرتے تو وہ ماننا تو جھوٹ موٹ کا ماننا ہوا' جس کے بارے میں سورۃ الصف میں فرمایا گیا:{یٰٓاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ﴿ ۲ ﴾ کَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰہِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ﴿ ۳ ﴾ }یعنی اے ایمان والو! تم ایسی باتیں کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو؟ اگر تم ''کہو کچھ 'کرو کچھ'' کی روش اختیار کرو گے تو یہ اللہ کے غضب کو بھڑکانے والی بات ہے! اگر ایسا معاملہ ہے کہ زبان سے ''اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ وَمَلَائِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ وَالْیَوْمِ الآخِرِ وَالْقَدْرِ خَیْرِہٖ وَشَرِّہٖ مِنَ اللّٰہِ تَعَالٰی وَالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْت''کا اقرار بھی کرلیا اور ''اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰہِ''کی گواہی بھی دے دی'لیکن عملاً کسی قسم کی کوئی اطاعت نہیں ہے تو صرف زبانی دعویٰ سے کوئی کریڈٹ نہیں ملے گا۔ اگر زبان سے اللہ کی وحدانیت اور محمد ﷺ کی رسالت کو مانا تھا تو پھر اُن کے احکامات کی تعمیل بھی کرنی تھی۔ زبان سے کہہ کر عمل نہ کرنا تو گویا دوہرا جرم ہو گیا 'کیونکہ یہ تو قول اور عمل کا تضاد ہے۔ یہ ایسی بنیادی

بات ہے جو ہر مسلمان کو معلوم ہے 'لہٰذا اس میں مزید تشریح کی ضرورت نہیں ہے۔

کلمہ طیبہ اور کلمہ شہادت' دونوں کے دو دو جزو ہیں --- کلمہ طیبہ: (۱) لاَ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ (۲) مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰہِ۔ کلمہ شہادت: (۱) اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ (۲) وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ ---- پہلے جزو کا تقاضا ہے اللہ کو یکتا ماننا اور اُس کے ہر حکم کے سامنے سر تسلیم خم کرنا'جبکہ دوسرے جزو کا تقاضا ہے محمد ﷺ کو اللہ کا رسول اور بندہ ماننا اور پھر ان کے فرمودات پر عمل بھی کرنا۔

مَیں چاہتا ہوں کہ{اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ}کا اس اعتبار سے تجزیہ کر لیا جائے کہ حضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں اس کا مفہوم کیا تھا اور آج ہمارے لیے اس کا مفہوم کیا ہے۔ آیا اس میں کچھ فرق ہے یا نہیں؟ یہ ذرا باریک بات ہے' لیکن میں نے اس کو سوال کی صورت میں آپ کے سامنے رکھا ہے کہ کیا حضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے دوران اللہ کی اطاعت اور رسول کی اطاعت اور آج اللہ کی اطاعت اور رسول کی اطاعت کا بالکل ایک مفہوم ہے یا ان میں کچھ فرق ہے؟ بظاہر تو یہی بات سامنے آتی ہے کہ اس میں کوئی فرق نہیں ہے' لیکن پھر بھی اس کا تجزیہ کرتے ہیں۔

اطاعتِ رسول ؐ ہی اطاعتِ ربانی ہے !

اس تجزیہ سے پہلے ایک بنیادی بات یہ نوٹ کرلیجیے کہ اللہ کی اطاعت کا راستہ بھی رسولؐ کی اطاعت ہے۔ گویا رسول کی اطاعت میں ہی اللہ کی اطاعت ہے۔ بفحوائے قرآنی: {مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ ۚ} (النساء:۸۰)''جس نے رسول کی اطاعت کی تو اُسی نے اللہ کی اطاعت کی''۔اس لیے کہ اللہ کا حکم ہم تک رسول پہنچاتے ہیں اور اللہ کے حکم کو جاننے کا کوئی اور ذریعہ ہمارے پاس نہیں ہے۔ قرآن مجید موجود ہے' لیکن قرآن بھی تو رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوا ہے' مجھ پر یا آپ پر تو نازل نہیں ہوا۔ ہمیں محمد رسول اللہ ﷺ کے بتانے ہی سے تو معلوم ہوا کہ یہ قرآن اللہ کا کلام ہے۔ اس اعتبار سے ایک نظری پہلو تو یہ سمجھئے کہ یہ دونوں حقیقتیں یعنی اللہ کی اطاعت اور رسول کی اطاعت ایک ہی وحدت ہیں۔ اس کو علامہ اقبال نے بڑی خوبصورتی سے کہا ہے کہ:

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی است !

یعنی اپنے آپ کو محمد مصطفی ﷺ کے قدموں تک پہنچا دو' اس لیے کہ دین تو سراپا آپ ﷺ ہی ہیں۔ دین نام ہے کتاب و سُنّت کا ---اور کتاب ہمیں رسول اللہ ﷺ کے ذریعے ملی ہے'جبکہ آپ ﷺ کے اقوال و افعال کا نام ''سُنّت'' ہے اور یہ سُنّت درحقیقت آپ ﷺ کی عملی تمثیلات ہیں کہ آپؐ نے اللہ کے احکام پر کیسے عمل کیا۔ مثلاً نماز کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا:((صَلُّوْا کَمَا رَاَیْتُمُوْنِیْ اُصَلِّیْ))(۴) ''نماز ایسے پڑھو جیسے تم مجھے نماز پڑھتا دیکھتے ہو''۔ الغرض اطاعت رسول میں درحقیقت دونوں چیزیں جمع ہو جاتی ہیں۔ گویا اللہ کی اطاعت اور رسول کی اطاعت عملی اعتبار سے ایک ہیں اور اصل اہمیت رسول کی اطاعت کی ہے۔

اطاعتِ رسولؐ کے چار گوشے

اس بنیادی بات کے بعد اب ہم تجزیہ کرتے ہیں کہ حضور ﷺ کی حیاتِ مبارکہ کے دوران آپ ﷺ کی اطاعت اور آپ ﷺ کی رحلت کے بعد آپؐ کی اطاعت میں کوئی فرق ہے یا نہیں؟اس حوالے سے نوٹ کرلیجیے کہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کے چار گوشے ہیں:

(۱) عبادات اور طریقہ عبادات میں اطاعت : قرآن مجید میں بار بار نماز کا حکم دیا گیا ہے 'جبکہ نماز کیسے ادا کرنی ہے 'اس کا طریقہ ہمیں رسول اللہ ﷺ نے بتلایا ہے۔ اسی طرح قرآن میں حج کا حکم آیا: {وَ لِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْہِ سَبِیْلًا ؕ} (آل عمران:۹۷)''اور اللہ کا حق ہے لوگوں پر کہ وہ حج کریں اُس کے گھر کا'جو بھی استطاعت رکھتا ہو اس کی طرف سفر کی''------اور حج کے مناسک حضور اکرم ﷺ نے بتلائے۔ حجۃ

الوداع کے موقع پر آپ ﷺ بار بار فرماتے تھے :((یَا اَیُّھَا النَّاسُ خُذُوْا مَنَاسِکَکُمْ فَاِنِّیْ لَا اَدْرِیْ لَعَلِّیْ لَا اَحُجُّ بَعْدَ عَامِیْ ھٰذَا))(۵) ''اے لوگو!

_____(۴) صحیح الجامع للالبانی' ح:۸۹۳۔

(۵) سنن الترمذی' ابواب مناسک حج' باب الرکوع الی الجمار استظلال المحرم۔

اپنے مناسک مجھ سے سیکھ لو' اس لیے کہ اس سال کے بعد شاید میں حج نہ کرسکوں''------ حضور ﷺ نے ہجرت کے بعد ایک ہی حج کیا ہے۔جب آپ ﷺ مکّہ میں مقیم تھے تو آپؐ نے یقیناً حج کیے ہوں گے' لیکن ہجرت اور حج کا حکم آجانے کے بعد آپؐ نے ایک ہی حج کیا۔ اس لیے کہ پہلے مکّہ پر مشرکین کا اقتدار تھا' وہ تو صلح حدیبیہ کے ایک سال بعد عمرے کی نوبت آئی تو رسول اللہ ﷺ نے ۷ ہجری میں پہلی مرتبہ عمرہ کیا۔ ۸ ہجری میں اگرچہ مکّہ فتح ہو گیا تھا' لیکن حضور ﷺ نے اس سال حج نہیں کیا۔ پھر ۹ ہجری میں بھی آپؐ خود حج کے لیے نہیں گئے' بلکہ آپؐ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی زیر امارت ایک جماعت حج کے لیے بھیج دی۔اس کے بعد ۱۰ ہجری میں آپ ﷺ نے پورے جزیرہ نمائے عرب میں اعلان کرادیا کہ میں اس سال حج کے لیے جا رہا ہوں اور یہی وجہ ہے کہ اس سال حج کے موقع پر تقریباً سوا لاکھ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے۔ اس موقع پر آپ ﷺ بار بار فرمارہے تھے کہ مجھ سے اچھی طرح مناسکِ حج سیکھ لو' اس لیے کہ میرا فرضِ منصبی بہت حد تک ادا ہو چکا ہے اور اب مجھے اللہ کی طرف لوٹنا ہے۔

اسی طرح قرآن حکیم میں صرف زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم مذکور ہے' جبکہ زکوٰۃ کی مقدار کیا ہے؟ اس کا نصاب کیا ہے؟ کم سے کم کتنی مقدار پر اور کن کن چیزوں پر زکوٰۃ فرض ہے ؟یہ سب تفصیلات رسول اللہ ﷺ نے ہمیں دی ہیں-------الغرض حضور ﷺ کی اطاعت کا پہلا دائرہ عبادات کے ضمن میں ہے' جن کا تاکیدی حکم قرآن میں آیا ہے اور ان کی تفصیل محمد رسول اللہ ﷺ نے عطا فرمائی ہے۔ اس کی بلاچون و چرا پیروی کرنا گویا پہلا کام ہے جو صحابہ کرامؓ کے ذِمّہ تھا اور یہ اطاعت آج بھی اسی طرح ہم پر فرض ہے اور اطاعت کا یہ سلسلہ تاقیامت جاری رہے گا۔

(۲) احکامِ شریعت میں اطاعت :حضور اکرم ﷺ کی اطاعت کا دوسرا گوشہ احکامِ شریعت سے متعلق ہے۔ قرآن مجید میں بہت سے احکام آئے ہیں اور حضور ﷺ نے ان میں کچھ اضافہ بھی کیا ہے۔ مثلاً قرآن مجید میں دو بہنوں کو بیک وقت نکاح میں رکھنا حرام قرار دیا گیا ہے:{وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَیْنَ الْاُخْتَیْنِ}(النساء:۲۳)''اور یہ(بھی تم

پر حرام کر دیا گیا ہے) کہ تم بیک وقت دو بہنوں کو ایک نکاح میں جمع کرو''۔ جبکہ حضور ﷺ نے اس ضمن میں مزید فرمایا کہ پھوپھی اور بھتیجی' نیز خالہ اور بھانجی کو بھی بیک وقت نکاح میں جمع کرنا حرام ہے۔ اسی طرح سود کو قرآن مجید میں حرام قرار دیا گیا ہے: {وَ اَحَلَّ اللّٰہُ الۡبَیۡعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ}(البقرۃ:۲۷۵)''اور اللہ نے بیع کو حلال قرار دیا ہے اور سود کو حرام ٹھہرایا ہے''لیکن سود کن کن چیزوں میں ہے اور کس جگہ پر اس کا اطلاق ہو گا' اور اس کے علاوہ دیگر بہت سی وضاحتیں رسول اللہ ﷺ نے فرمائی ہیں۔

اسی طرح سزاؤں کا معاملہ ہے۔ قرآن مجید میں چوری کے حوالے سے یہ حکم آگیا: {وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَۃُ فَاقْطَعُوْٓا اَیْدِیَہُمَا...}(المائدۃ:۳۸)''چوری کرنے والے مرد اور چوری کرنے والی عورت کا ہاتھ کاٹ دو...''اس ضمن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر کسی نے ایک پیسہ بھی چرا لیا یا کسی نے مالِ مشترک میں چوری کر لی تو کیا اس پر بھی یہ حکم نافذ ہو گا یا نہیں؟ یہ ساری تشریحات اور تفصیلات نبی اکرم ﷺ نے دی ہیں۔ یہ تو معاشرت و معیشت کے حوالے سے چند ایک مثالیں میں نے بیان کی ہیں' ورنہ ہماری زندگی کے اور بھی بہت سے دائروں کے ضمن میں حضور اکرم ﷺ نے تفصیلات بیان کی ہیں' جنہیں قانونِ شریعت یا احکامِ شریعت کہتے ہیں۔ ان کی پیروی جیسے آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں صحابہ کرامؓ پر لازم تھی اسی طرح آج بھی ان کی پیروی جوں کی توں ہم سب مسلمانوں پر لازم ہے۔

معلوم ہوا کہ حضور اکرم ﷺ کی اطاعت ان دو دائروں (یعنی عبادات اور احکامِ شریعت) میں آپؐ کی حیاتِ طیبہ میں بھی تھی اور آج بھی جوں کی توں ہے۔ لہٰذا آج ہمارے لیے عبادات کے ضمن میں وہی طریقہ معتبر ہو گا جو کتاب اللہ اور سُنّت رسول ﷺ پر مبنی ہو اور اسی طرح شریعت کے احکام بھی کتاب و سُنّت ہی سے ماخوذ ہوں گے۔ اگر مرورِ ایام سے کوئی نئی صورت پیدا ہو گی تو اس کے لیے بھی کتاب و سُنّت کی بنیاد پر اجتہاد کیا جائے گا' ان سے ماوراء ہو کر کیا جانے والا اجتہاد قابلِ قبول نہیں ہو گا۔

(۳) مقدمات و نزاعات میں آپؐ کو حَکم ماننا: قبل ازیں بیان کردہ اطاعت رسول کے

دو گوشے تو وہ ہیں جو جیسے آپؐ کی حیاتِ طیبہ میں تھے' ویسے ہی آج ہیں' البتہ دو گوشے ان کے علاوہ ایسے ہیں جن کا حضور اکرم ﷺ کی حیات میں جو معاملہ تھا' آج براہِ راست ہمارا وہ معاملہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نہیں ہو سکتا۔ پہلی بات یہ ہے کہ ہمارے مابین جو بھی نزاع اور جھگڑا ہو اس میں حَکم (فیصلہ کرنے والے) رسول اللہ ﷺ کو مانا جائے۔ اس بارے میں سورۃ النساء میں فرمایا گیا:

{فَلَا وَ رَبِّکَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوۡکَ فِیۡمَا شَجَرَ بَیۡنَہُمۡ ثُمَّ لَا یَجِدُوۡا فِیۡۤ اَنۡفُسِہِمۡ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیۡتَ وَ یُسَلِّمُوۡا تَسۡلِیۡمًا

''پس نہیں' آپ کے رب کی قسم ! یہ ہرگز مؤمن نہیں ہو سکتے جب تک کہ یہ آپ کو حَکم نہ بنائیں ان تمام معاملات میں جو ان کے مابین پیدا ہو جائیں' پھر جو کچھ آپ فیصلہ کر دیں اس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی محسوس نہ کریں' اور سرِ تسلیم خم کریں جیسے کہ سرِ تسلیم خم کرنے کا حق ہے۔''

یعنی ایک تو رسول اللہ ﷺ کو حَکم مانیں اور پھر آپ کے کیے گئے فیصلے پر نہ صرف راضی ہوں' بلکہ دل میں بھی اس کے خلاف کوئی ردّعمل نہ ہو کہ آپ ﷺ نے یہ کیا فیصلہ کر دیا ! یہ طرزِ عمل ہی مکمل اطاعت ہے۔جبکہ ایک صورت یہ ہے کہ آپؐ کا فیصلہ مان تو لیا' لیکن دل میں کہیں میل ہے کہ یہ فیصلہ ٹھیک نہیں ہوا اور حضور ﷺ نے میری بات صحیح طور پر سنی نہیں۔ معاذ اللہ' ثم معاذ اللہ ! ایسا شخص تو کوئی منافق ہی ہو سکتا تھا جو یہ سوچے کہ آپؐ نے کوئی جانبداری کا معاملہ کیا ہے اور میری حق تلفی کی ہے۔ چنانچہ یہاں تک فرما دیا گیا کہ حضور ﷺ کے فیصلے پر اگر دل میں ذرا سا تنگی کا احساس بھی پیدا ہو گیا تو بھی ایمان کے لالے پڑ جائیں گے' کجا یہ کہ حضور ﷺ کے بارے میں جانبداری یا ناانصافی کا شک پیدا ہو جائے !

ظاہر بات ہے کہ حضور ﷺ جب تک مسلمانوں کے اندر موجود تھے تو آپ ہی قاضی القضاۃ تھے' مقدمات آپ ہی کے پاس جاتے تھے اور آپؐ ہی ان کے فیصلے کرتے تھے۔ لیکن آپؐ کی وفات کے بعد اب یہ معاملہ اس انداز میں موجود نہیں کہ میرا اور آپ کا کوئی جھگڑا ہو اور میں اُسے حضور ﷺ کی عدالت میں لے جاؤں۔یہ سلسلہ اب منقطع ہو چکا ہے۔

252

(۴) غلبۂ دین کی جدّوجُہد میں آپؐ کا حکم بجالانا: اسی طرح کا معاملہ دین کو غالب کرنے کی جدّوجُہد میں آپؐ کے حکم کو بجا لانے کا ہے --- دین اسلام کو پورے عالم پر غالب کرنے کے لیے حضور ﷺ بھیجے گئے تھے: {هُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّهٖ ؕ}(الفتح:۲۸)''وہی تو ہے (اللہ) جس نے اپنے رسول کو ہدایت کاملہ اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اس کو پورے نظامِ زندگی پر غالب کرے''---یہ مقصدِ بعثت محمدیؐ ہے اور اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے آپؐ نے جنگیں بھی لڑیں اور مہمات بھی روانہ کیں۔چونکہ اُس وقت آپ ہی سپہ سالار تھے' لہٰذا آپؐ اپنے صحابہؓ کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے اور جہاد کے لیے نکلنے کا بھی خود حکم دیتے تھے اور جنگی حکمت عملی کے بارے میں ہدایات بھی خود ارشاد فرماتے تھے۔

غور کیجیے کہ دین الٰہی کو غالب کرنے کی یہ جدّوجُہد قانوناً شریعت کا مسئلہ نہیں ہے' لیکن یہ جدّوجُہد --- جس میں اُحد اور حنین کے معرکے بھی آئے' جس میں حضور اکرم ﷺ کے دندانِ مبارک بھی شہید ہوئے' جس میں حضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے دوران سینکڑوں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے جامِ شہادت بھی نوش

فرمایا --- اس میں حضور ﷺ کا ہر حکم صحابہ کرامؓ کے لیے واجب الاطاعت تھا۔ اگر رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ نکلو اللہ کی راہ میں اور کسی نے اس حکم کو نہیں مانا تو اُس نے اللہ کے رسول کے حکم کی خلاف ورزی کی۔ لیکن اطاعت کا یہ معاملہ حضور اکرم ﷺ کی زندگی کے ساتھ تھا' جبکہ آج حضور ﷺ بنفسِ نفیس ہم میں موجود نہیں ہیں۔ لہٰذا آج کے دور میں اگر دین کو غالب کرنے کی جدّوجُہد ہو گی تو اس میں اطاعت کس کی ہو گی؟

بہرحال وفات النبی ﷺ کے بعد دو معاملات میں ہمارے اور اللہ کے رسول ﷺ کے مابین ایک خلا پیدا ہو گیا ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ آپؐ کے وصال کے بعد عدالتی نظام کون سا ہو گا اور ہمارے تنازعات میں حَکَم کون بنے گا؟ اس لیے کہ حضور ﷺ بنفسِ نفیس تو ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں کہ ہم اپنے مقدمات ان کی عدالت میں لے جائیں اور ان کو حَکَم بنائیں۔ دوسری بات یہ کہ دینِ الٰہی کو غالب کرنے کی جدّوجُہد کس کی امارت اور قیادت

میں ہو گی اور اگر کسی موقع پر جنگ کا مرحلہ پیش آ گیا تو کون سپہ سالار بن کر حکم دے گا کہ آگے بڑھ کر حملہ کرو! کون حکم دے گا کہ پچاس تیر انداز اس دَرّے پر بیٹھے رہیں! اُس وقت تو یہ سارے احکام براہِ راست محمد رسول اللہ ﷺ کی زبانِ مبارک سے صادر ہو رہے تھے' لیکن آج کے دور میں ظاہری بات ہے کہ اس اعتبار سے بھی ایک خلا ہے۔

اطاعتِ رسولؐ کے ضمن میں نظامِ خلافت کی اہمیت

سورۃ النور کی اگلی آیت (۵۶) میں جو مضمون آ رہا ہے وہ دراصل اسی خلا کو پُر کرنے والا ہے ----- یہ خلا نظامِ خلافت کے ذریعے سے پُر ہو گا۔ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ منصب خلافت پر فائز ہوئے تو آپؓ ہی قاضی القضاۃ تھے اور آپؓ ہی امیر اور سپہ سالار تھے۔ آپ ہی نے فیصلہ کرنا تھا کہ مانعینِ زکوٰۃ سے جنگ کرنی ہے یا نہیں؟ حضور ﷺ کے وصال کے بعد اب فیصلہ کرنے کا اختیار خلیفہ کے پاس آ گیا۔ اسی لیے تو حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا تھا: اَنَا خَلِیْفَۃُ رَسُوْلِ اللّٰہِ ''میں اللہ کے رسول کا خلیفہ ہوں!''

آپ کے علم میں ہو گا --- اس لیے کہ سیرتِ صحابہؓ کی یہ باتیں بہت معروف ہیں --- کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بھی یہ مشورہ دے رہے تھے کہ مانعینِ زکوٰۃ کے معاملے میں آپ ذرا نرمی کیجیے اور مصلحت کو پیش نظر رکھیے' اس لیے کہ مسلمانوں کا مورال اِس وقت بہت گرا ہوا ہے۔ حضور ﷺ کے انتقال کے بعد سب کا دل پژمردہ ہے اور ہم اس وقت جنگ کا تصوّر بھی نہیں کر سکتے۔ جیسے کہ اُمّ ایمن رضی اللہ عنہا کے بارے میں آتا ہے کہ آپؓ بیٹھی رو رہی تھیں کہ حضرات ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما ان کے پاس پہنچے اور پوچھا: آپ کیوں رو رہی ہیں؟ انہوں نے کہا: میں اس لیے رو رہی ہوں کہ وہ ہدایت جو ہر آن محمد ﷺ پر چلی آ رہی تھی وہ ختم ہو گئی ہے اور وحی کا دروازہ بند ہو گیا ہے۔ اس لیے کہ وحی تو نبی کے ساتھ خاص ہے اور نبوت کا دروازہ بند ہونے سے وحی کا دروازہ بھی

ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ اس اعتبار سے مسلمانوں کے دل بہت زخمی تھے۔

اس کے ساتھ دوسرا مسئلہ جیش ِاسامہؓ کی روانگی کا تھا ‘جسے حضور ﷺ نے خود تیار کیا تھا۔ وہ تو آپ ﷺ کے مرضِ وفات کی وجہ سے رک گیا تھا‘ ورنہ سلطنت ِروما کے ساتھ

جنگ کا معاملہ حضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں شروع ہو چکا تھا۔ غزوۂ موتہ اور غزوۂ تبوک ہو چکے تھے اور اگلا جیش آپؐ نے حضرت اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کی قیادت میں تیار کیا ہوا تھا تو کیسے ممکن تھا کہ جو جیش حضور ﷺ نے خود تیار کیا ہو اسے حضرت ابوبکرؓ روک لیں! وہ تو جائے گا ہی ۔مزید برآں نئی نبوت کے مدعی کھڑے ہو گئے اور ان ''مرتدین'' کے خلاف بھی جہاد کرنا لازم ہو گیا۔

ان میں سب سے اہم اور نازک معاملہ مانعین ِزکوٰۃ کا تھا جو کہتے تھے کہ ہم اللہ کی وحدانیت کی شہادت بھی دیتے ہیں اور محمد ﷺ کی رسالت کو بھی مانتے ہیں۔ ہم نماز بھی پڑھیں گے‘ لیکن زکوٰۃ حکومت کو نہیں دیں گے بلکہ ہم اپنے طور پر دیں گے۔ ایسے لوگوں کے خلاف جہاد کیا جائے یا نہ کیا جائے؟ یہ ایک بڑا پیچیدہ مسئلہ تھا۔ ان کے خلاف اقدام کا فیصلہ خلیفہ وقت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کیا اور یہاں تک فرمایا کہ اگر کوئی میرے ساتھ نہیں جائے گا تو میں تنہا جاؤں گا اور ان کے خلاف جہاد کروں گا۔ اس طرح کے تمام فیصلے خلیفۃ المسلمین حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کیے اور اس طریقے سے اب گاڑی آگے چلی۔

معلوم ہوا کہ اگر کسی ملک میں نظامِ خلافت نہیں ہے تو اطاعت ِرسول کے یہ دو دائرے تو بالکل معطل ہو جائیں گے۔ ٹھیک ہے آپ نماز اسی طور سے پڑھ سکتے ہیں جیسا کہ ہمیں نبی اکرم ﷺ نے سکھائی‘ آپ حج بھی اسی طرح کر سکتے ہیں جیسے ہمیں حضور ﷺ نے سکھایا --- جزئیات میں اختلاف بھی ہو سکتا ہے ‘جیسے کہ مختلف ائمہ فقہ کے مابین ہوا ہے‘ لیکن اصولی طور پر مناسک ِحج متفق علیہ ہیں --- چنانچہ عبادات کے ضمن میں اطاعت کا پہلا دائرہ ہر زمانے کے لیے جوں کا توں ہے۔ اسی طرح اطاعت کا دوسرا دائرہ شریعت کے وہ احکام ہیں جو رسول اللہ ﷺ نے کتاب و سُنّت کی صورت میں ہم تک پہنچائے ہیں‘ وہ بھی جوں کے توں رہیں گے۔ اگر کوئی نئی صورت پیدا ہو گی تو کتاب و سُنّت ہی سے استنباط کرتے ہوئے اجتہاد کیا جائے گا‘ جبکہ ان سے آزاد ہو کر کیا گیا استنباط بھی قابل قبول نہیں ہے --- ہمارے ہاں ایک گروہ ''اہل ِقرآن'' کا ہے جو سُنّت کو ایک طرف رکھ کے کہتے ہیں کہ قرآن سے استنباط کریں۔ ہمارے نزدیک وہ گمراہ ہیں‘ اس لیے کہ

کتاب و سُنّت دونو قانونِ اسلامی کی مستقل بالذات بنیادیں اور اصل اساسات ہیں ‘ لہٰذا ان میں سے کسی کو بھی ساقط نہیں کیا جا سکتا۔ قیاس اور اجتہاد ہو گا تو کتاب و سُنّت کی روشنی میں ہو گا ---بہرحال ان دو دائرو ں کی حیثیت

جیسے حضور ﷺ کے حیاتِ طیبہ میں تھی ویسی ہی اب ہے۔

ان کے علاوہ اطاعت رسول کے دو دائرے اور ہیں ۔ایک تو ہے اپنے خصومات اور مقدمات میں آپ ﷺ سے فیصلہ کرانا۔نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں تو اس پر عمل درآمد ممکن تھا‘مگر آپؐ کی وفات کے بعد اس حوالے سے ایک خلاپیدا ہوگیا ہے اور اس خلا کو خلافت کا نظام پر کرے گا اور خلیفہ ہی قاضی القضاۃ کے منصب پر فائز ہوگا۔ اسی طرح دین کے غلبے کی جدّوجُہداور اس کے لیے محنت و کوشش کرنا‘حضور ﷺ کی حیات میں تو آپ کی قیادت میں ہورہا تھا‘مگر آپؐ کی وفات کے بعد نظامِ خلافت میں خلیفہ یہ ذِمّہ داری نبھائے گا ۔

اس ضمن میں یہ بھی نوٹ کرلیجیے کہ اگر خلافت کا نظام موجود نہیں ہے تو آپ کو یہ نظام لانے کے لیے جدّوجُہد کرنی پڑے گی ۔ اگر آپ اس کے لیے جدّوجُہد نہیں کرتے اور خلافت کا نظام قائم نہیں ہوتا تو گویا اطاعت ِرسول کے دو خانے بند پڑے رہیں گے۔

چاک کر دی ترکِ ناداں نے خلافت کی قبا

یہ ہماری بہت بڑی بد قسمتی ہے کہ اس دور میں خلافت کا ادارہ علامتی طور پر بھی موجود نہیں رہا۔ آئیڈیل سطح پر تو خلافت راشدہ کا دور تھا‘ جو خلافت علیٰ منہاج النبوۃ تھی۔ اس کے بعد کا دورِ خلافت ملوکیت پر مبنی تھا۔ نظامِ خلافت یک دم سارے کا سارا ختم نہیں ہو گیا تھا‘ بلکہ تدریجاً اس میں زوال آیا ہے۔ میں اس کی مثال وہی دیا کرتا ہوں جو شاہ اسمٰعیل شہیدؒ نے ’’منصب ِامامت‘‘ نامی کتاب میں لکھی ہے کہ چھ منزلہ عمارت میں سے اگر ایک منزل گر گئی تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ پوری عمارت ختم ہو گئی۔ ہمارے ہاں یہ پروپیگنڈا کیا گیا کہ جیسے خلافت راشدہ کے بعد اسلام بالکل ختم ہو گیا ‘ حالانکہ اسلام ختم تو نہیں ہوا۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ چھ منزلوں میں سے ایک گر گئی‘لیکن پانچ تو بہرحال باقی ہیں۔ پھر آگے اور زوال آیا تو پانچویں منزل بھی گر گئی‘ چار رہ گئیں۔ ہوتے ہوتے معاملہ یہاں تک پہنچا کہ

جب مغربی امپیریلزم کا سیلاب آیا تو وہ ساری مسلمان حکومتوں کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے گیا۔ اس سے تو سب کچھ ختم ہو گیا‘ نہ اسلامی قانون رہا‘نہ مفتی رہے‘ نہ قاضی رہے۔ جہاں جہاں بھی انگریزوں‘ فرانسیسیوں‘ اطالویوں اور ولندیزیوں کی حکومتیں آئیں وہاں خلافت کا پورے کا پورا نظام ختم ہو گیا۔ بالآخر خلافت کا ادارہ جو ترکی میں‘ کم از کم علامتی طور پر (symbolic)ہی سہی‘موجود تھا وہ بھی بد قسمتی سے ۱۹۲۴ء میں مصطفیٰ کمال پاشا نے ختم کر دیا۔ علامہ اقبال کو ابتدا میں مصطفیٰ کمال سے بڑی امیدیں تھیں‘ لیکن آخر وقت میں انہیں بڑی مایوسی ہوئی اور انہوں نے یہ اشعار کہے: ؎

نہ مصطفیٰ نہ رضا شاہ میں نمود اس کی
کہ روحِ شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی !

اور خاص طور پر خلافت کے ادارے کو ختم کرنے پر ان کا یہ شعر بڑا ہی درد انگیز ہے ؎
چاک کر دی ترکِ ناداں نے خلافت کی قبا
سادگی اپنوں کی دیکھ ' اوروں کی عیاری بھی دیکھ !

اس لیے کہ بعد میں یہ بات کھل گئی کہ یہ یہود کی فری میسن تحریک کی سازش تھی اور مصطفیٰ کمال پاشا نے ان کا آلہ کار بن کر خلافت کو ختم کیا۔ ہم یہ وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ شعوری طور پر مصطفیٰ کمال پاشا یہودیوں کی اس سازش کو جانتے تھے ۔یہ تو اللہ کے ہاں جواب طلبی ہوگی اور وہیں سارا حساب کتاب ہو جائے گا۔

بہرحال میں یہ عرض کر رہا تھا کہ آیت زیر مطالعہ کے حوالے سے سب سے پہلی بات سمجھنے کی یہ ہے کہ آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے دوران چار اعتبارات سے آپؐ کی اطاعت ہو رہی تھی۔ خلافت کا نظام رہے یا نہ رہے ' دو اطاعتیں تو اب بھی ہو سکتی ہیں ' لیکن بقیہ دو اطاعتیں تو ممکن ہی نہیں جب تک کہ خلافت کا نظام قائم نہ ہو۔

اطاعت ِرسولؐ سے روگردانی کا نتیجہ

آیت زیر مطالعہ کا اگلا ٹکڑا اطاعت ِرسولؐ سے روگردانی اور اس کے نتیجے سے متعلق ہے۔ فرمایا: {فَاِنۡ تَوَلَّوۡا}''پس اگر یہ لوگ روگردانی کریں '' یعنی اطاعت کرنے کو تیار

نہ ہوں۔{فَاِنَّمَا عَلَیۡہِ مَا حُمِّلَ وَ عَلَیۡکُمۡ مَّا حُمِّلۡتُمۡ ؕ}--یہ بہت جامع الفاظ ہیں۔ حمل کہتے ہیں بوجھ کو۔ حَمَلَ کا معنی ہے: اس نے بوجھ اٹھایا۔ قرآن مجید میں الفاظ آئے ہیں :{حَمَلَتۡہُ اُمُّہٗ وَہۡنًا عَلٰی وَہۡنٍ}(لقمٰن:۱۴) ''اُسے اُس کی ماں نے تکلیف پر تکلیف سہہ کر (پیٹ میں) اُٹھائے رکھا ''۔لیکن یہ لفظ جب باب تفعیل (تحمیل) اور پھر اس میں بھی مجہول (حُمِّلَ) کے صیغے میں آئے گا تو اس کے معنی ہوں گے: کسی پر بوجھ لاد دیا گیا ۔

اس آیت میں اس لفظ سے ذِمّہ داری کا بوجھ مراد ہے ' جبکہ ایک جسمانی بوجھ ہوتا ہے ' مثلاً آپ نے دو من کی بوری اٹھا لی یا کسی نے آپ کے کندھے پر یہ بوری رکھ دی۔ یہ ہے حملکہ دو من کا بوجھ آپ کے اوپر رکھ دیا گیا۔ایک ہے ذِمّہ داریوں اور فرائض کا بوجھ ' جیسے زیر مطالعہ آیت میں فرمایا: {فَاِنَّمَا عَلَیۡہِ مَا حُمِّلَ وَ عَلَیۡکُمۡ مَّا حُمِّلۡتُمۡ ؕ} اے مسلمانو ! اگر تم روگردانی کرو گے تو یاد رکھو کہ ہمارے پیغمبر ﷺ پر صرف وہی ذِمّہ داری ہے جو ان پر ڈالی گئی ہے

اور تم پر وہ ذِمّہ داری ہے جو تم پر ڈالی گئی ہے۔ اگر انہوں نے اپنی ذِمّہ داری ادا کر دی تو وہ بری ہو گئے‘ مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ تم بھی بری ہو گئے‘ بلکہ تم سے تمہاری ذِمّہ داریوں کے متعلق پوچھا جائے گا کہ تم نے وہ پوری کیں یا نہیں؟

آپ میں سے بہت سے حضرات کے علم میں ہوگا کہ سورۃ البقرۃ کے سولہویں رکوع میں دو مرتبہ یہ آیت (۱۳۴ اور ۱۴۱) آئی ہے: {تِلۡکَ اُمَّۃٌ قَدۡ خَلَتۡ ۚ لَہَا مَا کَسَبَتۡ وَ لَکُمۡ مَّا کَسَبۡتُمۡ ۚ وَ لَا تُسۡـَٔلُوۡنَ عَمَّا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۳۴﴾} ’’یہ ایک جماعت تھی جو گزر گئی (یعنی حضرات ابراہیم‘ اسماعیل‘ اسحاق اور یعقوب علیہم السلام ‘جو ہمارے برگزیدہ بندے تھے‘ وہ چلے گئے اور) جو کچھ انہوں نے کمایا وہ ان کے لیے ہے اور تمہارے لیے وہ ہو گا جو تم کماؤ گے۔ اور تم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ وہ کیا کرتے رہے تھے ‘‘۔یعنی تم صرف ان سے تعلق رکھنے کی وجہ سے نہیں بخش دیے جاؤ گے بلکہ تمہیں اپنا حساب لازماً پیش کرنا ہو گا کہ تم کیا کر کے لائے ہو ع ’’پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے!‘‘

رسول اللہ ﷺ کی ذِمّہ داریاں

آیت کے اس ٹکڑے کے ضمن میں اس کا بھی تجزیہ کر لیتے ہیں کہ رسول کی ذِمّہ داری کیا ہے؟ اس کو دو مرحلوں میں سمجھ لیں۔ ایک ہے رسول اللہ ﷺ کی بنیادی ذِمّہ داری اور وہ ہے اللہ کے پیغام کو لوگوں تک پہنچانا---رسول کے معنی ہیں: فرستادہ‘ ایلچی‘ پیغامبر۔ عام طور پر ہم ’’پیغامبر‘‘ کا لفظ ہر پیغام پہنچانے والے کے لیے استعمال کرتے ہیں‘ اور اگر اس میں سے الف نکال دیا جائے ’’پیغمبر‘‘ تو یہ لفظ اللہ کا پیغام پہنچانے والے کے لیے خاص ہو جاتا ہے۔ ویسے ’’رسول‘‘ کا لفظ عام ایلچی کے معنی میں بھی آیا ہے۔ جب حضور ﷺ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ اے عمر! تم مدینہ کی خواتین سے جا کر میری طرف سے بیعت لو تو حضرت عمرؓ خواتین کے اجتماع میں گئے اور وہاں جا کر فرمایا: اَنَا رَسُوْلُ رَسُوْلِ اللّٰہِ ’’میں اللہ کے رسول کا رسول ہوں‘‘ یعنی میں اللہ کے رسول کا بھیجا ہوا ہوں۔

رسول کی بنیادی ذِمّہ داری صرف پہنچا دینا ہے۔ چنانچہ یہ آیت ان الفاظ پر ختم ہوتی ہے: {وَمَا عَلَی الرَّسُوۡلِ اِلَّا الۡبَلٰغُ الۡمُبِیۡنُ ﴿۵۴﴾} ’’نہیں ہے ہمارے رسول پر مگر صاف صاف پہنچا دینے کی ذِمّہ داری‘‘۔ اس سے تو یہ مفہوم نکلتا ہے کہ اس کے سوا رسول کی اور کوئی ذِمّہ داری نہیں ہے! یہ بات ذرا غور طلب ہے۔ ہمارے ہاں اکثر عالم دین‘ واعظ اور خطباء اپنی تقریر کے اخیر میں کہہ دیتے ہیں: وَمَا عَلَیْنَا اِلَّا الْبَلَاغُ کہ ہمارے ذِمّہ تو صرف پہنچا دینا ہے! چنانچہ یہ الفاظ تو اکثر و بیشتر سب لوگوں کو یاد ہوں گے اور یہ مضمون قرآن مجید میں بھی متعدد بار

آیا ہے، لیکن کیا اسی عموم میں اس کے معنی کو لیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ حالانکہ قرآن مجید میں رسول اللہ ﷺ کی اور ذِمّہ داریاں بھی بیان ہوئی ہیں۔ مثلاً فرمایا گیا ہے:{فَقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ۚ لَا تُکَلَّفُ اِلَّا نَفْسَکَ وَ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِیْنَ ۚ} (النساء:۴۸)''(اے نبی ﷺ !)آپ اللہ کی راہ میں قتال کیجیے، آپ اپنے سوا کسی کے ذِمّہ دار نہیں ہیں،اور مسلمانوں کو بھی (قتال کی) ترغیب دیجیے!'' یعنی اگر کوئی آپ کے ساتھ نہیں جاتا تب بھی آپ کو تو اللہ کی راہ میں جنگ کرنے کے لیے جانا ہی ہے۔ وہی بات جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمائی تھی کہ اگر کوئی مانعینِ زکوٰۃ کے خلاف

جنگ کے لیے نہیں جائے گا تو میں تنہا چلا جاؤں گا۔

اسی طرح آپ ﷺ سے فرمایا گیا:{یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَ الْمُنٰفِقِیْنَ وَ اغْلُظْ عَلَیْهِمْ ؕ}(التوبۃ:۷۳)''اے نبی(ﷺ) ! جہاد کیجیے ان کافروں اور منافقوں سے اور ان پر سختی کیجیے''۔تو کیا یہ حضور ﷺ کی ذِمّہ داری نہیں ہے؟مزید برآں فرمایا گیا:{لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ بَعَثَ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ...}''اللہ نے مؤمنوں پر بڑا احسان کیا ہے کہ ان میں ان ہی میں سے ایک پیغمبر بھیجا جو ان کو اللہ کی آیات پڑھ پڑھ کر سناتا ہے''۔ کتاب اور آیات پڑھ کر سنانے سے ابلاغ اور تبلیغ کا حق تو ادا ہو گیا، لیکن ساتھ یہ بھی فرمادیا:{وَ یُزَكِّیْهِمْ وَ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ ۚ} (آلِ عمران:۱۶۴)''اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے''۔ کیا یہ رسول اللہ ﷺ کی ذِمّہ داری نہیں ہے؟ --- میں یہ سوالیہ انداز اس لیے اختیار کر رہا ہوں کہ سوال سے انسان کا ذہن بیدار ہو کر اُس کی طرف متوجّہ ہوجاتا ہے اور کچھ غوروفکر شروع کردیتا ہے۔اس صورتِ حال میں جب بات سامنے آتی ہے تو اس کے لیے ذہن گویا آمادہ ہو چکا ہوتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی ذِمّہ داریوں کو یوں سمجھئے کہ ایک ہے رسول کی بنیادی ذِمّہ داری اور وہ ہے :اللہ کا پیغام پہنچادینا۔ ''بنیادی'' سے مراد یہ ہے کہ جس نے اللہ کے پیغام کو نہیں مانا تو اس کی حد تک آپؐ کی ذِمّہ داری یہی تھی۔ مثلاً ابوجہل اور ابولہب تک پیغام پہنچا دیا، انہوں نے نہیں مانا تو اُن کے حوالے سے آپ کی ذِمّہ داری پوری ہوگئی اور آپ بریٔ الذمّہ ہوگئے۔ یہ آپؐ کی ذِمّہ داری نہیں ہے کہ زبردستی ان کو دین کے اوپر لے آئیں، ازروئے الفاظِ قرآنی:{لَسْتَ عَلَیْهِمْ بِمُصَۜیْطِرٍ ﴿۲۲﴾}(الغاشیۃ)''(اے نبی ﷺ !) آپ ان پر داروغہ نہیں ہیں''--- بہرحال جو نہیں مانتے ان کی حد تک آپؐ کی ذِمّہ داری بات پہنچانے سے ختم ہوگئی، البتہ جو مان لیں ان کے حق میں تو ذِمّہ داریوں کا گویا ایک نیا باب کھل گیا۔ اب ان کا تزکیہ بھی کرنا ہے، ان کی تربیت بھی کرنی ہے، انہیں تعلیم بھی دینی ہے، کتاب و حکمت بھی سمجھانی ہے، انہیں منظم کرکے ایک قوت بھی بنانا ہے اور پھر اس قوت کو

باطل سے ٹکرا کر باطل کا سر کچلنا ہے۔ جیسے قرآن میں ارشادِ ربانی ہے: {بَلۡ نَقۡذِفُ بِالۡحَقِّ عَلَى الۡبَاطِلِ فَيَدۡمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ‌ؕ}(الانبیاء:۱۸) ''بلکہ ہم حق کی ضرب لگاتے ہیں باطل کے اوپر جو اس کا بھیجا نکال دیتا ہے اور وہ اُسی وقت نابود ہوجاتا ہے!''

جو لوگ آپؐ کی دعوت پر ایمان لے آئیں تو اب آپؐ کے ذمے ہیں کہ انہیں جمع کریں' حزب اللہ بنائیں' ان کی تربیت کریں' ان کے دلوں میں باہمی محبت پیدا کریں' ایک دوسرے کے لیے ایثار و قربانی کا جذبہ پیدا کریں۔ تبھی تو یہ حزب اللہ یعنی اللہ کی جماعت بنیں گے۔ پھر انہیں منظم کریں' سمع و طاعت کا نظام سکھائیں' بایں طور کہ یہ ایک امیر کا حکم مان کر پیش قدمی کرنے کے لیے تیار رہیں اور جب امیر کا حکم مل جائے کہ رک جاؤ تو یہ وہیں رک جائیں۔ یہ سارے کام ہی درحقیقت رسول اللہ ﷺ کی ذمہ داری ہیں' مگر اُن لوگوں کے ضمن میں جنہوں نے آپؐ کی دعوت پر لبیک کہا۔

قرآن میں تکرارِ محض نہیں ہے

جیسا کہ مَیں نے عرض کیا' اطاعتِ رسول کے ضمن میں حضور ﷺ کے انتقال کے بعد دو اعتبارات سے جو ایک خلا پیدا ہوا ہے اس کو پر کرنے کے لیے خلافت کا نظام ضروری ہے۔ اسی لیے میں نے کہا تھا کہ یہ آیت' اگلی آیت (جس کو آیت استخلاف کہا جاتا ہے) کے لیے تمہید بن کر آ رہی ہے' ورنہ اطاعتِ خداوندی اور اطاعتِ رسول کا حکم تو قرآن مجید میں بہت مرتبہ آیا ہے۔

یہاں یہ بھی ملحوظ رہے کہ قرآن مجید میں تکرارِ محض نہیں ہے' اس لیے کہ تکرار محض تو کلام کا عیب ہوتا ہے کہ ایک ہی بات کو بار بار دہرایا جائے۔ اگر کوئی مصنف' ادیب یا واعظ ایک ہی بات کو بار بار دہرائے گا تو آپ اُسے بُرا سمجھیں گے اور یہ آپ کی طبیعت پر بوجھ پیدا کرے گی۔ قرآن مجید میں اگرچہ تکرار(repetition) ہے' لیکن وہ تکرار محض نہیں ہے کہ عیب محسوس ہو' بلکہ ہر جگہ یہ تکرار ایک نئے معانی لے کر آتی ہے۔ الفاظ بظاہر وہی ہیں' لیکن تصوّر (concept) کچھ اور ہے' سیاق و سباق اور ہے' گفتگو کچھ اور ہو رہی ہے۔ اس طرح ہر جگہ ایک نئی شان ہے۔ جیسے ذاتِ باری تعالیٰ کے لیے فرمایا گیا: {كُلَّ يَوۡمٍ هُوَ فِىۡ

شَاۡنٍ ﴿۲۹﴾} (الرحمٰن) ''ہر روز وہ ایک شان میں ہے''۔ جیسے اللہ کی شان ہے اسی طرح اللہ کی کتاب کی شان ہے کہ اس میں جو چیزیں بظاہر مکرر نظر آتی ہیں وہ تکرارِ محض نہیں ہیں' بلکہ سیاق و سباق کے اعتبار سے ان کے اندر نئے نئے مفہوم اور نئے نئے معانی پنہاں ہیں۔

اس کو ایک مثال سے یوں سمجھئے جیسے اپنی جگہ پر رکھے ہوئے موتی بہت خوبصورت نظر آتے ہیں اور اگر آپ نے ان موتیوں کو ایک نظم میں پرو کر ہار بنا لیا تو ان کے اندر حسن کا ایک اور رنگ پیدا ہو گیا۔ پھر آپ نے

ان کو کسی اور ترتیب میں جوڑ دیا تو ان میں اور ہی خوبصورتی اور رعنائی پیدا ہو جائے گی۔ اسی طرح قرآن مجید میں جو آیات باربار آتی ہیں ان میں بظاہر مضمون وہی ہوتا ہے ‘لیکن درحقیقت نظم اور سیاق و سباق کے اعتبار سے وہ بالکل نئے معانی کے ساتھ آتی ہیں۔

آیت استخلاف : قرآن کی عظیم آیت

سورۃ النور کی آیت ۵۴ کے مطالعہ کے بعد اب ہم اگلی آیت کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اس آیت کو ’’آیت لِیَستخلاف‘‘ کہا جاتا ہے ‘اس لیے کہ اس میں خلافت کا ذکر ہے۔ فرمایا: {وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡکُمۡ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسۡتَخۡلِفَنَّہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ کَمَا اسۡتَخۡلَفَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ } ’’(اے مسلمانو!) اللہ کا وعدہ ہے تم میں سے اُن لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور عمل صالح کا حق ادا کریں کہ وہ ان کو لازماً زمین میں خلافت (غلبہ) عطا کرے گا جیسے کہ اس نے ان سے پہلے والوں کو خلافت عطا کی تھی ‘‘-------یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس آیت میں ’’مِنۡکُمۡ‘‘ (تبعیضیہ) کیوں آیا ہے ؟کہ جو تم میں سے واقعی صاحب ایمان ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس معاشرے میں ایسے لوگ بھی تھے جو کہنے کو مسلمان تھے ‘لیکن حقیقت میں منافق تھے۔ عبداللہ بن اُبی بھی اُسی معاشرے کا ایک فرد تھا ‘جو انصار کے ایک بڑے قبیلے خزرج کا سردار تھا‘ لیکن پکا منافق تھا۔ حضور ﷺ غزوۂ اُحد کے لیے ایک ہزار کا لشکر لے کر مدینہ سے روانہ ہوئے‘ لیکن تین سو لوگ آپ ﷺ کا ساتھ چھوڑ کر اسی عبداللہ بن اُبی کے ساتھ واپس آ گئے۔ نبی کی زندگی میں نبی کا ساتھ چھوڑ دینے والوں کے بارے میں آپ کیا رائے قائم کریں

گے؟ اسی لیے فرمایا کہ اللہ کا وعدہ تم میں سے اُن کے ساتھ ہے جو واقعی مؤمن ہیں۔

اس پر مزید اضافہ یہ ہے کہ محض ایمان کافی نہیں بلکہ عمل صالح بھی ضروری ہے۔ اور یہاں عمل صالح سے مراد صرف نماز‘ روزہ‘ حج‘ زکوٰۃ نہیں ‘بلکہ اس سے مراد ہے: دین کو غالب کرنے کی جدّوجُہد‘ محنت‘ قربانیاں اور اللہ کے رسول کی پکار پر لبیک کہنا جب بھی پکارا جائے۔ اگر یہ سب نہیں ہے تو پھر عمل صالح بھی نہیں ہے‘ اس لیے کہ مدینہ کے منافقین بھی نمازیں پڑھتے تھے‘ بلکہ صف ِاولیٰ اور تکبیر ِتحریمہ کا خصوصی اہتمام کرتے تھے‘ جبکہ عبداللہ بن اُبی کے بارے میں تو آتا ہے کہ اپنی چودھراہٹ جتانے کے لیے وہ یہ طریقہ اختیار کرتا تھا کہ حضور ﷺ جب خطبہ کے لیے اٹھتے تھے تو پہلے خود آگے بڑھ کر کھڑا ہوتا اور کہتا: مسلمانو! یہ اللہ کے رسول ہیں‘ ان کی بات کو غور سے سنو اور اس پر عمل کرو! اس سے اس کا مقصد تبلیغ اور تلقین نہیں بلکہ اپنی چودھراہٹ ظاہر کرنا تھا۔ ایسے منافقین کے بارے میں ہی فرمایا گیا: {اِذَا جَآءَکَ الۡمُنٰفِقُوۡنَ قَالُوۡا نَشۡہَدُ اِنَّکَ لَرَسُوۡلُ اللّٰہِ ۘ وَ اللّٰہُ یَعۡلَمُ اِنَّکَ لَرَسُوۡلُہٗ ؕ وَ اللّٰہُ یَشۡہَدُ اِنَّ الۡمُنٰفِقِیۡنَ لَکٰذِبُوۡنَ ۚ﴿۱﴾} (المنٰفقون) ’’(اے محمد ﷺ!) جب یہ منافق آپ کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپؐ یقیناً اللہ کے رسول ہیں ۔اور اللہ سے بڑھ کر کس کو معلوم ہو گا کہ آپ اللہ کے رسول

ہیں ! لیکن (اے نبی ﷺ !) اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق جھوٹے ہیں۔‘‘

اس ضمن میں سمجھ لیجیے کہ اللہ کا وعدہ ان لوگوں سے ہے جو حقیقتاً مؤمن ہیں اور عمل صالح کی روش اختیار کیے ہوئے ہیں۔پھر عمل صالح میں نماز بھی ہے اور اس میں رسول ﷺ کی مکمل اطاعت بھی ہے۔اگر اللہ کے رسول پکار رہے ہیں کہ اللہ کی راہ میں نکلو‘ تو اگر ان کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے نکلو گے تو عمل صالح ہو گا‘اور نہیں نکلو گے تو تمہارے ایمان کی گویا نفی ہو گئی اور تم منافق قرار پاؤ گے۔ اس پورے پس منظر کو ذہن میں رکھیے‘ بلکہ یہاں نوٹ کرلیجیے کہ یہ سورۂ مبارکہ ۶ہجری میں نازل ہوئی ہے اورسورۃ الفتح بھی ۶ ہجری میں ہی نازل ہوئی ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ سورۃ الفتح کی آخری دو آیات میں بھی وہی مضمون ہے جو سورۃ النور کی ان دو آیات میں آیا ہے۔فرمایا:

{ہُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَہٗ بِالۡہُدٰی وَ دِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡہِرَہٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّہٖ ؕ وَ لَوۡ کَرِہَ الۡمُشۡرِکُوۡنَ ﴿۳۳﴾}

’’وہی تو ہے جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت ِکاملہ اور دین ِ حق دے کر بھیجا تاکہ اس کو پورے نظامِ زندگی پر غالب کرے ۔ اور اللہ کافی ہے بطور گواہ !‘‘

{مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰہِ ؕ وَ الَّذِیۡنَ مَعَہٗۤ... وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنۡہُمۡ مَّغۡفِرَۃً وَّ اَجۡرًا عَظِیۡمًا ﴿۲۹﴾}

’’محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں۔ اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں... ان میں جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے تو ان سے اللہ نے گناہوں کی بخشش اور اجر عظیم کا وعدہ کیا ہے۔‘‘

نوٹ کیجیے کہ وہی الفاظ ہیں ‘بس فرق صرف ضمیر کا ہے‘ وہاں مِنۡہُمۡ ہے‘ جبکہ یہاں مِنۡکُمۡ ہے۔دوسرا فرق یہ ہے کہ وہاں مغرت اور اجر عظیم کا وعدہ ہے جس کا تعلق آخرت سے ہے‘ جبکہ یہاں دنیا کا وعدہ ہے کہ لازماً انہیں زمین میں خلافت (غلبہ) عطاکی جائے گی۔

آج کے مسلمان ایما ِتحقیقی سے خالی !

قبل ازیں یہ بات بڑی تفصیل سےبیان کی جاچکی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے دوران چار اعتبار سے آپؐ بنفس ِ نفیس مطاع تھے۔عبادات کے طور طریقے بھی آپؐ ہی سکھا رہے تھے‘احکامِ شریعت کی تنفیذ بھی آپؐ ہی کررہے تھے‘ مقدمات کے فیصلے بھی آپ ہی کر رہے تھے اور ڈگریاں بھی دے رہے تھے کہ یہ زمین کس کی ملکیت

ہے۔ جہاد اور غلبہ دین کی جدّوجُہد میں بھی آپؐ ہی امیر تھے‘ میدانِ جنگ میں بھی آپؐ ہی سپہ سالار تھے۔ لہٰذا چاروں اعتبار سے براہِ راست آپ کی اطاعت ہو رہی تھی‘لیکن آپؐ کی وفات کے بعد اب معاملہ یہ ہے کہ عبادات اور شریعت میں تو کتاب اللہ اور سُنّت رسول قائم مقام ہو گئے ‘ باقی رہ گئے فصل خصومات تو اس

پر عمل تب ہو گا جب کوئی عدالتی نظام ہو گا ۔ اسی طرح جہاد و قتال اور اللہ کے دین کے غلبے کی جدّوجُہد تب ہوگی جب خلافت قائم ہو گی ---- وہ خلافت جس کا آیت زیر مطالعہ میں وعدہ کیا گیا ہے ---- لیکن یہ وعدہ ان مسلمانوں سے ہے جو ایمانِ حقیقی کے حامل ہوںاور عمل صالح کی روش اختیار کیے ہوئے

ہوں۔نام کے مسلمانوں سے یہ وعدہ نہیں ہے۔ جیسے آج دنیا میں تقریباً سوا ارب مسلمان ہیں' لیکن خلافت نام کی کوئی شے موجود نہیں ہے۔یہی ایک بات ثابت کرتی ہے کہ ہم کون ہیں۔ ہمیں سوچنا چاہیے کہ کیا ہم اس آیت کے مصداق ہیں؟یقیناً اس کا جواب نفی میں ہے۔ اس لیے کہ اگر ہم اس آیت کے مصداق ہوتے تو آج خلافت موجود ہوتی' لیکن ۱۹۲۴ء کے بعد سے لے کر آج تک اس کا وجود ہی نہیں ہے' اس کا کہیں کوئی ذکر ہی نہیں ہے۔ حالانکہ اس سے پہلے خلافت کا ادارہ ------- برا بھلا جیسا بھی تھا'کمزور تھا' مردِبیمار تھا یا مردِ صحت مند تھا' بہرحال موجودتو تھا۔

اس کے بارے میں ایک واقعہ میں آپ کو سنا دوں۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ اسیر مالٹا جب قید میں تھے تو آپ نے اس جیل کے انگریز کمانڈنٹ سے ایک دفعہ فرمایا کہ آپ لوگ خلافت کے کیوں پیچھے پڑ گئے ہیں؟ -- - شیخ الہندؒ ۱۹۲۰ء میں رہا ہو کر واپس آئے تھے اور اسی سال ان کا انتقال بھی ہو گیا تھا۔ انگریز نے رہا بھی اسی لیے کیا تھا کہ ان کی ٹی بی آخری سٹیج کو پہنچ چکی تھی اور انگریزوں کو یقین تھا کہ اب ان کی زندگی کا چراغ گُل ہونے والا ہے اور اگر ہماری قید میں ان کا انتقال ہو گیا تو نمعلوم ہندوستان میں کیا شورش برپا ہو جائے'لہٰذا اس سے بہتر ہے کہ ان کو رہا کر دیا جائے --- بہرحال حضرت شیخ الہندؒ نے انگریز کمانڈنٹ سے کہا کہ آپ لوگ کیوں خلافت کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں ؟ وہ تو مردِبیمار ہے' بس نام کی خلافت ہے۔ آپ خواہ مخواہ اس کو ختم کرنے کے درپے ہیں ! - ---اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شیخ الہندؒ کو معلوم تھا کہ خلافت کو ختم کرنا انگریز کی سازش ہے 'ورنہ یہ بات اس انگریز سے کہنے کا کوئی مطلب نہیں --- اس انگریز کمانڈنٹ نے ہنس کر بڑا طنزیہ جواب دیا: مولانا ! آپ اتنے بھولے بننے کی کوشش نہ کریں۔ ہم بھی جانتے ہیں اور آپ بھی جانتے ہیں کہ اس گئی گزری حالت میں بھی اگر خلیفۃ المسلمین اعلانِ جہاد کر دے تو جاوا اور سماٹرا سے لے کر موریطانیہ تک لاکھوں مسلمان کفن باندھ کر نکل کھڑے ہوں گے۔ہمیں معلوم ہے کہ خلافت کی ایک علامت(symbol)بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے اور ہم اس علامت کو ختم کر کے جائیں گے۔ پھر انہوں نے اسے ختم کر کے دم لیا۔

بہرحال یہ نوٹ کرلیں کہ آج کا مسلمان اس آیت کا مصداق نہیں ہے‘اسی لیے آج کرۂ ارضی پر کہیں خلافت کا نشان تک نہیں ہے --- یہ وہی مضمون ہے جو سورۂ آل عمران میں بھی آیا ہے :{وَلَا تَہِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۱۳۹﴾} ’’(اے مسلمانو!)گھبرائو نہیں اور دل شکستہ مت ہو‘ اور تم ہی غالب رہو گے اگر تم (حقیقی)مؤمن ہو‘‘۔ حقیقی ایمان والوں کے غالب ہونے کا اللہ کا وعدہ ہے اور اگر مسلمان مغلوب ہیں‘ جیسے آج کل حالات ہیں تو سمجھ لیجیے کہ آج کے مسلمانوں میں حقیقی ایمان نہیں ہے۔ جو کچھ اہل اسلام کے ساتھ ہوا ہے وہ آپ کے علم میں ہے۔ عراق کا کس قدر بھرکس نکالا گیا ہے۔ دعوے تو یہ تھے کہ ہم مسئلہ حل کرائیں گے‘ امن کانفرنس ہوگی اور اسرائیل کو ۱۹۶۷ء کے مقبوضہ عرب علاقے واپس کرنے پڑیں گے۔ لیکن آپ نے دیکھ لیا کہ امن کانفرنس بھی ہو گئی اور وہ بدمعاشوں کی طرح کہتا ہوا گیا کہ ایک انچ زمین بھی نہیں چھوڑیں گے۔ کسی عرب ملک کے اندر اتنا دم خم نہیں ہے کہ وہ پوچھ بھی سکے کہ جناب آپ کے وعدوں کا کیا ہوا؟عرب ممالک میں سے عراق واحد ملک تھا جو کچھ آنکھیں دکھانے کے قابل تھا۔ اسرائیل کے پاس تو سینکڑوں ایٹم بم ہیں ‘جبکہ عراق تو ابھی صرف ایٹم بم بنانے کی صلاحیت(capibality)رکھتا تھا ‘ لیکن پھر بھی وہ ان کی آنکھوں میں کھٹک رہا تھا۔

اس سارے کھیل میں صدام حسین بھی بہت بڑا احمق ثابت ہوااور امیر کویت بھی۔ دونوں کو امریکہ نے دام میں پھنسایا ہے۔ ایک طرف کویت کی پیٹھ ٹھونکی کہ ان کا تیل کھینچ لو اور ایران کے خلاف جنگ میں جو پیسے تم نے صدام کو دیے تھے وہ ان سے سود سمیت واپس مانگو۔ دوسری طرف امریکی سفارت کار نے صدام حسین سے جا کر صاف کہا کہ جناب یہ آپ کا سرحدی معاملہ ہے ‘آپ جیسے چاہیں حل کریں‘ہم درمیان میں نہیں آئیں گے۔ چنانچہ صدام نے کویت پر فوج کشی کر کے اس پر قبضہ کر لیا۔ دونوں مسلمان احمق اس جال میں پھنس گئے اور اس سے کس قدر شدید نقصان ہوا۔ تین لاکھ عراقی مارے گئے اور اس سے بھی بڑا نقصان یہ ہوا کہ کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ اگر جان چلی جائے اور کوئی مثبت نتیجہ برآمد ہو جائے تو پھر بھی غنیمت ہے ۔ جیسے علامہ اقبال نے کہا تھا ؎

اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا!

لاکھوں ستارے ختم ہوتے ہیں تو سورج طلوع ہوتا ہے‘ لیکن سورج تو طلوع ہو ! وہاں یہ ہوا ہے کہ اب اس پورے علاقے کے اندر امریکہ کا شکنجہ ہے۔ *بہرحال یہ حالات اس لیے درپیش ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کی عائد کردہ شرائط (ایمانِ حقیقی اور عمل صالح) پر پورا نہیں اُتر رہے‘ورنہ معاذ اللہ ! اللہ کا وعدہ تو غلط نہیں ہو سکتا۔ ذرا سا بھی یہ خیال پیدا ہو

جائے تو ہمارا ایمان جاتا رہے گا۔

روئے ارضی پر خلافت کا قیام

آیت زیر مطالعہ میں خلافت کے اس وعدے کے ساتھ یہ بھی فرمایا:{کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِہِمْ }''جیسے کہ اس نے خلافت عطا کی تھی ان کو جو ان سے پہلے تھے''۔ اس میں حضرت دائود علیہ السلام کی طرف اشارہ ہے ---- اصولِ تفسیر کا ایک قاعدہ ہے : اَلْقُرْآنُ یُفَسِّرُ بَعْضُہٗ بَعْضًا کہ قرآن کی ایک آیت دوسری آیت کی تفسیر بیان کرتی ہے۔چنانچہ آیت زیر مطالعہ کی تفسیر قرآن مجید ہی میں موجود ہے:{یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰکَ خَلِیْفَۃً فِی الْاَرْضِ} (صٓ:۲۶)''اے دائود! ہم نے آپ کو زمین میں خلافت عطا فرمائی ہے۔''

اس ضمن میں یہ تجزیہ بھی کرنا پڑے گا کہ آیت زیر مطالعہ میں مسلمانوں سے جو خلافت کا وعدہ کیا جا رہا ہے کیا یہ ہر اعتبار سے اسی طرح ہو گا جیسے اسرائیل کے عہد زریں میں وعدہ پورا ہوا تھا یا اس میں کوئی فرق ہو گا؟ اس حوالے سے نوٹ کرلیں کہ اس میں ایک بہت بڑا فرق ہے۔ وہ یہ ہے کہ حضرت دائود' حضرت سلیمان' اور بنی اسرائیل کے تمام انبیاء کرام بشمول حضرت عیسیٰ (علیہم السلام) کی بعثت صرف بنی اسرائیل کی طرف تھی' جبکہ محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت پوری نوع انسانی کے لیے ہوئی ہے :{وَ مَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّ نَذِیْرًا} (سبا:۲۸)''اور ہم نے نہیں بھیجا آپ (ﷺ) کو مگر تمام

---

* واضح رہے کہ یہ خطاب ۱۹۹۳ء کا ہے اور اس میں اُسی دور کے حالات کی عکاسی کی گئی ہے۔

انسانوں کے لیے بشیر اور نذیر بنا کر''۔ گویا آپ ﷺ کی اُمّت کو جب تک پورے کرۂ ارضی کی خلافت نہیں ملتی تب تک یہ وعدہ ہنوز شرمندۂ تکمیل رہے گا ۔ ایک درجے میں تو خلافت راشدہ کی صورت میں یہ وعدہ پورا ہو گیا۔اس اعتبار سے یہ بڑی اہم بات ہے کہ ہمارے ہاں ایک خاص فرقے نے حضرات ابوبکر 'عمر اور عثمان رضوان اللہ علیہم اجمعین کی خلافت پر جو شبہ پیدا کیا ہے اس کی نفی اس آیت سے ہو جاتی ہے۔ اگر ان کی خلافت صحیح نہیں تھی تو گویا خلافت ابھی تک سرے سے قائم ہی نہیں ہوئی اور اللہ کا وعدہ ابھی تک کسی درجے میں بھی پورا نہیں ہوا۔ یہ بات قطعاً قرآن مجید کے منافی ہے ۔ اللہ کا یہ وعدہ ایک خاص درجے میں پورا ہو چکا ہے' بایں طور کہ رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں سرزمین عرب میں اللہ کا دین غالب ہو گیا: {وَ قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَ زَہَقَ الْبَاطِلُ ؕ اِنَّ الْبَاطِلَ کَانَ زَہُوْقًا ﴿۸۱﴾} (بنی اسرائیل)''اور کہہ دو کہ حق آگیا اور باطل نابود ہو گیا' بے شک باطل نابود ہونے والا ہے''۔اس کے بعد حضور ﷺ نے جزیرہ نمائے عرب سے باہر دین کے غلبہ کی جدّوجُہد شروع کی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ

عنہ کے زمانے میں یہ دائرہ مزید وسیع ہوا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دس برس میں بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی اور پھر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے زمانے میں یہ سیلاب اور تیزی سے آگے جا رہا تھا۔ گویا ع ''تھمتا نہ تھا کسی سے سیل رواں ہمارا''۔ یوں سمجھئے کہ دریائے جیحوں (آج بھی جس کا بڑا حصّہ روس اور افغانستان کی سرحد بناتا ہے) سے بحر اوقیانوس تک یہ خلافت قائم ہو گئی تھی۔

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی خلافت پر چونکہ اختلاف رہا ہے اور ان کی خلافت پورے عالم اسلام پر قائم نہ ہو سکی' بلکہ ایک علاقہ علیحدہ رہا لہٰذا میں نے صرف تین کے نام لیے ہیں۔ حضرت علیؓ خلیفۂ راشد ہیں 'اس میں کوئی شک نہیں' لیکن شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کی خلافت مستحکم نہیں ہو سکی۔ لیکن کم سے کم تین خلفاء کی خلافت میں تو کوئی اختلاف نہیں۔ درحقیقت اس درجے میں اللہ کا یہ وعدہ پورا ہوچکا ہے' لیکن اس وعدے کا ایک دور ابھی باقی ہے اور وہ تب ہو گا جب پورے کرۂ ارضی پر خلافت کا نظام قائم ہوگا۔ یہ ہو کر رہے گا 'اس لیے کہ یہ حضور ﷺ کے پورے روئے ارضی کی طرف مبعوث

ہونے کا منطقی نتیجہ ہے۔ آپ ﷺ کی بعثت پوری نوعِ انسانی کے لیے تھی --- آپ خطبوں میں کبھی یہ الفاظ سنتے ہیں: اَلْمَبْعُوث اِلی الاَسود والاَحْمر یعنی ہر سیاہ فام اور سرخ رو کی طرف بھیجے ہوئے --- لہٰذا پورے کرۂ ارض پر خلافت کا نظام قائم ہوکر رہے گا۔ اس کے لیے صریح احادیث بھی موجود ہیں۔ حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے حضور ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا:

((لَایَبْقٰی عَلٰی ظَھْرِ الْاَرْضِ بَیْتُ مَدَرٍ وَلَا وَبَرٍ اِلَّا اَدْخَلَہُ اللہُ کَلِمَۃَ الْاِسْلَامِ بِعِزِّ عَزِیْزٍ وَذُلِّ ذَلِیْلٍ۔ اِمَّا یُعِزُّھُمُ اللہُ عَزَّوَجَلَّ فَیَجْعَلُھُمْ مِنْ اَھْلِھَا اَوْیُذِلُّھُمْ فَیَدِیْنُوْنَ لَھَا)) قُلْتُ: فَیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ (٦)

''دنیا میں نہ کوئی اینٹ گارے کا بنا ہوا گھر باقی رہے گا نہ کمبلوں کا بنا ہوا خیمہ جس میں اللہ اسلام کو داخل نہیں کردے گا' خواہ عزت والے کے اعزاز کے ساتھ خواہ کسی مغلوب کی مغلوبیت کی صورت میں۔ (یعنی) یا لوگ اسلام قبول کرکے خود بھی عزت کے مستحق بن جائیں گے یا اسلام کی بالادستی تسلیم کرکے اس کی فرماں برداری قبول کرنے پر مجبور ہو جائیں گے''۔ میں (راوی) نے کہا: تب تو سارے کا سارا دین اللہ کے لیے ہوجائے گا۔

تو یہ وعدہ ضرور پورا ہو گا ' البتہ اس وعدے کو پورا کرنے کے لیے جدّوجُہد کرنی ہو گی 'اس کے تقاضوں کو پورا کرنا ہو گا۔ ابھی تاریخ منتظر ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر ایمان کے دعوے دار پھر اٹھیں' منظم ہوں' ایک طاقت بن کر باطل سے ٹکرا جائیں اور اللہ کے دین کو غالب کریں ' جیسے کہ محمد ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے کیا۔ اقبال نے کہا تھا: ؎

تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اَسلاف کا قلب و جگر !

قیامِ خلافت کے لیے جدّوجُہد ہماری ذِمّہ داری ہے !
پورے روئے ارضی پر اللہ کے دین اور نظامِ عدلِ اجتماعی کو غالب کرنا' یہ مشن ہے

_____(٦) رواہ احمد بسند صحیح وقد رواہ جماعۃ آخرون ... بحوالہ مشکاۃ المصابیح بتحقیق الالبانی' کتاب الایمان' ح ۴۲۔

محمد عربی ﷺ کا اور ابھی اس کی تکمیل باقی ہے ؎
وقت فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اِتمام ابھی باقی ہے !

نورِ توحید اپنی جگہ تو مکمل ہو گیا' لیکن ابھی اس سے صرف جزیرہ نمائے عرب منور ہوا تھا' جبکہ اطراف و اکنافِ عالم' مشرق اور مغرب سب کے سب ابھی اس کے نور سے محروم تھے اور پورا کرۂ ارضی شرک کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں ڈوبا ہوا تھا ' وہ تثلیث کی صورت میں یا ثنویت کی شکل میں۔ خلافت راشدہ کے دوران یہ نورِ توحید کرۂ ارضی کے بہت بڑے حصے پر پھیل گیا' لیکن اس کا اتمام ابھی باقی ہے ۔ محمد عربی ﷺ کے مشن کی تکمیل ابھی باقی ہے اور یہ کام ہمیں حضور ﷺ کے خلیفہ کی حیثیت سے کرنا ہے۔ بعض لوگ یہ سوال پوچھتے ہیں کہ خلافت نہیں ہے تو ہم کیا کریں؟ اس کا ایک ہی جواب ہے کہ جو مسلمان اپنی ذِمّہ داری کو سمجھ لیں اور اللہ کے اس وعدے {وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡکُمۡ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ...} کا مصداق بننا چاہیں تو وہ کھڑے ہوں' جمع ہو کر ایک جماعت بنائیں' کسی ایک امیر کے ہاتھ پر بیعت سمع و طاعت فی المعروف کریں' پھر اس نظام کے لیے جدّوجُہد کریں اور اس نظام کو برپا کریں۔

ظاہر بات ہے کہ یہ نظام سب سے پہلے کسی ایک ملک میں قائم ہو گا اور پھر اس کی توسیع ہوگی۔ حضور ﷺ بھی پوری دنیا میں ایک دم اس نظام کو نہیں لا سکے۔ آخر اس دنیا کے کچھ قوانین فطرت ہیں۔ یہی وجہ

ہے کہ آپ ﷺ کی ذاتی جدّوجُہد اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی قربانیوں کے نتیجے میں پہلے سرزمین عرب میں وہ نظام برپا ہوا۔ اس کے بعد بات آگے پھیلی تو عراق ' شام' مصر ' ایران تک یہ معاملہ گیا ۔ پھر اِدھر ماوراء النہر تک اور اُدھر آگے لیبیا وغیرہ تک معاملہ پہنچا۔ یعنی پہلے یہ نظام ایک ملک میں قائم ہوا اور پھر اس کی توسیع ہوئی۔ یہی ایک طریقہ ہے محمد عربی ﷺ کا اور یہی طریقہ آج اختیار کیا جا سکتا ہے۔

اگر ہم اس نظام کے لیے جدّوجُہد کریں گے تو ہم اللہ تعالیٰ کے تین وعدوں کے مستحق ہوجائیں گے جن کا ذکر آگے آرہا ہے۔ کاش اللہ تعالیٰ اس سرزمین پاکستان کو نظامِ خلافت کا

نقطہ آغاز بنائے' جو اِس وقت باہمی خلفشار' انتشار ' طرح طرح کے جھگڑوں 'نسلی و گروہی فسادات' نفاقِ عملی' نفاقِ باہمی اور نفاقِ قلبی جیسے مصائب ومسائل کا شکار ہے۔ خدانخواستہ جو بھٹیاں یہاں کبھی دہک رہی تھیں کہیں وہ دوبارہ نہ بھڑک اٹھیں۔ اندرون سندھ میں وہی شکل ہو سکتی ہے۔ بیرونی حالات نہایت خراب ہیں 'جبکہ اندرونی خلفشار بھی بے قابو ہو رہا ہے ۔ہرآنے والی نئی حکومت میں ایک سے ایک بڑا سکینڈل سامنے آتا ہے۔ ہمیں ایک قوم کی حیثیت سے سوچنا چاہیے کہ درحقیقت ہم کس خلفشار اور کس خوفناک انجام کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اس کے باوجود نامیدی میں بھی اُمید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے' جس کو انگریزی میں کہتے ہیں: Hoping against hope ۔ سورۂ یوسف میں فرمایا گیا ہے:{لَا تَایْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰہِ ط} (آیت ۸۷) کہ اللہ کی رحمت سے مایوس مت ہو۔ اس لیے میں تو پھر بھی اُمید کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق دے اور مسلمانانِ پاکستان کو اس کی سعادت عطا فرمائے کہ وہ خلافت کا نظام پہلے اس ملک میں قائم کریں۔ پھر جب اس کی برکات ظاہر ہوں گی تو یقیناً پوری دنیا دیکھے گی اور باقی ممالک بھی خلافت کی طرف آئیں گے۔ دُنیا تو دردر کی ٹھوکریں کھا رہی ہے ۔ایک تجربہ کمیونزم کا کیا تو وہ ناکام ہو گیا' اب کوئی اور تجربہ کریں گے اور پھر ٹھوکر کھائیں گے۔ اس لیے کہ ہدایت آسمانی اور محمدرسول اللہ ﷺ کا لایا ہوا نظام تو خود مسلمان قائم نہیں کر رہے ہیں ۔ مسلمان خود اپنے وجود کے ذریعے سے گویا اس کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔

اللہ ربّ العزت کے تین وعدے

آیت استخلاف میں ایمان والوں سے اللہ تعالیٰ کے تین پختہ وعدوں کا بیان ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ امید سے انسان کے اندر عزم و حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔ اگر اُمید ہو تو ہمت بندھتی ہے' کام کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور برقرار رہتا ہے۔ اور اگر اُمید دم توڑ جائے تو پھر قویٰ بھی مضمحل ہو جاتے ہیں' ہمت جواب دے دیتی ہے اور کمر ٹوٹ کر رہ جاتی ہے ۔تو اللہ کے یہ وعدے ہمارے لیے امید کا سہارا ہیں۔ فرمایا: {وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ}''(اے مسلمانو!) اللہ کا وعدہ ہے تم میں سے اُن

لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور عمل صالح کا حق ادا کریں ''۔ پہلا وعدہ یہ ہے: {لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ } ''کہ لازماً وہ انہیں زمین میں خلافت (غلبہ) عطا کرے گا جیسے کہ اُس نے ان سے پہلے والوں کو خلافت عطا کی تھی ''۔دوسرا وعدہ ہے: {وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ} ''اور تمکن عطا فرمائے گا اُن کے لیے اُن کے دین کو جو اُس نے اُن کے لیے پسند کرلیا ہے''-------سورۃالمائدۃ بھی تقریباً ٦-٧ہجری میں نازل ہوئی ہے اور اس میں یہ آیت موجو دہے:{اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا } (آیت٣) ''آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو کامل کر دیاہے اور تم پر اپنی نعمت کا اِتمام فرمادیا ہے اور تمہارے لیے میں نے اسلام کو بحیثیت دین کی پسند کر لیا ہے ''-------جبکہ تیسرا وعدہ ہے :{وَ لَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا } ''اور لازماً وہ بدل دے گا ان کے خوف کی حالت کو امن کی حالت میں۔''

جو لوگ عربی زبان کی معمولی شدبد بھی رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ عربی زبان میں کسی وعدے پر تاکید کا اس سے بڑھ کر کوئی اسلوب نہیں ہے کہ فعل مضارع کے شروع میں لامِ مفتوح اورآخر میں نون مشدد لایا جائے۔ یہاں ان تینوں وعدوں میں یہی انتہائی تاکید کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے: لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ ... لَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمْ... لَيُبَدِّلَنَّهُمْ ... یعنی وہ انہیں لازماً خلافت عطا فرمائے گا...وہ لازماً ان کے لیے دین کو تمکن عطا فرمائے گا... وہ لازماً ان کی خوف کی حالت کو امن سے بدل دے گا۔ یہ خوف کی حالت امن سے تب بدلتی ہے جب دشمن کے اندر طاقت نہ رہے اور دشمن زیر ہو جائے ۔ اگر دشمن برابر کا ہے یا دشمن قوی ہے تو ہر وقت حملے کا اندیشہ رہتا ہے۔ ہجرت کے بعد ابتدائی دنوں میں مدینہ منورہ میں ہر وقت یہ کیفیت طاری رہتی تھی کہ پتا نہیں کب حملہ ہوجائے اور منافقین اس قسم کی افواہیں اڑاتے رہتے تھے تاکہ مسلمانوں کے حوصلے پست ہوں۔تو یہ جو خوف کی سی کیفیت رہتی تھی اس کو اللہ تعالیٰ نے امن سے بدل دیا۔ اللہ ربّ العزت نے ان

تینوں وعدوں کو پہلے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ساتھ پورا فرمایا تھا'اس لیے کہ انہوں نے ایمان اور عمل صالح کی دونوں شرطیں پوری کیں'جدّوجُہد کی' قربانیاں دیں اورجس وقت جو تقاضا آیا اس کے سامنے سر تسلیم خم کیا۔

پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

ظاہر بات ہے کہ وہ وقت آکر رہے گا اور یہ خلافت عالمی سطح پر قائم ہوگی 'اس لیے کہ اس کی خبر تو حضور ﷺ نے دی ہے ۔پھر اس کا کہیں نہ کہیں سے تو آغاز ہو گا۔ کہاں سے ہوگا' اس کے بارے میں ہم نہیں جانتے۔ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسی خطہ ارضی کو یہ سعادت عطا فرمائے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی اور مسلمان

ملک کو اس کے لیے قبول فرما لے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اللہ تمام مسلمان ممالک کورد (reject) کر کے کسی نئی قوم کو ایمان لانے کی توفیق عطا فرما دے اور ان کے ہاتھوں نظامِ خلافت کا آغاز فرمائے۔ بلکہ میں آخری بات کہہ رہا ہوں کہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کو پہلے کسی دشمن سے پٹوائے' ان کا بھرکس نکلوائے اور پھر اسی قوم کو اسلام کی توفیق دے دے اور ان کے ذریعے خلافت کو قائم فرمائے۔ اسلامی تاریخ میں ایک بار پہلے ایسا ہو چکا ہے' جس کے بارے میں اقبال نے کہا تھا: ؎

ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے!

تاتاریوں نے لاکھوں نہیں' کروڑوں مسلمانوں کو قتل کیا اورپورے کے پورے ملک تہس نہس کر دیے۔ پورا افغانستان' سارے کا سارا ترکستان کا علاقہ' پورا ایران اور اکثر حصّہ عراق کا تہس نہس ہو گیا۔یہ قتل ہونے والے کہنے کو تو مسلمان تھے لیکن ایمان اور عمل صالح ان کے ہاتھ سے جا چکا تھا' جیسے آج ہمارا حال ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ایسے انجام سے بچائے اور ہمیں توفیق دے کہ ہم ایمان اور عمل صالح کا حق ادا کر سکیں۔

تاتاری بالکل وحشی لوگ تھے۔ان کے ہاتھوں ایسے بھی ہوا کہ کسی وحشی سردار نے کسی شہر کو فتح کیا تو وہاں کی ساری آبادی کو قتل کر دیا۔ پھر ان کے سر علیحدہ کیے اور ان سروں کو جمع کر کے ایک پہاڑی سی بنا دی۔پھر اس پہاڑی پر تخت بچھایا گیا اور اس وحشی سردار نے

اس تخت پر بیٹھ کر شراب پی ۔ لیکن پھر آپ نے دیکھا کہ وہ تاتاری جن سے اللہ نے مسلمانوں کو اتنی سخت سزا دلوائی' وہی ایمان لے آئے۔ انہی کے یہ چار سلسلے تھے : ترکانِ سلجوقی' ترکانِ تیموری' ترکانِ صفوی اور ترکانِ عثمانی۔پھر جیسی کبھی عظیم سلطنت روما ہوتی تھی ویسی عظیم سلطنت ِعثمانیہ قائم ہوئی اور خلافت بھی عربوں میں ختم ہو کر ترکوں کے پاس آ گئی --------- قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:{وَ اِنۡ تَتَوَلَّوۡا یَسۡتَبۡدِلۡ قَوۡمًا غَیۡرَکُمۡ ۙ ثُمَّ لَا یَکُوۡنُوۡۤا اَمۡثَالَکُمۡ ﴿۳۸﴾}(محمد)''اور اگر تم پیٹھ دکھا دو گے تو اللہ تمہاری جگہ کسی دوسری قوم کو لے آئے گا ' پھر وہ تمہاری طرح کے نہیں ہوں گے۔''

خلافت اور حاکمیت میں فرق

ان تین وعدوں کے نتیجہ کا ذکرآیت کے اگلے حصے میں ہے جو اس آیت کا بہت ہی پیارا ٹکڑا ہے : {یَعۡبُدُوۡنَنِیۡ لَا یُشۡرِکُوۡنَ بِیۡ شَیۡئًا ؕ}''وہ میری ہی بندگی کریں گے اور میرے ساتھ کسی شے کو شریک نہیں کریں گے''۔یہ ہے خلافت 'جبکہ ایک ہے حاکمیت۔ ان دونوں میں فرق ہے۔ حاکمیت یہ ہے کہ میں حاکم اور مختارِ مطلق ہوں لہٰذا جو

چاہوں کروں۔فرعون کا بھی یہی دعویٰ تھا : {اَلَیۡسَ لِیۡ مُلۡکُ مِصۡرَ وَہٰذِہِ الۡاَنۡہٰرُ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِیۡ ۚ}(الزخرف: ۵۱)''کیا مصر کی حکومت میرے ہاتھ میں نہیں ہے اور یہ نہریں جو میرے(محلات کے)نیچے بہہ رہی ہیں(میرے اختیار میں نہیں ہیں) !'' یعنی دریائے نیل کا آبپاشی کا جو بھی نظام ہو گا اس کے بارے میں اس کا دعویٰ تھاکہ یہ میرے حکم کے تحت ہے' لہٰذا میں جس کو چاہوں گا پانی دوں گا اورجس کو چاہوں گا نہیں دوں گا۔اختیار میرا ہے اور میں مختار مطلق ہوں۔یہی تو تھا اس کا خدائی کا دعویٰ۔

آج اتنا فرق واقع ہوا ہے کہ خدائی کا دعویٰ ایک شخص نہیں کرتا بلکہ پوری قوم کرتی ہے کہ ہم حاکم ہیں (we are sovereign) لہٰذا ہم جو چاہیں گے قانون بنائیں گے۔ آج کہا جاتاہے ملائوں کو ہم نہیں مانتے اور ان کی حکومت تسلیم نہیں کرتے۔ کوئی نہیں چاہتا کہ ملائوں کی حکومت ہو' لیکن مطلوب یہ ہے کہ کتاب و سُنّت کی بالادستی ہو۔ خلافت میں انسان کی حاکمیت کا تصوّرہی نہیں ہے' بلکہ انسان کی حیثیت خلیفہ کی ہے اور حاکم ومالک اللہ ہے:

{قُلۡ اَعُوۡذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۙ﴿۱﴾مَلِکِ النَّاسِ ۙ﴿۲﴾اِلٰہِ النَّاسِ ۙ﴿۳﴾ } (الناس) ''کہو میں پناہ میں آتا ہوں (اللہ کی جو) تمام انسانوں کا رب ہے۔ جو تمام انسانوں کا بادشاہ ہے۔جو تمام انسانوں کا معبود ہے !''

انتہائی افسوس کی بات یہ ہے کہ علامہ اقبال جو عصر حاضر میں اس نکتے کو سب سے زیادہ واضح کرنے والے تھے 'انہی کے فرزند ارجمند ڈاکٹر جاوید اقبال پارلیمنٹ کی حاکمیت کا ڈھونڈورا پیٹ رہے ہیں' جبکہ علامہ اقبال تو یہ کہہ کر گئے ہیںکہ :

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اِک وہی' باقی بتانِ آزری !

اسی طرح اقبال کا بڑاپیارا شعر ہے 'جس میں ابلیس کے ایک مشیر کی ترجمانی بایں الفاظ کی گئی ہے ؎

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس
جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس وخود نگر

پہلے انسانوں میں اتنا شعور نہیں تھا کہ ہمارے بھی کچھ حقوق ہیں ۔وہ یہی سمجھتے تھے کہ ہم توپیدا ہی بادشاہ کا حکم ماننے کے لیے کیے گئے ہیں۔ ہم کسان کے گھر میں پیدا ہی اس لیے ہوئے ہیں کہ ہم محنت مزدوری کریں اور جاگیردار ہماری محنت پر عیش کرے۔ ایک زمانہ تھا کہ جب انسانوں میں اپنے حقوق کا شعور نہیں تھا' لیکن رفتہ رفتہ نوعِ انسانی

اس سٹیج کو پہنچ گئی کہ عوام میں بھی اپنے حقوق کا شعور پیدا ہوا کہ یہ جاگیرداراور بادشاہ بھی دوہاتھ اور دوپاؤں والے انسان ہیں اور ہم بھی انسان ہیں تو ان کے پاس حکومت کا حق کہاں سے آگیا؟ جنہوں نے یورپ کی تاریخ پڑھی ہے‘ وہ جانتے ہیں کہ وہاں کے بادشاہوں کا دعویٰ تھا کہ ہم خدائی اختیارات (Divine Rights of the King) کے مالک ہیں۔ ہندوستان میں بھی چندر بنسی اور سورج بنسی خاندان کا دعویٰ تھا کہ ہم دیوتاؤں کی اولاد ہیں اور ہمارا کام ہی یہ ہے کہ ہم بادشاہت کریں اور تمہارا کام ہی یہ ہے کہ تم غلام بن کر رہو اور ہمارا حکم مانو!

یہ نظام کئی صدیوں تک اسی طرح چلتا رہا‘ لیکن جب انسان ذرا خود شناس و خود نگر ہوا تو ابلیس نے یہ کیا کہ وہ جو بادشاہ کے سر کے اوپر حاکمیت کی گندگی کی بہت بڑی ٹھڑی

رکھی ہوئی تھی اس نے اس گندگی کو پوری قوم میں تولہ تولہ‘ ماشہ ماشہ تقسیم کر دیا۔ اس طرح شیطان کا کام چلتا رہا۔ اصل میں شیطان کو ضد اس بات سے ہے کہ کہیں اللہ کی حاکمیت قائم نہ ہوجائے‘ اس لیے کہ اللہ کی حکومت قائم ہونے سے اس کی شکست ہے۔ اس لیے اس کی کوشش کی ہے کہ انسانوں کی حاکمیت رہے‘ چاہے ایک بادشاہ کی ہو یا دس کروڑ عوام کی۔

خلافت‘ حاکمیت کی ضد ہے!

دوسری طرف اسلام کا نقطہ نظر یہ ہے کہ حاکم اللہ ہے اور حاکمیت اُسی کی ہے۔ اس حوالے سے قرآنی آیات کے تین ٹکڑے ملاحظہ ہوں: (۱) {اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰہِ ؕ} (یوسف:۴۰) ’’حکم صرف اللہ ہی کے لیے ہے!‘‘ (۲) {وَّ لَا یُشۡرِکُ فِیۡ حُکۡمِہٖۤ اَحَدًا ﴿۲۶﴾}(الکہف) ’’وہ اپنی حاکمیت میں کسی کو شریک نہیں کرتا!‘‘ (۳) {وَّ لَمۡ یَکُنۡ لَّہٗ شَرِیۡکٌ فِی الۡمُلۡکِ}(بنی اسرائیل:۱۱۱) ’’کوئی نہیں ہے شریک اس کی بادشاہی میں‘‘۔ ان آیات سے معلوم ہوا کہ بادشاہی اللہ کے لیے ہے‘ جبکہ انسانوں کے لیے خلافت ہے۔

خلافت کے معنی یہ ہیں کہ جہاں اللہ اور اس کے رسول کا حکم آگیا تو وہاں سر تسلیم خم ہوگیا۔ اکیاون(۵۱) فیصد تو کیا‘ سو فیصد لوگ بھی اس میں کوئی ترمیم نہیں کر سکتے۔ اللہ کا حکم ہے‘ لہٰذا کوئی نہیں بدل سکتا۔ اسی طرح اللہ کے رسول کا فرمان ہے اور وہ اللہ کے نمائندے ہیں تو وہاں بھی سر تسلیم خم۔ البتہ جس معاملے میں ان کا کوئی حکم نہیں ہے وہاں باہمی مشورے اور ووٹنگ کے ذریعے کثرتِ رائے سے طے کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ یہ ہے خلافت! اور جہاں یہ ہو کہ ہم جو چاہیں گے قانون بنائیں گے‘ چاہیں گے تو دو مَردوں کی شادی کو جائز قرار دیں گے‘ شراب کی اجازت دے دیں گے یا اس کے لائسنس جاری کریں گے۔ اسی طرح اگر ہم چاہیں گے تو زنا کو جرم قرار دیں گے اور چاہیں گے تو صرف زنا بالجبر کو جرم قرار دیں گے اور زنا بالرضا کو جرم شمار نہیں کریں گے۔ چونکہ یہ ہمارا اختیار ہے لہٰذا ہماری پارلیمنٹ بیٹھ کر تمام فیصلے کرے گی۔ یہ ہے جمہوریت اور یہ بدترین شرک ہے۔

خلافت کو آپ ''اسلامی جمہوریت'' بھی کہہ سکتے ہیں' اس لیے کہ اس میں جمہوریت کا ایک عنصر موجود ہے 'بایں طور کہ جہاں اللہ اور اس کے رسول کا کوئی حکم نہیں ہے تو وہاں باہمی

مشورے اور رائے دہی سے معاملہ طے کرنے کا اختیار موجود ہے۔ اس حد تک تو جمہوریت کا عنصر اس میں موجود ہے 'لیکن کسی ایک شخص کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ جو چاہے قانون بنائے۔ جس معاملے میں اللہ اور اُس کے رسول کا حکم موجود نہیں ہے وہاں بھی کسی ایک شخص کو قانون سازی کا اختیار نہیں ہے 'بلکہ یہ تو مسلمانوں کی خلافت ہے اور یہاں فیصلہ بھی مسلمانوں کی باہمی مشاورت سے ہو گا۔

البتہ غیر مسلم اس خلافت میں شریک نہیں ہیں' اس لیے کہ جس نے نہ اللہ کو مانا' نہ کتاب کو مانا' نہ رسول کو مانا تو اس کا مسلمانوں کی خلافت میں کوئی حصّہ نہیں ہے۔ یہ مسلمانوں کا حق ہے کہ وہ اپنی رائے دے کر کسی شخص کو خلیفہ منتخب کریں ۔ آگے اس خلیفہ کی ذِمّہ داری ہے کہ اللہ اور اُس کے رسول کے احکام کی تنفیذ کرے اور جہاں کوئی حکم موجود نہ ہو وہاں باہمی مشورے {اَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ}کا نظام قائم کر کے قانون سازی کرے۔ اس پس منظر میں آیت کے اس ٹکڑے {يَعۡبُدُوۡنَنِىۡ لَا يُشۡرِكُوۡنَ بِىۡ شَيۡـئًا} کا مفہوم یہ ہوگا کہ وہ میری ہی بندگی کریں گے ' میری ہی اطاعت کریں گے 'نماز بھی میرے لیے پڑھیں گے اور حاکمیت بھی میری ہی تسلیم کریں گے۔

مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے !

آیت زیر مطالعہ کا آخری ٹکڑا میرے اور آپ کے لیے بہت لرزا دینے والا ہے۔ فرمایا:{وَمَنۡ كَفَرَ بَعۡدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ ﴿۵۵﴾}''اور جو کوئی اس کے بعد بھی کفر کرے تو ایسے لوگ ہی فاسق ہیں''۔ان الفاظ کے حوالے سے ایک بات یہ نوٹ کر لیں کہ عام طور پر ہمارے ہاں ''فاسق'' کا لفظ ذرا ہلکے معنی میں مستعمل ہے۔ مثلاً فاسق اُسے سمجھا جاتا ہے جو مسلمان تو ہے 'لیکن متقی نہیں ہے اور کچھ گناہ کی زندگی گزار رہا ہے۔ حالانکہ یہ ایک سخت لفظ ہے اور یہ درحقیقت شیطنت کا عکاس ہے۔یہی وجہ ہے کہ سورۃ الکہف میں یہ لفظ ابلیس کے لیے آیا ہے :

{وَاِذۡ قُلۡنَا لِلۡمَلٰٓئِكَةِ اسۡجُدُوۡا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوۡۤا اِلَّاۤ اِبۡلِيۡسَ ؕ كَانَ مِنَ الۡجِنِّ فَفَسَقَ عَنۡ اَمۡرِ رَبِّهٖ ؕ} (آیت ۵۰)

''اور جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے(نہ کیا) وہ جنات میں سے تھا پس اپنے پروردگار کے حکم سے نکل بھاگا۔''

دوسری بات {وَمَنۡ كَفَرَ بَعۡدَ ذٰلِكَ}کے حوالے سے نوٹ کرنے کی ہے کہ ایک تو شرعی کفر ہے 'یعنی کوئی شخص اللہ کا' آخرت کا' رسول کا اور قرآن کا انکار کر دے ' لیکن یہاں وہ کفر مراد نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہاں معاملہ

مسلمانوں سے ہو رہا ہے اور آیت میں خطاب بھی ان ہی سے ہے‘ لہٰذا یہاں وہ کافر مراد ہیں جو مسلمان ہوتے ہوئے بھی کفر کر رہے ہیں۔ وہ کفر کیا ہے ؟ اس حوالے سے سورۃ المائدۃ میں تین دفعہ یہ آیت آئی ہے : {وَ مَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ ﴿۴۴﴾ ...فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۴۵﴾ ...فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ ﴿۴۷﴾} (المائدۃ) ’’اور جو لوگ اللہ کے اتارے ہوئے قانون کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہی تو کافر ہیں ... وہی تو ظالم ہیں... وہی تو فاسق ہیں‘‘------ ایک کافر ابوجہل تھا اور ایک ’’کافر‘‘ ہم ہیں جو کہنے کو مسلمان ہیں‘ لیکن ہمارے فیصلے شریعت کے مطابق نہیں ہیں۔ یہ بھی کفر ہے اور اس حوالے سے علامہ اقبال کا بڑا پیارا شعر ہے ؎

بتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے؟

درحقیقت ہم ان آیات کو پڑھتے ہوئے جب لفظ ’’کفر‘‘ دیکھتے ہیں تو بڑی آسانی سے گزر جاتے ہیں کہ اس کا ہم سے تعلق نہیں ہے ‘اس لیے کہ ہم تو کافر نہیں ہیں۔ حالانکہ کبھی تجزیہ کرنا پڑتا ہے کہ مضمون کیا آرہا ہے اور کس سیاق و سباق) (context) میں یہ بات آرہی ہے۔

اللہ کے وعدوں پر یقین نہ کرنا بھی کفر ہے !

آیت زیر مطالعہ میں کفر کے دو مفہوم ہیں۔ پہلا مفہوم قبل ازیں بیان کر دیا گیا ہے کہ جو لوگ مسلمان ہوتے ہوئے غیر اللہ کی حاکمیت پر مطمئن ہیں‘ جو مسلمان ہوتے ہوئے کتاب و سُنّت کے سوا کسی اور قانون کو تسلیم کر رہے ہیں اور اس سے آگے بڑھ کر جو اسے نافذ کر رہے ہیں‘ ان کو سورۃ المائدۃ کی آیات میں کافر‘ ظالم اور فاسق کہا گیا ہے۔

کفر کا دوسرا مفہوم وہ ہے جو شکر کے مقابلے میں آتا ہے‘ جیسے کہ قرآن حکیم میں ارشاد ہے:{لَئِنۡ شَکَرۡتُمۡ لَاَزِیۡدَنَّکُمۡ وَ لَئِنۡ کَفَرۡتُمۡ اِنَّ عَذَابِیۡ لَشَدِیۡدٌ ﴿۷﴾} (ابراھیم) ’’اگر تم میری نعمتوں کا شکر (اور قدر دانی) کرو گے تو میں تمہیں لازماً مزید عطا کروں گا اور اگر کفر (کفرانِ نعمت) کرو گے تو (پھر یاد رکھو) میرا عذاب بڑا سخت ہے‘‘۔ اس پس منظر میں{وَمَنۡ کَفَرَ بَعۡدَ ذٰلِکَ ...}کا مفہوم یہ ہوگا کہ اللہ کے وعدوں پر اگر آپ کو یقین نہیں ہے تو آپ نے اللہ کے وعدے کی بہت بڑی ناقدری کی ہے اور یہ کفر ہے-------- اللہ تعالیٰ اپنے وعدوں سے متعلق خود فرماتا ہے :{وَعۡدَ اللّٰہِ حَقًّا ؕ وَ مَنۡ اَصۡدَقُ مِنَ اللّٰہِ قِیۡلًا ﴿۱۲۲﴾}(النساء) ’’اللہ کا وعدہ سچا ہے‘ اور اللہ سے بڑھ کر بات کا سچا کون ہوسکتا ہے !‘‘ اسی طرح سورۃ التوبہ میں فرمایا گیا: {وَمَنۡ اَوۡفٰی بِعَہۡدِہٖ مِنَ اللّٰہِ} (آیت ۱۱۱) ’’اور اللہ سے بڑھ کر اپنے وعدے کا وفا کرنے والا کون ہے؟‘‘ غور کیجیے کہ آیت زیر مطالعہ میں اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں سے یہ وعدہ کر رہا ہے کہ

اگر تم ایمان اور عملِ صالح کا تقاضا پورا کرو تو ہمارا وعدہ ہے کہ ہم تمہیں خلافت عطا کریں گے۔ اللہ کا یہ وعدہ اٹل ہے‘جیسے سورۃ الطارق میں فرمایا گیا: {اِنَّہٗ لَقَوۡلٌ فَصۡلٌ ﴿۱۳﴾ وَّ مَا ہُوَ بِالۡہَزۡلِ ﴿۱۴﴾ } ’’یہ ایک فیصلہ کن کلام ہے ‘اور یہ کوئی یاوہ گوئی نہیں ہے‘‘۔یعنی یہ کسی شاعر کی تک بندی یا کسی واعظ کا غیر یقینی قول نہیں ہے‘ بلکہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ اگر تم اللہ کے کلام اوراس وعدوں کی بھی ناقدری کرو‘ بایں طور کہ کمر ہمت نہ کسو ‘جُہد و کوشش کرنے کو تیار نہ ہوتو پھر بتاؤکہ اتنے پختہ وعدوں کے بعد اب کون سا وعدہ ہوگا جس سے تمہارے اندر کوئی جذبہ انگڑائی لے گا اور تم جدّوجُہد کے لیے کمر کسو گے؟

یہاں اللہ تعالیٰ کے تین وعدے بیان ہوئے ہیں اور تیسرا وعدے پر ذرا غور تو کیجیے : {وَ لَیُبَدِّلَنَّہُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ خَوۡفِہِمۡ اَمۡنًا ؕ}کہ اللہ تعالیٰ خوف کی موجودہ حالت کو لازمی طور پر امن سے بدل دے گا ۔ آج کتنا خوف ہم پر طاری ہے‘ اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے۔ پاکستان اور بھارت کے مابین کنٹرول لائن کی ایک لکیر کھنچی ہوئی ہے اور اس لائن کے اُس پار ہزارہا مسلمان عورتوں کی عصمت دری ہو چکی ہے‘ کتنے مسلمان گولیوں

سے اڑائے جا چکے ہیں‘ کیا کیا ظلم و ستم وہاں ہورہا ہے اور کروڑہا مسلمانوں کی پاکستانی قوم‘ جس کو کبھی یہ سمجھا گیا تھا کہ جب پاکستان بن جائے گا تو وہ ہندوستانی مسلمانوں کی محافظ ہوگی‘ بھیگی بلی بنی بیٹھی ہے۔ انڈر دی ٹیبل اگر کوئی مدد ہو رہی ہو تو یہ الگ بات ہے‘ ورنہ کھلم کھلا کیا ہو رہا ہے اس پر مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اس سے زیادہ بے غیرتی اور بے حمیتی کوئی ممکن ہے؟ آپ دورِ بنواُمیہ کو گالیاں دیتے ہیں‘ لیکن اس دور بنواُمیہ کی شان یہ تھی کہ چند مسلمان عورتوں کی چیخیں اِسی علاقے سے گئی تھیں اور محمدبن قاسم رحمہ اللہ علیہ حجاز سے وہاں پہنچ گئے تھے۔جبکہ آج مسلمان آبادیوں کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم پر خوف طاری ہے ‘ہم میں لڑنے کی سکت نہیں ‘ ہم کوئی خطرہ(risk)مول نہیں لے سکتے اورآنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات نہیں کر سکتے۔ اگر کچھ کر بھی رہے ہیں تو جھوٹ بولتے ہیں کہ ہم کچھ نہیں کر رہے‘ اور اگر ہم اپنے مظلوم مسلمان بھائیوں کے لیے کچھ نہیں کر رہے تو یہ بے غیرتی کی انتہا ہے۔ لیکن اگر ہم خلافت کا راستہ اختیار کریں گے تو پھر طاقت اللہ دے گا اورعالمِ کفر کو ہمارے خلاف کچھ کرنے کی جرأت نہیں ہو گی۔ یہ اللہ کے پختہ وعدے ہیں‘اور اس کے باوجود لوگ اگر کمر ہمت نہ کسیں‘ محنت نہ کریں‘ جدّوجُہد نہ کریں تو اس سے بڑا کفر اور کیا ہو گا !

’’تحریک خلافت پاکستان‘‘

آخر میں یہ عرض ہے کہ یہ لمحہ فکریہ ہے۔ ہر شخص سوچے ‘غور کرے کہ میں کیا کروں اور کیسے کروں ! ہم نے مسلمانوں کو ان کی دینی ذِمّہ داریوں سے آگاہ کرنے کے لیے ایک اسلامی انقلابی جماعت ’’تنظیم اسلامی‘‘ کے نام

سے قائم کی ہے' جو اولاً پاکستان اور بالآخر ساری دنیا میں دینِ حق یعنی نظامِ خلافت کو قائم کرنے کے لیے کوشاں ہے۔ اس مقصد کے لیے خاص طور پر ''تحریک خلافت پاکستان'' کے نام سے تحریک چلائی گئی ہے۔ اس میں شامل ہونا ہر شخص کے لیے فرض نہیں ہے۔ البتہ جو شخص ہم پر اعتماد کرے' ہمارے طریقہ کار سے اتفاق کرے تو وہ ہمارے ساتھ شامل ہو کر ہمارا دست و بازو بنے۔نبی ﷺ کا ساتھ دینا شخصاً لازم تھا' لیکن ختمِ نبوت کے بعد اب کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس کے ماننے یا نہ

ماننے پر ایمان اور کفر کا دار و مدار ہو۔ آپ کو جس سے اتفاق ہو اس کے ساتھ لگ جایئے' جو طریق کار سمجھ میں آئے اُس کے مطابق کام کیجیے' لیکن یہ یاد رکھیے کہ خلافت کے نظام کو قائم کرنے کے لیے جدّوجُہد کرنا ہم پر لازم ہے۔

یہاں یہ بھی یاد رکھیں کہ ترکی میں جب خلافت ختم کی جا رہی تھی تو اُس کے بچاؤ کے لیے ہندوستان میں تحریک اٹھی۔ یہ بھی تاریخ کا ایک عجیب واقعہ ہے کہ خلافت کا مسئلہ اگرچہ پورے عالمِ اسلام کا تھا' ترکی کی خلافت صرف ہندوستان کے لیے تو نہیں تھی' لیکن اس پر صرف برصغیر پاک و ہند میں تحریک چلی' اور کہیں نہیں چلی۔ ۱۹۲۰ء کی تحریک خلافت میں ایک نظم اور خاص طور پر اس کے ایک شعر سے پورا ہندوستان گونج اٹھا تھا: ''بولی اماں محمد علی کی ----جان بیٹا خلافت پہ دے دو''۔اس پر تحریک خلافت نے اتنا زور پکڑا کہ گاندھی کو بھی اپنی قیادت و سیادت اور چودھراہٹ بچانے کے لیے تحریک خلافت میں شمولیت اختیار کرنی پڑی۔ یہ بھی ایک معجزہ تھا 'اس لیے کہ گاندھی کا تو خلافت سے کوئی تعلق تھا ہی نہیں۔ آگے ہماری بدقسمتی کی داستان شروع ہوجاتی ہے کہ تحریک خلافت تو اگرچہ زوروشور سے جاری تھی 'مگر ترکوں نے ''مدعی سست 'گواہ چست'' کے مصداق خود ہی اسے ختم کر دیا۔

اب ہندوستان کے وہی مسلمان 'جن کی ایک بہت بڑی تعداد آج پاکستان میں ہے' آج اپنے حقوق اور ملازمتوں کے لیے تحریکیں چلاتے ہیں--------یہ ٹھیک ہے' میں اس کی نفی نہیں کرتا۔ ہر انسان کو اپنا حق لینے کے لیے کوشش کرنی چاہیے۔ اس حوالے سے تو یہاں تک فرمایا گیا ہے کہ آپ کوئی سودا خریدیں تو جھگڑیں' تاکہ آپ کی نرمی کی وجہ سے کوئی آپ کو ناجائز نقصان نہ پہنچا دے یا ناجائز فائدہ نہ اٹھالے -------- لیکن یہ کہ اصل فرض منصبی جس کے لیے پاکستان بنایا گیا تھا وہ منزل نہ آج سندھی کو یاد ہے 'نہ مہاجر 'پنجابی' بلوچی اور پٹھان کو۔ جھگڑا ہے تو صرف اپنے دنیوی حقوق اور ملازمتوں کا۔ حالانکہ جس جذبے کے ساتھ ان معاملات میں آپ تحریکیں چلا رہے ہیں اگر اس کو اصل مشن کی طرف موڑدیں تو کوئی انہونی بات نہیں کہ تحریک خلافت والا جذبہ کراچی سے اُبھرے۔ لیکن یہ ہم سب کے لیے لمحہ فکریہ ہے کہ جس مقصد کے لیے یہ ملک بنا تھا اور لاکھوں جانیں دی گئی تھیں' اس کو

حاصل کرنے کے لیے اس سرزمین میں کوئی زرخیزی نہیں ہے‘ کوئی اس کے لیے اُٹھنے والا نہیں ہے‘ کوئی اس تحریک کو زندہ کرنے والا نہیں ہے۔

اس سلسلے میں جو تحریک خلافت ہم نے شروع کی ہے‘ اس کا مقصد یہ ہے کہ شاید مسلمانوں کو بھولی ہوئی منزل یاد آجائے اور ہو سکتا ہے کہ نوجوان اٹھ کھڑے ہوں۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں تو بنی اسرائیل جہاد کے لیے تیار نہیں ہوئے‘ لیکن چالیس برس کے بعداُن کے نوجوان اُٹھ کھڑے ہوئے تھے اور انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جانشین حضرت یوشع بن نون کے ساتھ مل کر جہاد کیا اور اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھ سے فلسطین فتح کرادیا۔ کچھ پتا نہیں اللہ تعالیٰ اب بھی ایسا کردے اورہمارے نوجوان اس کام کے لیے کمر کس لیں۔ میری آپ سب سے گزارش ہے کہ یہاں جو چارورقہ پمفلٹ بعنوان: ’’پاکستان میں نظامِ خلافت: کیا‘کیوں اور کیسے؟‘‘ تقسیم کیا گیا ہے‘آپ اُسے حاصل کیجیے اور اس پر غور کیجئے۔

ہم اُمید کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سرزمین سے خلافت کے قیام کا آغاز فرمائے گا‘اس لیے کہ یہ سرزمین بہت عظیم چیزوں کی امین ہے۔ بالاکوٹ میں تحریک شہیدین کا خون اس میں جذب ہے۔ ؎

ہیں بالاکوٹ کی مٹّی کے ذرّے ہماری آرزوئوں کے مزارات
ہیں ہر ذرّے کی پیشانی پہ منقوش ہمارے عزم کے خونی نشانات

اس اعتبار سے سوچیے‘ غور کیجیے‘ کوشش کیجیے اور پھر یہ کہ اللہ تعالیٰ اگر عزم و ارادہ کی توفیق دے تو ہمت کریں اور ہماری اس تحریک خلافت کے ساتھ مل کر کام کریں۔

میری اس تحریک کی جڑ اور بنیاد قرآن حکیم کا پڑھنا پڑھانا ہے‘اس لیے کہ انقلابی عمل کا پہلا کام ہی {یَتْلُوْا عَلَیْہِمْ اٰیٰتِہٖ} ہے‘ یعنی اللہ کی آیات پڑھ کر سنانا۔ اسی سے ایمان پیدا ہو گا اوراسی سے اپنے فرض کا احساس پیدا ہو گا۔ اس لیے کہ میری بات تو میری بات ہے‘جبکہ قرآن کی بات تو اللہ کا کلام ہے۔ اس کی جو تاثیر ہو گی وہ کسی انسان کی بات کی تو نہیں ہو سکتی۔ قرآن کے درس کا اصل مقصد ہی یہی ہے کہ قرآن پڑھنا ہے تو اس پر عمل

بھی کرنا ہے۔ اب قرآن پر عمل کرنا انفرادی بھی ہے اوراجتماعی بھی۔ انفرادی عمل میں خود تقویٰ اختیار کرنا‘ متقی بننا‘ عبادات اور حلال و حرام پر کاربند ہونا وغیرہ شامل ہے‘ جبکہ اجتماعی عمل یہ ہے کہ اللہ کی حاکمیت اور مسلمانوں کی خلافت کا نظام عملاً قائم ہو جائے۔

اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں!

جب سے میں نے اس تحریک کا آغاز کیا ہے تو بہت سے لوگ اس کا مذاق بھی اڑا رہے ہیں۔ جیسے اکبر الٰہ آبادی نے کہا تھا ؎

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں !

اس زمانے میں جمہوریت کا راگ الاپنے والے کی واہ واہ ہے۔ ہم نے بھی مارشل لاء کے مقابلے میں جمہوریت کی تائید کی ‘اس لیے کہ اس ملک کے لیے مارشل لاء زہر قاتل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس ملک کی فوج میں سندھ اور بلوچستان کی کوئی نمائندگی سرے سے ہے ہی نہیں ۔ جیسے کہ پہلے ہمارے بنگالی بھائیوں کو شکایت ہو گئی تھی کہ مارشل لاء کا مطلب ہے: مغربی پاکستان کی حکومت مشرقی پاکستان پر‘ اس لیے کہ فوجی تو سارے کے سارے وہیں کے ہیں۔ سندھ کے اندر بھی جو بہت سا فساد پیدا ہوا ہے‘ یہ مارشل لاء ہی کا نتیجہ ہے۔

لیکن اب ہم نے ’’اسلامی جمہوریت‘‘ کے لفظ کو بھی چھوڑ دیا ہے ‘اس لیے کہ جمہوریت کے لفظ کے اندر انسانی حاکمیت کی نجاست گھلی ہوئی ہے اور کہیں نہ کہیں اس کے اندر حاکمیت کا تصوّر خود بخود آجاتا ہے۔ لہٰذا ہم نے اس کے لیے قرآن و سُنّت کی اصطلاح ’’خلافت‘‘کو استعمال کیا ہے ‘جس کا آیت زیر مطالعہ میں تذکرہ آیا ہے۔اس تحریک خلافت پر غور کیجیے اوراس کے ساتھ کام کرنے کا ارادہ کیجیے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو توفیق دے کہ ہم اس آیت:{وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡکُمۡ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسۡتَخۡلِفَنَّہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ...}کا مصداق بن کر اللہ کے وعدوں کے مستحق ٹھہریں۔ آمین یا ربّ العالمین !

اقول قولی هذا واستغفر الله لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات○○

دین اور مذہب میں فرق

اور سیکولرازم کی اصل حقیقت

۱۸ ؍اکتوبر ۱۹۹۱ء کا خطابِ جمعہ

نحمدہٗ ونصلی علٰی رَسولِہ الکریم ... امَّا بَعد:

اعوذ باللّٰہِ من الشَّیطٰن الرَّجیم ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

{شَہِدَ اللّٰہُ اَنَّہٗ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ۙ وَ الْمَلٰٓئِکَۃُ وَ اُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ﴿۱۸﴾اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ ۟ وَ مَا اخْتَلَفَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَہُمُ الْعِلْمُ بَغْیًۢا بَیْنَہُمْ ؕ وَ مَنْ یَّکْفُرْ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ فَاِنَّ اللّٰہَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ ﴿۱۹﴾فَاِنْ حَآجُّوْکَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْہِیَ لِلّٰہِ وَ مَنِ اتَّبَعَنِ ؕ وَ قُلْ لِّلَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ وَ الْاُمِّیّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ؕ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اہْتَدَوْا ۚ وَ اِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَیْکَ الْبَلٰغُ ؕ وَ اللّٰہُ بَصِیْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰﴾ } (آل عمران)

{وَ مَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ ۚ وَ ہُوَ فِی الْاٰخِرَۃِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ﴿ ۸۵ ﴾ کَیْفَ یَہْدِی اللّٰہُ قَوْمًا کَفَرُوْا بَعْدَ اِیْمَانِہِمْ وَ شَہِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّ جَآءَہُمُ الْبَیِّنٰتُ ؕ وَ اللّٰہُ لَا یَہْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿ ۸۶ ﴾ اُولٰٓئِکَ جَزَآؤُہُمْ اَنَّ عَلَیْہِمْ لَعْنَۃَ اللّٰہِ وَ الْمَلٰٓئِکَۃِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِیْنَ ﴿۸۷﴾ ﴿ ۸۷ ﴾ خٰلِدِیْنَ فِیْہَا ۚ لَا یُخَفَّفُ عَنْہُمُ الْعَذَابُ وَ لَا ہُمْ یُنْظَرُوْنَ ﴿۸۸﴾ ﴿ ۸۸ ﴾ اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِکَ وَ اَصْلَحُوْا ۟ فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿ ۸۹ ﴾ } (آل عمران)

تفہیمِ آیات

سورۂ آل عمران کے ان دونوں مقامات پر ایک عظیم حقیقت بیان فرما دی گئی‘ جس سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اسلام اصلاً دین ہے‘ صرف مذہب نہیں۔ لیکن یہ عظیم حقیقت موجودہ دَور میں سمجھنا اکثر و بیشتر مشکل ہو جاتا ہے‘ اس لیے کہ موجودہ دور کے کچھ اپنے تصوّرات ہیں جن سے مسلمان بھی بحیثیت مجموعی محفوظ نہیں ہیں۔ اس کی تفصیل اِن شاء اللہ آگے آجائے گی۔

ان دونوں مقامات پر اسلام کا جو تذکرہ ہوا ہے‘ ایک جگہ { اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ ۟ } اور دوسری جگہ اسی کا معکوس (converse){ وَ مَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ ۚ } تو دراصل بات ایک ہی ہے۔ بیان کرنے کا ایک مثبت انداز ہے۔ یعنی ’’بے شک اللہ کے نزدیک دین اسلام ہے‘‘ یا ’’بے شک اللہ کے نزدیک اسلام دین ہے‘‘۔ یہ دونوں ترجمے مستعمل ہیں۔ یہی بات دوسرے مقام پر منفی انداز میں سامنے آ رہی ہے ۔ یعنی ’’جو کوئی اسلام کے سوا کسی اور دین کو اختیار کرے گا تو اُس سے یہ قبول نہیں کیا جائے گا۔‘‘ اللہ تعالیٰ اُسے قبول نہیں فرمائے گا۔ اس کا یہ مفہوم بھی از خود ہے کہ جو اسلام کو سوائے دین کے کسی اور حیثیت میں قبول کرے گا وہ بھی

اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول نہیں ہو گا۔

مندرجہ بالا چاروں مفاہیم کی روشنی میں تفصیلی گفتگو سے پہلے یہ مناسب ہو گا کہ متذکرہ بالا آیات کا ایک رواں ترجمہ ذہن نشین کر لیں۔ آیت ۱۸ میں ایک عظیم حقیقت بیان ہو رہی ہے اور وہ ہے توحید۔ توحید کے ایک پہلو کا تعلق تو عقیدہ سے ہے' یعنی توحید فی الذات اور توحید فی الصفات' جو اصلاً ایک علمی معاملہ ہے۔ توحید کا دوسرا گوشہ جو توحید فی العبادات اور توحید فی الحاکمیت پر مشتمل ہے' یہی درحقیقت توحید عملی ہے۔ لہٰذا فرمایا: {شَہِدَ اللّٰہُ اَنَّہٗ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ...} ''اللہ خود گواہ ہے اُس پر کہ اُس کے سوا کوئی معبود نہیں۔'' اُس کے سوا کوئی مالک نہیں' کوئی حاکم نہیں' کوئی قانون عطا کرنے والا نہیں۔ الٰہ کے مفہوم میں یہ تمام گوشے شامل ہیں۔ {وَالْمَلٰٓئِکَۃُ وَاُولُوا الْعِلْمِ} ''اور (اس پر

گواہ ہیں) تمام فرشتے اور اصحابِ علم بھی۔'' یعنی جو عقل مند انسان اپنی صحیح فطرت پر قائم ہے وہ بھی اس بات کی گواہی دیتا ہے۔{قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ} ''(اللہ) قائم کرنے والا ہے عدل و انصاف کا۔'' دُنیا میں بظاہر اگر کچھ تاخیر ہو جائے تو ہم خیال کرنے لگتے ہیں کہ شاید یہاں ''اندھیر نگری چوپٹ راج'' والا معاملہ ہے' لیکن حقیقت یہ نہیں ہے۔ بالآخر یہاں بھی اللہ تعالیٰ کا عدل نافذ ہو کر رہتا ہے' جبکہ آخرت میں تو اس کے عدل و قسط کا ظہور اپنی آخری اور تکمیلی شکل میں ہو کر ہی رہنا ہے۔ {لَآ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ﴿۱۸﴾} ''اُس کے سوا کوئی معبود نہیں' وہ زبردست کمالِ حکمت والا ہے۔''

{اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ ۟}اب یہ اس کا منطقی نتیجہ ہے کہ ''اللہ کے نزدیک دین تو بس (ایک ہی ہے اور وہ) اسلام ہے۔'' اسلام کے معنی ہیں گردن جھکا دینا' سرِ تسلیم خم کر دینا' سپر انداختن۔ اب جبکہ وہی مالک ہے تو اُس کی اطاعت بھی لازم ٹھہری۔ لہٰذا نہ کوئی اُس کا مدِّ مقابل بن سکتا ہے اور نہ ہی اُس کی حاکمیت کے سامنے کسی اور کی حاکمیت کا ڈھنڈورا پیٹا جا سکتا ہے۔ وہ ہمارا معبود اور ہم اُس کے عبد ہیں۔ وہ ہمارا مالک اور ہم اُس کی ملکیت ہیں۔ وہ ہمارا حاکم اور ہم اُس کے محکوم ہیں۔ ان تینوں چیزوں کو جمع کر لیجیے تو یہی درحقیقت اسلام کا تصوّر ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ کے نزدیک واحد مقبول اور پسندیدہ طریقِ زندگی صرف اسلام ہے' اور یہ دین ہمیشہ سے یہی رہا ہے۔ازروئے الفاظِ قرآنی: {شَرَعَ لَکُمْ مِّنَ الدِّیْنِ مَا وَصّٰی بِہٖ نُوْحًا وَّ الَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ وَ مَا وَصَّیْنَا بِہٖٓ اِبْرٰہِیْمَ وَ مُوْسٰی وَ عِیْسٰٓی...}(الشوریٰ:۱۳)''ہم نے تمہارے لیے وہی دین مقرر کیا ہے جس کی تاکید ہم نے نوحؑ کو کی تھی' اور جس کی وحی ہم نے (اے نبی ﷺ !) آپ کی طرف کی ہے' اور جس کی تاکید ہم نے ابراہیمؑ' موسیٰ اور عیسیٰؑ کو بھی کی تھی۔'' لہٰذا دین میں تو کوئی فرق نہیں۔ یہ دین اسلام تو ہمیشہ ایک ہی رہا ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر یہ تفرقے کہاں سے پیدا ہو گئے؟ یہ یہودیت اور مسیحیت کہاں سے آگئی؟

لہٰذا ساتھ ہی اس کی وجوہ بھی بیان فرمادیں : {وَ مَا اخۡتَلَفَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَتۡہُمُ الۡعِلۡمُ بَغۡیًۢا بَیۡنَہُمۡ } ’’اور (اِس

دین سے) اختلاف نہیں کیا اُن لوگوں نے جنہیں کتاب دی گئی تھی ‘مگر اس کے بعد کہ اُن کے پاس علم آ چکا تھا‘ آپس کی ضد اور حسد سے۔‘‘حقیقی علم اور اصل ہدایت اُن کے پاس آ چکی تھی‘ لیکن آپس کی ضِدم ضِدا اور ایک دوسرے پر بالادستی حاصل کرنے کی خواہش (the urge to dominate) اس تفرقے کا سبب بن گئی اور یوں اصل دین سے کئی شاخیں نکل آئیں۔ ایک شاخ دین سے علیحدہ ہوئی تو یہودیت بن گئی۔ اسی دین سے دوسری شاخ نکلی تو عیسائیت وجود میں آگئی۔ حالانکہ دین تو ایک ہی ہے آدمؑ سے ایں دم ۔{وَ مَنۡ یَّکۡفُرۡ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ فَاِنَّ اللّٰہَ سَرِیۡعُ الۡحِسَابِ ﴿۱۹﴾ }’’اور جو کوئی اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار کرے تو (وہ جان لے کہ) اللہ تعالیٰ جلد حساب لینے والا ہے۔‘‘اللہ تعالیٰ کی طرف سے روشن نشانیاں آجانے کے بعد بھی اگر لوگ اُسی کفر اور غلط روش پر اَڑے رہیں گے تو اللہ تعالیٰ کو حساب چکاتے دیر نہیں لگتی۔

{فَاِنۡ حَآجُّوۡکَ فَقُلۡ اَسۡلَمۡتُ وَجۡہِیَ لِلّٰہِ وَ مَنِ اتَّبَعَنِ ؕ}’’پھر بھی (اے نبی ﷺ !) اگر یہ آپ سے جھگڑا کریں (حُجّت بازی یا دلیل بازی کریں) تو کہہ دیجیے کہ مَیں نے تو اپنا رُخ اپنے پروردگار کی طرف کر لیا ہے (سرِ تسلیم خم کر دیا ہے) اور میرے ساتھ جو میرا اتباع کرنے والے ہیں (انہوں نے بھی یہی روش اختیار کر لی ہے)۔‘‘ اب تم جانو تمہارا کام۔ ہم نے تو دین اسلام عملاً قبول کر لیا ہے۔ یہ وہ اعلانِ براء ت ہے جس کی نمایاں ترین صورت قرآن حکیم میں بایں الفاظ سامنے آتی ہے : {قُلۡ یٰۤاَیُّہَا الۡکٰفِرُوۡنَ ۙ﴿۱﴾ لَاۤ اَعۡبُدُ مَا تَعۡبُدُوۡنَ ۙ﴿۲﴾ وَ لَاۤ اَنۡتُمۡ عٰبِدُوۡنَ مَاۤ اَعۡبُدُ ۚ﴿۳﴾ } (الکٰفرون) ’’کہہ دو کہ اے کافرو ! میں اُن کی عبادت نہیں کرتا جن کی تم عبادت کرتے ہو‘ نہ تم اُس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔‘‘

{وَ قُلۡ لِّلَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ وَ الۡاُمِّیّٖنَ ءَاَسۡلَمۡتُمۡ ؕ}’’اور (آپؐ) کہہ دیجیے اہلِ کتاب سے اور اُمّیین سے کہ کیا تم نے بھی (اُسی کی) اطاعت و بندگی قبول کی؟‘‘ {فَاِنۡ اَسۡلَمُوۡا فَقَدِ اہۡتَدَوۡا ۚ}’’پھر اگر وہ بھی اسلام لے آئیں (اور اسی طرح سرِ تسلیم خم کر دیں) تو وہ بھی ہدایت پر آجائیں گے۔‘‘ انہیں ہدایت پر آنے کے لیے کوئی کوہِ

ہمالیہ سر نہیں کرنا‘ بس اپنی ضد اور سرکشی چھوڑنی ہے اور اللہ کے مدّ مقابل بننے کے دعوے سے دست بردار ہونا ہے۔ {وَ اِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنَّمَا عَلَیۡکَ الۡبَلٰغُ ؕ} ’’اور اگر یہ روگردانی کریں تو (اے نبی ﷺ ! آپ پریشان نہ ہوں) آپؐ کے ذِمّہ صرف پہنچانے کی ذِمّہ داری ہے۔‘‘{وَ اللّٰہُ بَصِیۡرٌۢ بِالۡعِبَادِ ﴿۲۰﴾ }’’اور اللہ اپنے بندوں کو دیکھ رہا ہے۔‘‘کون کیا کر رہا ہے‘ اُس کی نگاہ سے کوئی شے پوشیدہ نہیں ہے اور وہ ہر ایک کو اُس کے کیفرِ کردار تک پہنچا کر رہے گا۔

یہی بات ایک دوسرے اسلوب سے بیان فرما دی گئی :{وَ مَنۡ یَّبۡتَغِ غَیۡرَ الۡاِسۡلَامِ دِیۡنًا فَلَنۡ یُّقۡبَلَ مِنۡہُ ۚ}''اور جو کوئی بھی اسلام کے سوا کسی اور دین کو اختیار کرے گا تو وہ اُس سے ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔'' اور اس میں تبعاً یہ مفہوم بھی مَیں آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں کہ اگر کوئی اسلام کو بھی بحیثیت ِدین نہیں بلکہ صرف ایک عقیدے کے طور پر اختیار کرے گا تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول نہیں ہو گا۔ اس لیے کہ یہاں پھر تفریق ہو گئی۔ دین کو اگر صرف عقائد اور عبادات تک محدود کر دیا جائے تو وہ دین نہیں' مذہب بن جائے گا۔ {وَ ہُوَ فِی الۡاٰخِرَۃِ مِنَ الۡخٰسِرِیۡنَ ﴿۸۵﴾}''اور وہ آخرت میں خسارہ پانے والوں میں سے ہو گا۔'' یعنی ناکام و نامراد ٹھہرے گا۔

{کَیۡفَ یَہۡدِی اللّٰہُ قَوۡمًا کَفَرُوۡا بَعۡدَ اِیۡمَانِہِمۡ وَ شَہِدُوۡۤا اَنَّ الرَّسُوۡلَ حَقٌّ}''اللہ تعالیٰ ایسی قوم کو کیسے ہدایت دے گا جو اپنے ایمان کے (دعوے کے) بعد پھر کفر کی روش اختیار کر لے اور اس بات کی بھی گواہی دے کہ یہ رسول حق ہیں۔''گویا دعویٰ تو ایمان کا کریں' لیکن اسلام کو اختیار نہ کریں۔

سورۃ البقرۃ اور سورۂ آلِ عمران آپس میں جوڑے کی حیثیت رکھتی ہیں۔اس اعتبار سے ان میں ایک مناسبت یہ ہے کہ سورۃ البقرۃ میں زیادہ زور (emphasis) ایمان پر جبکہ سورۂ آل عمران میں اسلام پر ہے۔ ایمان اور اسلام اگرچہ ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں' لیکن اپنی جگہ پر دونوں کی علیحدہ علیحدہ حقیقت بھی ہے۔یہی وجہ ہے کہ سورۃ الحجرات کی آیت ۱۴ میں فرمایا گیا: {قَالَتِ الۡاَعۡرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلۡ لَّمۡ تُؤۡمِنُوۡا وَ لٰکِنۡ قُوۡلُوۡۤا

اَسۡلَمۡنَا وَ لَمَّا یَدۡخُلِ الۡاِیۡمَانُ فِیۡ قُلُوۡبِکُمۡ ؕ }''یہ بدو کہہ رہے ہیں ہم ایمان لے آئے ۔ (اے نبی ﷺ ! ان سے)کہیے تم ایمان نہیں لائے ہو' بلکہ یوں کہو کہ ہم اسلام لے آئے ہیں (مسلمان ہوگئے ہیں) جبکہ ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔'' معلوم ہوا کہ یہ دونوں ایک وحدت بھی ہیں' یعنی ایمان دل میں اور اسلام عمل میں۔ گویا ایک باطنی کیفیت ہے اور ایک اس کا خارجی طرزِ عمل ہے' اس کا ظہور ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اپنی جگہ پر ان کی علیحدہ categories بھی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ حدیث جبریل (جسے اُمّ السُّنَّۃ کہا جاتا ہے) کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام نے رسول اللہ ﷺ سے باقاعدہ علیحدہ علیحدہ سوال کر کے اسلام اور ایمان کی تعریف (definition) معلوم کی۔ پہلے انہوں نے دریافت کیا: یَا مُحَمَّدُ اَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِسْلَامِ (۱) ''اے محمد(ﷺ) ! مجھے اسلام کے بارے میں آگاہ کیجیے۔'' جب آپ ﷺ نے اس کی وضاحت فرما دی تو سوال کیا : فَاَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِیْمَانِ ''اچھا تو مجھے ایمان کے بارے میں آگاہ کیجیے'' تو آپؐ نے اس کی وضاحت بھی فرما دی۔

سورۃ البقرۃ میں ایمان پر جو زیادہ زور دیا گیا ہے اس حوالے سے میں تین مقامات کی طرف صرف اشارہ کر رہا ہوں۔ سورۃ کی ابتدا میں فرمایا: {الَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡغَیۡبِ وَ یُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوۃَ وَ مِمَّا رَزَقۡنٰہُمۡ یُنۡفِقُوۡنَ ۙ﴿۳﴾ وَ الَّذِیۡنَ

یُؤۡمِنُوۡنَ بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ وَ مَاۤ اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلِکَ ۚ وَ بِالۡاٰخِرَۃِ ہُمۡ یُوۡقِنُوۡنَ ؕ﴿ ۴ ﴾ } سورۃ البقرۃ کے وسط میں آیۂ بر ہے: {لَیۡسَ الۡبِرَّ اَنۡ تُوَلُّوۡا وُجُوۡہَکُمۡ قِبَلَ الۡمَشۡرِقِ وَ الۡمَغۡرِبِ وَ لٰکِنَّ الۡبِرَّ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَ الۡمَلٰٓئِکَۃِ وَ الۡکِتٰبِ وَ النَّبِیّٖنَ ۚ} (آیت ۱۷۷) اور اختتام پر یہ آیت ہے :{اٰمَنَ الرَّسُوۡلُ بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡہِ مِنۡ رَّبِّہٖ وَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ؕ کُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَ مَلٰٓئِکَتِہٖ وَ کُتُبِہٖ وَ رُسُلِہٖ } (آیت ۲۸۵) ان تینوں مقامات کے مطالعے سے معلوم ہو گا کہ زیادہ زور ایمان پر ہے‘ جبکہ سورۂ آل عمران میں زیادہ زور اسلام پر ہے‘ جیسا کہ ہم نے ابھی مطالعہ کیا۔

_____(۱) صحیح مسلم‘ کتاب الایمان‘ باب بیان الایمان والاسلام والاحسان۔

ان آیاتِ مبارکہ کی روشنی میں وہ لوگ جو ایمان کے مدّعی ہوں اور پھر اسلام کو اختیار نہ کریں‘ یہ درحقیقت وہ category ہے جس میں آج کا مسلمان شامل ہے کہ دعویٰ تو ایمان کا ہے لیکن اسلام کو ایک دین کی حیثیت سے اختیار کرنے کو تیار نہیں۔ یہ ہے ہمارا تضاد! گویا زیر مطالعہ آیتِ مبارکہ ‘بڑی تہدید والی آیت ہے اور یہ سب سے زیادہ آج کے مسلمان پر منطبق ہوتی ہے۔ فرمایا : {کَیۡفَ یَہۡدِی اللّٰہُ قَوۡمًا کَفَرُوۡا بَعۡدَ اِیۡمَانِہِمۡ وَ شَہِدُوۡۤا اَنَّ الرَّسُوۡلَ حَقٌّ وَّ جَآءَہُمُ الۡبَیِّنٰتُ ؕ}’’اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو کیسے ہدایت دے گا جو اپنے ایمان کے بعد کفر کی روش اختیار کریں ؟اور انہوں نے اس بات کی بھی گواہی دی کہ رسولؐ حق ہیں اور وہ روشن نشانیاں لے کر آئے ہیں۔‘‘ {وَ اللّٰہُ لَا یَہۡدِی الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿ ۸۶ ﴾}’’اور اللہ ایسے ظالموں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔‘‘

اگر یہ لوگ بھی اسلام کو ایک دین کی حیثیت سے اختیار کرنے کو تیار نہ ہوں تو پھر سب سے بڑے ظالم تو یہ ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے بڑے مجرم تو یہ ٹھہرے۔ جو ایمان کا دعویٰ نہیں کرتے اُن کا معاملہ تو علیحدہ ہو گیا‘ لیکن اگر دعویٰ ایمان کا ہو اور اسلام کو ایک دین کی بجائے علامت کے طور پر اختیار کریں‘ اور محض اسی پر فخر ہو کہ ہم اُمّت ِ محمد ﷺ ہیں‘ بلکہ عشق ِ رسولؐ کا بھی دعویٰ ہو‘تو ایسا طرزِ عمل اختیار کرنے والوں کے بارے میں قرآن کا فیصلہ ہے :{اُولٰٓئِکَ جَزَآؤُہُمۡ اَنَّ عَلَیۡہِمۡ لَعۡنَۃَ اللّٰہِ وَ الۡمَلٰٓئِکَۃِ وَ النَّاسِ اَجۡمَعِیۡنَ ﴿۸۷﴾ }’’یہ تو وہ لوگ ہیں جن کی سزا یہ ہے کہ ان پر لعنت ہے اللہ کی اور فرشتوں کی اور تمام انسانوں کی۔‘‘

اگر دعویٰ ایمان کا ہے لیکن نظام وہی اپنایا ہوا ہے جو نہ ماننے والوں کا ہے تو یہ منافقت ہو گئی ! قول و عمل کے تضاد پر اللہ تعالیٰ کا غضب کفر کے مقابلے میں کہیں زیادہ بھڑکتا ہے۔ یہ مضمون قرآن حکیم میں کئی مقامات پر آیا ہے ۔ سورۃ النساء میں الفاظ آئے ہیں : {اِنَّ الۡمُنٰفِقِیۡنَ فِی الدَّرۡکِ الۡاَسۡفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ} (آیت ۱۴۵) ’’بے شک منافق جہنّم کے سب سے نچلے طبقے میں ہوں گے۔‘‘ یہاں فرمایا:{خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَا ۚ لَا یُخَفَّفُ عَنۡہُمُ الۡعَذَابُ وَ لَا ہُمۡ یُنۡظَرُوۡنَ ﴿ ۱۶۲ ﴾}’’ہمیشہ رہیں گے اس میں‘ ان

پر سے عذاب میں کوئی تخفیف نہ ہو گی ا ور نہ ہی انہیں کوئی مہلت ملے گی۔ ''عذاب کے ضمن میں نرمی کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ عذاب کی شدّت میں کچھ تخفیف ہو جائے' اور دُوسری یہ کہ کچھ دیر کے لیے اس کا سلسلہ روک دیا جائے اور پھر کچھ وقفے کے بعد عذاب دوبارہ شروع ہو جائے۔یہاں پر اِن دونوں صورتوں کی نفی کر دی گئی۔

البتہ اس سلسلے کی آخری آیت ہمارے لیے اُمید کی ایک کرن ہے۔ فرمایا: {اِلَّا الَّذِیۡنَ تَابُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِکَ وَ اَصۡلَحُوۡا ۫ فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۸۹﴾} ''سوائے اُن کے جو اس کے بعد توبہ کریں اور اصلاح کر لیں تو اللہ بڑا غفور بڑا رحیم ہے۔'' یہ توبہ اور اصلاح انفرادی سطح پر بھی ہو گی اور اجتماعی سطح پر بھی۔انفرادی سطح پر توبہ کے ضمن میں کم از کم یہ مطلوب ہے کہ امکانی حد تک اپنی ذاتی اصلاح کی جائے اور اپنی معاش' معاشرت اور گھریلو زندگی کے معاملات کو منکرات سے پاک کیا جائے۔ بالفاظِ دیگر اللہ تعالیٰ کی حکومت اور خلافت کو اپنی ذات اور اپنے دائرۂ اختیار میں قائم کرنا ہو گا۔یوں اس انفرادی سطح پر توبہ سے انسان کم از کم اُخروی عذاب سے تو بچ سکے گا۔ اس ضمن میں یہ بات ہمیشہ پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ انفرادی توبہ تو میرے اور آپ کے دائرۂ اختیار میں ہے' لہٰذا اس میں کوئی عذر یا تاخیر اللہ تعالیٰ کے ہاں قابلِ قبول نہیں۔

جہاں تک اجتماعی سطح پر توبہ کا تعلق ہے' اس کا تقاضا یہ ہے کہ قوم میں ایک کثیر تعداد میں ایسے لوگ جمع ہو جائیں جو انفرادی سطح پر توبہ کر چکے ہوں اور پھر وہ ایک قوت بن کر باطل نظام سے ٹکرا جائیں۔ اس کے نتیجے میں انقلاب آجائے گا 'جس کا مطلب یہ ہو گا کہ ہم نے اب اسلام کو ایک نظام کی حیثیت سے اپنی اجتماعی زندگی پر نافذ کر دیا ہے۔یہ اجتماعی سطح پر توبہ ہوجائے گی۔

اجتماعی توبہ میرے اور آپ کے بس میں نہیں ہے۔ جب قوم کی ایک بڑی تعداد اسلام کو بحیثیت دین قبول کرے گی تب ہی ایسا ممکن ہو گا۔ اس اجتماعی توبہ کے لیے جدّوجُہد کو نظامِ خلافت کے قیام کے لیے کوشش کہہ لیں یا نظامِ اسلامی کے قیام کے لیے اسلامی انقلاب کا نام دے لیں' اصلاً یہ مختلف عنوانات سے اجتماعی توبہ کی سعی اور جدّوجُہد ہے۔ اس کا

طریق کار یہی ہے کہ لوگ انفرادی سطح پر توبہ کرنے کے بعد جمع ہو کر ایک طاقت بنیں اور پھر باطل کے نظام کو تلپٹ کر کے اسلام کو بحیثیت دین قائم کر دیں۔ اسی کا نام اقامت ِدین ہے' جس کا حکم بایں الفاظ دیا گیا:{اَنۡ اَقِیۡمُوا الدِّیۡنَ وَ لَا تَتَفَرَّقُوۡا فِیۡہِ ؕ} (الشوریٰ:۱۳) ''کہ دین کو قائم کرو اور اس میں متفرق نہ ہوجائو!'' اگر یہ کر لیں گے تو گویا ہماری اجتماعی توبہ ہو گئی۔ پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت کا وعدہ ہے۔ جیسے فرمایا: {اِلَّا الَّذِیۡنَ تَابُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِکَ وَ

اَصۡلَحُوۡا ۟ فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿ ۸۹ ﴾} اللہ تعالیٰ اِن آیات کی برکت سے ہمیں فوری طور پر انفرادی توبہ کی توفیق عطا فرمائے اور اجتماعی توبہ کے لیے اپنا تن‘ من‘ دھن وقف کرنے کی ہمت عطا فرمائے۔ آمین !

انسانی زندگی کے انفرادی اور اجتماعی گوشے

اب تک کی گفتگو کے حوالے سے پہلی بات تو یہ سامنے آگئی کہ اسلام اصلاً دین ہے‘ صرف مذہب نہیں۔ دُنیا میں آج جو تصوّر کارفرما ہے ‘ بین الاقوامی سطح پر جس تہذیب کا غلبہ ہے اور جو حقائق اب درجہ بدرجہ منکشف ہو رہے ہیں‘ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑی گہری سازش اور پلاننگ کے تحت ایک مخصوص فکر کو پھیلایا گیا ہے ۔ اس فکر کو ’’نیو ورلڈآرڈر‘‘ کا نام دیا گیا ہے۔ ’’Novo Ordus Seclorum‘‘ کے الفاظ امریکہ کے ایک ڈالر کی مالیت کے نوٹ پر بھی کندہ ہیں۔ ’’نیو ورلڈ آرڈر‘‘ کا خاکہ درحقیقت ۱۷۷۱ء میں تیار کیا گیا تھا‘ جس کے مطابق دنیا کے اندر سوچ کے رُخ کو ایک خاص انداز میں ڈھالا گیا اور اس میں یہ بات شامل کی گئی کہ مذہب سے اجتماعی زندگی کا تعلق منقطع کر کے تمام مذاہب کو صرف انفرادی زندگی تک محدود کر دیا جائے۔

عام طور پر انسانی زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے‘ پھر ہر حصّہ تین ذیلی حصوں پر مشتمل ہے۔ انسانی زندگی کے جو یہ چھ گوشے (۳+۳) مانے جاتے ہیں ان میں سے تین کا تعلق انفرادی اور بقیہ تین کا تعلق اجتماعی زندگی سے ہے۔ جو گوشے انسان کی انفرادی زندگی کا احاطہ کرتے ہیں وہ ’’عقیدہ‘ عبادات اور کچھ معاشرتی رسومات‘‘ پر مشتمل ہیں۔ عقیدہ کے ضمن میں کوئی ایک خدا کو مانے‘ ہزار کو مانے یا کسی کو نہ مانے‘ سیکولرازم کی رُو سے ہر فرد یہ

فیصلہ کرنے میں آزاد ہو گا۔ اسی طرح مراسمِ عبودیت کی ادائیگی کس طریقے سے ہو گی‘ آیا مسجد میں جانا ہے‘ مندر میں‘ چرچ میں یا کہیں بھی نہیں‘ یہ بھی ہر فرد کا انفرادی معاملہ ہو گا۔ انفرادی زندگی کا تیسرا گوشہ معاشرتی رسومات (social customs) سے بحث کرتا ہے۔ یعنی بچے کی پیدائش پر کیا رسومات ادا کرنی ہیں؟ شادی کن رسوم و رواج کے مطابق ہو گی؟ نکاح ہو گا‘ یا پھیرے ڈلوائے جائیں گے‘ یا گرجے میں جانا ہو گا ؟ وغیرہ۔ اسی طرح کسی فرد کی موت کی صورت میں میّت کی تدفین ہو گی یا اسے جلایا جائے گا یا گِدھوں اور چیلوں کو کھلا دیا جائے گا۔ سیکولرازم میں یہ تمام معاملات افراد کی اپنی صوابدید پر چھوڑ دیے گئے۔

اسی طرح اجتماعی زندگی کے بھی تین ہی گوشے ہیں جو معاشرتی‘ معاشی اور سیاسی نظام سے بحث کرتے ہیں۔ سیکولرازم یا نیو ورلڈ آرڈر کی رُو سے اجتماعی زندگی کے اِن تینوں گوشوں کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہو گا۔ افراد اپنی کثرتِ رائے سے‘ اپنے نمائندوں کے ذریعے قانون سازی کر کے طے کریں گے کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط۔ مثال کے طور پر کسی معاشرے میں شراب محض اس لیے حرام قرار نہیں دی جا سکے گی کہ اسلام میں حرام ہے۔ اسی طرح کسی اور مذہب میں کوئی اور چیز حرام ہے تو اُس پر بھی مذہب کی بنیاد پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جا

سکے گی‘ البتہ کثرتِ رائے سے اگر فیصلہ ہو جائے تو اسے حرام قرار دیا جا سکے گا۔ اس کی انتہا یہ ہے کہ دو مرد اگر اپنی جنسی خواہش ایک دوسرے سے پوری کرنا چاہیں اور میاں بیوی کی حیثیت سے رہنا چاہیں تو کثرتِ رائے سے ایسا قانون بھی بن سکتا ہے۔ گویا اجتماعی زندگی میں قانون سازی عوام کی کثرتِ رائے سے اُس کے نمائندوں کے ذریعے عمل میں آئے گی‘ اور یہی دراصل سیکولرازم ہے۔

یہاں درمیان میں ایک اہم چیز اور آتی ہے جو اِس وقت دنیا میں مابہ النزاع بنی ہوئی ہے۔ اس لیے کہ ایک طرف تو وہ انفرادی ہے اور دوسری طرف اس کا تعلق اجتماعیت سے بھی جڑتا ہے‘ اور وہ ہے عائلی قوانین (family laws)۔ یہ اس اعتبار سے انفرادی زندگی کا حصّہ بنتے ہیں کہ ازدواجی بندھن میں بندھنے کے لیے آیا نکاح کرنا ہے‘ پھیرے ڈلوانے ہیں یا چرچ میں شادی کی رسومات ادا کرنی ہیں‘ یہ فرد کا انفرادی معاملہ ہے۔ لیکن دوسری

طرف یہ اجتماعیت کا نقطۂ آغاز بھی تو ہے۔ معاشرت اور اجتماعیت کی پہلی اینٹ تو یہی ہے۔ لہٰذا اس معاملے میں اگر کسی مذہب کا عمل دخل قبول کر لیا جائے تو سیکولرازم کی رو سے یہ مذہب کی طرف سے اجتماعیت کے اندر نقب لگانے کے مترادف ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اِس وقت دنیا میں اس بات کا بڑا چرچا ہے کہ عائلی قوانین کے ضمن میں ایک کامن سول کوڈ (Common Civil Code) ہونا چاہیے‘ اور یوں یہ معاملہ بھی مذاہب کے زیر اثر نہیں چھوڑنا چاہیے۔ اِس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ اگر آپ امریکہ میں رہ رہے ہیں تو شادی بیاہ کے ضمن میں وہاں آپ پر امریکی قوانین کی پابندی لازمی ہے‘ خواہ آپ کا تعلق کسی بھی مذہب سے ہو۔ یہی کشمکش اب بھارت میں بھی جاری ہے۔ ہندوئوں کی ہر ممکن کوشش ہے کہ کسی طور بھارتی مسلمانوں کے عائلی قوانین ختم کر کے ایک کامن سول کوڈ کا اطلاق کیا جائے‘ جو اُن کے نزدیک قومی یکجہتی کے لیے ناگزیر ہے۔ گویا یہ کوشش پورے شدّ و مدّ سے جاری ہے کہ اس سے پیشتر کہ مذہب اجتماعی زندگی میں کچھ نقب لگائے‘ کیوں نہ سیکولرازم کو مذہبی زندگی اور گھر کے دائرے کے اندر نقب لگانے کا موقع فراہم کیا جائے اور گھر کی چار دیواری میں بھی مذہب کا عمل دخل ختم کر دیا جائے۔ لہٰذا اِس وقت ایک بڑی گہری سازش کے تحت اس بات کی پوری کوشش ہو رہی ہے کہ مذہب کو انفرادی زندگی سے بھی بے دخل کر دیا جائے۔ یہ بات انسانی ذہنوں کے اندر اس طرح اُتار دی گئی ہے کہ پوری دنیا اسی اصول پر کارفرما ہے۔ مسلمان بھی بظاہر اسلام کا نعرہ تو لگاتے ہیں لیکن درحقیقت اسلام کو مذہب مانتے ہیں‘ دین نہیں۔ دنیا کے کسی بھی مسلم ملک میں زندگی کا کوئی بھی گوشہ ایسا نہیں جہاں اسلام کو دین کی حیثیت سے رائج کیا گیا ہو۔ بس کچھ مراسمِ عبودیت کی پابندی ہے۔ مسجدیں اچھی سے اچھی بن رہی ہیں۔ رمضان کے دوران روزے کے احکامات کے ضمن میں کچھ سختی سے عمل نظر آجائے گا۔ گویا اسلام کو ہم نے صرف کچھ مراسمِ عبودیت اور سماجی رسومات تک

محدود کر دیا ہے‘ جبکہ اجتماعی زندگی کا نقشہ ہمارا بھی وہی ہے جو غیر مسلموں کا ہے۔ یہی دراصل سیکولرازم ہے جو اِس وقت پوری دنیا کا دین ہے۔ اگرچہ کچھ احیائی تحریکوں کے ذریعے یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ اسلام کو ایک دین کی

حیثیت سے پیش کیا جائے‘لیکن فی الواقع دنیا میں کہیں بھی اسلام بحیثیت دین موجود نہیں ہے ‘ بلکہ صرف ایک مذہب بن کر رہ گیا ہے۔

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اسلام مذہب نہیں ہے۔ اسلام میں مذہب بھی ہے۔ اس کے مسلّمہ عقائد ہیں‘ جیسے توحید‘ ایمان بالرسالت‘ فرشتوں پر ایمان‘ آخرت کا عقیدہ۔ اس میں عبادات کا نظام ہے۔ نماز‘ روزہ‘ حج‘ زکوٰۃ وغیرہ ہیں۔ پھر اس کے معاشرتی قوانین ہیں۔ سماجی برائیوں (social evils)کا تصوّر ہے جنہیں ختم کرنا ہے۔ سماجی اقدار (social values)کا تصوّر ہے جنہیں عام کرنا ہے۔ اس میں شادی بیاہ ہے‘ عقیقہ ہے‘ نمازِ جنازہ ہے‘ تجہیز وتکفین ہے۔اس کے اپنے بھرپور اور مکمل عائلی قوانین ہیں‘ جنہیں مسلمانانِ پاکستان نے قومی سطح پر بحیثیتِ مجموعی مسترد کر رکھا ہے جبکہ بھارتی مسلمان ان کے دفاع میں آج تک ڈٹا ہوا ہے۔ وہ کب تک ڈٹا رہے گا‘میں یہ نہیں کہہ سکتا‘ اس لیے کہ وہاں پر حالات بڑی تیزی سے ایک دوسرے رُخ پر جا رہے ہیں۔ بہرحال ہمارے مقابلے میں اُن کا پلڑا اس اعتبار سے بھاری ہے کہ انہوں نے جدید تہذیب کو اپنے عائلی قوانین میں نقب لگانے کی اجازت نہیں دی‘ جبکہ ہمارے ہاں جدید مغربی فکر عائلی قوانین کے اندر بھی نقب لگا چکا ہے۔

۱۹۶۲ء میں ایک آرڈی نینس کے ذریعے یہاں غیر اسلامی عائلی قوانین نافذ کر دیے گئے ‘ پھر انہیں قانونی حیثیت دے دی گئی۔ تمام مکاتبِ فکر کے چوٹی کے علماء نے انہیں غیر اسلامی قرار دیا۔ ان میں سے چند نام ملاحظہ کیجیے: امیر جماعت اسلامی سیّد ابوالاعلیٰ مودودی‘ اہلِ تشیع میں سے مفتی جعفر حسین مجتہد اور حافظ کفایت حسین‘ بریلوی علماء میں سے مولانا ابوالحسنات قادری اور مولانا محمود احمد رضوی‘ دیوبندی علماء میں سے مفتی محمد شفیع صاحب‘ اہلِ حدیث حضرات میں سے حافظ عبداللہ روپڑی۔ تمام مکاتبِ فکر کے علماء نے کہا کہ یہ قوانین غیر اسلامی ہیں لیکن ایک فوجی آمر نے انہیں نافذ کیا اور وہ آج تک نافذ ہیں‘ ان میں سرِمُو فرق نہیں آیا۔ اس دوران گیارہ برس پر محیط ’’اسلامی مارشل لاء‘‘ بھی گزر گیا اور اسلامی جمہوری اتحاد کی حکومت بھی‘ لیکن پرنالہ وہیں کا وہیں ہے۔

یہ حقیقت ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ اسلام دین ہے اور مذہب اس کا ایک جزو ہے۔ جب تک ہم اسے دین کی حیثیت سے تسلیم اور نافذ نہیں کریں گے ‘ہماری کوئی حقیقت ہی نہیں۔ ہمارا مُنہ نہیں کہ ہم اللہ سے مخاطب ہوں‘ اُس سے دعا کریں‘ مخاطبہ اور مکالمہ کریں۔ ازروئے الفاظِ قرآنی:

{قُلْ یٰٓاَہْلَ الْکِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰی شَیْءٍ حَتّٰی تُقِیْمُوا التَّوْرٰىۃَ وَالْاِنْجِیْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ} (المائدۃ:۶۸)

''(اے نبی ﷺ ! ان سے) کہہ دیجیے کہ اے اہلِ کتاب ! تم کسی شے پر نہیں ہو (تمہارا کوئی مقام نہیں ہے) جب تک تم تورات اور انجیل کو قائم نہیں کرتے اور اُس کو جو نازل کیا گیا تمہاری طرف تمہارے ربّ کی طرف سے۔''

قرآن حکیم میں یہ خطاب اہلِ سے ہے' لیکن ہمارا معاملہ بھی اسی طرح کا ہے۔

دو قومی نظریہ اور علاّمہ اقبال کا خطبہ الٰہ آباد

بیسویں صدی کے دوران ایک بہت بڑی انقلابی تبدیلی کی کوشش ہوئی' جس کی بنیاد ''دو قومی نظریہ'' تھا ۔یہ وہ دَور تھا جب ہر طرف سیکولرازم کا چرچا تھا۔ پوری دنیا کی فضا متحدہ وطنی قومیت (Territorial Nationalism) کے نعرے سے گونج رہی تھی کہ ایک ملک کے رہنے والے ایک قوم ہیں اور مذہب ان کا انفرادی معاملہ ہے۔ اُس وقت بر عظیم میں ایک آواز اٹھی جو نہایت زوردار تھی ۔اگرچہ اس کے مختلف سیاسی اور تاریخی اسباب بھی تھے' لیکن جس چیز نے اسے ایک تحریک کی شکل دی وہ علاّمہ اقبال کا ۱۹۳۰ء کا خطبۂ الٰہ آباد تھا۔ انہوں نے فرمایا کہ اسلام ایک دین ہے' جس پر دورِ ملوکیت میں بہت سے پردے پڑ گئے' اور یوں اسلام کا اصل نظام لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ انہوں نے کہا کہ ہندوستان میں ہندو مسلم کشاکش کا حل بھی یہی ہے کہ اس خطے کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ ایک مسلمان اور دوسرا ہندو اکثریت کا علاقہ۔ اس سے جہاں ان دونوں قوموں میں منافرت اور کشاکش ختم ہو گی وہیں انہیں موقع مل جائے گا کہ اپنی اپنی پسند کا نظام لے آئیں۔ اس کے برعکس اگر ہندوستان ایک وحدت کی حیثیت سے آزاد ہو جاتا ہے تو مسلمان ایک غیر مؤثر

اقلیت بن کر رہ جائیں گے۔ اس صورت میں وہ اپنے نظام کو بروئے کار لانے کی پوزیشن میں نہیں رہیں گے۔ لہٰذا ہم مسلمانوں کے لیے ایک ایسا خطہ چاہتے ہیں جو اُن کی اکثریت پر مشتمل ہو۔ اس طرح انہیں یہ موقع میسّر آجائے گا کہ عرب شہنشاہیت کے دَور میں اسلام کے چہرے پر جو پردے پڑ گئے تھے ان کو ہٹا کر اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی کا نمونہ دنیا کے سامنے پیش کیا جائے' تاکہ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ اسلام نوعِ انسانی کے لیے باعث ِ رحمت ہے۔یہی وجہ ہے کہ مَیں یہ بات زور دے کر کہہ رہا ہوں کہ نظریۂ پاکستان کے ضمن میں علاّمہ اقبال کے مذکورہ خطبہ کو لوگوں کے سامنے اجاگر کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔

یہ وہ دَور تھا جب خود قائداعظم بھی اپنے چودہ نکات سے آگے نہیں بڑھے تھے۔ ابھی تک وہ اس کوشش میں تھے کہ ہندو مسلم مفاہمت کی کوئی صورت پیدا ہو جائے۔ لہٰذا یہ علاّمہ اقبال کا خطبہ الٰہ آباد ہی تھا جس نے تحریک پاکستان کو ایک نیا رُخ' نئی سوچ' نئی امنگ اور نیا تصوّر دیا ۔ اگرچہ مذکورہ خطبے میں لفظ پاکستان نہیں تھا' لیکن علاّمہ اقبال کے الفاظ "At least in the north west of India" اسی خطۂ ارضی کی نشان دہی کر رہے تھے جسے

آج دُنیا ''پاکستان'' کے نام سے جانتی ہے۔ علّامہ اقبال کے نزدیک ''دین'' کا ایک وسیع تصوّر تھا اور وہ سیاست کو بھی دین کا حصّہ سمجھتے تھے ع

''جُدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی''

وہ چاہتے تھے کہ اس خطۂ ارضی میں اسلام مذہب کی حیثیت سے نہیں' بلکہ دین کی حیثیت سے نافذ ہو۔ یہ ایک نعرۂ مستانہ تھا' جس کے فروغ کے لیے انہوں نے اپنی شاعری کو بھی ذریعہ بنایا: ؎

دیں ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملّت
ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارا!

فکری اعتبار سے علّامہ اقبال کا مذکورہ خطبہ بے حد اہمیت کا حامل ہے۔ یہ ایک بہت بڑا انقلابی نعرہ تھا جو سیکولرازم کی نفی پر مبنی تھا' جس کا اُس وقت بھی پوری دنیا پر غلبہ تھا اور آج بھی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ دورِ خلافت راشدہ کا نمونہ سامنے لانا آج دُنیا کی سب سے بڑی ضرورت ہے' کیونکہ نوعِ انسانی کا قافلہ کسی آئیڈیل نظام کی تلاش میں ٹھوکریں کھا رہا ہے۔

انسان مختلف تجربات کرتا ہے' لیکن ہر بار اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ نوعِ انسانی کی کتنی مساعی صرف ہوئیں' کتنے انسانوں نے خون دیا' کتنی جدّوجُہد ہوئی' جب کہیں کمیونسٹ انقلاب آیا تھا' لیکن آج وہ تاش کے پتوں کی طرح بکھر کر' بلکہ موم کے بنے ہوئے گھر (house of wax) کی طرح پگھل کر رہ گیا اور وہ ساری محنت اور جدّوجُہد اکارت گئی۔ یہ کتنے بڑے پیمانے پر نوعِ انسانی کا اجتماعی ضیاع اور نقصان ہے! ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ اس لیے کہ اصل ہدایت پر تو پردے پڑے ہوئے ہیں اور جو اِس ہدایت کے علم بردار ہیں وہ خود' اوروں کے پرستار بنے ہوئے ہیں۔ اپنے نظام کے اوپر وہ پردے ڈال کر بیٹھے ہیں' بلکہ یوں کہیے خزانے کا سانپ بن کر بیٹھے ہوئے ہیں جو نہ تو خود اس سے کوئی استفادہ کر سکتا ہے اور نہ ہی کسی کو قریب آنے دیتا ہے۔ یہ درحقیقت ایک بہت بڑا انقلابی مشن تھا جس کو نظریۂ پاکستان کہا جاتا ہے' اور اس کے ضمن میں علّامہ اقبال کے خطبۂ الٰہ آباد پر ازسرِنو توجّہ دینے کی ضرورت ہے۔

تقسیمِ ہند کا حاصل؟

اس سارے منظرنامے میں' جبکہ پاکستان کو قائم ہوئے تقریباً نصف صدی کا عرصہ گزر چکا' ہمیں

اس بات کا جائزہ لینا ہو گا کہ حاصل کیا ہوا! مَیں یہ نہیں کہہ رہا کہ کچھ حاصل نہیں ہوا۔ ہر چیز کی نفی کر دینا بھی انتہا پسندی ہے۔ جو چیز حاصل ہوئی ہے اس کو سمجھ لیجیے۔ اگر پورا ہندوستان ایک وحدت کی حیثیت سے آزاد ہو جاتا تو اس صورت میں اسلام کے اجتماعی نظام کے بروئے کار آنے کا امکان تقریباً صفر کے درجے میں ہوتا۔ میں ''تقریباً'' اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اس کی کلیۃً نفی بہرحال نہیں کی جا سکتی' اس لیے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی مثال ہمارے سامنے ہے کہ آپؐ نے فردِ واحد سے دعوت کا آغاز کر کے انقلاب برپا کر دیا۔ لیکن برعظیم کے زمینی حقائق کے پیشِ نظر اِس بات کا امکان تقریباً صفر تھا کہ یہاں اسلام ایک نظامِ زندگی کی حیثیت سے آ سکے۔

جدّوجُہدِ آزادی کے نتیجے میں ابتداءً دو ملک وجود میں آ گئے۔ ایک ملک میں غالب اکثریت مسلمانوں کی اور دوسرے میں ہندوؤں کی تھی۔ یوں دونوں کو یہ موقع میسّر آگیا کہ

اپنی اکثریت کی بنیاد پر اپنی اپنی پسند کا نظام لے آئیں۔ ؎

برآور ہرچہ اندر سینہ داری سرودے' نالۂ' آہے' فغانے!

مسلمانوں کو یہ سنہری موقع مل گیا کہ اپنی غالب اکثریت کو بروئے کار لاتے ہوئے اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی کا نمونہ دنیا کو دکھا دیں۔ اس کا ایک امکان پیدا ہوا' لیکن بعد میں جو صورت حال بنی اس کے نتیجے میں پاکستان دولخت ہوا اور بنگلہ دیش ایک الگ ملک کی حیثیت سے وجود میں آگیا۔ اس طرح دو کی بجائے تین ملک ہو گئے اور تقسیم کے وقت پاکستان اور بھارت کا جو نسبت تناسب تھا وہ ایک دم تبدیل ہو گیا۔ بنگلہ دیش ایک ایسا ملک ہے جس میں مسلمان اکثریت میں تو ہیں لیکن ایسی فیصلہ کن اور غالب اکثریت میں نہیں کہ اُن سے اس اصول کی بنیاد پر کوئی زیادہ توقع کی جا سکے۔ البتہ مغربی پاکستان وہ ملک ہے جہاں کم از کم نام کے مسلمان اور ایمان کے مدّعی اتنی غالب اور فیصلہ کن اکثریت میں ہیں کہ اگر یہ بالفعل چاہیں تو دنیا کی کوئی طاقت ایسی نہیں جو نظامِ اسلام کے قیام کے معاملے میں ان کے راستے کی رکاوٹ بن سکے۔ گویا پورے برعظیم پاک و ہند کے مسلمانوں کی ذِمّہ داری کا بوجھ اب ہمارے کندھوں پر آ گیا ہے۔ لہٰذا اگر اتنی غالب اور فیصلہ کن اکثریت کے باوجود بھی ہم یہاں اسلام کا نظام قائم نہیں کرتے تو پھر ہم سے بڑا بدنصیب' اللہ کا باغی اور مجرم کون ہو گا!

قائد اعظم اور سیکولرازم

آگے بڑھنے سے قبل میں قائد اعظم کے ۱۱/ اگست ۱۹۴۷ء کے متنازعہ جملے کے بارے میں ذرا وضاحت کرنا چاہتا ہوں' جس کے بارے میں مَیں یہ بھی کہا کرتا ہوں کہ کاش وہ یہ الفاظ نہ کہتے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میرے نزدیک اُن کے اس جملے کی ایک توجیہہ بھی ہے' کیونکہ میرا یہ پختہ یقین ہے کہ قائد اعظم ایک راست باز انسان تھے۔

اُن کا ظاہر و باطن ایک تھا۔ اُن کے بدترین ناقدین نے بھی تسلیم کیا ہے کہ وہ ایک راست رَو (straight forward) اور دیانت دار آدمی تھے' اُن کے قول و فعل میں تضاد نہیں تھا۔ میرے نزدیک یہ اُن کا بہت بڑا کارنامہ ہے کہ انہوں نے کم از کم یہ کام تو کر دکھایا کہ پاکستان کا قیام عمل میں آگیا' ورنہ ہندوستان اگر ایک وحدت کی حیثیت سے آزاد ہوتا تو

اس میں نظامِ اسلام کے دین کی حیثیت سے قیام کا تقریباً کوئی امکان نہیں تھا۔ لہٰذا یہ ایک بہت بڑی کامیابی (achievement) ہے جو مسلم لیگ کے ذریعے حاصل ہوئی۔ متذکرہ بالا جملے سے قائد اعظم کا منشا یہی تھا کہ یہاں ہمیں اسلام لانے کے لیے سیاسی اور جمہوری راستہ اختیار کرنا چاہیے' بجائے اس کے کہ ہم جذباتی نعرہ بازی کے ذریعے پوری دنیا کو چوکنا کر دیں۔ اس طرح یہ امکان پیدا ہو سکتا تھا کہ بنیاد پرستی (fundamentalism) جو آج ایک گالی بنا دی گئی ہے' شاید اُسی وقت بنا دی جاتی اور دنیا کی ساری سیکولر قوتیں اُسی وقت "Nip the evil in the bud" کے مصداق پاکستان کو ختم کرنے کے درپے ہوجاتیں۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایک طرح سے قائداعظم نے breathing space حاصل کی کہ جب ہم ایک مقصد جمہوری اصول کے تحت حاصل کر سکتے ہیں اور سیکولرازم بھی ہمارے راستے کی رکاوٹ نہیں بنتا تو مذہب کی بجائے اکثریت کی بنیاد پر اسلام کا نظام لایا جا سکتا ہے۔

مَیں نے اپنی کتاب ''استحکامِ پاکستان'' میں قائد اعظم کے محولہ بالا جملہ کی توجیہہ اِن الفاظ میں پیش کی ہے:

''راقم کے نزدیک قائد اعظم کا وہ قول نہ تو اُن کے سابقہ موقف سے انحراف کا مظہر تھا' اس لیے کہ قائد اعظم مرحوم خواہ ایک ''مذہبی شخصیت'' نہ تھے تاہم ہرگز دنیا کے عام سیاست دانوں کے مانند جھوٹے اور فریبی نہیں تھے اور اُن کے کردار کی مضبوطی' سیرت کی پختگی' ظاہر و باطن کی یکسانیت اور صداقت و امانت کا لوہا اُن کے بدترین دشمن بھی مانتے ہیں۔ اسی طرح اُن کا وہ متنازع جملہ حالات کے وقتی دباؤ کے تحت اعصاب کے متأثر ہوجانے کا بھی مظہر نہیں تھا' اس لیے کہ قائد اعظم کے اعصاب ہرگز اتنے کمزور نہ تھے' بلکہ وہ واقعتاً فولادی اعصاب کے مالک تھے اور بُرے سے بُرے حالات میں بھی اُن پر کبھی گھبراہٹ یا سراسیمگی کے طاری ہونے کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ راقم کے نزدیک اُن کے اس قول کی اصل توجیہہ اور اُن کے سابق موقف کے ساتھ اس کی مطابقت و موافقت کی صورت یہ ہے کہ پیشِ نظر اوّلاً برعظیم پاک و ہند میں بسنے والے مسلمانوں کے دین و مذہب' تہذیب و ثقافت اور سیاسی و معاشی حقوق کی حفاظت و مدافعت تھی جو قیامِ پاکستان کی صورت میں بتمام و کمال

حاصل ہو گئی' اور ان چیزوں کے ضمن میں ہندوئوں کے نامنصفانہ بلکہ منتقمانہ رویے سے پیدا شدہ خطرات کا سدّ باب ہو گیا۔ ثانیاً پاکستان میں واقعتاً اسلامی نظام کے بالفعل قیام کے ضمن میں اُن کے پیش نظر ایک خالص جمہوری طریقہ تھا۔ یعنی یہ کہ اگر پاکستان کے مسلمانوں میں جو ایک غالب اور فیصلہ کن اکثریت میں ہیں' واقعتاً اسلام کے ساتھ حقیقی اور واقعی لگاؤ پیدا ہو جائے اور وہ حقیقتاً اور واقعتاً اسلامی تہذیب و تمدن کے فروغ اور اسلامی قانون و شریعت کے نفاذ و اجراء کے خواہاں بن جائیں تو خالص سیکولر جمہوری نظام بھی اُن کے راستے میں ہرگز رکاوٹ نہیں بن سکتا اور اُن کے ''اجتماعی ارادے''(collective will) کے بروئے کار آنے میں ہرگز کوئی چیز مانع نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا فوری طور پر دستوری اور قانونی سطح پر مذہبیت کا راگ الاپنے اور پوری دنیا کو خبردار اور چوکنا کر دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک جمہوری نظام میں قانون سازی کا سارا دار و مدار کثرتِ رائے پر ہوتا ہے' لہٰذا اگر بالفرض پاکستان میں ایک سیکولر لیکن حقیقتاً جمہوری نظام قائم ہو جائے تو مسلمانوں کی عظیم اکثریت کو دین و مذہب کی جانب پیش قدمی سے کوئی چیز روک نہیں سکتی!

اب یہ تو ممکن ہے کہ کسی کو قائد اعظم کی اس رائے سے اختلاف ہو اور وہ اس طریق کار کو اسلامی نظام کے قیام اور قانونِ اسلامی کے نفاذ و ترویج کے لیے درست اور مؤثر نہ سمجھے' لیکن اس توجیہہ سے وہ سارے اشکال حل ہو جاتے ہیں جو اس جملے کے ظاہری الفاظ سے پیدا ہوتے ہیں' اور نہ کسی انحراف کا کوئی سوال باقی رہتا ہے نہ کسی وقتی اور فوری سراسیمگی کا۔ ھٰذَا مَا عِنْدِیْ وَالْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰہِ!''

ہماری مذہبی جماعتوں کا طرزِ عمل

البتہ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ بالفعل ہوا کیا ہے۔ بدقسمتی سے اسی تصوّر کو ہماری مذہبی جماعتوں نے بھی عملاً اختیار کر لیا۔ یہ حضرات قائد اعظم کے اس موقف کے حوالے سے انہیں ہدفِ تنقید بناتے ہیں' لیکن عملاً وہی کچھ کر رہے ہیں' یعنی وہی جمہوری اور انتخابی سیاست۔ مجھے اس طریقِ کار سے اختلاف کیوں ہے؟ میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اگر مسئلہ صرف مذہب کا ہوتا تو اسلام بطورِ مذہب تو بھارت میں بھی تاحال موجود ہے۔ ایک دو مسجدوں میں جھگڑا ہو جانا یا جن علاقوں میں مسلمان بالکل ختم ہو گئے وہاں کی مساجد کا اصطبل بنا دیا جانا

ایک دوسری بات ہے' ورنہ واقعہ یہ ہے کہ بھارت میں مساجد پاکستان کے مقابلے میں کہیں زیادہ آباد ہیں۔ اسی طرح اسلام بطورِ مذہب تو امریکہ میں بھی ہے۔ اصل مسئلہ ہے اسلام بطور دین اور نظام کا' اور یہ بات اچھی طرح جان لیجیے کہ نظام انتخابات کے ذریعے کبھی تبدیل نہیں ہو سکتا۔ نظام تو ہمارے ہاں جاگیرداری کا ہے۔ اسلام کے حوالے سے بھی اس نظام میں ایسی چیزیں شامل کر دی گئی ہیں جو دورِ ملوکیت کی طرح آج بھی قائم و دائم ہیں۔ وہی مسلمان جاگیردار اور سرمایہ دار آج بھی موجود ہیں جن کے بارے میں اقبال نے کہا تھا: ؎

جانتا ہوں مَیں یہ اُمّت حامل قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مؤمن کا دیں
جانتا ہوں مَیں کہ مشرق کی اندھیری رات میں
بے یدِبیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں !

چنانچہ جب یہ طرزِ عمل ہماری مذہبی جماعتوں نے بھی اختیار کر لیا تو سارا فساد یہیں پیدا ہوا۔ اس کا صغریٰ کبریٰ یہ ہے کہ اصل معاملہ نظام کا ہے' لیکن نظام انتخابات کے ذریعے بدل نہیں سکتا۔ ووٹ تو جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی گرفت میں ہیں' ان کے خلاف ووٹ کون اور کیسے دے گا؟ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے' اور یہی ہوتا بھی رہا ہے 'کہ ایک جاگیردار کے مقابلے میں کسی دوسرے کو لے آئیں۔ ایک قریشی کے بجائے دوسرا قریشی' ایک گیلانی کے بجائے دوسرا گیلانی اور ایک مزاری کے بجائے دوسرا مزاری آ جائے۔ اسی طرح قیاس کرتے چلے جایئے۔ چونکہ موجودہ نظام کے تحت پھندے میں پھنسا ہوا ووٹ اُس کے خلاف نہیں جا سکتا' لہٰذا نظام الیکشن کے ذریعے تبدیل کرنا ناممکن ہے۔

اس سارے منظر نامے میں جب ہماری مذہبی جماعتوں نے الیکشن میں حصّہ لینے کا فیصلہ کیا تو نظام کی بات انہیں خود چھوڑنی پڑی۔ مَیں کسی ایک جماعت کا نام نہیں لے رہا۔ اس راستے میں یقیناً کچھ لوگوں نے اوّلین پیش قدمی کی ہے اور کچھ اُن کے نقشِ قدم پر چلے ہیں۔ کچھ آگے بڑھے ہیں' کچھ اُن کے پیچھے آئے ہیں۔ مَیں اِس وقت کسی کو علیحدہ نہیں کر رہا' بلکہ جن مذہبی جماعتوں نے یہ سمجھا کہ الیکشن کے ذریعے وہ یہاں اسلام لا سکتے ہیں

اُن کے مجموعی طرزِ عمل کا تجزیہ کر رہا ہوں۔ اس طرزِ عمل کا منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ اس دَور میں جاگیرداروں کو راضی کرنے کے لیے ایسی کتابیں لکھی گئیں جن کے ذریعے انہیں اطمینان دلانے کی سعی کی گئی کہ اسلام میں جاگیرداری بھی ہے اور زمینداری بھی۔ ہماری مذہبی جماعتیں یہ بات اچھی طرح جانتی تھیں کہ سارا معاملہ تو اِن (جاگیرداروں اور زمینداروں) کے ہاتھ میں ہے' لہٰذا اگر یہ طبقات نہ چاہیں تو ہمارے لیے اقتدار کا راستہ کیسے ہموار ہو گا ! یوں ہماری مذہبی جماعتوں نے اپنے آپ کو دورِ ملوکیت والے اسلام کے علمبردار کے طور پر پیش کیا جس نے جاگیرداری اور زمینداری کو برقرار رکھا ہے۔ پیش نظر تو یہ تھا کہ الیکشن کے ذریعے اگر اقتدار مل جائے تو اسلامی نظام لے آئیں گے' لیکن اس بنیادی غلطی کے سبب سارا صغریٰ کبریٰ غلط ہو گیا۔ جب یہ بات سمجھ میں آگئی کہ الیکشن کے ذریعے نظام نہیں بدلا جا سکتا تو طے یہ ہوا کہ نظام پر تو انگلی مت اٹھاؤ' بلکہ جاگیردار اور زمیندار طبقے کو یہ اطمینان دلاؤ کہ ہمارے بارے میں کوئی اندیشے نہ رکھو۔ یوں ہوتے ہوتے بات صرف قانونِ شریعت تک محدود ہو کر رہ گئی۔ رہا نظام جس کے

لیے یہ ساری تگ و دَو تھی‘ وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

جب بات صرف قانونِ شریعت تک محدود ہو کر رہ گئی ‘تو کچھ لوگوں کو یہ موقع مل گیا کہ قانونِ شریعت کے نام پر کچھ ادھورے قسم کے اقدامات کیے گئے یا محض کچھ لیبل تبدیل کر دیے گئے۔ جیسے یہاں زکوٰۃ کا نفاذ عمل میں آیا‘ سود کا نام تبدیل کر کے مارک اپ رکھ دیا گیا‘ سیونگ اکاؤنٹ کو پی ایل ایس کا نام دے دیا گیا اور حدود آرڈی نینس کا نفاذ ہوگیا‘ وغیرہ ۔یوں قانون کا چہرہ کسی درجے میں تبدیل کر دیا گیا‘ رہا نظام تو وہ صد فی صد جوں کا توں رہا۔ کسی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو جائے تو کم از کم داغ تو پڑ جاتا ہے ‘لیکن یہاں تو موجودہ نظام پر کوئی داغ تک نہیں پڑا‘ وہ جوں کا توں موجود ہے۔ یہ ہے اصل میں اس سارے طرزِ عمل کا نتیجہ جو پاکستان میں نکلا۔

بھارتی مسلمانوں کی غلط حکمت ِ عملی

اِس صورت حال کا مداوا کس طرح ہو سکتا ہے اور ہمارے کرنے کا اصل کام کیا ہے؟ اس سے پہلے میں آپ کی توجّہ اس امر کی طرف مبذول کروانا چاہتا ہوں کہ بھارت کے

مسلمانوں نے اس سے بھی بڑھ کر غلطی کی کہ انہوں نے ہندو کے غلبے کے خوف کی بنیاد پر سیکولرازم کو بطورِ ڈھال اختیار کر لیا۔ ہمارا مُنہ نہیں ہے کہ ہم انہیں کوئی مشورہ دیں۔ بہت سے مواقع پر سعودی عرب‘ امارات اور امریکہ میں مقیم بعض بھارتی مسلمانوں نے مختلف ملاقاتوں کے دوران جب کوئی مشورہ مانگا تو میرا جواب یہی تھا کہ ہم اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ کوئی مشورہ آپ کے گوش گزار کریں۔ آپ کے جو بھی حالات ہیں اور جن مسائل اور مشکلات کا آپ شکار ہیں‘ اُن کے پیش نظر ہمارے پاس تو آپ کے لیے بجز ندامت اور کچھ نہیں ہے۔ آپ کی cost پر ہم پاکستان میں عیش کر رہے ہیں۔ ہم نے آپ کو ہندو کے پاس یرغمال بنوایا اور خود گوشۂ عافیت میں بیٹھے ہیں۔ پاکستان جس مقصد کے لیے بنایا تھا ‘وہ ہم نے پورا نہیں کیا۔ آپ نے تو پاکستان بنوا کر ہمیں اسلامی نظام کے قیام کے لیے ایک موقع فراہم کر دیا تھا‘ گویا ایک درجے میں آپ اپنا فرضِ کفایہ ادا کر چکے۔ چنانچہ ہم تو آپ کے مجرم ہیں ۔اب میرا بھارت آنا جانا کچھ زیادہ ہوا ہے اور وہاں بعض مشاہیر اکابرین سے میری جو گفتگوئیں ہوئی ہیں تو مَیں نے محسوس کیا کہ کچھ بات ان سے بھی کہی جا سکتی ہے۔ اگرچہ ابھی تک جتنی باتیں بھی مَیں نے ان کے سامنے رکھی ہیں‘ ماسوائے ایک دو استثناء ات کے‘ کسی کو اس بارے میں سوچنے پر آمادہ نہیں پایا۔ لیکن جو بات صحیح ہو وہ کہنی تو بہرحال ضرور چاہیے۔ کیا عجب آج کسی کے دل میں بیج پڑ جائے ‘ جو کل ظاہر ہو جائے ! اس کے امکانات بہرحال موجود ہیں۔

بھارتی مسلمانوں نے اس خوف کے سبب کہ ہندو اکثریت کی بنیاد پر بھارت میں رام راج آسکتا ہے اور اس کے نتیجے میں مسلمان ملیچھ ہو جائے گا ‘سیکولرازم کو ایک ڈھال کے طور پر اختیار کر لیا۔ سیکولرازم تو

اسلام کی نفی ہے۔ آپ کسی نظام میں مجبور ہوں تو یہ الگ بات ہے‘ جیسے بنی اسرائیل آلِ فرعون کے عذاب کی چکّی میں پس رہے تھے‘ لیکن خود کسی غیر اسلامی نظام کو ذہناً قبول کرکے اُس کے علَم بردار بن جانا درحقیقت بہت بڑی بنیادی فکری غلطی ہے۔ یہی غلطی بھارتی مسلمانوں سے مصلحت کے تحت ہوئی کہ اُن کے نزدیک اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ لہٰذا انہوں نے سیکولرازم کا سہارا لے کر قومی سیاست میں شمولیت

اختیار کر لی اور اس طرح متحدہ قومیت کے نظریے کو بالفعل تسلیم کر لیا‘ حالانکہ پاکستان بنانے میں بھارتی مسلمانوں نے حصّہ اس اصول کی بنیاد پر لیا تھا کہ مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں‘ ورنہ تحریک پاکستان میں اُن کا حصّہ لینا بے معنی تھا ۔ ایک الگ قوم ہونے کی حیثیت سے جداگانہ قومی تشخص ایک علیحدہ شے ہے‘ جبکہ علاقائی وطنیت(Territorial Nationalism) اور سیکولرازم ایک بالکل دوسرا دین ہے۔ ان دونوں میں نہ کوئی ربط ہے اور نہ مناسبت۔

درحقیقت ہونا یہ چاہیے تھا کہ بھارت کے مسلمان اپنے اسی موقف پر قائم رہتے کہ ہم علیحدہ قوم ہیں اور عظیم تر ہندی قومیت کا جزو نہیں ہیں۔ اپنے لیے ان اقلیتی حقوق کی گارنٹی مانگتے جو دنیا میں اقلیتوں کے مسلّمہ حقوق ہیں‘ اور اگر ان کے حقوق کو کوئی خطرہ لاحق ہوتا تو اس کے تحفظ کے لیے ایجی ٹیشن کا راستہ اختیار کرتے۔ لیکن بدقسمتی سے سیکولرازم کو ڈھال بنا کر اور متحدہ قومیت کے نظریے کو ذہناً‘عقلاً اور عملاً قبول کر کے بھارتی مسلمانوں نے آج تک پایا تو کچھ نہیں‘ لیکن کھویا بے پناہ ہے۔ جو کچھ پایا ہے‘ وہ ایجی ٹیشن کے راستے سے ہی پایا ہے۔ ’’شاہ بانو کیس‘‘ میں بھارتی سپریم کورٹ نے مسلمانوں کے عائلی قوانین میں دراندازی کرتے ہوئے طلاق کے قانون میں صرف ایک اضافہ کر دیا تھا کہ اگر کوئی مسلمان اپنی بیوی کو طلاق دے دے تو جب تک مطلّقہ عورت کی دوسری شادی نہ ہو جائے یا اُس کا انتقال نہ ہو جائے‘ اُس کا نان نفقہ سابقہ شوہر کے ذِمّہ رہے گا۔ یہ بات ذہن میں رکھیے کہ اگر مطلّقہ عورت کسی وجہ سے دوسری شادی نہ کرنا چاہے اور سابقہ شوہر اُس کی مالی معاونت کرنا چاہے تو اسلام اس سے روکتا نہیں‘ لیکن سابقہ شوہر یہ سب کسی پابندی کے بغیر تبرّعاً اور رضاکارانہ طور پر کرے گا۔ اس ضمن میں اسلام سابقہ شوہر پر کوئی پابندی عائد نہیں کرتا۔ اسلام میں شوہر کی ذِمّہ داری صرف عدّت پوری ہونے کی حد تک ہے۔ جیسے ہی عدّت پوری ہوئی اور علیحدگی عمل میں آ گئی تو سابقہ شوہر کی ذِمّہ داری ختم ہوجائے گی۔ سپریم کورٹ کے مذکورہ بالا فیصلے کے خلاف بھارتی مسلمانوں نے مسلم پرسنل لاء بورڈ تشکیل دے کر احتجاجی تحریک چلائی‘ جلسے کیے‘ جلوس نکالے‘ جس کے نتیجے میں گولیاں بھی چلیں اور مسلمانوں نے جانیں بھی دیں‘یہاں تک کہ اس ایجی ٹیشن کے نتیجے میں حکومت کو گھٹنے ٹیکنے

پڑے ‘اور یہ قانون بن گیا کہ مسلمانوں کے پرسنل لاء میں بھارت کی کوئی عدالت دخل نہیں دے سکتی۔ تاریخی اعتبار سے یقیناً یہ ایک بہت بڑی کامیابی اور achievement تھی جو مسلمانانِ ہند کو ایجی ٹیشن کے راستے سے حاصل ہوئی۔ الیکشن کے راستے سے تو ایسا ہونا ناممکن تھا۔ الیکشن کے ذریعے کتنے مسلمان بھارتی پارلیمنٹ میں آسکتے ہیں؟ پورے بھارت میں ماسوائے دو یا تین سیٹوں کے ایک بھی یقینی مسلم سیٹ نہیں ہے۔ لہٰذا کہیں بھی مسلمان اپنے ووٹ کے بل پر الیکشن نہیں جیت سکتے۔ نتیجۃً کسی بھی سیکولر پارٹی‘ خواہ وہ کانگریس ہو یا جنتا دَل‘ سے مفاہمت کر کے انہی کے ٹکٹ پر الیکشن لڑنا پڑے گا اور یوں ان پارٹیوں کے پورے نظریے‘ فلسفے اور منشور سے اتفاق کرنا پڑے گا۔ اس کا نتیجہ یہ نکل رہا ہے کہ مسلمانوں کا اپنا جداگانہ تشخص ختم ہو رہا ہے۔

مسلمانوں کے اس طرزِ عمل کے سبب بھارت میں ایک خاص کلچر فروغ پا رہا ہے۔ اونچے طبقے میں تو ہندو مسلم کلچر آپس میں گھل مل گئے ہیں اور اسلامی کلچر ختم ہوتا جارہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی عوامی سطح پر بھی بڑی تیزی سے تبدیلی رونما ہو رہی ہے اور دانشور‘ صحافی‘ سیاست دان سبھی سیکولرازم کو ہی اصل حقیقت سمجھنے لگے ہیں۔ گویا اسلام ایک دین کی حیثیت سے قصّۂ ماضی بنتا جا رہا ہے۔ بقول اکبر الٰہ آبادی : ؎

میرے اسلام کو اب قصّۂ ماضی سمجھو!
ہنس کے وہ بولی کہ پھر مجھ کو بھی راضی سمجھو!

اس طرزِ عمل کا لازمی نتیجہ تو یہی نکلے گا اور ہندو اکثریت اسی پر راضی ہو جائے گی۔ اب جھگڑا اور کس بات کا ہے؟ رہا مسلمانوں کے مسجدوں میں جانے کا معاملہ تو اس پر نہ تو پہلے کوئی پابندی تھی نہ اب کوئی اعتراض ہو گا۔ مقبروں اور مزاروں کی تو ہندو خود بھی حفاظت کرتے ہیں۔ اس کا ایک نمونہ مَیں خود گزشتہ دورۂ بھارت کے دوران حصار میں دیکھ آیا ہوں۔ وہاں ایک بہت بڑے نقشبندی بزرگ مظفر علی خان کی قبر ہے‘ جس کا بڑے احسن طریقے سے خیال رکھا جا رہا ہے‘ حالانکہ اس علاقے میں ایک بھی مسلمان آباد نہیں۔ جس کمرے میں یہ قبر واقع ہے اس کے طاقوں میں ہندوئوں نے اپنے بُت بھی سجا رکھے ہیں۔ مزاروں اور

قبروں کی بے حرمتی تو وہ بھی نہیں کرتے‘ بلکہ وہ تو مزاروں کی زیارتیں بھی کرتے ہیں۔

اس ضمن میں ایک اور اہم بات یہ ہے کہ بھارت میں مسلمانوں کے ووٹ کے استعمال نے آج تک منفی نتائج ہی پیدا کیے ہیں۔ ایک الیکشن میں نس بندی کے ایشو پر مسلمانوں کا ووٹ تقریباً یکجا ہو کر اندرا گاندھی کے خلاف کاسٹ ہو گیا تھا‘ جس کے سبب اسے شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ اگلے الیکشن میں اُس نے ہندی کارڈ کھیلا اور یوں ہندو جذبات کو اپیل کر کے وہ جیت گئی۔ اسی سے یہ بی جے پی کا سارا ہنگامہ کھڑا ہوا‘ ورنہ اس سے پہلے تو

بھارتیہ جنتا پارٹی کی بھارتی سیاست میں کوئی حیثیت ہی نہیں تھی۔ جب انہوںنے دیکھا کہ مسلمان اپنے ووٹ کے ذریعے اس قدر مؤثر ہو سکتا ہے تو انہوں نے اکثریتی ووٹ کو ہندومت کے نام پر اپیل کیا۔ اس کے بھارتی سیاست پر دُور رس اثرات مرتّب ہوئے اوربی جے پی ایک بھرپور سیاسی قوت بن کر اُبھری ۔یوں مسلمانوں کو لینے کے دینے پڑ گئے۔ بجائے فائدے کے الٹا نقصان ہوگیا۔

بھارتی مسلمانوں کی خدمت میں چند گزارشات

اس صورت حال میں کیا خطرات مضمر ہیں' ان کے حوالے سے اب مجھے کچھ باتیں عرض کرنی ہیں۔ گو یہ باتیں بظاہر باریک اور چھوٹی نظر آتی ہیں' لیکن بسا اوقات بڑے بڑے دانشوروں کے لیے بھی سمجھنی مشکل ہو جاتی ہیں۔ ہمیں اپنی بات کہنے میں کوئی جھجک نہیں ہونی چاہیے۔ کیا عجب اللہ تعالیٰ ان باتوں کے لیے لوگوں کے سینوں کو کھول دے۔

مَیں آپ کی توجّہ ایک مرتبہ پھر علّامہ اقبال کے خطبۂ الٰہ آباد (۱۹۳۰ء) کی طرف مبذول کروانا چاہتا ہوں' جس میں انہوں نے یہ بھی فرمایا تھا کہ سیکولرازم ہندو کی ضرورت ہے' اس لیے کہ ہندو کوئی قوم ہیں ہی نہیں۔ ہندوئوں میں تو چار ورن برہمن' کھشتری' ویش اور شودر ہیں۔ ان کے درمیان تو ایسے ایسے فاصلے ہیں جن کو عبور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ جو برہمن پیدا ہو گا وہ برہمن ہی مرے گا۔ اسی طرح جو کھشتری ' ویش یا شودرپیدا ہو گا وہ کھشتری' ویش اور شودر ہی مرے گا۔ لہٰذا وہ ایک قوم کیسے ہو جائیں گے؟اسی وجہ سے انہیں ایک قوم بننے کے لیے سیکولرازم کی ضرورت ہے۔ اس کے برعکس مسلمان تو ایک قوم ہیں ۔ جب

مسلمان سیکولرازم کا نعرہ لگاتے ہیں تو بنیادپرست اور انتہا پسند ہندو تنظیمیں اِس سے یہ نتیجہ اخذ کرتی ہیں کہ اس میں یقیناً مسلمانوں کا فائدہ اور ہمارا نقصان ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ بھارت میں انتہا پسند ہندو تنظیموں کے ذریعے سیکولرازم کے خلاف ایک تحریک پروان چڑھ رہی ہے۔ اس صورت حال میں بھارتی مسلمانوں کے کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ وہ ایک اقلیت کا کردار ادا کریں۔ وہ اس بات کا واضح طور پر اعلان کریں کہ ہم ایک علیحدہ قوم ہیں' اور اس فریم ورک میں رہتے ہوئے اپنے حقوق کی گارنٹی کا مطالبہ کریں۔ اپنے حقوق کے ضمن میں اگر کوئی دست اندازی اور مداخلت ہو تو ایجی ٹیشن کا راستہ اختیار کریں۔

اگرچہ عائلی قوانین کے ضمن میں مسلمانوں نے اس بات کو منوا کر چادر اور چار دیواری کا تحفظ تو کر لیا ہے ،لیکن یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ سیکولرازم کے زیراثر مسلمان دانشوروں کا ایک خاصا بڑا طبقہ ایسا پیدا ہو چکا ہے جو کامن سول کوڈ کا طرف دار بنا ہوا ہے۔ اس غیر تسلی بخش صورت حال کے باوجودمَیں نے اپنے حالیہ سفر بھارت کے دوران وہاں کے مختلف مسلمان صحافیوں' سیاست دانوں اور اکابرین سے مفصل گفتگوئیں کی ہیں۔

ڈاکٹر سلمان حسینی ندوی جو مولانا علی میاں کے بڑے بھائی کے نواسے ہیں اورا نہیں مولانا کے جانشین کی حیثیت حاصل ہے' ان سے بھی بڑی مفصل گفتگوئیں ہوئیں۔ جماعت اسلامی ہند کی چوٹی کی قیادت سے بھی ملاقاتیں ہوئیں اور گفتگوئیں رہیں۔ سیّد شہاب الدین صاحب ایک اہم مسلمان رہنما ہیں جن کا بابری مسجد اور رام جنم بھومی کے نازعے میں بڑا اہم رول ہے' ان سے بھی بڑی مفصل ملاقات ہوئی۔ دیوبندی حلقہ کے تھانوی مکتب ِفکر سے تعلق رکھنے والے بعض علماء سے بھی ملاقاتیں ہوئیں۔میں نے اپنا نقطۂ نظر بڑی وضاحت کے ساتھ اُن کے سامنے رکھا ہے' لیکن تاحال اُن کا جواب حوصلہ افزا نہیں۔ تاہم میں اپنی کوششیں جاری رکھوں گا۔

اس ضمن میں سب سے اہم لیکن ذرا مختلف رول جماعت اسلامی ہند کا رہا ہے۔ جماعت اسلامی جب ۱۹۴۱ء میں قائم ہوئی تو وہ اپنے نظریات کے اعتبار سے بڑی اصولی اور انقلابی جماعت تھی۔ اس کا واضح موقف تھا کہ جہاں پر اللہ کی حکومت نہیں ہے وہ نظام

طاغوت ہے' لہٰذا ایسے نظام کے ساتھ کوئی تعاون نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اس کا نہایت درست اور اصولی موقف تھا' کیونکہ اگر آپ کسی طاغوتی نظام کے تحت الیکشن میں حصّہ لیں گے تو یہ طاغوت کے ساتھ تعاون کے مترادف ہے۔ ایسے نظام میں حکومت کی ملازمت اختیار کرنا بھی اس کا سہار ا بننے کے ذیل میں آئے گا۔ چنانچہ تقسیم سے قبل جماعت اسلامی کے نزدیک انگریزی حکومت کی ملازمت' ماسوائے دو محکموں تعلیم اور ڈاک کے 'حرام تھی۔ خاص طور پر عدلیہ کا محکمہ جہاں فیصلے غیر اللہ کے قانون کے تحت ہوتے ہوں' اس میں ملازمت بھی حرام تصوّر کی جاتی تھی اور وکالت کا پیشہ بھی۔آج آپ کو جماعت اسلامی کا یہ موقف بڑا عجیب محسوس ہو رہا ہو گا کہ معلوم نہیں یہ کون سی دنیا کی باتیں ہیں' لیکن ذرا ماضی میں جھانکئے تو آپ کو جماعت کا یہی اصولی موقف نظر آئے گا۔

تقسیم کے بعد پاکستان آکر جماعت نے اپنی کیفیت بدلی اور اپنے اصولی موقف سے انحراف کرتے ہوئے ایک سیاسی جماعت کا رول اختیار کر لیا۔ اس کے برعکس جماعت اسلامی ہند اپنے بنیادی اصولی موقف پر کافی عرصہ تک قائم رہی ہے اور ایک ایسے سیاسی نظام میں جہاں اللہ کی حاکمیت تسلیم نہیں کی گئی' الیکشن لڑنا حرام سمجھتی رہی ہے۔ اب وہ بھی اس عذر کے ساتھ ڈھیلی پڑ گئی ہے کہ حالات ہی ایسے ہو گئے ہیں' اب کیا کریں۔ ایک طرف ہندو مت کے احیاء (revivalism) کا مہیب خطرہ ہے تو دوسری طرف سیکولر طاقتیں ہیں جو کم از کم ہندو بالادستی کی تو علَم بردار نہیں ہیں۔ لہٰذا اُس نے یہ فیصلہ کر لیا کہ الیکشن میں تو حصّہ نہیں لیا جائے گا' لیکن ووٹ دینے کی حد تک اپنے اراکین کو آزادی دے دی ہے۔ جماعت کے مختلف رہنمائوں سے جو میری گفتگو ہوئی تو ان کا کہنا یہ تھا کہ سیکولرازم کا جو مفہوم آپ لیتے ہیں وہ ہمارے اخذ کردہ مفہوم سے مختلف ہے۔ لیکن جب تفصیل سے گفتگو ہوئی تو بات وہی نکلی۔ اس پر مَیں نے عرض کیا کہ یہی تو سیکولرازم ہے۔ سیکولرازم کا مطلب ایک ہی

ہے کہ تمام مذاہب کے ماننے والوں کو مذہبی معاملات میں آزادی۔ البتہ یہ الگ بات ہے کہ بھارت میں ہندوئوں کی عظیم اکثریت کے پیش نظر حکومت ہندو تہذیب اور کلچر ہی کا فروغ چاہے گی۔ اصولی طور پر ہندو مت' اسلام' عیسائیت اور دیگر مذاہب آئین

اور قانون کے اعتبار سے وہاں برابر (at par) ہیں۔

اسی طرح امریکہ میں بھی تمام مذاہب آئین اور قانون کی نگاہ میں برابر ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہودیوں کو امریکہ میں اس درجے مؤثر ہونے کا موقع ہی نہ ملتا۔ یہودیوں اور عیسائیوں میں تو اتنی دشمنی تھی کہ ایک شخصیت (عیسیٰ علیہ السلام) جنہیں عیسائی خُدا مانتے ہیں یہودی انہیں مرتد اور واجب القتل قرار دے کر اپنے بس پڑتے سولی پر چڑھا چکے تھے۔ یہودی انہیں آج تک (معاذ اللہ!) ولد الحرام کہتے ہیں۔ لہٰذا جب تک یہودی تمام مذاہب کو سائیڈ لائن کر کے سیکولرازم نہ لاتے تب تک اُن کے لیے ممکن ہی نہ تھا کہ وہ یوں امریکہ پر مسلط ہو کر بیٹھتے۔ چنانچہ سیکولرازم درحقیقت یہودی ذہن کی پیداوار ہے۔ اس کی رو سے مذہب اور عقیدے کو ایک طرف رکھ دیا گیا کہ یہ تو ہر فرد کا انفرادی معاملہ ٹھہرا' لیکن جہاں تک اجتماعی نظام کا تعلق ہے وہ سیکولرازم کی بنیاد پر بنے گا۔ چنانچہ اسی سبب سے اُن کے لیے راستے کھلے اور اسی کی وجہ سے یہودیوں اور عیسائیوں میں مفاہمت پیدا ہوئی۔ یہی کچھ بھارت میں بھی ہو رہا ہے اور ہندو کلچر اور تہذیب اسی راستے سے پھیلتی چلی جا رہی ہے۔ تو سیکولرازم دو نہیں درحقیقت ایک ہی ہے' اور یہ اسلام کی نفی ہے۔

اسلام کو ''مذہب'' بنا دیجیے تو یہ دس مذہبوں کے ساتھ شامل ہو سکتا ہے' لیکن اسلام کو اگر ''دین'' مانیں گے تو ایک نیام میں دو تلواریں نہیں سما سکتیں۔ دین تو ایک ہی ہو گا' دو ہو نہیں سکتے۔ ایک ہی ملک میں بیک وقت اشتراکی نظام بھی ہو اور سرمایہ دارانہ نظام بھی' ایسا تو ہو نہیں سکتا۔ یہ تو ناممکنات میں سے ہے۔ نظام تو کسی ملک میں ایک ہی ہو گا۔ لہٰذا اسلام کو جب آپ دین مانیں گے تو وہ کسی قسم کی شراکت گوارا نہیں کرے گا:

باطل دوئی پسند ہے' حق لا شریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول!

البتہ اسلامی ریاست میں {حَتّٰی یُعۡطُوا الۡجِزۡیَۃَ عَنۡ یَّدٍ وَّ ہُمۡ صٰغِرُوۡنَ ﴿۲۹﴾} (التوبۃ) کے مصداق ہاتھ سے جزیہ دے کر چھوٹے بن کر رہنے والوں کو مذاہب کی حیثیت سے قبول کر لیا جائے گا' دین کی حیثیت سے نہیں۔

بھارت میں تبلیغ اسلام کا صحیح منہج

بھارت کے مسلمان راہنما ایک بات یہ کہتے ہیں کہ ہندو معاشرے کی اونچ نیچ کے پیش نظر اُن کے لیے یہ بڑا آسان موقع ہے کہ وہ اس تفریق کی نشاندہی کرتے ہوئے اس کے مقابل اسلام کے اصولِ اخوت و مساوات کو نمایاں کریں۔ اس طرح انہیں نچلی ذاتوں میں تبلیغ کرنے کا بڑا اچھا موقع میسّر آ جائے گا۔ اس ضمن میں مَیں نے عرض کیا کہ اسلام کا تبلیغی مزاج ہرگز یہ نہیں ہے کہ گرے پڑے طبقوں کو ٹارگٹ بنایا جائے۔ ایسا انداز اُن مذاہب کا ہوتا ہے جن کے پاس کوئی دلیل نہ ہو۔ اسی سبب سے عیسائیت کا طریقہ کار یہ ہے کہ گرے پڑے پس ماندہ طبقات میں بسکٹوں اور گھی کے ڈبے وغیرہ تقسیم کر دیے جائیں اور ان کی بچیوں کی تعلیم کا کچھ بندوبست کر دیا جائے تاکہ وہ نرسیں بن جائیں۔ اسی طرح اُن کے نام بدل دیے جائیں۔ اس کے علاوہ وہ اور کیا تبلیغ کر سکتے ہیں؟ اس کے برعکس اسلام کا کبھی بھی یہ معاملہ نہیں رہا۔ اسلام تو دلیل کے ساتھ اور اونچے طبقے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتا ہے۔ ازروئے الفاظِ قرآنی :{قُلْ ہٰذِہٖ سَبِیْلِیْٓ اَدْعُوْٓا اِلَی اللّٰہِ ۰ عَلٰی بَصِیْرَۃٍ اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِیْ ط}(یوسف:۱۰۸) ''(اے نبی ﷺ !) کہہ دیجیے یہ ہے میرا راستہ مَیں اللہ کی طرف بلاتا ہوں سمجھ بوجھ کر مَیں بھی اور وہ لوگ بھی جنھوں نے میری پیروی کی ہے۔'' مَیں جو بات کہہ رہا ہوں علیٰ وجہ البصیرت کہہ رہا ہوں اور دلیل کے ساتھ کہہ رہا ہوں۔ اسلام کا چیلنج تو یہ ہے: {قُلْ ہَاتُوْا بُرْہَانَکُمْ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿ ۱۱۱ ﴾}(البقرۃ)''(اے نبی ﷺ !) کہہ دیجیے کہ لے آئو اپنی سند اگر تم سچے ہو۔'' اگر تمہارے پاس کوئی دلیل موجود ہے تو پیش کرو۔ مشنری طرز کا اندازِ تبلیغ درحقیقت اسلام کا نہیں' عیسائیت کا تصوّر ہے۔ البتہ اس اعتبار سے ہندوستان میں اگر مسلمان بادشاہوں نے اپنے دَورِ حکومت میں نچلے طبقات کی کسی درجے میں حوصلہ افزائی کی ہوتی تو اُن کی اکثریت مسلمان ہو جاتی۔ بہرحال اب وہ حالات نہیں رہے۔ لہٰذا اب اگر آپ کو از سرِ نو تبلیغ کرنی ہے تو دلیل کی طاقت سے کیجیے اور اونچے طبقے سے بات کیجیے۔

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے مصر بھیجا تو گلی گلی تبلیغ کے لیے نہیں' بلکہ حکم ہوا :

{اِذْہَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّہٗ طَغٰی ﴿۱۷﴾}(النّٰزعٰت)''(اے موسیٰ !) فرعون کی طرف جائو' اُس نے سرکشی اختیار کی ہے۔'' اسی طرح جب رسول اللہ ﷺ طائف تشریف لے گئے تو وہاں جا کر گلیوں میں تبلیغ کرنے کی بجائے آپؐ نے وہاں کے تین بڑے سرداروں سے ملاقات کی۔ جہاں تک مکہ کا معاملہ تھا' اگرچہ وہاں آپؐ نے ہر سطح پر تبلیغ کی ہے لیکن سب سے پہلے بنو ہاشم کے چوٹی کے سرداروں کو جمع کیا اور اُن کے سامنے اپنی دعوت رکھی۔ آپ ﷺ جہاں بھی پہلی مرتبہ تشریف لے گئے وہاں عوام کے بجائے خواص سے بات کی ہے۔ مَیں نے اپنے گزشتہ دورۂ بھارت میں مولانا علی میاں کی خدمت میں گزارش کی تھی کہ آپ اپنے دارالعلوم میں سنسکرت کی تعلیم کا اہتمام بھی

لیجیے‘ تاکہ آپ ایسے علماء تیار کرسکیں جو ہندو مذہب ‘ ہندو ذہن اور ہندو فکر و فلسفہ کو اس کے براہِ راست مآخذ(direct sources)سے سمجھ سکیں۔ جب تک آپ ہندو ذہن کو نہیں سمجھیں گے ‘اُسے اپیل کیسے کریں گے ! یہی بات اس مرتبہ میں جماعت اسلامی ہند کے اکابرین کے بھی گوش گزار کرکے آیا ہوں کہ اگرچہ آپ بھارت میں بولی جانے والی مختلف زبانوں میں قرآن مجید کے تراجم‘ رسائل و جرائد کے اجراء اور دیگر دینی لٹریچر کی اشاعت کے ذریعے یقیناً ایک بہت بڑی خدمت سرانجام دے رہے ہیں‘لیکن ہندو ذہن بنیادی طور پر منطقی اور فلسفیانہ ہے‘لہٰذا اُسے approach بھی اُسی راستے سے کیجیے۔ تبھی اونچے طبقے کا ہندو آپ کی بات سنے گا۔ اگر آپ نچلے طبقے کو ہی ہدف بنائیں گے تو تامل ناڈو جیسے واقعات ہوتے رہیں گے ‘جہاں نچلے طبقے کے کچھ لوگ مسلمان ہو گئے تھے تو ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا تھا۔اس کا ردِّ عمل یہ ہوا کہ ہندوئوں نے جوابی تحریک کے ذریعے راجستھان میں بے شمار مسلمانوں کو شودر بنا دیا اوریوں لینے کے دینے پڑ گئے‘ کیونکہ مسلمانوں میں بھی تو ایسے بے شمار طبقات موجود ہیں جنہیں دین کی کوئی شُدبُد نہیں۔ اندریں حالات مَیں نے اُن سے گزارش کی کہ نچلے طبقات کو ہدف بنانے کی بجائے اونچے طبقات کے ہندوئوں کے سامنے اپنی دعوت رکھیں اور اس حوالے سے شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی یہ پیشین گوئی آپ کے پیش نظر رہنی چاہیے کہ ’’ایک وقت آئے گا جب ہندوستان کے اعلیٰ ذات کے ہندوئوں کی اکثریت اسلام قبول

کرلے گی۔‘‘ لیکن یہ اُسی وقت ممکن ہو گا جب ’’ کَلِّمُوا النَّاسَ عَلٰی قَدْرِ عُقُوْلِھِمْ‘‘ کے مصداق اُن سے اُن کی ذہنی سطح کے مطابق یعنی فلسفیانہ انداز میں اور حکمت کے ساتھ بات کی جائے۔ازروئے الفاظِ قرآنی:

{اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَ الْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَ جَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ ط}(النحل:۱۲۵)

’’آپؐ بلائیے لوگوں کو اپنے ربّ کے راستے کی طرف دانائی سے اور اچھی نصیحت سنا کر‘اور بحث و مناظرہ کیجیے اُن سے بہترین انداز سے۔‘‘

اہلِ پاکستان کے لیے لمحۂ فکریہ

یہ وہ چند باتیں تھیں جو مَیں نے ڈرتے ڈرتے اور ایک عرصے کی ہچکچاہٹ کے بعد بھارتی مسلمانوں کے سامنے رکھی ہیں‘ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ اس سے پیشتر میری زبان ہی نہیں کھلتی رہی ۔ اس لیے کہ اُن کو کوئی مشورہ دینے سے پہلے ہمیں اپنا دامن دیکھنا چاہیے کہ ہم نے پاکستان میں کیا کیا۔ وہی مغرب کا جمہوری نظام‘ وہی سود پر مبنی بینکنگ‘ وہیں جوا اور سِٹّہ اور وہی جاگیرداری ہم سینے سے لگائے بیٹھے ہیں۔ اہلِ بھارت نے کم از کم جاگیرداری کا جنازہ تو آزادی کے فوراً بعد ہی نکال دیا تھا‘ لیکن ہمارے ہاں تو یہ سب سے بڑا عفریت آج بھی دندنا رہا ہے اور اسی طرح قائم ودائم ہے۔ چنانچہ بھارت کا مسلمان بھی ہم سے بازی لے گیا ہے اور وہاں کا ہندو بھی۔ البتہ سرمایہ داری کی لعنت وہاں بھی ہے‘ یہاں بھی ہے۔ ہمارے لیے لمحہ فکریہ ہے کہ وقت بڑی تیزی سے گزر رہا ہے جبکہ

حکومتی سطح پر جو اقدامات ہو رہے ہیں اور اسمبلیوں میں جو کارروائیاں ہو رہی ہیں وہ سب کے سامنے ہیں۔ ہر کوئی ایک دوسرے پر الزام تراشی کر رہا ہے۔ وہ خود اِس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ ہم سب لٹیرے ہیں ۔ بس اس سے آگے اور کوئی دلیل نہیں کہ ''ہم نے لوٹا تو تم نے بھی تو لوٹا !''گویا اِس حمام میں سبھی ننگے ہیں۔ اس لوٹ کھسوٹ کا کیا نتیجہ نکلے گا : ؎

یہ ڈرامہ دکھائے گا کیا سین؟
پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ !

اس تشویش ناک صورتِ حال کے پیش نظر میری آپ سے گزارش ہے کہ خوابِ غفلت سے بیدار ہوں' سوئے نہ رہیں۔ع

''دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا !''

اس کی ایک ہی صورت ہے کہ نظام کو بدلنے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں۔ میں حیران ہوتا ہوں کہ ڈھائی سو برس پہلے شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ علیہ یہ الفاظ کیسے کہہ گئے کہ ''فکُّ کُلّ نِظَامٍ''۔ دراصل یہ وہ نابغہ شخصیات ہوتی ہیں جو علمی اور فکری میدان میں قوم کی راہنمائی کرتی ہیں۔ میں علّامہ اقبال کا حوالہ دیتا ہوں' ان سے پہلے اس بر عظیم پاک و ہند میں علمی و فکری میدان میں نہایت جامع اور پورا شعور رکھنے والی شخصیت شاہ ولی اللہ دہلوی ؒ کی ہے۔ علّامہ اقبال نے موجودہ دَور میں مغرب کے فکر اور فلسفے کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں' جبکہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ اپنے دَور میں اسلام کی ایک مستحکم اور مثبت تعبیر کر گئے' کیونکہ اُس دَور میں ابھی مغربی فکر و فلسفہ تو آیا ہی نہیں تھا۔ اسی اعتبار سے فکُّ کُلّ نِظَامٍ کا حوالہ میں نے آپ کے سامنے رکھا۔ باطل نظام کے تار و پود بکھیرے بغیر تو حق کا نظام قائم ہونا ممکن نہیں ہے۔

نظامِ خلافت کے خدوخال

ہم نے تحریکِ خلافت کا آغاز کیا ہے تو اگرچہ ابھی تک کوئی major break through تو نہیں ہوا لیکن ایک چہ میگوئی ضرور شروع ہو گئی ہے' ہلچل سی ہے کہ یہ خلافت کی بات کدھر سے آگئی ! اس کا مطلب کیا ہے؟ وغیرہ۔ یہ ایک فطری امر ہے کہ آغاز میں کچھ مغالطے ہوتے ہیں۔ چنانچہ کہا جا رہا ہے کہ نظامِ خلافت کے قیام سے شاید ہماری مراد مُلّائوں کی حکومت (theocracy)کا قیام ہے۔ دراصل یہ چیز ذہنوں سے محو ہو چکی تھی' لہٰذا اس کا نام اب لوگوں کے لیے غیر مانوس سا ہے۔ اسی طرح کی صورتِ حال کا سامنا ہمیں اُس وقت بھی کرنا پڑا تھا

جب ہماری طرف سے بیعت کا لفظ سامنے آیا تھا' گویا ایک قیامت برپا ہو گئی تھی۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ذہنوں میں جو بھی اندیشے یا مغالطے تھے وہ دُور ہو گئے ۔ اسی طرح خلافت کا لفظ آیا ہے تو اس پر بھی لوگ چونکے ہیں۔ لہٰذا ہمیں مسلسل محنت اور جدّوجُہد سے ان مغالطوں اور شکوک و شبہات کو دُور کرنا ہے۔

اس ضمن میں چند باتیں مَیں دانشور حضرات کو نوٹ کرانا چاہتا ہوں۔ اوّلاً یہ کہ جہاں

تک لفظ خلافت کا تعلق ہے یہ صرف حاکمیت (sovereignty) کے مقابلے میں ہے۔ اسلام میں حاکمیت صرف اللہ کے لیے ہے ' انسان کے لیے نہیں۔ انسان کے لیے خلافت ہے۔ اس کے برعکس جمہوریت کا اصول عوامی حاکمیت ہے۔ اسلام میں حاکمیت کا لفظ اللہ کے سوا کسی اور کے لیے استعمال کرنا کفر ہے۔ اسی بات کے پیش نظر جمہوریت کے ساتھ ''اسلامی'' کا لفظ لگایا جاتا تھا اور ''اسلامی جمہوریت'' کا مطلب اللہ کی حاکمیت کے تحت جمہوری اور شورائی نظام لیا جاتا تھا۔ ہمارا نقطۂ نظر یہ ہے کہ جب ہمارے دین میں اس کے لیے صحیح (proper) اصطلاح موجود ہے تو کیوں نہ اسے اختیار کیا جائے۔ ثانیاً اس سے ہماری مراد وہ مکمل سیاسی' معاشی اور سماجی نظام ہے جس کا مظہرِ کامل و اَتم خلافت راشدہ تھی۔ اسی لیے ہم نے نظامِ خلافت کے دس نکات معیّن کیے ہیں جو سیاسی' معاشی اور معاشرتی پہلوئوں کا احاطہ کرتے ہیں۔

تیسری اہم بات جو مَیں نوٹ کروانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ خلافتِ راشدہ تو اَب جوں کی توں قائم ہو نہیں سکتی۔ وہ تو رسول اللہ ﷺ کے تربیت یافتہ لوگوں (صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین) کے ذریعے قائم ہوئی تھی۔ گویا وہ دورِ نبوت کا ایک ضمیمہ تھی۔ اُس وقت دلیل یہ نہ تھی کہ '' ایک آدمی ایک ووٹ '' کے ذریعے خلیفہ کا انتخاب عمل میں لایا جائے' بلکہ دلیل یہ تھی کہ محمد رسول اللہ ﷺ کا قریبی ساتھی کون ہے ! {مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ؕ وَ الَّذِیْنَ مَعَہٗٓ } (الفتح:۲۹)۔ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا نام تجویز کیا تو یہ نہیں کہا کہ بڑے سمجھ دار ہیں' بڑے فہیم اور زیرک ہیں' بلکہ یہ کہا : ''یہ عمرؓ موجود ہیں' اللہ کے رسول ﷺ دنیا سے اِس حال میں تشریف لے گئے تھے کہ اِن (عمرؓ) سے راضی تھے' لہٰذا ان کے ہاتھ پر بیعت کر لو۔'' موجودہ دَور میں یہ دلیل اب کسی کے لیے نہیں۔ اس کے علاوہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں بھی ایک درجہ بندی تھی۔ یعنی پہلے عشرۂ مبشرہ' پھر اصحابِ بدر' پھر اصحابِ بیعت رضوان۔ اس درجہ بندی کا بھی اب کوئی سوال نہیں۔ اسی طرح اُس دَور میں قبائلی نظام تھا جو اَب موجود نہیں ۔ اس اعتبار سے خلافت راشدہ کا نقشِ ثانی (replica) تو ممکن ہی نہیں۔ عصرِ حاضر میں خلافت کا جو نظام بنے گا اُس میں دورِ خلافت راشدہ سے راہنما اصول لے کر

اُن کے ساتھ دَورِ جدید کے تقاضوں اور عمرانی ارتقاء (social volution) کو سمویا جائے گا۔ علّامہ اقبال نے اپنے لیکچرز میں کہا تھا کہ اسلام کا نظامِ حکومت republican نوعیت کا ہے۔ ایسا طرزِ حکومت دنیا کو تو آج نظر آیا ہے' جبکہ اسلام کے نظامِ عدل اجتماعی کی جھلک تو دنیا دورِ خلافت ِ راشدہ میں دیکھ چکی ہے۔ آج ہمیں نظام خلافت کو دَورِ حاضر کے اعلیٰ ترین تقاضوں کے مطابق develop کرنا ہو گا۔

اس نظام کے نمایاں ترین خصائص انسانی حاکمیت کی نفی' کتاب و سُنّت کی بلا استثناء مکمل بالادستی اور کفالت ِ عامہ کے نظام کے تحت عوام کی بنیادی ضروریات کی کفالت ہیں۔ علاوہ ازیں دستور سازی کے عمل میں صرف مسلمان حصّہ لے سکیں گے اور خلیفہ صرف مسلمان مَرد ہو گا۔ یہ ہیں نظامِ خلافت کے بنیادی خدوخال ! اِس نظام کے قیام کے لیے خلوصِ نیت کے ساتھ کوشش اور جدّوجُہد ہمارا فرض ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت بھی اِن شاء اللہ ہمارے شامل ِ حال ہو گی۔

آج معاملہ صرف پاکستان کا نہیں بلکہ کم از کم پورے بر عظیم پاک و ہند کے مسلمانوں کے فرضِ کفایہ کا بوجھ ہمارے کندھوں پر ہے۔ اگر ہم اس فرض کی ادائیگی میں مزید کوتاہی کے مرتکب ہوئے تو پھر اللہ کے بھی مجرم ٹھہریں گے اور اُن کے بھی جنہوں نے ہمیں پاکستان بنوا کر دے دیا تھا۔ چنانچہ اب کمر ِ ہمت کسنے کی ضرورت ہے۔ اس تحریک سے تعاون کے لیے آگے بڑھیے۔ نظامِ خلافت کے قیام سے ہم اسلام کے اصل نظام کا وہ نمونہ دنیا کو دکھا سکیں گے جس کا خواب کبھی علّامہ اقبال اور قائد اعظم نے دیکھا تھا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں انفرادی توبہ کرنے کی بھی فوری توفیق عطا فرمائے اور اجتماعی توبہ کے لیے بھی اپنا تن' من' دھن وقف کرنے کی ہمت عطا فرمائے۔ آمین !

اقول قولی هذا واستغفر الله لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلماتoo

* * *

نبی اکرم ﷺ بحیثیت منتظم

[ایک تقریر جو ریڈیو پاکستان لاہور کے پروگرام ''خیر البشر ﷺ'' کے سلسلے میں ۷ / ربیع الاول ۱۳۹۹ھ کو نشر ہوئی]

احمدہٗ واُصَلِّی علٰی رسولہ الکریم --------- امّا بعد:

فَاَعُوْذُ بِاللهِ مِنَ الشَّیطٰن الرَّجِیْم ۔ بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

ہمارا ایمان ہے کہ نبی اکرم ﷺ صرف ایک نبی ہی نہیں ''خاتم النّبیین'' ہیں اور صرف ایک رسول ہی نہیں ''آخر المرسلین'' ہیں۔ اس طرح جہاں نفس نبوت آنحضور ﷺ اور جملہ انبیاء و رسل علیہم السلام کے مابین ایک قدر مشترک ہے ،وہاں ختم نبوت آپ ﷺ کا وہ امتیازی وصف ہے جس میں کوئی دوسرا نبی یا رسول آپؐ کا شریک و ہمسر نہیں۔ گویا اس اعتبار سے آپ ﷺ کی مبارک شخصیت میں اللہ تعالیٰ کی شانِ یکتائی کا ایک پرتو بتمام و کمال موجود ہے ۔ مزید برآں آپ ﷺ کی ذاتِ مبارکہ پر نبوت ختم ہی نہیں ہوئی ،مرتبہ ٔ اِتمام و اِکمال کو بھی پہنچی ہے اور آپؐ کی ذاتِ والا صفات پر رسالت کا سلسلہ منقطع ہی نہیں ہوا درجہ ٔ تکمیل کو بھی پہنچا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے اس اٹل فیصلہ کا اظہار و اعلان ---------کہ آپؐ پر نُورِ نبوت و رسالت کا اِتمام واِکمال بھی ہو کر رہے گا اور نعمت شریعت و ہدایت کی تکمیل بھی --------- زبانِ وحی سے بار بار ہوتا رہا۔ جیسے سورۃ الصف میں فرمایا :{ وَ اللهُ مُتِمُّ نُوْرِہٖ وَ لَوْ کَرِہَ الْکٰفِرُوْنَ ﴿ ۸ ﴾ } ''اللہ اپنے نُور کا اتمام فرما کر رہے گا خواہ یہ کافروں کو کتنا ہی ناگوار ہو''۔ اور سورۃ التوبہ میں فرمایا:{وَ یَاْبَی اللهُ اِلَّآ اَنْ یُّتِمَّ نُوْرَہٗ وَ لَوْ کَرِہَ الْکٰفِرُوْنَ ﴿ ۳۲ ﴾ } ''اللہ کو ہرگز منظور نہیں مگر یہ کہ وہ اپنے نُور کا اِتمام فرما کر رہے گا خواہ کافر کتنا ہی ناپسند کریں ''۔ اور اس پر آخری مہر تصدیق ثبت کر دی اس آیۂ مبارکہ نے جو عین حجۃ الوداع کے موقع پر نازل ہوئی :{اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ

عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ}(المائدۃ:۳)''آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت کا اتمام فرما دیا۔'' فَلَہُ الْحَمْدُ وَالْمِنَّۃ!!

اب اس پر غور فرمایئے کہ نفسِ نبوت اور ختم نبوت کے اعتبار سے نبی اکرم ﷺ کی بعثت اور بنابریں آپؐ کی شخصیت کے دو پہلو ہیں:

(۱) نفس نبوت کی رعایت سے آپ ﷺ شاہد بھی تھے اور بشیر و نذیر بھی ،بفحوائے الفاظِ قرآنی :{یٰٓاَیُّہَا النَّبِیُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰکَ شَاہِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِیْرًا ﴿۴۵﴾ } (الاحزاب) داعی بھی تھے اور مبلغ و مذکر بھی ، معلّم بھی تھے اور مربی و مزکی بھی--------- اوراس اعتبار سے آپ ﷺ کی عظمت کا مظہر اَتم وہ نفوسِ قدسیہ ہیں جو آپؐ کی دعوت و تبلیغ اور تعلیم و تربیت کے ذریعے تیار ہوئے ،جنہیں ہم صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے نام سے یاد کرتے ہیں اور

جن سے بہتر یا افضل کوئی جماعت اس زمین کی پشت پر اور اس آسمان کے نیچے لبھی دیکھنے میں نہیں آئی' رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُمْ وَاَرْضَاھُمْ اَجْمَعِیْنَ!

(۲) اِتمام و اِکمالِ نبوت و رسالت کے مقاصد کی تکمیل کے اعتبار سے آپ ﷺ نسلِ آدم کے عظیم ترین انقلابی رہنما' ہمہ گیر ترین اسلامی تحریک کے قائد' پاکیزہ ترین معاشرے اور عمدہ ترین تہذیب و ثقافت کے مؤسس' بہترین نظامِ حکومت کے بانی اور عدل و انصاف کے اعلیٰ ترین اصولوں پر مبنی نظامِ معیشت کے قائم کرنے والے ہیں --- اور ان تمام حیثیتوں سے آپ ﷺ کے کمالات کا مظہر جامع وہ نظامِ حیات ہے جو آپ ﷺ نے نوعِ انسانی کو صرف نظری طور پر ہی عنایت نہیں فرمایا بلکہ اپنی بہترین عملی و انتظامی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اسے ایک وسیع و عریض خطۂ ارضی پر بالفعل قائم فرما دیا اور اس طرح اس کا ایک کامل نمونہ عملاً پیش کر دیا تاکہ نوعِ انسانی پر ہمیشہ ہمیش کے لیے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی حُجّت بالغہ قائم ہو جائے اور محاسبۂ اُخروی کے موقع پر انسان یہ نہ کہہ سکیں کہ ہمیں اپنے اُلجھے ہوئے عمرانی عقدوں اور پیچ در پیچ سیاسی و معاشی مسائل کا کوئی متوازن اور معتدل حل دیا ہی نہیں گیا۔

یہ بات بادنیٰ تأمل سمجھ میں آسکتی ہے کہ اگرچہ آنحضور ﷺ کی بعثتِ مبارکہ کے

مقدّم الذکر پہلو کے اعتبار سے بھی حکمتِ تامّہ کی بھی ضرورت تھی اور بصیرتِ کاملہ کی بھی' بالخصوص نفسیاتِ انسانی کا گہرا فہم تو اس کے ضمن میں لازمی و لابدی اہمیت کا حامل ہے' لیکن بعثتِ محمدی علی صاحبھا الصلوۃ والسلام کا مؤخر الذکر پہلو تو ان سے بھی بڑھ کر اجتماعیاتِ انسانی کے ضمن میں گہری بصیرت اور اعلیٰ ترین انتظامی صلاحیتوں کا متقاضی تھا' جن کے بغیر اس میدان میں ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھایا جا سکتا' کجا یہ کہ کامیابی کے آخری مراحل سے ہم کنار ہوا جا سکے! اور واقعہ یہ ہے کہ سیرتِ محمدی علی صاحبھا الصلوۃ والسلام کا یہ پہلو اس درجہ روشن و تابناک ہے کہ اَغیار و اَعداء کو بھی اپنی تمام تر کورچشمی اور بدباطنی کے باوصف پوری آب و تاب کے ساتھ نظر آتا رہا ہے! چنانچہ ایچ جی ویلز ہو یا سر ولیم میور' ٹائن بی ہو یا پروفیسر منٹگمری واٹ' سب نے آنحضور ﷺ کے حسنِ تدبر و معاملہ فہمی' دور اندیشی و پیش بینی اور حسنِ تدبیر و حسنِ انتظام کو بھرپور خراجِ تحسین ادا کیا ہے۔ اگرچہ یہ سعادت تو صرف دورِ حاضر کے ایک امریکی مصنف مائیکل ہارٹ کے حصے میں آنے والی تھی کہ وہ آنحضور ﷺ کی عظمت کے دونوں پہلوؤں کو مساوی طور پر خراجِ تحسین ادا کرتا' بایں طور کہ اس نے اپنی تصنیف ''THE 100'' یعنی ''نسلِ انسانی کے سو عظیم ترین افراد'' میں آنحضور ﷺ کو سرفہرست رکھا ہے اس دلیل کے ساتھ کہ:

"He was the only man in history who was supermely successful on both the religious and secular levels".

یعنی آپ ﷺ دینی و روحانی اور دنیوی و سیاسی جملہ اعتبارات سے نسل انسانی کے کامیاب ترین فرد ہیں! واضح رہے کہ ان آراء کا تذکرہ صرف اس عربی مقولے کے پیش نظر کیا جا رہا ہے کہ ''الفضلُ مَا شهِدَتْ به الاعداءُ'' یعنی اصل فضیلت وہ ہے جس کی گواہی دشمن دیں' ورنہ ان لوگوں کے یہ اقوال نہ ہمارے لیے کسی بھی درجے میں سند ہیں' نہ آنحضور ﷺ کی عظمت کسی درجے میں ان کی محتاج ہے۔ الغرض آنحضور ﷺ کی بعثت مبارکہ کے مؤخر الذکر تکمیلی و اتمامی پہلو میں آپؐ کی تنظیمی و انتظامی صلاحیتوں کا ظہور بتمام و کمال ہوا۔

مثل مشہور ہے ''ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات'' چنانچہ نبی اکرم ﷺ کی سیرت و

شخصیت میں بھی تنظیمی و انتظامی صلاحیتوں کا ظہور شروع ہی سے ہو گیا تھا۔ تجارت اور کاروبار کے ضمن میں ان کا اظہار جس شان و شوکت سے ہوا وہ تو اظہر من الشمس ہے ہی' اس لیے کہ یہ اسی کی بنا پر ہوا کہ ایک جانب قوم نے آپ ﷺ کو ''الصَّادق'' اور ''الامین'' کا خطاب دیا اور دوسری جانب آپؐ ہی کی طرح قوم سے ''الطاهره'' کے خطاب کی صورت میں اپنی پاک دامنی اور حسنِ اخلاق کا لوہا منوا لینے والی خاتون حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی طرف سے پیغامِ نکاح موصول ہوا۔ تجارت کے علاوہ دوسرے قومی معاملات میں بھی قبل از آغازِ وحی آپ ﷺ کے حسنِ تدبیر اور حسنِ انتظام کی اعلیٰ صلاحیتوں کا ظہور وقتاً فوقتاً ہوتا رہا۔ مثلاً یہ کہ ''حِلف الفضول'' کے ذریعے آپ ﷺ نے قوم کے ایسے صالح نوجوانوں کو منظّم کرنے کی سعی فرمائی جو ظالم کا ہاتھ روکنے اور مظلوم کی مدد کرنے کے لیے جان و مال کی بازی لگانے کا حلف اٹھائیں اور کعبہ مشرفہ کی تعمیر نو کے دوران حجر اسود کو نصب کرنے کے موقع پر جس خون خرابے کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا وہ صرف آپ ﷺ کے حسنِ تدبر و حسنِ انتظام کی بدولت ٹل سکا۔

آغازِ وحی کے بعد سے ہجرت تک کے زمانے میں اگرچہ مجموعی طور پر آپ ﷺ کی سیرتِ مطہرہ کے بعض دوسرے پہلو جو دعوت و تبلیغ اور تزکیہ و تربیت سے زیادہ مناسبت رکھتے تھے زیادہ نمایاں رہے' تاہم اس دوران میں بھی ایک جانب تو حسنِ انتظام کا ظہور دعوت و تبلیغ کے لیے اختیار کیے جانے والے طریقوں اور ذریعوں کے ضمن میں ہوتا رہا' جیسے {وَ اَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ ﴿۲۱۴﴾}(الشعراء)''خبردار کیجیے اپنے قریبی عزیزوں کو'' کے حکم ربانی پر عمل کے سلسلے میں دوبار دعوتِ طعام کا اہتمام اور {فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ}(الحجر:۹۴) ''اب ڈنکے کی چوٹ کہیے جس کا حکم آپ کو دیا گیا ہے!'' کے حکم خداوندی کے ضمن میں قوم کو جمع کرنے کے لیے عمدہ ترین انتظامی تدبیر یعنی کوہِ صفا پر چڑھ کر ''واصباحاه'' کا نعرہ لگانا! وَقِسْ عَلٰی ذٰلِک --- اور دوسری طرف اسی دعوتی

وتبلیغی سرگرمی کے بالکل متوازی اور پہلو بہ پہلو آپ ﷺ کی تنظیمی استعداد بھی بھرپور طور پر مسلسل بروئے کار رہی، جس کے نتیجے میں آپؐ نے دعوت و تبلیغ کے ذریعے جو انسانی مواد

(human material) جمع کیا اُس نے بدھ مت کے بھکشوئوں کے مانند فقیروں اور درویشوں کے ایک اَنبوہ کے بجائے ''اِعلائِ کلمۃ اللہ'' اور ''اظہارِ دین حق'' کے لیے جان لڑادینے والوں کی ایک ایسی منظّم جماعت کی صورت اختیار کی جس نے مدنی دور میں {اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیۡنَ یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِہٖ صَفًّا کَاَنَّہُمۡ بُنۡیَانٌ مَّرۡصُوۡصٌ ﴿۴﴾} (الصف) ''اللہ تو محبّت کرتا ہے اُن سے جو اُس کی راہ میں جنگ کریں ایسی صفیں باندھ کر گویا وہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہوں!'' کی عملی تفسیر بن کر دکھا دیا۔ یہ تنظیم ظاہر ہے کہ کسی ایسے ناظم یا منتظم کے بغیر ممکن نہیں ہے جس میں تنظیمی و انتظامی صلاحیتیں درجۂ کمال کو پہنچی ہوئی ہوں ---- اور یہ ناظم اور منتظم ظاہر ہے کہ آنحضور ﷺ ہی تھے!

حیاتِ طیبہ کے مکی دور کے وسط میں تعذیب و تشدد (persecution) کے شدّت اختیار کرنے پر اہل ِایمان کو ارضِ حبشہ کی طرف ہجرت کر جانے کی اجازت بھی آپ ﷺ کے حسن انتظام کا شاہکار ہے۔ اور پھر ہجرتِ مدینہ منورہ کے موقع پر بھی اس عظیم نقل مکانی کو اس طور سے منظّم کرنا کہ جماعت المسلمین کے اکثر افراد کو اپنے سامنے مدینہ روانہ فرمانے کے بعد آپ ﷺ نے آخر میں رختِ سفر باندھا، جس کے نتیجے میں سفرِ ہجرت نے ایک منظّم نقل و حرکت کی صورت اختیار کر لی نہ کہ کسی بھگدڑ یا فرار کی --- یہ پوری صورت حال بھی بلاشبہ ایک عظیم تنظیمی و انتظامی استعداد کی مظہر اَتم ہے!

رہا مدنی دور تو اس کے بارے میں کچھ عرض کرنا بلاشبہ سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے، اس لیے کہ ان دس سالوں کے دوران آنحضور ﷺ کے حسنِ تدبر و معاملہ فہمی، دور اندیشی وپیش بینی، ترتیب و تنظیم اور انتظام و انصرام کے ایک دو نہیں سینکڑوں اور ہزاروں مظاہر سامنے آتے ہیں، جن پر مؤرخین اور محققین کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جاتی ہیں، بڑے سے بڑے مدبر و سیاستدان دنگ رہ جاتے ہیں اور اعلیٰ سے اعلیٰ ناظم اور منتظم حیران و ششدر رہ جاتے ہیں کہ ایک فردِ واحد میں اتنے محاسن و کمالات کا اجتماع، ہر جہت اور ہر پہلو سے حسنِ تدبیر و تدبر اور حسنِ تنظیم و انتظام کا مظہر اَتم! پھر لطف یہ کہ حیاتِ انسانی کے کسی ایک ایسے گوشے کا تعین ممکن ہی نہیں جس کے بارے میں یہ کہا جا سکے کہ اس میں آنحضور ﷺ کے حسنِ

انتظام کا ظہور دوسرے گوشوں سے زیادہ ہوا ہے۔ گویا بات صدفی صد وہی ہے کہ ؎

زفرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جا ست!

مسلمانوں کا جو اجتماعی نظام نبی اکرم ﷺ نے قائم فرمایا اور اس میں نظم و تنظیم کو جو اہمیت آپؐ نے دی ‘اس کا سب سے بڑا مظہر یہ ہے کہ آپؐ نے عبادات کے نظام کو بھی ایک اجتماعی نظم کے ساتھ وابستہ کر دیا۔ یہاں تک کہ نماز کے بارے میں شدید تاکید فرما دی کہ اسے باجماعت ادا کیا جائے‘ خواہ سفر ہو خواہ حضر اسے کسی صورت ترک نہ کیا جائے۔ چنانچہ امام ابوداؤدؒ نے ایک روایت تو حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے یہ نقل فرمائی کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا: ((اِذَا کَانَ ثَلَاثَۃٌ فِیْ سَفَرٍ فَلْیُؤَمِّرُوْا اَحَدَھُمْ)) ’’جب سفر میں تین آدمی ہوں تو ان میں سے ایک کو لازماً امیر بنا لیا جائے۔‘‘ اور دوسری روایت حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے نقل فرمائی کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا:

((مَا مِنْ ثَلَاثَۃٍ فِیْ قَرْیَۃٍ اَوْ بَدْوٍ وَلَا تُقَامُ فِیْھِمُ الصَّلَاۃُ اِلَّا وَقَدِ اسْتَحْوَذَ عَلَیْھِمُ الشَّیْطَانُ‘ فَعَلَیْکَ بِالْجَمَاعَۃِ‘ فَاِنَّمَا یَاْکُلُ الذِّئْبُ الْقَاصِیَۃَ))

’’اگر کسی بستی یا جنگل میں تین آدمی ہوں اور پھر وہ نماز باجماعت کا نظام قائم نہ کریں تو ان پر شیطان لازماً مسلط ہو کر رہے گا۔ سنو! جماعت سے وابستہ رہو‘ اس لیے کہ بھیڑیا ریوڑ سے علیحدہ رہنے والی بھیڑ کو ضرور ہڑپ کر جاتا ہے!‘‘

پھر اس نماز باجماعت میں آنحضور ﷺ کا ذوقِ ترتیب و تنظیم اسے برداشت نہ کر سکتا تھا کہ صف ٹیڑھی ہو‘ اس لیے کہ صفوں کی کجی بھی جذبِ اندروں کے فقدان کی غمازی کرتی ہے‘ لہٰذا تکبیر تحریمہ سے قبل آپ ﷺ کی نوائے شیریں بلاناغہ بلند ہوتی تھی:

((سَوُّوْا صُفُوْفَکُمْ فَاِنَّ تَسْوِیَۃَ الصُّفُوْفِ مِنْ اِقَامَۃِ الصَّلَاۃِ)) (متفق علیہ)

’’اپنی صفوں کو سیدھا کرو‘ اس لیے کہ صفوں کو سیدھا کرنا بھی اقامت صلوٰۃ کے آداب میں سے ہے!!‘‘

مسلمانوں کی حیاتِ ملّی کے اس اساسی اور بنیادی شعبے یعنی عبادات میں‘ جس میں بالعموم اجتماعیت پر انفرادیت مقدّم رہتی ہے‘ نبی اکرم ﷺ نے نظم و تنظیم کو اس درجہ اہمیت دی ہے‘ تو اس پر قیاس کیا جا سکتا ہے کہ حیاتِ اجتماعی کے دوسرے شعبوں میں انتظام و انصرام

کا عالم کیا ہو گا! ع ’’قیاس کن زگلستانِ من بہارِ مرا!‘‘

مدینہ منورہ کی چھوٹی سی شہری اسلامی ریاست کا چارج سنبھالنے کے فوراً بعد معاشرے کی تنظیم نو اور دفاعی انتظامات کا جو اہتمام رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ ملّی و ملکی سطح پر حکومت و ریاست کے معاملات کے ضمن میں آپؐ کے حسنِ انتظام کی نہایت اعلیٰ مثال ہے۔ چنانچہ ایک جانب آپ ﷺ نے یہود سے معاہدے کر

کے مدینہ کے دفاع کا انتظام فرمایا اور دوسری جانب مہاجرین اور انصار میں مؤاخات یعنی بھائی چارے کے ذریعے معاشرے کی تنظیم نو کا اہتمام کیا۔ اور یہ بات بادنیٰ تأمل سمجھ میں آسکتی ہے کہ ان دونوں معاملات میں ادنیٰ سی چوک یا ذرا سی تاخیر بھی آئندہ حالات و واقعات کے رخ کو بالکل بدل کر رکھ سکتی تھی۔ اور کسی بھی مدبر یا منتظم کے لیے وقت کے تقاضوں کو بروقت سمجھ کر ان کے لیے مناسب انتظام کر لینے ہی میں کامیابی کا راز مضمر ہوتا ہے !

مدنی دور کے ابتدائی آٹھ سال کے اکثر و بیشتر حصّے کے دوران مسلح تصادم کا سلسلہ جاری رہا۔ اس کے ضمن میں بھی جہاں آنحضور ﷺ کی دُور اندیشی اور معاملہ فہمی کے شاہکار مسلسل سامنے آتے ہیں اور آپؐ کی حکمت ِحربی ' مہارتِ جنگ اور سپہ سالارانہ صلاحیتوں کا اظہار ایسے پُرشکوہ انداز میں ہوتا ہے کہ دوست دشمن سب مرحبا کہنے پر مجبور ہوجاتے ہیں 'وہاں فوجوں کی ترتیب و تنظیم' رسد کا اہتمام و انصرام' چھاپہ مار دستوں کی برموقع ترسیل اور دشمن کی ہر ممکن چال کو ناکام بنانے کے لیے پیش بندی کے ضمن میں آپ ﷺ کی انتظامی صلاحیتوں کا ظہور بھی بتمام و کمال ہوتا رہا۔تاآنکہ ۸ھ میں فتح مکّہ اور معرکہ حنین کے بعد جب اللہ تعالیٰ نے آنحضور ﷺ کو عرب پر فیصلہ کُن غلبہ عطا فرما دیا اور اَطراف و اَکنافِ عرب سے تمام قبائل کے وفود نے مدینہ منورہ حاضر ہو کر اطاعت قبول کر لی' گویا {وَ رَاَیۡتَ النَّاسَ یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اَفۡوَاجًا ۙ﴿۲﴾}(النصر)کا سماں بندھ گیا تب آپؐ کی انتظامی صلاحیتیں پورے طور پر بروئے کار آئیں اور پورے جزیرہ نمائے عرب میں وہ نظام قائم ہوا جس کی داغ بیل تو آنحضور ﷺ نے بنفس ِ نفیس اپنی حیاتِ دُنیوی کے آخری دو سال کے دوران ڈال دی تھی' لیکن جس پر نظامِ اسلامی کا قصرِ عظیم اپنی

پوری شان و شوکت کے ساتھ دورانِ خلافت ِراشدہ تعمیر ہوا۔

اس انتظام و انصرامِ مملکت اسلامی کے ضمن میں وُلاۃ و عُمال کا تقرر بھی شامل تھا' ائمہ و مؤذّنین کی تقرری بھی شامل تھی' محصّلینِ زکوٰۃ و جزیہ کی نامزدگی بھی تھی' جنگوں کا انسداد بھی تھا'غیر قوموں سے گفت و شنید اور صلح و مصالحت کے معاملات بھی تھے ' انسدادِ جرائم اور اقامت ِحدود و اجرائے تعزیرات کا نظام بھی تھا۔ حُکام و عمال اور محصّلینِ زکوٰۃ و فدیہ کی خبرگیری اور احتساب کا سلسلہ بھی تھا اور ان سب کے ساتھ ساتھ تھا قیامِ حکومت ِاسلامی کا اصل اور اوّلین مقصد یعنی تبلیغ و دعوتِ دین' تربیت و اصلاح عوام اور تعلیم و تلقین شریعت ! ! اور یہ سب کچھ تو تھا اندرونِ ملک ِعرب ' اس پر مستزاد تھیں آنحضور ﷺ کی بعثت ِعمومی {کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیۡرًا وَّنَذِیۡرًا} (سبا:۲۸)کی ذِمّہ داریوں کے ذیل میں آپؐ کی مصروفیات 'یعنی تحریر دعوت نامہ ہائے مبارک اور ترسیل ِ وفود۔ اور چونکہ ان کے ضمن میں آغاز ہو گیا سلطنت ِروما کے ساتھ عسکری تصادم کا ' لہٰذا ترتیب و تنظیم جیوش' جس کے ضمن میں اوّلاً پیش آیا غزوۂ مُوتہ' ثانیاً سفر تبوک اور ثالثاً تیار ہوا جیش اُسامہ' جو روانگی کے لیے تیار ہی تھا کہ

آنحضور ﷺ نے اس جہانِ فانی سے کوچ کیا اور رفیق اعلیٰ کی جانب مراجعت اختیار فرما لی۔ فصلّی اللہ علیہ وسلّم تسلیمًا کثیرًا کثیرًا وفداہ آباؤنا وأُمّہاتنا!

عقلیں دنگ ہیں کہ آنحضور ﷺ نے اپنی حیاتِ دُنیوی کے آخری دو سال کتنی متنوع اور گوناگوں مصروفیات میں بسر کیے اور پھر یہ کہ آج تک کوئی نہیں کہہ سکا کہ فلاں معاملے میں انتظامی اعتبار سے آنحضور ﷺ سے کسی غلطی کا صدور ہو گیا تھا۔{فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ﴿ ۳ ﴾ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّ هُوَ حَسِيْرٌ ﴿ ۴ ﴾ }(الملک)''ذرا نظر دوڑائو تو 'کوئی خامی نظر آتی ہے؟ پھر بار بار اچھی طرح دیکھو' تمہاری نگاہ تھک ہار کر واپس آجائے گی اور کسی پہلو سے کسی غلطی کی نشاندہی تم نہ کر سکو گے!''

وآخر دعوانا ان الحَمد لِلّٰہِ ربِّ الْعَالَمِینoo

اَخلاقیات کے میدان میں نبی اکرم ﷺ کی اِتمامی اور تکمیلی شان کا اصل مظہر

عدل و اِعتدال

یہ مقالہ حکومت ِپاکستان کی وزارت مذہبی اُمور کے زیر اہتمام منعقدہ نیشنل سیرت کانفرنس (ربیع الاول ۱۴۰۲ھ / ۱۹۸۲ء) میں پڑھا گیا

یہ بات تو اظہر من الشمس ہے کہ نبی اکرم ﷺ صرف ایک نبی ہی نہیں خاتم النّبیین ہیں اور آپؐ پر نبوت ختم ہی نہیں مکمل بھی ہوئی ہے------ اور آپ ﷺ صرف ایک رسول ہی نہیں آخرالمرسلین ہیں اور آپؐ کی رسالت آخری ہی نہیں دائمی بھی ہے ----- اور ہر پہلو اور ہر جہت سے اِکمال و تکمیل اور اتمام و تتمیم ہی آپ ﷺ کی نبوت و رسالت کی امتیازی شان ہے۔ چنانچہ سورۃ المائدۃ کی آیت ۳ میں بھی ''اَکْمَلْتُ'' اور ''اَتْمَمْتُ'' ہی کے الفاظ

استعمال ہوئے ‘یعنی:

{اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ وَ اَتۡمَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ نِعۡمَتِیۡ وَ رَضِیۡتُ لَکُمُ الۡاِسۡلَامَ دِیۡنًا ؕ}

’’آج میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کا بھی ’اکمال‘ کر دیا اور تم پر اپنی نعمت کا بھی ’اتمام‘ کر دیا اور تمہارے لیے (ابد الآباد تک کے لیے) ’اسلام‘ کو بطورِ دین پسند کر لیا۔‘‘

اور سورۃ التوبۃ کی آیات ۳۲‘۳۳ اور سورۃ الصف کی آیات ۸‘۹ میں بھی ’’اظہارُ دینِ الحَقِّ علی الدِّین کُلِّہٖ‘‘ کے ضمن میں متصلاً ذکر فرمایا گیا ’اتمامِ نور‘ کا۔

سورۃ التوبۃ میں {وَ یَاۡبَی اللّٰہُ اِلَّاۤ اَنۡ یُّتِمَّ نُوۡرَہٗ} کے الفاظ میں اور سورۃ الصف میں{وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوۡرِہٖ} کے الفاظ میں۔ دونوں مقامات پر{وَ لَوۡ کَرِہَ الۡکٰفِرُوۡنَ ﴿۳۲﴾} کے تہدید آمیز الفاظ کے اضافہ کے ساتھ !

اور یہی شان ظاہر ہوتی ہے آنحضور ﷺ کے ان اقوالِ مبارکہ میں کہ:((اِنَّمَا بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ)) اور ((اِنَّمَا بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ حُسْنَ الْاَخْلَاقِ)) یعنی میں تو مبعوث ہی اسی لیے ہوا ہوں کہ ’مکارمِ اخلاق‘ اور ’محاسنِ اخلاق‘ کی تکمیل و تتمیم کر دوں۔

یہاں ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ آپ ﷺ سے پہلے کے جلیل القدر انبیاء اور اُولوالعزم رسل علیہم السلام اَخلاقِ حسنہ کی جن بلندیوں اور رفعتوں پر نظر آتے ہیں ان میں آنحضور ﷺ کی بعثت سے کون سا تکمیلی یا تتمیمی اضافہ ہوا ہے؟ ---------- کیا یہ واقعہ نہیں کہ دعوت و تبلیغ کے ضمن میں لوگوں کی جانب سے ایذاء و مخالفت پر صبر میں حضرت نوح علیہ السلام بلند ترین مقام پر ہیں جنہوں نے ساڑھے نو سو برس تک صبر و مصابرت پر مداومت کی۔ اسی طرح جان و مال کے ضمن میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی جانب سے ابتلاء و آزمائش پر صبر کی چوٹی پر فائز ہیں حضرت ایوب علیہ السلام جن کا صبر ضرب المثل ہے۔ حسنِ خلق اور تواضع میں بلند ترین مقام پر ہیں سیدنا ابراہیم علیٰ نبیّنا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام ۔ مقامِ شکر پر بتمام و کمال متمکن نظر آتے ہیں حضرت دائود و سلیمان علیہما السلام ۔ مخاطبہ ومکالمۂ الٰہی میں ممتاز اور غیرت و حمیتِ دینی سے سرشار نظر آتے ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام ‘ تو تائیدِ روح القدس کے اعتبار سے نمایاں ترین اور زہد و ورع کی بلند ترین چوٹیوں پر متمکن نظر آتے ہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام ۔ اسی طرح حِلم ختم ہے حضرت اسماعیل علیہ السلام پر‘ تو تبتّل کی انتہا نظر آتی ہے حضرت یحییٰ علیہ السلام میں ---------- چناں چہ سوال یہ ہے کہ اخلاقیاتِ انسانی کے میدان میں نبی اکرم ﷺ کی امتیازی شان کیا ہے ----------اور بالخصوص آپؐ کا وہ کارنامہ کون سا ہے جسے محاسن و مکارمِ اخلاق کی تکمیل و تتمیم کا مظہر قرار دیا جا سکے؟

آپ ﷺ کے قائم کردہ نظامِ اجتماعی کی امتیازی شان ہے :عدل و اعتدال ! !
اللہ تعالیٰ کے ننانوے اسماءِ حسنیٰ کی تفصیل پر مشتمل جو حدیث امام ترمذیؒ اور امام بیہقیؒ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے اس میں اللہ تعالیٰ کا ایک نام نامی اوراسم گرامی ''العَدل''بھی ہے' یعنی سراپا عدل و مجسم انصاف ۔قرآن حکیم میں اگرچہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا یہ نام وارد نہیں ہوا'تاہم متعدد مقامات پر اللہ تعالیٰ کی اس شان کا ذکر موجود ہے' مثلاً:
(۱) {وَ اللّٰہُ یَقْضِیْ بِالْحَقِّ ؕ} (المؤمن:۲۰)
''اللہ تعالیٰ فیصلے صادر فرماتا ہے بالکل حق کے ساتھ۔''
(۲) {وَ تَمَّتْ کَلِمَتُ رَبِّکَ صِدْقًا وَّ عَدْلًا ؕ} (الانعام:۱۱۵)
''تیرے رب کی (ہر) بات صدق و عدل کے(جملہ معیارات کے)مطابق پوری ہو چکی ہے۔''
(۳) {شَہِدَ اللّٰہُ اَنَّہٗ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ۙ وَ الْمَلٰٓئِکَۃُ وَ اُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ} (آل عمران:۱۸)
''خود اللہ بھی گواہ ہے کہ اُس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور فرشتے اور تمام اہلِ علم بھی گواہ ہیں 'وہی عدل و انصاف کو لے کر کھڑا ہے !''
صوفیائے کرامؒ کے حلقے میں ایک 'حدیثِ نبویؐ ''تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ'' کثرت سے بیان ہوتی ہے' اور اگرچہ بعض محدثین کرام کو اس کی سند پر کلام ہےتاہم اس کا مضمون بھی قرآن مجیدکے متعددمقامات سے ثابت ہے 'مثلاً سورۃ التغابن میں ارشاد ہوتا ہے:
{وَ اِنْ تَعْفُوْا وَ تَصْفَحُوْا وَ تَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۴﴾}
''اگر تم معاف کر دیا کرو اور درگزر سے کام لیا کرو اور لوگوں کی خطاؤں کو بخش دیا کرو تو اللہ بھی غفور اور رحیم ہے۔''
ظاہر ہے کہ یہ الفاظِ مبارکہ لوگوں کوترغیب دے رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی شانِ غفوری اور رحیمی کا ایک عکس اپنے اندر بھی پیدا کرو۔ اب اگر یہ بات اصولاً درست ہے تو اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہی کہ جملہ صفات و شئونِ باری تعالیٰ کا کامل واکمل اور جامع

ترین عکس ہے ذاتِ محمدی علی صاحبھا الصلوۃ والسلام ---------- اور چونکہ صفاتِ باری تعالیٰ میں بعض بظاہر ایک دوسرے سے متضاد بھی ہیں' جیسے یہ کہ وہ ''اَلْمُعِزّ'' بھی ہے اور ''اَلْمُذِلّ'' بھی' ''اَلرَّافِع'' بھی ہے اور ''اَلْخَافِض'' بھی ' ''اَلْقَابِض''بھی ہے اور ''اَلْبَاسِط'' بھی ---------- اسی طرح ''اَلظَّاھِر'' بھی ہے اور''اَلْبَاطِن'' بھی اور ''اَلْغَفُوْر'' بھی ہے اور ''اَلْمُنْتَقِم'' بھی ' لہٰذا اللہ تعالیٰ کا اہم ترین وصف ہوگا''عدل'' جو نہ صرف جملہ مخلوقات کے مابین عدل و انصاف کی صورت میں جلوہ گر ہو گا بلکہ خود اُس کی جملہ صفات و شئون میں توازن و اعتدال کی صورت میں ظاہر ہو گا۔ شاید یہی رمز ہوا س میں کہ جبکہ اللہ تعالیٰ کے دوسرے اَسماءِ حسنیٰ یا اسم فاعل کی صورت میں ہیں یا صفت مُشَبّہ (فعیل) کے وزن پر یا اسم مبالغہ (فَعّال یا فَعُول) کے اوزان پر وہاں اسم احسن ''العَدل'' مصدر پر مبنی ہے ---------- بہرحال اسی اسم احسن 'العدل' کا عکس کامل ہیں نبی اکرم ﷺ ----------گویا آپؐ 'العادل' ہیں یعنی 'عادل کامل' ---------- ! !چنانچہ ایک جانب خود آپ ﷺ کی اپنی سیرتِ مطہرہ عظیم ترین مظہر ہے عدل و اعتدال کا اور آپ ﷺ کی شخصیت مبارکہ حسین ترین امتزاج ہے جلال و جمال اور بشریت و ملکیت کا۔ بقول علاّمہ اقبال مرحوم ؎

شوکتِ سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود
فقرِ جنید و بایزید تیرا جمالِ بے نقاب !

واقعہ یہ ہے کہ دُنیا پرستی یا حبِ عاجلہ اور ترکِ دُنیا یا رہبانیت کی دو انتہائوں کے مابین صحیح ترین نقطۂ عدل تلاش کرنا ہو تو وہ ملے گا محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ مطہرہ میں۔ اسی طرح عورت کو بھیڑ بکری کی طرح کی ملکیت اور جوتی کی نوک سمجھنے اور اختیارات و معاملات کو اُس کے حوالے کر کے خود تابع مہمل بن جانے کی اِفراط و تفریط کے مابین اعتدال کی روش دیکھنی ہو تو وہ بھی ملے گی محمد رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیّبہ میں۔اسی طرح اِسراف و تبذیر اور بخل و شح کی انتہائوں کے مابین اعتدال کا رویّہ دیکھنا ہو تو وہ بھی نظر آئے گا آنحضور ﷺ کی ذاتِ مقدّسہ میں۔ اسی طرح ایک طرف ذاتی معاملات میں خون کے پیاسوں تک کو معاف کر دینے میں {وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ

النَّاسِ ؕ } (آلِ عمران:۱۳۴)کی مکمل تصویر اور دوسری طرف اللہ کے دین کے قیام اور اس کی حدود کے اجراء و نفاذ کے ضمن میں {وَّ لَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ}(النور:۲) کا کامل مرقع اگر بیک وقت دیکھنا ہو تو وہ بھی میسّر آئے گا صرف سیرتِ محمدی علی صاحبھا الصلوۃ والسلام میں۔ وَقِس علیٰ ذٰلک:

دوسری طرف جو تعلیم آپ ﷺ لے کر آئے اس میں بنیادی اہمیت ہے عدل و انصاف اور قیامِ نظام عدل و قسط کو۔ بفحوائے آیاتِ قرآنی:

(۱) {وَ اِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ} (النساء:۵۸)

''اور جب تم لوگوں کے مابین فیصلہ کرو تو عدل سے کام لو۔''

(۲) {وَ اِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ} (المائدۃ:۴۲)

''اور اگر آپ ان کے مابین فیصلہ کرنا قبول ہی کر لیں تو فیصلہ انصاف کے ساتھ کریں۔''

(۳) {قُلْ اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ} (الاعراف:۲۹)

''کہہ دیجیے کہ میرے رب نے تو عدل و انصاف کا حکم دیا ہے''

(۴) {اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ} (النحل:۹۰)

''یقیناً اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے عدل کا''

(۵) {وَ اِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَ لَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى} (الانعام:۱۵۲)

''اور جب بھی بات کرو تو انصاف کے مطابق کرو خواہ معاملہ کسی قرابت دار ہی کا ہو''

(۶) {يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَ لَوْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَ الْاَقْرَبِيْنَ} (النساء:۱۳۵)

''اے ایمان والو! عدل و انصاف کے علمبردار بن کر کھڑے ہو جاؤ اور اللہ کے حق میں گواہی دو خواہ وہ تمہارے اپنے خلاف پڑ رہی ہو' خواہ تمہارے والدین اور اقرباء کے خلاف جا رہی ہو۔''

(۷) {يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۫ وَ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۫ هُوَ اَقْرَبُ

لِلتَّقْوٰى ۫} (المائدۃ:۸)

''اے ایمان والو! اللہ کے علمبردار اور عدل و انصاف کے گواہ بن کر کھڑے ہو جاؤ' اور تمہیں کسی قوم کی دشمنی اس پر آمادہ نہ کر دے کہ تم انصاف نہ کرو۔ انصاف کرو' یہی تقویٰ کے قریب تر ہے۔''

(۸) {لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ} (الحدید:۲۵)

''ہم نے بھیجا اپنے رسولوں کو بینات دے کر اور نازل کی اُن کے ساتھ کتاب اور میزان تاکہ لوگ قائم ہوں عدل و انصاف پر''

(۹) {وَ قُلْ اٰمَنْتُ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ وَ اُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ} (الشوریٰ:۱۵)

''اور کہہ دیجیے میں ایمان رکھتا ہوں اُس کتاب پر جو اللہ نے نازل فرمائی ہے' اور مجھے حکم ہوا ہے کہ

تمہارے مابین عدل قائم کروں۔''

(۱۰) {اِنَّ اللہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ ﴿ ۴۲ ﴾} (المائدۃ، الحجرات، الممتحنۃ)

''یقیناً اللہ محبّت فرماتا ہے انصاف کرنے والوں سے۔''

چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ایک جانب تو فصلِ خصومات اور رفع نزاعات کے لیے وہ سنہری اصول متعین فرمائے جن کو آج عالمِ انسانی میں قبولِ عام حاصل ہے۔ مثلاً یہ کہ کسی ایک فریق کی بات سن کر اور فریقِ ثانی کو صفائی کا موقع دیے بغیر فیصلہ سنادینا غلط ہے، یا یہ کہ دلیل یا ثبوت مہیّا کرنے کی ذِمّہ داری مدّعی کی ہے نہ کہ مدّعا علیہ کی، اور اگر مدّعی ثبوت نہ دے سکے تو مدّعا علیہ کی جانب سے محض قسم یا حلف بھی دعوے کو باطل کرنے کے لیے کافی ہے، یا یہ کہ شک کا فائدہ ملزم کو پہنچتا ہے --------- نتیجتاً خواہ ایک سو مجرم بَری ہو جائیں لیکن کوئی ایک بے گناہ بھی خواہ مخواہ سزا نہ پائے۔ اور آخری لیکن اہم ترین یہ کہ قانون کی نگاہ میں سب لوگ برابر ہیں۔ کسی بڑے سے بڑے انسان حتیٰ کہ سربراہِ مملکت کو بھی کوئی امتیازی مقام یا خصوصی تحفظ حاصل نہیں ہے ---------

دوسری

طرف آپ ﷺ نے وہ نظام عدلِ اجتماعی قائم فرمایا جس کی یاد تاحال نوعِ انسانی کی اجتماعی یادداشت میں ایک 'حسین خواب' کی مانند باقی ہے۔

بنظرِ غائر دیکھا جائے تو اس نظامِ عدلِ اجتماعی کا اصل وصف بھی عدل و اعتدال ہی ہے، چنانچہ اس میں نظامِ سیاست و حکومت کے ضمن میں ایک جانب انسانی حاکمیت اور لادینی جمہوریت اور دوسری جانب مذہبی طبقے کی حکومت و آمریت کے مابین حاکمیتِ الٰہی (Divine Sovereignty) اور عوامی حکومت (Popular Vicegerency) کا معتدل اور متوازن راستہ اختیار کیا گیا -------اسی طرح نظامِ معیشت کے باب میں ایک جانب انفرادی ملکیت مطلقہ اور مادر پدر آزاد معیشت سے پیدا شدہ Haves اور Have-nots کی شدید اونچ نیچ اور طبقاتی تقسیم اور دوسری جانب انفرادی ملکیت کی نفیٔ مطلق اور جبری مساوات کے مابین تصوّرِ امانت پر مبنی محدود ذاتی تصرف اور حدودِ حلال و حرام کی پابند معیشت کی درمیانی راہ اختیار کر کے اجتماعیاتِ انسانیہ کی دو اعلیٰ ترین اَقدار یعنی آزادی اور مساوات کے مابین بھی عدل قائم کر دیا۔ فصلی اللہ علیہ وعلٰی آلہٖ واصحابہٖ وسَلَّم!

مختصر یہ کہ عدل و انصاف اور توازن و اعتدال کے ضمن میں انسان کی جھولی میں فی الوقت اگر کچھ موجود ہے تو وہ لازماً محمد رسول اللہ ﷺ کا عطیہ ہے اور اگر نوعِ انسانی ان کے حصول کے لیے کوشاں ہے تو گویا وہ ابھی نظامِ مصطفیٰ ﷺ کی تلاش میں سرگرم ہے۔ گویا بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بُو
آن کہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفیٰ او را بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ است

* * *

مقامِ صحابہ کرام رضی اللہ عنھم

سورۃ الفتح کے آخری رکوع کی روشنی میں

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام پانچویں سالانہ قرآن کانفرنس کا انعقاد ۲۲ تا ۲۴ مارچ۱۹۷۸ء کو انسٹی ٹیوٹ آف بزنس ایڈمنسٹریشن(I.B.A) کراچی یونیورسٹی کے ہال میں عمل میں آیا۔ اس کانفرنس کے کل پانچ اجلاس ہوئے۔ ۲۴ مارچ کو بعد نماز مغرب پانچویں اور آخری اجلاس کا موضوع تھا: ''قرآن' سُنّت رسولؐ اور صحابہ کرامؓ''۔ اس اجلاس کا افتتاح صدر مؤسس ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے سورۃ الفتح کے آخری رکوع کے درس سے کیا۔

سورۃ الفتح کے آخری رکوع کی تلاوت کے بعد:

حضرات! آج کی نشست میں میرا کوئی خطاب پروگرام میں درج نہیں تھا' لیکن بہت سے حضرات کے اصرار پر یہ طے ہوا کہ آج صرف روایتی تلاوتِ کلام پاک سے اس نشست کی ابتدا کرنے کے بجائے آج کے موضوع سے متعلق چند آیات میں آپ کو پڑھ کر سنائوں اور انہی کے ترجمہ اور مختصر تشریح سے اس اجلاس کا آغاز کیا

جائے۔

یہ سورۃ الفتح کا آخری رکوع ہے جس کے پس منظر میں صلح حدیبیہ کا واقعہ ہے‘ جسے اللہ تعالیٰ نے فتح مبین قرار دیا :{اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحًا مُّبِیْنًا ۙ﴿۱﴾} ’’یقینا ہم نے آپ کو ایک بڑی روشن فتح عطا فرمائی ہے‘‘۔وجہ اس کی یہ ہے کہ اس صلح کے بعد دو سال کا عرصہ نبی اکرم ﷺ کو مکمل امن و سکون کا میسّر آیا تو اس عرصہ میں آپؐ کی تبلیغی و دعوتی سرگرمی پوری شدّت اور انتہا کو پہنچ گئی۔نبی اکرم ﷺ نے پورے اطمینان اور سکون کے ساتھ اطراف و اکنافِ عرب میں مبلغین اور معلمین کو بھیجا۔ نتیجتاً یوں سمجھئے کہ ایک طرف تو اندرونِ ملک

عرب میں انقلابِ نبوی علي صاحبها الصلوۃ والسلام کی تکمیل کا پورا سامان فراہم ہوگیا اور اس کے لیے پوری تمہید پیدا ہو گئی اور دوسری طرف یہی وہ عرصہ ہے جس میں نبی اکرم ﷺ نے مختلف ملوک و سلاطین کے نام دعوتی خطوط ارسال فرمائے اور پھر یہاں سیبین الاقوامی دعوت و تبلیغ کے ایک سلسلے کا آغاز ہوا۔ غزوۂ موتہ‘ سفر تبوک‘ جیشِ اسامہ‘ یہ تین کڑیاں ہیں دعوت کے بین الاقوامی مرحلے کی۔اس سلسلے کا آغاز اگرچہ حضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے آخری دور میں ہوا ‘لیکن یہ اپنی پوری شدت کو پہنچا ہے دورِ خلافت راشدہ ‘ بالخصوص دورِ فاروقی اور دورِ عثمانی میں (i)۔

صلح حدیبیہ کی شرائط مسلمانوں کے لیے بعض اعتبارات سے بظاہر کچھ باوقار محسوس نہ ہوئی تھیں‘ بلکہ بہت سے حضرات نے یہ محسوس کیا کہ ہم نے کچھ دب کر صلح کی ہے۔چنانچہ یہ وہ الجھن تھی جس کے حوالے سے مسلمانوں کی تشفی اور دلجوئی کے لیے اس رکوع میں سب سے پہلی آیت اسی موضوع پر نازل ہوئی کہ اے مسلمانو! پریشان نہ ہو۔ جو خواب ہم نے اپنے رسول ﷺ کو دکھایا تھا‘ وہ غلط نہ تھا۔نبی کا خواب تو وحی ہوتا ہے اور وحی میں کسی خطا اور کسی غلطی کا کوئی امکان نہیں۔فرمایا:{لَقَدْ صَدَقَ اللّٰہُ رَسُوْلَہُ الرُّءْیَا بِالْحَقِّ ۚ} ’’اللہ نے اپنے رسول کو بالکل سچا خواب دکھایا حق کے ساتھ‘‘۔یعنی وہ خواب جو حضور ﷺ نے بیان فرمایا‘جس کے بعد آپؐ نے سفر اختیار کیا‘جس کے نتیجہ میں صلح حدیبیہ واقع ہوئی‘ وہ درست‘ سچا اور صحیح تھا۔{لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰہُ} ’’(اے مسلمانو!) تم لازماً داخل ہو گے مسجد الحرام میں ‘اگر اللہ نے چاہا‘‘۔آج نہیں تو دو سال بعد ایسا ضرور ہوگا۔یہی جواب حضور ﷺ نے دیا تھا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو‘ جب انہوں نے یہ سوال کیا تھا کہ کیا ہم حق پر نہیں ہیں؟ جب حضور ﷺ نے اثبات میں جواب دیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ پھر ہم دب کر کیوں صلح کریں؟ حضور ﷺ نے فرمایا کہ وہ وقت لازماً آئے گا جب تم مسجد حرام میں داخل ہو گے۔ قرآن نے یہاں حضور ﷺ کے اس ارشاد کی تائید کر دی کہ تم مسجد حرام میں ضرور داخل ہو گے۔ اللہ نے چاہا تو وہ وقت یقیناً آئے گا۔

آگے یہ بھی بیان کردیا کہ کس شان اور کس کیفیت کے ساتھ داخل ہوگے:{اٰمِنِیۡنَ ۙ مُحَلِّقِیۡنَ رُءُوۡسَکُمۡ وَ مُقَصِّرِیۡنَ ۙ لَا تَخَافُوۡنَ ؕ} ''پورے امن کے ساتھ' اپنے سروں کو منڈواتے ہوئے اور بالوں کو ترشواتے ہوئے' (اُس وقت) تمہیں کوئی اندیشہ نہیں ہوگا''۔یعنی پورے عزم اور اطمینان کے ساتھ داخل ہوگے۔نہ کوئی کھٹکا ہوگا اور نہ ہی کوئی خدشہ'بلکہ تم حلق بھی کرائو گے اور قصر بھی کرائو گے ----- حلق اور قصر'یہ دواصطلاحات ہیں' اور جن حضرات نے حج یا عمرہ کیا ہے وہ اس سے بخوبی واقف ہیں کہ احرام کھولنے سے قبل' حج میں بھی اور عمرہ میں بھی'یا تو سر کے تمام بال منڈوائے جاتے ہیں یا انہیں تراشا جاتا ہے۔اگر تمام بال منڈوائے جائیں تو اسے حلق کہتے ہیں اور اگر بالوں کو تراشا جائے تو یہ قصر ہے ---- اٰمِنِیۡنَ کے بعدلَا تَخَافُوۡنَ فرما کر مزید تاکیدپیدا کردی کہ اُس وقت ہر طرف امن وامان ہوگا اور تمہیں کسی قسم کا کوئی خوف نہ ہوگا۔

{فَعَلِمَ مَا لَمۡ تَعۡلَمُوۡا}''تو اللہ وہ کچھ جانتا ہے جو تم نہیں جانتے''۔اللہ کا علم تو لامحدود ہے'جبکہ تمہارا علم محدود ہے۔آیۃ الکرسی میں اس بات کو بایں الفاظ بیان کیا گیا ہے:{یَعۡلَمُ مَا بَیۡنَ اَیۡدِیۡہِمۡ وَ مَا خَلۡفَہُمۡ ۚ وَ لَا یُحِیۡطُوۡنَ بِشَیۡءٍ مِّنۡ عِلۡمِہٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ} ''وہ جانتا ہے جو کچھ ان کے سامنے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے'اور وہ احاطہ نہیں کرسکتے اللہ کے علم میں سے کسی شے کا بھی سوائے اُس کے جو اللہ چاہے''۔چنانچہ بندۂ مؤمن کا کام یہ ہے کہ اپنے تمام معاملات اللہ کوتفویض کردے:{وَ اُفَوِّضُ اَمۡرِیۡۤ اِلَی اللّٰہِ ؕ}(المؤمن:۴۴)اس لیے کہ اُس کا علم کامل ہے۔جیسا کہ دعائے استخارہ میں حضورﷺ نے یہ الفاظ تعلیم فرمائے:((فَاِنَّکَ تَقۡدِرُ وَلَا اَقۡدِرُ)) ''یقیناً تو معاملات کا صحیح ادراک کرسکتا ہے اور میں نہیں کرسکتا(یقیناً تو قدرت رکھتا ہے اور میں قدرت نہیں رکھتا)۔''

آیت کے آخر میں فرمایا:{ فَجَعَلَ مِنۡ دُوۡنِ ذٰلِکَ فَتۡحًا قَرِیۡبًا ﴿۲۷﴾ }''تو اس کے علاوہ اس نے (تمہارے لیے) ایک قریب کی فتح بھی رکھی ہے''۔یعنی مسجد حرام میں داخل ہوناتو بعد کی بات ہے' اس سے بھی پہلے اپنے اوپر اللہ کا فضل و کرم تو دیکھو کہ اس نے تمہیں ایک فتح عطا فرمائی ہے جسے تم بظاہر یہ سمجھ رہے ہو کہ دب کر معاملہ ہوا ہے' حالانکہ

تمہارے لیے وہ فتح مبین ہے۔

اس آیت کے حوالہ سے یہ بات ذہن نشین کرلیجیے کہ یہاں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی دلجوئی فرمائی جا رہی ہے' جس طرح قرآن مجید میں جابجا ہمیں نظر آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب محمد رسول اللہﷺ کی دلجوئی فرماتے ہیں ---- کسی نے حضورﷺ کو اگر مجنون کہہ دیا اور حضورﷺ کے دل پر کچھ تکدر یا کچھ رنج و غم کی کیفیت پیدا ہوئی تو فوراً وحی نازل ہوئی:

{نٓ وَ الۡقَلَمِ وَ مَا یَسۡطُرُوۡنَ ۙ﴿۱﴾ مَاۤ اَنۡتَ بِنِعۡمَۃِ رَبِّکَ بِمَجۡنُوۡنٍ ۚ﴿۲﴾ وَ اِنَّ لَکَ لَاَجۡرًا غَیۡرَ مَمۡنُوۡنٍ ۚ﴿۳﴾ وَ اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیۡمٍ ﴿۴﴾ فَسَتُبۡصِرُ وَیُبۡصِرُوۡنَ ۙ﴿۵﴾ بِاَیِّکُمُ الۡمَفۡتُوۡنُ ﴿۶﴾} (القلم)

''ن، قسم ہے قلم کی اور جو کچھ یہ لکھتے ہیں۔ آپ اپنے رب کے فضل و کرم سے مجنون نہیں ہیں۔ اور یقیناً آپ کے لیے تو وہ اجر ہے جس کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوگا۔ اور آپؐ یقیناً اخلاق کے بلند ترین مرتبے پر فائز ہیں۔ تو عنقریب آپؐ بھی دیکھ لیں گے اور وہ بھی دیکھ لیں گے کہ تم میں سے کون فتنے میں مبتلا تھا!''

قرآن مجید میں بے شمار مقامات سے معلوم ہوتا ہے کہ کُفّار و مشرکین کی باتوں کی وجہ سے جب بھی رسول اللہ ﷺ کے دل میں کچھ تنگی یا کوئی رنج و غم محسوس ہوا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضور ﷺ کی دلجوئی فرمائی گئی' اسی طرح زیر درس آیت میں نظر آ رہا ہے کہ اس میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی جماعت کی دلجوئی کی جا رہی ہے کہ طبیعت پر کوئی میل نہ آنے دو' یہ نہ سمجھو کہ دب کر یہ معاملہ کیا گیا ہے' بلکہ یہ تو فتح مبین ہے جسے تم نہیں جانتے' ہم جانتے ہیں۔

اس کے بعد وہ عظیم آیت آئی جس کے الفاظ کو شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ علیہ نے پورے قرآن مجید کے لیے بمنزلۂ عمود قرار دیا ہے' اور اس کے لیے میرا ذاتی احساس یہ ہے کہ کم از کم سیرتِ رسول ﷺ کو سمجھنے کے لیے یہ الفاظ اساسی کلید ہیں۔ ان کو سمجھیں گے تو سیرتِ نبوی ؐ سمجھ میں آئے گی' ورنہ نہیں آئے گی۔ فرمایا: {ہُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَہٗ بِالۡہُدٰی وَ دِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡہِرَہٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّہٖ ؕ} --- یہ الفاظ قرآن مجید میں تین مقامات پر وارد ہوئے ہیں' اور یہاں ایک عجیب شان کے ساتھ آئے ہیں۔ اب فتح نہ آئے کیسے

ممکن ہے! غلبہ نہ ہو کیسے ممکن ہے؟--- ''اللہ ہی وہ ذات ہے جس نے اپنے رسول (ﷺ) کو الہدیٰ (ہدایت کاملہ) اور دین حق دے کر بھیجا ہی اس لیے ہے تاکہ وہ غالب کرے اسے پورے کے پورے دین پر (یا تمام کے تمام ادیان پر!)''۔ چنانچہ دین کا غالب ہونا تو تقدیرِ الٰہی ہے اور اسے ہو کر ہی رہنا ہے۔ مَیں نے اس آیت پر ایک تفصیلی مضمون بھی لکھا تھا' جو 'میثاق' میں چھپ چکا ہے' اور تیسری سالانہ قرآن کانفرنس میں' مَیں نے اسی آیت کو اپنے خطاب کا مرکزی موضوع بنایا تھا*۔ یہاں اس تفصیل کا بہرحال موقع نہیں ہے' لیکن یہ بات ذہن میں رکھئے کہ تمام انبیاء و رسل علیہم السلام کی مقدّس جماعت میںبعثتِ محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی جو اتمامی و تکمیلی شان ہے' وہ درحقیقت اسی آیت کے حوالہ سے سمجھ میں آئے گی۔

آیت کے آخر میں فرمایا: {وَ کَفٰی بِاللّٰہِ شَہِیۡدًا ﴿۲۸﴾} ''اللہ کافی ہے گواہی کے لیے''۔ نبی اکرم ﷺ نے اپنے اس فرضِ منصبی کو کس طور سے سرانجام دیا' اس کے لیے کیسی کیسی مشقتیں جھیلیں' کیسی مخالفتوں کا مقابلہ کیا' فقر و فاقہ کے کن مراحل کو طے کیا' قید و بند کی کیا کیا صعوبتیں برداشت کیں' کس طریقہ سے

پتھروں کی بوچھاڑ اپنے جسم پر جھیلی‘ کس طرح طنز و استہزاء کے تیروں کو اپنے سینے پر لیا‘ یہ سب اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے۔ اور پھر اللہ تعالیٰ کو یہ بھی معلوم ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھیوں (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) نے کس کس طرح ان کی نصرت کی ہے ---- سورۃ الحدید میں فرمایا:

{لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا رُسُلَنَا بِالۡبَیِّنٰتِ وَ اَنۡزَلۡنَا مَعَہُمُ الۡکِتٰبَ وَ الۡمِیۡزَانَ لِیَقُوۡمَ النَّاسُ بِالۡقِسۡطِ ۚ وَ اَنۡزَلۡنَا الۡحَدِیۡدَ فِیۡہِ بَاۡسٌ شَدِیۡدٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَ لِیَعۡلَمَ اللّٰہُ مَنۡ یَّنۡصُرُہٗ وَ رُسُلَہٗ بِالۡغَیۡبِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ قَوِیٌّ عَزِیۡزٌ ﴿۲۵﴾}(الحدید)

’’ہم نے بھیجا اپنے رسولوں کو واضح نشانیوں کے ساتھ اور ہم نے ان کے ساتھ کتاب اور میزان اُتاری تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں۔ اور ہم نے لوہا بھی اُتارا

---

* یہ مقالہ ’’نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت‘‘ کے عنوان سے کتابی شکل میں دستیاب ہے۔

ہے‘ اس میں شدید جنگی صلاحیت ہے اور لوگوں کے لیے دوسری منفعتیں بھی ہیں‘ اور تاکہ اللہ جان لے کہ کون مدد کرتا ہے اُس کی اور اُس کے رسولوں کی غیب میں ہونے کے باوجود۔ یقیناً اللہ بہت قوت والا‘ بہت زبردست ہے۔‘‘

یعنی نزولِ کتاب کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ اللہ ظاہر کر دے گا کہ کون ہیں وہ لوگ جنہوں نے اللہ اور اس کے رسولؐ کی مدد کی۔ اللہ کی مدد اس لیے کہ دین اللہ کا ہے جسے غالب کیا جا رہا ہے اور رسولؐ کی مدد اس لیے کہ اس کو غالب کرنا رسول کا فرضِ منصبی قرار پایا ہے۔ لہٰذا جو اس مشن میں‘ اس مقصد کی تکمیل میں رسول اللہ ﷺ کے دست و بازو بنے ہیں‘ اُنہی لوگوں کا یہاں ذکر ہے کہ اللہ ان کے ایثار اور ان کی قربانیوں سے واقف بھی ہے اور اس پر گواہ بھی ہے۔

جب وہ وقت آگیا‘ چشمِ تصوّر سے دیکھئے‘ کہ جب پورے جزیرہ نمائے عرب پر اللہ کا دین غالب ہو گیا۔ حجۃ الوداع کا موقع ہے‘ سوا لاکھ سے زائد کا مجمع سامنے ہے۔ حضور ﷺ اپنی دعوت کو finishing touches دے رہے ہیں۔ آخری باتیں بیان کرنے کے بعد آپؐ اس پورے مجمع سے ایک گواہی لیتے ہیں: ((اَلَا ھَلْ بَلَّغْتُ؟)) ’’لوگو سنو! کیا میں نے پہنچا دیا؟‘‘ اس پر پورے مجمع نے یک زبان ہو کر جواب دیا: نَشْھَدُ اَنَّکَ قَدْ بَلَّغْتَ وَاَدَّیْتَ وَنَصَحْتَ(۱)۔ ایک روایت میں الفاظ آتے ہیں: اِنَّا نَشْھَدُ اَنَّکَ قَدْ بَلَّغْتَ الرِّسَالَۃَ وَاَدَّیْتَ الْاَمَانَۃَ وَنَصَحْتَ الْاُمَّۃَ وَکَشَفْتَ الْغُمَّۃَ کہ ہاں ہم گواہ ہیں کہ آپ ﷺ نے رسالت کا حق ادا کر دیا‘ آپؐ نے امانت کا حق ادا کر دیا (یہ قرآن

آپؐ کے پاس اللہ کی امانت تھی جو آپؐ نے ہم تک پہنچا دی)' آپؐ نے اُمت کی خیر خواہی کا حق ادا کر دیا 'اور آپ ؐ نے گمراہی اور ضلالت کے اندھیروں کا پردہ چاک کر دیا۔ حضور ﷺ نے تین دفعہ یہ سوال کیا اور تین دفعہ جواب لیا اور تینوں دفعہ انگشت شہادت آسمان کی طرف اٹھا کر پکارا: ((اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ! اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ! اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ!)) اے اللہ! تو بھی اس پر گواہ رہ کہ آج میں اپنے فرضِ منصبی سے سبکدوش ہو گیا

_____(۱) صحیح مسلم 'کتاب الحج' باب حجۃ النبیﷺ۔ وسنن ابی داؤد' کتاب المناسک' باب صفۃ حجۃ 'النبی ﷺ۔

ہوں!---- اللہ کی گواہی کے بارے میں یہاں فرمایا:{وَ کَفٰی بِاللّٰہِ شَہِیْدًا ﴿۲۸﴾} ''اور کافی ہے گواہی اللہ کی!'' کوئی اور مانے نہ مانے' کوئی اور اس میں سقم نکالے' اعتراض کرتا رہے' بس اللہ کافی ہے گواہی کے لیے۔ اسے معلوم ہے کہ اس کے رسولؐ نے اپنے مقصدِ بعثت کو پورا کرنے کے لیے کیسے کیسے شدائد و مصائب کا مقابلہ کیا۔

اگلی آیت میں فرمایا:{مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ }''محمد(ﷺ) اللہ کے رسول ہیں''۔ غلبۂ دین کی اس جدّوجُہد میں ایک تو رسول کی شخصیت ہے اور ایک اُنؐ کے اعوان و انصارؓ ہیں جو اس الٰہی مشن میں اُنؐ کے دست و بازو بنے۔یہی وجہ ہے کہ سورۃ الصف میں جب یہ آیت آئی تو اس کے فوراً بعد مسلمانوں کو دعوتِ جہاد دی گئی:

{یٰٓاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ہَلْ اَدُلُّکُمْ عَلٰی تِجَارَۃٍ تُنْجِیْکُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ﴿۱۰﴾ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖ وَ تُجَاہِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ بِاَمْوَالِکُمْ وَ اَنْفُسِکُمْ ؕ ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۱﴾ ...}

''اے ایمان کے دعوے دارو! کیا میں تمہیں ایسی تجارت کے بارے میں بتائوں جو تمہیں دردناک عذاب سے چھٹکارا دلا دے؟(وہ یہ کہ) تم ایمان لائو اللہ اور اُس کے رسولؐ پر اور جہاد کرو اللہ کے راستے میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ۔یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم سمجھ رکھتے ہو...''

تو حضور ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی جماعت اب یہاں ایک وحدت بن گئی۔ نبی اکرم ﷺ فرائض نبوت ورسالت کی ادائیگی میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے تعاون حاصل کر رہے ہیں 'اور جس درجہ کا تعاون کیا ہے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے 'دنیا کی تاریخ اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے۔ کہیں اور کیا 'خود انبیاء کرام علیہم السلام کی جماعت میں اس کی کوئی دوسری مثال موجود نہیں۔ حضور ﷺ سے قریب ترین حضرت موسیٰ علیہ السلام آتے ہیں جن کا ذکر قرآن مجید میں متعدد بار آیا ہے' لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حیاتِ طیبہ میں جب قتال کا مرحلہ آیا تو آپ کو معلوم ہے اُمّت نے ٹکا سا جواب دے دیا لہ :{فَاذْہَبْ اَنْتَ وَ رَبُّکَ فَقَاتِلَآ اِنَّا ہٰہُنَا قٰعِدُوْنَ ﴿۲۴﴾} (المائدۃ) ''بس تم اور تمہارا رب دونوں جائو

اور جا کر قتال کرو‘ہم تو یہاں بیٹھے ہیں‘‘۔اب ذرا اندازہ کیجیے کہ اُمّت کے اس جواب کا کیا شدید اثر تھا جس کے تحت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے یہ الفاظ نکلے ہیں: {رَبِّ اِنِّیۡ لَاۤ اَمۡلِکُ اِلَّا نَفۡسِیۡ وَ اَخِیۡ فَافۡرُقۡ بَیۡنَنَا وَ بَیۡنَ الۡقَوۡمِ الۡفٰسِقِیۡنَ ﴿۲۵﴾}’’پروردگار‘ مجھے تو اختیار نہیں ہے سوائے اپنی جان کے اور اپنے بھائی (ہارونؑ کی جان) کے‘ تو اب تفریق کردے ہمارے اوران نافرمان لوگوں کے درمیان‘‘۔ حد ہے بیزاری کی کہ کسی اُمّت کا رسول اپنی اُمّت سے اعلانِ براء ت اور اظہارِ بیزاری کر رہا ہو۔اس کے تقابل (contrast)میں دیکھئے اصحابِ محمد ﷺ کو۔ غزوۂ بدر سے قبل جب مشاورت ہوئی تو صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین میں سے حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہمانے اسی کا حوالہ دیا تھا کہ حضورؐ آپ ہمیں اصحابِ موسیٰ پر قیاس نہ کیجیے جنہوں نے کہہ دیا تھا: {فَاذۡہَبۡ اَنۡتَ وَ رَبُّکَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا ہٰہُنَا قٰعِدُوۡنَ ﴿۲۴﴾}‘ بلکہ آپؐ بسم اللہ کیجیے‘ ہم آپؐ کا ساتھ دیں گے اور آپؐ دیکھیں گے کہ اللہ تعالیٰ آپؐ کو ہمارے ذریعے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرمائے گا۔

{مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰہِ ؕ}‘اس حوالے سے ایک ضروری نکتہ ذہن میں رکھئے کہ حضور ﷺ کا مزید وصف بیان کرنے کی یہاں کوئی ضرورت نہیں‘ یہ بات کافی ہے کہ وہ اللہ کے رسولؐ ہیں۔ یہ رسالت اور نبوت گویا تمام محاسن کی جامع ہے‘ لہٰذا {مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰہِ ؕ}پر اکتفا کیا کہ محمد ﷺ تو اللہ کے رسول ہیں اور ان کے بارے میں مزید کچھ کہنے کی احتیاج ہی نہیں۔ ایک اور نکتہ بھی ذہن میں رکھئے۔ آپ نے مختلف انبیاء و رسل علیہم السلام کے ساتھ مختلف نسبتیں سنی ہیں۔ ابراہیم خلیل اللہ ہیں‘ اسماعیل ذبیح اللہ ہیں‘ موسیٰ کلیم اللہ ہیں‘ عیسیٰ روح اللہ ہیں اورنبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کا امتیازی وصف ہی یہی ہے کہ آپ مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰہِ ہیں! وجہ یہ ہے کہ رسالت اپنی تکمیل کو پہنچی ہے محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت میں اور آپؐ کی نبوت و رسالت میں۔ گویا آپؐ کا تو عالم ہی یہ ہے کہ آپ رسول اللہ ہیں‘ لہٰذا اس پر مزید کوئی تفصیل اختیار کیے بغیر آگے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا ایک نقشہ کھینچا گیا۔ ظاہر ہے کہ اللہ کا علم تو قدیم ہے اور ہر بات کا علم اسے پہلے سے تھا۔ وہ تو جانتا

تھا کہ محمد ﷺ کی شخصیت پر چھینٹے نہیں اُڑائے جائیں گے‘ داغدار کرنے کی کوشش ہوگی تو اصحابِ رسول رضوان اللہ علیہم اجمعین کی شخصیتوں کو ہوگی۔ لہٰذا پیش بندی کے لیے زیادہ شرح و بسط کے ساتھ گفتگو {وَالَّذِیۡنَ مَعَہٗ}سے متعلق ہو رہی ہے۔

یہ بھی واضح رہے کہ حضور ﷺ کی رسالت کو تسلیم کرنے والوں کو اپنے طرزِ عمل میں مکمل تغیر پیدا کرنا ہوگا اور آپؐ کی اطاعت بھی کرنی پڑے گی‘ اس لیے کہ رسول بھیجے ہی اس لیے جاتے ہیں کہ ان کی اطاعت کی جائے۔ اب جس نے بھی محمد ﷺ کو اللہ کا رسول مان لیا تو اس کے ایمان کا اولین اورلازمی تقاضا یہ ہے کہ

آپ ﷺ اس کو کل نوعِ انسانی اور اپنی جان سے بھی زیادہ محبوب ہو جائیں۔ اتباع، اطاعت، محبت، نصرت، تعظیم، حضور ﷺ کے مشن کی تکمیل کے لیے جان و مال کا کھپانا وغیرہم، یہ تمام لوازم ہیں محمد مصطفیٰ ﷺ کو اللہ کا رسول تسلیم کرنے کے۔ میں نے اس موضوع پر یہیں کراچی میں ایک مرتبہ ایک تقریر کی تھی جو مطبوعہ موجود ہے: ''نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی بنیادیں!'' سورۃ الاعراف کی آیت ۱۵۷ میں حضور ﷺ کے ساتھ تعلق کی شرائط مذکور ہیں جن میں سے ہر شرط پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ فرمایا: {فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَ عَزَّرُوْهُ وَ نَصَرُوْهُ وَ اتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْۤ اُنْزِلَ مَعَهٗۤ ۙ اُولٰٓىٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۵۷﴾} ''تو جو لوگ آپ (ﷺ) پر ایمان لائیں گے اور آپ (ﷺ) کی تعظیم کریں گے اور آپ کی مدد کریں گے اور پیروی کریں گے اُس نور کی جو آپ ﷺ کے ساتھ نازل کیا جائے گا وہی لوگ ہوں گے فلاح پانے والے۔''

مَیں یہاں عرض کردوں کہ ہمارے ہاں بڑے فتنے اٹھتے رہے ہیں اور ان فتنوں میں انکارِ حدیث یا انکارِ سُنّت کا فتنہ بڑا عظیم فتنہ ہے۔ چونکہ علمائِ کرام کا یہ فرضِ منصبی ہے کہ دین کی مدافعت کریں، لہٰذا اس فتنہ کی بنیادوں پر تیشہ چلانے کی پوری کوشش ہوئی ہے اور حجیت ِ حدیث کے موضوع پر ایک زمانہ میں ہمارے ہاں آٹھ دس کتابیں ایک ہی دور میں سامنے آئی ہیں۔ وہ وقت کا ایک تقاضا تھا ---- لیکن میں نے ایک بات مولانا امین احسن اصلاحی صاحب سے عرض کی تھی کہ مدافعت ِ سُنّت میں جو طریقہ اب تک ہم نے اختیار کیا ہے اس

میں مجھے ایک خامی محسوس ہوئی ہے۔ وہ خامی یہ ہے کہ ہم نے صرف مدافعانہ جنگ لڑی ہے اور حدیث کی حجیت پر دلائل دے رہے ہیں، حالانکہ Offense is the best defence کے مصداق اس فتنہ کا جارحانہ انداز میں مقابلہ کرنا ہوگا اور یہ ثابت کرنا ہوگا کہ وہ لوگ قرآن کے نام سے جس فکر کو پیش کر رہے ہیں وہ غیر قرآنی فکر ہے۔ ہمارے اب تک کے انداز سے عام لوگ اور خام اذہان یہ محسوس کرتے ہیں کہ شاید قرآن مجید کے ٹھیکیدار تو وہی ہیں اور یہ لوگ صرف حدیث کو لے کر اور اسی کی مدافعت میں پورا زور صرف کر رہے ہیں۔ یہ تاثر جو پیدا ہو رہا ہے اس کو ختم کرنے کے لیے ان کے پالے میں جا کر بات کی جائے کہ تمہیں قرآن کا صحیح فکر حاصل نہیں ہے۔ تم جو کچھ قرآن سے منسوب کر کے کہہ رہے ہو، وہ قرآن نہیں، غیر قرآن ہے۔ جب تک اس انداز سے مقابلہ نہیں ہوگا، وہ تقاضا، وہ اثر جو اس کا مطلوب ہے وہ پیدا نہیں ہوگا۔

ایک حدیث حضرت عبیدہ ملیکی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں حضور ﷺ نے ہم سے بایں الفاظ خطاب فرمایا ہے:

((یَا اَهْلَ الْقُرْآنِ لَا تَتَوَسَّدُوا الْقُرْآنَ، وَاتْلُوْهُ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ مِنْ آنَائِ اللَّیْلِ وَالنَّهَارِ، وَافْشُوْهُ وَتَغَنَّوْهُ وَتَدَبَّرُوْا فِیْهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ))(شعب الایمان للبیہقی)

''اے قرآن والو! قرآن کو بس اپنا تکیہ ہی نہ بنا لو' بلکہ دن اور رات کے اوقات میں اس کی تلاوت کیا کرو جیسا اس کی تلاوت کا حق ہے' اور اس کو (چار دانگ عالم میں) پھیلائو' اور اس کو خوش الحانی سے حظ لیتے ہوئے پڑھا کرو' اور اس پر غور و فکر کرو' تاکہ تم فلاح پائو۔''

میں نے اپنی کتاب ''مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق'' کو اسی حدیث پر ختم کیا ہے۔ غور کیجیے' ہم سے خطاب کیا جا رہا ہے :((یَا اَھْلَ الْقُرْآنِ لَاتَتَوَسَّدُوا الْقُرْآنَ...)) کہ اے قرآن والو! قرآن کو تکیہ نہ بنائو' پس۔ پشت نہ پھینک ڈالو بلکہ اس کا حق ادا کرو! ''جب کہ ان لوگوں نے قبضہ مخالفانہ کیا اور اپنے لیے ''اہل۔ قرآن'' کا نام اختیار کر لیا۔ آپ کی زمین کے ایک گز کے اوپر بھی کوئی قبضہ مخالفانہ کرتا ہے تو آپ اس سے دست بردار نہیں

ہوتے بلکہ اس کے لیے لڑتے ہیں' لیکن آپ نے ''اہل۔ قرآن'' کا خطاب انہیں الاٹ کر دیا ہے۔ آپ نے ان پر تنقیدیں کرتے ہوئے خود انہیں ''اہل۔ قرآن'' لکھا ہے۔ یہ درحقیقت بہت بڑی غلطی ہے۔ اہل۔ قرآن وہ نہیں ہیں' اہل۔ قرآن ہم ہیں۔ ان کے لیے لفظ ہونا چاہیے منکرین۔ سُنّت' منکرین۔ حدیث ۔ ان کے قبضہ مخالفانہ کو ہم تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہیں۔

ایک اور بات بھی میں عرض کر دوں کہ سُنّت رسولؐ کی اصل مدافعت ہو گی عملاً اتباعِ سُنّت سے۔ آپ اتباعِ سُنّت پر ضخیم کتاب لکھ دیجیے' لیکن لوگوں کو اگر آپ کی زندگی میں سُنّت کی جھلک نظر نہیں آئے گی تو آپ کا وہ سارا لکھا لکھایا بالکل بے کار اور باطل ہے۔ ہم خود اپنے لیے تو رعایتیں لے لیتے ہیں کہ یہ سُنّت عادت ہے اور یہ سُنّت رسالت ہے۔ اب حضور ﷺ نے تو بتایا ہی نہیں کہ میری یہ سُنّت 'سُنّت عادت ہے اور یہ سُنّت' سُنّت۔ رسالت ہے۔ سارا استنباط تو خود ہم کر رہے ہیں۔چنانچہ جو لوگ سُنّت کی مدافعت کرنا چاہتے ہیں انہیں تو حضور ﷺ کے اتباع میں اس درجہ آگے جانا چاہیے کہ سُنّت۔عادت کو بھی عملاً اپنی زندگی میں اختیار کریں اور سُنّت کا چلتا پھرتا نقشہ نظر آئیں۔

الغرض یہاں فرمایا کہ ''محمد(ﷺ) اللہ کے رسول ہیں''۔ ذہن میں رکھیے کہ اس سورت کے فوراً بعد سورۃ الحجرات ہے اور اس میں واضح کر دیا گیا ہے کہ محمد ﷺ کو رسول ماننے کے تقاضے کیا ہیں؟آپ ﷺ کے سامنے آواز بھی بلند نہ کرو' آپ ؐسے اس طرح بات نہ کرو'جس طرح آپس میں کر لیتے ہو۔ آپؐ کے حجرے کے سامنے کھڑے ہو کر آپؐ کو اس طرح نہ پکارو جس طرح ایک دوسرے کو پکار لیتے ہو: {وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ فِیْکُمْ رَسُوْلَ اللّٰہِ ؕ لَوْ یُطِیْعُکُمْ فِیْ کَثِیْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ}(الحجرات:۷) ''اور جان لو کہ تمہارے مابین اللہ کا رسول موجود ہے۔ اگر وہ تمہارا کہنا مانا کریں اکثر معاملات میں تو تم لوگ مشکل میں پڑ جائو''۔چنانچہ آپ ﷺ کے مقام اور مرتبہ کو پہچانو' یہ اللہ کے رسول ہیں۔ ان کی اتباع اور اطاعت کے اندر عافیت ہے۔ اپنی بات اُن پر ٹھونسنے کی کوشش نہ کرو' اگر کرو گے تو

خود مشکل میں پڑ جائو گے۔

یہ تو ''محمدؐ رسول اللہ '' کے بارے میں چند کلمات میں نے عرض کر دیے۔ اب

آگے پوری تفصیل سے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بارے میں بات ہوئی ہے:{وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ...} ''اور جو ان کے ساتھ ہیں''----آپ چاہیں تورفقاء ‘ساتھی اور اعوان وانصار کہہ لیجیے‘چاہیں تو colleagues یا comrades کہہ لیجیے‘اُن تمام صحابہ کرامؓ کوجو آپ ﷺ کے ساتھ ہیں‘ جوآپ ﷺ کے دست و بازو ہیں‘ جو آپ ﷺ کے دائیں ‘ بائیں‘ آگے اور پیچھے ہیں۔ جو وہاں خون بہانے کو اپنے حق میں سعادت جانتے ہیں جہاں محمدرسول اللہ ﷺ کا پسینہ گرتا ہے۔ان کی کیفیت یہ بیان کی گئی:{اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ}کہ کفّار کے حق میں بہت سخت ہیں‘ نرم خو نہیں ہیں کہ کوئی شخص جس طرح چاہے انہیں exploit کر سکے‘لیکن جب بات آپس کی آئے تو ان سے زیادہ رحم دل کوئی نہیں۔علامہ اقبال نے اس کی بڑی پیاری ترجمانی کی ہے ؎

ہو حلقہ یاراں تو بریشم کی طرح نرم

رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مؤمن !

بہت ہی صحیح کہا جس نے کہا کہ اگر کسی تاریخی روایت میں آپ کو یہ نظر آئے کہ صحابہ کرامؓ کے مابین یہ نقشہ نہیں کوئی اور نقشہ تھا‘ کہیں صحابہ کے مابین دشمنی کا کوئی تذکرہ ملے تو ان روایات کو دریابرد کر دیجیے۔ ہمیں یہ معلوم ہے کہ وہؓ ایک دوسرے کے دشمن کبھی نہیں ہو سکتے۔ اختلاف ممکن ہے اور انسانوں میں باہم اختلاف کا ہونا لازمی ہے۔ خلوص کی بنا پر اختلاف میں شدت بھی پیدا ہوجاتی ہے۔چنانچہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مابین اختلافات میں شدت بھی پیدا ہوئی ہے ‘لیکن یہ کہ ان دلوں میں ایک دوسرے کے لیے نفرت ہو‘ عداوت ہو‘ دشمنی ہو‘ معاذاللہ‘ معاذ اللہ !یہ بات قرآن مجید کی نص قطعی کے خلاف ہے:{مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ط وَالَّذِیْنَ مَعَہٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ}یہاں بعض حضرات نے یہ نکتہ آفرینی کی ہے کہ {وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ} محمد ﷺ کی صداقت کی دلیل ہے۔ میں بڑے ادب سے اس بات سے اختلاف کی اجازت چاہوں گا۔یہ عربی مبین ہے اور اس کے کچھ قواعد وضوابط ہیں۔ یہاں ایسا کوئی قرینہ موجود نہیں ہے کہ {وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ} کو حضور ﷺ کی صداقت کی دلیل کے طور پر پیش کیا جا رہا ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ کسی نبی کی

صداقت کا تعلق کسی کے ساتھ دینے یا نہ دینے سے نہیں ہے۔ ایسے نبی بھی گزرے ہیں کہ جن کا ساتھی ان کے سائے کے سوا کوئی نہیں ہوا۔ تو کیا ان کی صداقت اسی وقت ثابت ہو گی جب ان کے اعوان و انصار ہوں اور ان کے جاں نثار موجود ہوں؟ معاذ اللہ ! ایسا بالکل نہیں ہے ‘بلکہ نبی کی صداقت اپنی جگہ مسلّم ہے۔ اگر یہی دلیل آپ کے پیش نظر ہے تو پھر حضرت نوح علیہ السلام کی صداقت کہاں سے ثابت کریں گے؟ حالانکہ حضرت نوح علیہ السلام بھی سچے رسول ہیں‘ حضرت مسیح علیہ السلام بھی سچے رسول ہیں۔

مَیں اس بارے میں سوچ رہا تھا تو میرے ذہن میں غزوۂ حنین کا نقشہ آگیا۔ اس سے تو انکار ممکن نہیں ہے کہ وہاں بھگدڑ مچی ہے۔ آخر قرآن کی نص قطعی ہے:{وَيَوْمَ حُنَيْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ...}(التوبۃ:۲۵) وہ پورا واقعہ ذہن میں لایئے‘ جب بھگدڑ مچی تو چند سو صحابہ کرامؓ آپ ﷺ کے ساتھ رہ گئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اغیار کا تراشا ہوا افسانہ ہے کہ صرف گنتی کے چند رہ گئے تھے۔ لیکن بارہ ہزار کے لشکر میں سے چند سو رہ جائیں تو بہرحال بھگدڑ تو ہے۔ اُس وقت حضور ﷺ اُترے ہیں اپنی سواری سے‘ عَلم ہاتھ میں لیا ہے‘ زندگی میں پہلی مرتبہ رجز پڑھا ہے اور اس کے الفاظ دیکھئے موقع کی مناسبت سے کیا ہیں: اَنَا النَّبِيُّ لَا كَذِبْ ‘ اَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبْ ’’مَیں نبی ہوں ‘ اس میں کوئی جھوٹ نہیں ہے ‘اور مَیں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں‘‘۔ یعنی یہ بارہ ہزار کا مجمع بنیانِ مرصوص کی طرح کھڑا رہتا۔ تب بھی میں نبی تھا اور اگر کوئی ایک متنفس بھی میرا ساتھ نہ دے تب بھی مَیں نبی ہوں۔ کسی کے ساتھ دینے یا نہ دینے سے میری نبوت کا کوئی تعلق نہیں ! صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا مقام و مرتبہ ضرور بیان کیجیے ۔ انہوں نے جس طرح اپنی جانیں دی ہیں اور مال کھپائے ہیں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی نصرت میں اور پھر اللہ کا جو فضل و کرم ان پر ہوا ہے‘ وہ لائقِ صد تحسین ہے۔ وہ یقیناً اللہ کے منتخب ہیں : {هُوَ اجْتَبٰىكُمْ}’’اُس نے تمہیں چن لیا ہے‘‘۔ حضرت محمد ﷺ مصطفیٰ بھی ہیں اور مجتبیٰ بھی ‘یعنی اللہ کے چنیدہ ہیں ‘ آپ کے صحابہؓ بھی مقامِ اجتبائیت پر فائز ہیں اور وہ بھی مجتبیٰ ہیں۔ ان کا اپنی جگہ عظیم مقام و مرتبہ ہے ‘لیکن خلط مبحث بہرحال نہیں کرنا چاہیے۔

آگے فرمایا:{تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا ۫ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ} ’’تم دیکھو گے انہیں رکوع کرتے ہوئے‘ سجدہ کرتے ہوئے ‘ وہ (ہر آن) اللہ کے فضل اور اس کی رضا کے متلاشی رہتے ہیں‘ ان کی پہچان ان کے چہروں پر (ظاہر) ہے سجدوں کے اثرات کی وجہ سے‘‘۔ ان کا تعبدی جذبہ پوری شدت کے ساتھ ان کے پورے وجود سے پھوٹ رہا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ صرف انقلابی کارکن ہیں کہ نعرے لگا رہے ہوں‘نماز کا وقت آئے تو پتا ہی نہ چلے کہ کون سی نماز کا وقت آیا اور کب نکل گیا۔ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ ذٰلِكَ ! ان کی شان تو یہ ہے کہ میدانِ جنگ میں سرفروشی کے جوہر دکھاتے ہوئے نماز کا وقت آگیا تو وہیں سجدہ ریز ہو گئے ؎

آگیا عین لڑائی میں اگر وقت نماز
قبلہ رُو ہو کے زمیں بوس ہوئی قومِ حجاز!

یہ اوصاف ہیں اصحابِ محمد ﷺ کے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین ---- قرآن حکیم میں ''صلوٰۃ الخوف'' کی تعلیم دی گئی ہے کہ عین لڑائی کے درمیان اگر نماز کا وقت آجائے تو اسلامی فوج دو ٹکڑوں میں بٹ جائے۔ پہلے ایک گروہ حضور ﷺ کی اقتدا میں نماز پڑھ لے' پھر دوسرا گروہ پڑھ لے' لیکن نماز تو پڑھنی ہے ---- معلوم ہوا کہ ان میں یہ دونوں شانیں جمع ہیں' وہ جو کہا کسی کہنے والے نے: هُمْ رُهْبَانٌ بِاللَّيْلِ وَفُرْسَانٌ بِالنَّهَارِ ''یہ رات کے راہب ہیں اور دن کے شہسوار ہیں''۔ یہ دونوں شانیں بتمام وکمال جمع ہوئی ہیں صحابہ کرام ؓ کے اندر۔ دن میں گھوڑوں کی پیٹھوں پر اس طرح جمے ہوئے ہیں جیسے پہاڑ زمین پر جمے ہوں اور رات کو جائے نماز پر کھڑے ہیں تو ان کے آنسوئوں سے سجدہ گاہیں بھیگ جاتی ہیں۔ یہ اگر دن کے شہسوار ہیں تورات کے راہب 'اور ان میں تعبدی جذبہ بھی ایسا ہے کہ ان کے چہروں پر طویل سجدوں کے آثار موجود ہیں۔

{ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۚ...}''یہ ہے ان کی مثال تورات میں...''گویا اصحابِ محمد ﷺ کے یہ اوصاف الہامی کتب میں پہلے سے بیان کر دیے گئے تھے۔ جہاں حضور ﷺ کی پیشین گوئیاں موجود تھیں' وہاں آپؐ کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا بھی نقشہ کھینچ دیا

گیا تھا۔ تاریخ کا عظیم واقعہ ہے کہ بیت المقدس اسی بناپر فتح ہوا ہے ۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی پوری تفصیل ان کے ہاں موجود تھی۔ اس درویش بادشاہ کا پورا حلیہ ان کے ہاں لکھا ہوا موجود تھا۔ اسی لیے تو بلائے گئے اور آپؓ کو دیکھنے کے بعد اور ان علامتوں کے مشاہدے کے بعد مدافعت) (resistance) ختم ہو گئی' دروازے کھول دیے گئے۔ معلوم ہوا کہ تورات اور انجیل میں اصحابِ رسول رضوان اللہ علیہم اجمعین کے تمام اوصاف اورتمام خصائص موجود تھے۔

آگے فرمایا:{وَ مَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ۚ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْـَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ}''اور انجیل میں ان کی مثال یوں ہے کہ جیسے ایک کھیتی ہو جس نے نکالی اپنی کونپل' پھر اس کو تقویت دی' پھر وہ سخت ہوئی' پھر وہ اپنے تنے پر کھڑی ہو گئی''۔ یہ شان ہے محمد رسول اللہ ﷺ کی جماعت کی جو آپ نے تیار کی۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک موقع پر فرمایا تھا:((بَدَءَ الْاِسْلَامُ غَرِيْبًا وَسَيَعُوْدُ كَمَا بَدَءَ غَرِيْبًا فَطُوْبٰى لِلْغُرَبَاءِ))(۲)''اسلام اپنے ابتدائی دنوں میں غریب (اجنبی) تھا اور وہ عنقریب غریب ہوجائے گا جیسے شروع میں تھا'پس مبارک باد ہے غریبوں کے لیے''۔ ان دونوں غربتوں کے مابین ایک عظمت و شوکت موجود ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا لگایا ہوا یہ پودا تناور درخت بن گیا

اور رسول اللہ ﷺ کا دل خوشی سے باغ باغ ہوگیا: {یُعۡجِبُ الزُّرَّاعَ}''یہ کاشتکار کو بڑی بھلی لگتی ہے''۔ کھیتی جب پھلتی پھولتی ہے تو کاشتکار کا دل خوش ہوتا ہے' باغ باغ ہوتا ہے۔ اپنے صحابہؓ کی جماعت کو پھلتے پھولتے دیکھ کر محمد رسول اللہ ﷺ کا دل باغ باغ ہو جاتا ہے 'اس لیے کہ اس کھیتی کے کاشتکار آپ ﷺ ہیں۔ دوسری طرف اس نقشہ کو دیکھ کر اعدائِ دین' دشمنانِ دین' اللہ اور رسولؐ کے دشمنوں کے دلوں پر آریاں چلتی ہیں :{لِیَغِیۡظَ بِہِمُ الۡکُفَّارَ}''تاکہ ان سے کافروں کے دل جلائے۔''

یہ بہت اہم مقام ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو دیکھ کر جن لوگوں کے دلوں کو تکلیف پہنچے وہ اپنا مقام قرآنِ مجید کی رو سے خود متعین کر لیں یہ بات وہ ہے جو حضور ﷺ نے بیان فرمائی: ((فَمَنْ اَحَبَّهُمْ فَبِحُبِّیْ اَحَبَّهُمْ وَمَنْ اَبْغَضَهُمْ

_____(۲) صحیح مسلم 'کتاب الایمان' باب بیان بدأ الاسلام غریبا وسیعود غریبا۔

فَبِبُغْضِیْ اَبْغَضَهُمْ))(۳)یعنی جو ان سے محبّت کرتا ہے وہ میری محبّت کی وجہ سے ان سے محبّت کرتا ہے۔ وہ میرے ساتھی ہیں' میرے دست و بازو ہیں' میرے اعوان و انصار ہیں۔ اور جو ان سے دشمنی کرتا ہے اس کی دشمنی حقیقت میں مجھ سے ہے' عداوت مجھ سے ہے۔چونکہ وہ مجھ پر اپنے غیظ و غضب کا اظہار نہیں کر سکتا' مجبوری ہے'لہٰذا اس نے میرے صحابہؓ کو ہدف بنا لیا ہے اور ان پر اپنا غیظ و غضب نکال رہا ہے۔ چنانچہ حضور ﷺ کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے جن کو اپنے دلوں میں محبّت محسوس ہو ' ان کے لیے تہنیت ہے' مبارک باد ہے' اور جن کو انقباض محسوس ہو ' جن کو ان سے کد محسوس ہو' ان سے عداوت اور بغض کا احساس ہوا 'وہ جان لیں کہ ازروئے قرآن ان کا مقام کیا ہے !کسے باشد۔میں جماعتی یا فرقہ وارانہ اعتبار سے نہیں کہہ رہا'بلکہ جس کے سینے میں بھی صحابہ کرامؓ کے بارے میں بغض وعداوت موجود ہے'وہ آئینہ قرآنی میں اپنی صورت دیکھ لے۔

یہ جو ایک نقشہ کھینچا گیا ہے صحابہ کرامؓ کی جماعت کا' اس کا مقصود یہ ہے کہ جن کو اس کاشت کار (محمد رسول اللہ ﷺ) کے ساتھ کوئی قلبی تعلق ہے تو ان کا دل باغ باغ ہوتا ہے اُس جماعت کے ذکر سے'اُن کے حالات پڑھ کر اور ان کے دلوں میں ان کے لیے محبّت اور عقیدت ہے۔ اس کے برعکس وہ لوگ جن کو اپنے دل میں خلش سی محسوس ہو' جن کو کد' عداوت اور بغض محسوس ہو' وہ جان لیں کہ ازروئے قرآن ان کا مقام کیا ہے؟ قرآن ان کے حق میں کیا فتویٰ صادر کر رہا ہے۔

آخر میں فرمایا:{وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنۡہُمۡ مَّغۡفِرَۃً وَّ اَجۡرًا عَظِیۡمًا ﴿۲۹﴾}''اللہ نے وعدہ

لیا ہے ان لوگوں سے جو ان میں سے ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے ' مغفرت اور اجر عظیم کا''۔دنیا میں بھی ان کے لیے فتح عظیم اور نصرت ہے۔ازروئے الفاظِ قرآنی:{وَ اُخۡرٰی تُحِبُّوۡنَہَا ؕ نَصۡرٌ مِّنَ اللّٰہِ وَ فَتۡحٌ قَرِیۡبٌ } (الصّف:۱۳)''اور ایک اور چیز جو تمہیں بہت پسند ہے۔اللہ کی طرف سے مدد اور قریبی فتح''۔زیر مطالعہ آیات میں فرمایا:{ فَجَعَلَ مِنۡ دُوۡنِ ذٰلِکَ فَتۡحًا

_____(۳) سنن الترمذی' کتاب المناقب' باب فیمن سب اصحاب النبی ﷺ۔

قَرِیۡبًا ﴿۲۷﴾}''تو اس کے علاوہ اس نے (تمہارے لیے) ایک قریب کی فتح بھی رکھی ہے''-----یہ دنیا میں فتح و نصرت ہے جو ان کے پائوں چوم رہی ہے اور دوسری طرف آخرت میں ان کے لیے بہت ہی عظیم اجر اور ثواب ہے جو کسی ناپ تول میں آنے والا نہیں۔

آخر میں یہ نوٹ کر لیجیے کہ سورۃ الحجرات کے پورے دو رکوع انہی آیات کی شرح ہیں اور ان میں دو مضامین کو کھول کر بیان کیا گیا ہے:(۱) مسلمانو! اللہ کے رسول ﷺ کے مقام کو پہچانو اور محمد رسول اللہ ﷺ کو ماننے سے جو کچھ تم پر لازم آتا ہے اس کو جانو اور اس کے تقاضوں کو سمجھ لو۔(۲) مسلمانوں کا باہمی تعلق کس انداز کا ہونا چاہیے۔ آپس میں محبّت و مودت ہو۔ ایک دوسرے کا تمسخر نہ کرو' کسی کا برانام بھی نہ رکھو'کہیں اختلاف ہو جائے توفوراً رفع کرنے کی فکر کرو۔ مسلمانو! بنیانِ مرصوص بنے رہو۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارے اختلاف اور افتراق سے اعدائے دین او ر دشمنانِ اسلام کے لیے مسرت اور خوشی کا ذریعہپیدا ہوجائے'بلکہ اپنے آپ کو ایک بنیانِ مرصوص بنا کے رکھو۔یہ دو مضمون سورۃ الحجرات میں پوری شرح و بسط کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ اللہ ربّ العزت سے دعا ہے کہ قرآن مجید کو سمجھ کر صحیح معنوں میں اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔آمین یاربّ العالمین!

اقول قولی هذا واستغفر الله لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات

* * *

نبی اکرم ﷺ کی امتیازی شانوں میں سے ایک شان

پوری نسلِ انسانی کی تاریخ میں بے شمار اعتبارات سے نبی اکرم ﷺ کا معاملہ منفرد ہے۔ کسی اعتبار سے نبی اکرم ﷺ کی شانوں کا جائزہ لیجیے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ آنحضرت ﷺ کی کسی شان تک بھی جماعت انبیاء و رسل علیہم السلام میں سے کوئی نہیں پہنچتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق کا نقطۂ کمال ہیں جناب محمد ﷺ۔ تمام کائنات کی تخلیق کا نقطۂ عروج انسان اور تمام انسانوں کے سردار ہیں جناب محمد ﷺ۔ پس آنحضرت ﷺ کا تو نہ معلوم کس کس پہلو سے معاملہ امتیازی ہے۔ ہم ان امتیازی شانوں کو گن بھی نہیں سکتے۔ جب ہم کسی خاص مسئلہ پر غور کر رہے ہوتے ہیں تو کبھی کسی وقت کسی ایک بات کا شعور ہوجاتا ہے اور کبھی کسی دوسری بات کا۔ نبی اکرم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے جو ساتھی دیے' واقعہ یہ ہے کہ اس معاملہ میں آپؐ کا معاملہ بالکل مختلف اور امتیازی ہے۔ ساتھیوں کے معاملہ میں آپ ﷺ سے زیادہ کسی خوش قسمت انسان کا ہم تصور نہیں کرسکتے۔ نہ ایسی کوئی شخصیت آنحضرت ﷺ سے پہلے گزری ہے' نہ آپؐ کے بعد اس کا کوئی امکان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو جو ساتھی دیے' اس کی نظیر پوری انسانی تاریخ میں موجود نہیں ہے۔ اس بات میں ہمیں دیگر انبیاء و رسل علیہم السلام کا معاملہ بھی مختلف نظر آتا ہے۔

اصحابِ موسیٰ علیہ السلام

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حالات کو دیکھئے' آپ کو نظر آئے گا کہ بنی اسرائیل آنجنابؑ کا اس وقت تک ساتھ دیتے رہے جب تک کہ آنجنابؑ ان کو فرعون کی غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرا کے بخیر و عافیت مصر سے نکال نہیں لائے۔ پھر جو نافرمانیوں کا معاملہ شروع ہوا ہے

تو وہ لامتناہی تھا۔ مصر سے نکلتے ہی انہوں نے بچھڑے کی پرستش شروع کی۔ پھر ان کا طرزِ عمل پیہم اتنا دل آزار رہا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پکار اُٹھے:{یٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِیْ وَ قَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ ؕ}(الصف:۵)'' اے میری قوم کے لوگو! تم کیوں مجھے اذیت دیتے ہو حالانکہ تم خوب جانتے ہو کہ میں تمہاری طرف اللہ کا بھیجا ہوا رسول

ہوں''۔یہ بات کسی ایک واقعہ سے متعلق نہیں ہے۔یہاں فعل مضارع لایا گیا ہے' جس میں دوام ہوتا ہے ۔یعنی اے میری قوم کے لوگو! تمہارا میرے ساتھ ایذارسانی کا طرزِ عمل مسلسل جاری ہے۔ آنجنابؑ پر تنقیدیں ہوتی تھیں' آپؑ کا استہزاء ہوتا تھا' فقرے چست کیے جاتے تھے' الزام لگائے جاتے تھے کہ تم نے ہمیں مروا دیا۔ گویا وہ مصر میں چین کی بنسری بجاتے تھے۔یہ ساری اذیتیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جھیلنی پڑیں۔ ایک وقت وہ بھی آیا جب جہاد و قتال سے پوری قوم نے کورا جواب دے دیا اور صاف انکار کرتے ہوئے کہا:{فَاذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ﴿۲۴﴾ } (المائدۃ) ''پس جائو' تم اور تمہارا ربّ جا کر جنگ کرو' ہم تو یہاں بیٹھے ہیں''۔یہ آخری چرکا تھا جو اپنے ساتھیوں کی طرف سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو لگا 'جس پر آنجنابؑ کی قوتِ برداشت جواب دے گئی اور آپؑ کی زبان سے بے اختیار نکلا: {رَبِّ اِنِّیْ لَاۤ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِیْ وَ اَخِیْ فَافْرُقْ بَیْنَنَا وَ بَیْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ ﴿۲۵﴾ }(المائدۃ)''اے میرے رب! میرے اختیار میں کوئی نہیں مگر میری اپنی ذات یا میرا بھائی' پس تو ہمارے اور ان نافرمان لوگوں کے درمیان تفریق کر دے۔''

اصحابِ عیسیٰ علیہ السلام

انجیل پڑھیے تو آپ کو معاملہ اس سے بھی دو ہاتھ آگے نظر آئے گا۔یہودیوں نے بحیثیت اُمت حضرت مسیح علیہ السلام کے ساتھ کیا کچھ نہیں کیا۔ گمراہ کہا' کافر کہا' مرتد کہا' جادوگر کہا' واجب القتل ٹھہرایا اور اپنی دانست میں صلیب پر چڑھوا کر دم لیا۔ چلیے' ان کا معاملہ چھوڑیئے۔ انہوں نے تو حضرت مسیح علیہ السلام کو رسول ہی نہیں مانا' آنجنابؑ کے حواریین کا معاملہ دیکھئے! آپؑ کو کُل بہتر (۷۲)افراد عطا ہوئے ۔ آنجنابؑ کی اپنے حواریین کو یہ دعوت

تھی کہ میرے ساتھ رہو۔ لیکن ان بہتر میں سے اس دعوت پر لبیک کہنے والے صرف بارہ حواریین نکلے۔ ان بارہ میں سے ایک وہ ہے جس نے غداری کی' دوسرا وہ ہے جس نے تین مرتبہ آنجنابؑ کا انکار کیا۔محرف شدہ انجیل میں یہ بات اب بھی موجود ہے کہ گرفتاری کی رات کو آخری کھانے کے بعد حضرت مسیح علیہ السلام نے کہا:''پیٹر! اس سے پہلے پہلے کہ مرغِ سحر اذان دے تو مجھ سے تین بار اعلانِ براءت کرے گا''۔ لہٰذا اب رہ گئے دس۔ تو انجیل کی گواہی یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بھی جان نثاری نہ دکھا سکا اور اس آڑے وقت میں حضرت مسیح علیہ السلام کا ساتھ نہ دے سکا۔ پھر مسلسل ساتھ رہنے والوں کو حضرت مسیح علیہ السلام جس طرح نصیحتیں کرتے رہے وہ بھی انجیل میں مذکور ہے' جن کے بین السطور ان حواریین کی قلبی کیفیات کی ایک جھلک نظر آ سکتی ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام ان سے بار بار کہتے نظر آتے ہیں: ''تم یقین کیوں نہیں رکھتے! تم مانتے کیوں نہیں! تم کو اللہ پر توکّل کیوں نہیں ہے؟''

اس لحاظ سے بھی دیکھا جائے تو آنحضرت ﷺ کا معاملہ بے حد ونہایت منفرد بلکہ امتیازی ہے ۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوںکہ نبی کریم ﷺ کو ایسے جان نثار اصحاب ملے کہ تاریخ انسانی اس کی کوئی مثال پیش نہیں کر سکتی۔ حالات وواقعات کی تہ میں اصل حکمت و مشیت تو اللہ تعالیٰ کی کارفرما ہوتی ہے ‘لیکن اُسی کی یہ سنت ہے کہ وہ ظاہر میں بھی حالات وواقعات کے لیے اسباب و علل فراہم کرتا ہے ‘لہٰذا اس بات کو ذہن میں رکھئے کہ کسی قوم کا جو بنیادی اخلاقی سرمایہ ہوتا ہے‘ اس کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ جس قوم میں سے بنیادی انسانی اخلاق کا دیوالہ نکل چکا ہو‘ اس قوم کو آپ بلوئیں گے تو جو مکھن نکلے گا وہ اس قوم کی اجتماعی کیفیات کے مطابق نکلے گا۔ اسی طرح بنیادی انسانی اخلاقیات کی اگر کچھ پونجی کسی قوم میں محفوظ ہو تو اس قوم کا مکھن ایسے لوگوں پر مشتمل ہو گا جن میں انسانی اخلاق کی اقدار بدرجۂ اَتم موجود ہوں گی۔

آنحضرت ﷺ جس قوم کی طرف مبعوث فرمائے گئے‘ اس میں شک نہیں کہ وہ بڑی اکھڑ اور جھگڑالو قوم تھی۔ خود قرآن مجید میں اس کو قَوْمًا لُّدًّا کہا گیا ہے۔ وہ اعتقادی

اور عملی طور پر بھی بہت سے مفاسد میں گرفتار تھی‘لیکن اس سب کے باوجود بنیادی انسانی کردار ان میں محفوظ(intact) تھا ۔ہاتھ میں ہاتھ دے دیا تو دے دیا تو اب ہرچہ بادا باد! مان لیا تو مان لیا ۔ مہمان آجائے تو اس کے لیے خود فاقہ کریں گے لیکن اس کو کھلائیں گے۔ باپ کا قاتل بھی اگر امان لے چکا ہے تو اس سے انتقام نہیں لیا جائے گا۔ اندازہ کیجیے کہ ایک شخص کے باپ کا قاتل جس کو وہ وادیوں میں تلاش کر رہا ہے‘ جس پر قابو پانے کے لیے وہ صحرائوں میں سرگرداں ہے اوراس تلاش و تعاقب میں سالہا سال بیت گئے ہیں کہ یہ قاتل ہاتھ لگے تو اس کے خون سے انتقام کی آگ بجھائی جائے... اور وہی شخص آتا ہے اور رات کے اندھیرے میں امان لے لیتا ہے‘ پہچانا نہیں جاتا کہ کون ہے۔ صبح کے اجالے میں شناخت ہوتی ہے کہ یہ تو باپ کا قاتل ہے تو جذبۂ انتقام پر امان دینے کی قدر غالب آجاتی ہے اور اس سے صرف یہ کہا جاتا ہے کہ جلد سے جلد میری دسترس سے دور چلے جائو‘ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکوں۔ تو یہ اس قوم کاجو کردار تھا‘ یہی اس کا بنیادی سرمایہ تھا۔ اسی لیے نبی کریم ﷺ نے فرمایا:((اَلنَّاسُ کَالْمَعَادِنِ)) ’’انسانوں کی مثال معادن کی سی ہے‘‘۔اگر لوہے کی کچ دھات (ore) ہو گی تو اس سے لوہا نکلے گا‘ سونے کی کچ دھات ہے تو سونا باہر نکلے گا۔ ہوسکتا ہے کہ سونے کی کچ دھات(ore)جب کان سے نکلے تو اس کے ساتھ کچھ دوسری دھاتیں اس طرح ملی جلی ہوں کہ وہ بظاہر لوہے سے بری نظر آئے‘ لیکن جب صاف کریں گے تو خالص سونا نکل آئے گا۔اسی طرح لوہے کی کچ دھات کان سے نکلتے وقت خواہ سونے کی کچ دھات سے بہتر نظر آ رہی ہو لیکن صاف کرنے میں کتنی ہی جان لڑائو گے تو نتیجتاً لوہا ہی نکلے گا ۔ چنانچہ نبی

اکرم ﷺ نے فرمایا:((خِیَارُکُمْ فِی الْجَاھِلِیَّۃِ خِیَارُکُمْ فِی الْاِسْلَامِ)) ''تم میں سے جو جاہلیت میں بہترین تھے ' وہ اسلام میں بھی بہترین ہیں''۔ یعنی حالت ِکفر میں جو لوگ بہترین انسانی اخلاق و کردار اور اعلیٰ صفات و اوصاف کے حامل تھے' اسلام میں ان کی یہ خوبیاں مزید نکھر گئیں اور وہ ''نورٌ علیٰ نور'' کا مصداق بن گئے۔

مَیں یہ عرض کر رہا تھا کہ آنحضرت ﷺ کے امتیازات میں یہ بات بھی شامل ہے

کہ آپ ﷺ کو ایسے اصحابؓ ملے جو اس سے قبل کسی نبی یا رسول کو نہیں ملے تھے۔ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کے اصحاب نے ان جلیل القدر رسولوں کے ساتھ جو معاملہ کیا تھا' میں اس کا اجمالاً ذکر کر چکا ہوں۔ بنی اسرائیل کے لیے اللہ تعالیٰ نے ارضِ مقدّس ''یروشلم'' لکھ دی تھی اور ان کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے جہاد و قتال کا حکم دیا تھا۔ نیز ان کو دو مؤمنین صالحین کی زبانی بشارت مل گئی تھی:{فَاِذَا دَخَلْتُمُوْہُ فَاِنَّکُمْ غٰلِبُوْنَ ۚ وَ عَلَی اللّٰہِ فَتَوَکَّلُوْۤا اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿ ۲۳ ﴾}(المائدۃ)''پس جب تم (ان جباروں کے مقابلے میں) دروازے کے اندر داخل ہو گئے تو تم ہی غالب رہو گے اور اللہ پر بھروسہ رکھو اگر تم اُس پر ایمان رکھتے ہو۔''لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے جواب دیا جو میں آپ کو سنا چکا ہوں۔

اب تقابل میں نبی اکرم ﷺ کے اصحاب (رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین) کا طرزِ عمل دیکھئے۔ غزوۂ بدر سے قبل آنحضرت ﷺ نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو مشورے کے لیے جمع کیا اور بتایا کہ قریش ایک ہزار کا لشکر جرار لے کر مکّہ سے کوچ کر چکے ہیں۔ مہاجرین میں سے اکثر اصحابؓ نے جان نثارانہ تقریریں کیں لیکن رسول اللہ ﷺ انصار کی طرف دیکھتے رہے 'کیونکہ انصار نے بیعت کے وقت صرف یہ اقرار کیا تھا کہ وہ اس وقت تلوار اٹھائیں گے جب دشمن مدینہ پر چڑھ آئے۔ یہ کیفیت دیکھ کر حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہما (سردارِ خزرج) نے اُٹھ کر کہا: ''کیا حضورؐ کا اشارہ ہماری طرف ہے؟یارسول اللہ ! ہم آپؐ پر ایمان لا چکے' ہم آپؐ کی تصدیق کر چکے' ہم آپؐ کو اللہ کا رسول تسلیم کر چکے۔ اب خدا کی قسم ! آپؐ فرمائیں تو ہم آگ اور سمندر میں کود پڑیں''۔ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ انہوں نے مزید عرض کیا:''اور آپؐ حکم دیں تو ہم برک غماد تک(عرب کا ایک دور دراز علاقہ جس کی راہ میں لق و دق صحرا پڑتا ہے) اپنی سواریاں لے جائیں ۔ کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ ہمارے ذریعے آپؐ کی آنکھوں کو ٹھنڈک عطا فرمائے !'' حضرت مقداد رضی اللہ عنہ نے کہا : ''یارسول اللہ ! ہم حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کی طرح یہ نہیں کہیں گے کہ {فَاذْہَبْ اَنْتَ وَ رَبُّکَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا ہٰہُنَا قٰعِدُوْنَ ﴿ ۲۴ ﴾}ہم لوگ آپؐ کے داہنے سے 'بائیں سے' سامنے سے'

پیچھے سے لڑیں گے''۔ چند دوسرے انصار نے بھی سرفروشانہ اور جاں نثارانہ انداز میں عرض کیا: ''یارسول اللہؐ! آپ کو جو بات محبوب ہو بسم اللہ فرمایئے۔ جہاں آپؐ کا پسینہ گرے گا' وہاں ہم اپنا خون بہانے کو اپنے لیے سعادت سمجھیں گے''۔ احادیث ِ صحیحہ میں آتا ہے کہ جاں نثاروں کی ان تقریروں سے نبی اکرم ﷺ کا رخِ انور دمک اٹھا۔

غزوہ اُحد میں جب مسلمانوں کی ایک غلطی کی وجہ سے فتح شکست سے بدل گئی اور کُفّار کے ایک دستے نے رسول اللہ ﷺ کو نرغے میں لے کر شہید کرنا چاہا اور آنحضرت ﷺ پر ہجوم کیا تو آپؐ نے فرمایا: ''کون ہے جو مجھ پر جان دیتا ہے؟'' احادیث میں آتا ہے کہ زیاد بن سکن رضی اللہ عنہ نامی ایک انصاری صحابی سات انصاریوں کو لے کر آگے بڑھے اور ایک ایک نے جان کی بازی لڑا کر اپنی جانیں فدا کر دیں۔ حضرت زیاد رضی اللہ عنہ کو یہ شرف حاصل ہوا کہ جب پھر نصرت الٰہی سے شکست فتح میں تبدیل ہوئی اور کُفّار میدان چھوڑ کر پلٹ گئے تو آنحضرت ﷺ نے حکم دیا کہ زیاد بن سکنؓ کا نیم جان لاشہ قریب لائو۔ لوگ اٹھا کر لائے' کچھ جان باقی تھی' قدموں میں سر رکھ دیا اور اسی حالت میں جان دے دی ؎

بچہ ناز رفتہ باشد ز جہاں نیاز مندے
کہ بوقت ِجاں سپردن بسرش رسیدہ باشی

(وہ نیاز مند کس عظمت سے اس جہان سے گزر گیا کہ جب وہ جان جاں آفریں کے سپرد کر رہا تھا تو اس کا سر آپ ﷺ کے قدموں میں تھا۔)

اسی غزوۂ اُحد میں ایک مرحلہ یہ بھی آیا کہ ایک کافر صفوں کو چیرتا پھاڑتا آنحضرت ﷺ کے قریب پہنچ گیا اور اس شقی نے رحمۃٌ للعالمین ﷺ کے چہرۂ مبارک پر تلوار کا وار کیا جس کی وجہ سے مغفر کی دو کڑیاں چہرۂ مبارک میں چبھ کر رہ گئیں۔ اُس وقت چاروں طرف سے تلواروں کے وار ہو رہے تھے' تیر برس رہے تھے۔ یہ دیکھ کر جان نثاروں نے آپ ﷺ کو اپنے حلقے میں لے لیا۔ ابودجانہ رضی اللہ عنہ جھک کر سپر بن گئے' چنانچہ جو تیر آتے تھے' ان کی پیٹھ پر لگتے تھے۔ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے تلوار کے وار کو ہاتھ پر روکا اور ان کا

ایک ہاتھ کٹ کر گر پڑا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کے علاتی باپ ابوطلحہ رضی اللہ عنہ مشہور تیر انداز تھے۔ انہوں نے اتنے تیر برسائے کہ دو تین کمانیں ان کے ہاتھ میں ٹوٹ گئیں۔ انہوں نے سرورِعالم ﷺ کا چہرۂ انور اپنے سینے کی اوٹ میں کر دیا تھا۔ جب کبھی آنحضرت ﷺ گردن اٹھا کر دشمنوں کی فوج کی طرف دیکھتے تو وہ عرض کرتے: ''یا نبی اللہ! گردن نہ اٹھائیں' ایسا نہ ہو کہ کوئی تیر لگ جائے! یہ میرا سینہ سامنے ہے''۔ انہی حضرت انس بن مالکؓ کے چچا ابن نضر رضی اللہ عنہ نے جب یہ خبر سنی کہ رسول اللہ ﷺ نے شہادت پائی ہے تو یہ کہہ کر دشمنوں کی صفوں

میں گھس گئے کہ ''آپؐ کے بعد ہم زندہ رہ کر کیا کریں گے!'' اور لڑ کر شہادت پائی۔ لڑائی کے بعد جب ان کی لاش دیکھی گئی تو اسّی سے زیادہ زخم تھے۔ آنحضرت ﷺ پر دشمنوں نے یورش کی تو حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ جو مشہور تیرانداز تھے، آپؐ کے ساتھ مسلسل لگے رہے۔ آنحضرت ﷺ نے اپنا ترکش ان کے حوالے کر دیا اور فرمایا: ''تم پر میرے ماں باپ قربان ہوں تیر برساتے جاؤ!'' پوری حیاتِ طیبہ میں یہ کلمہ صف حضرت سعدؓ کے نصیب میں آیا۔ حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ کے جسم پر اس غزوے میں لاتعداد گہرے زخم آئے۔ مندمل ہونے کے بعد بھی وہ اتنے گہرے تھے کہ ان کے پوتے ان میں انگلیاں ڈالتے تھے۔ اس معرکۂ کارزار کے وقت ایک نوجوان مسلمان بے پرواہی کے ساتھ کھڑا کھجوریں کھا رہا تھا، اس نے آگے بڑھ کر پوچھا کہ ''یارسول اللہ! اگر میں مارا جاؤں تو کہاں ہوں گا؟'' آنحضور ﷺ نے فرمایا: ''جنت میں!'' اُس نے اس بشارت سے بے خود ہو کر کھجوریں پھینک دیں اور کُفّار پر اس طرح ٹوٹ پڑا کہ شہید ہو گیا --- یہ چند واقعات جستہ جستہ میں نے اس لیے بیان کیے ہیں کہ آپ پر واضح ہو جائے کہ نبی اکرم ﷺ کو کیسے جاں نثار ساتھی ملے تھے

صحابیاتِ رسول رضی اللہ عنھن

اب کچھ واقعات صنف نازک کے بھی سن لیجیے تاکہ یہ بات بھی مستحضر رہے کہ اللہ تعالیٰ نے خواتین میں سے کیسی کیسی جاں نثار صحابیات رضی اللہ عنھن آنحضرت ﷺ کو دی تھیں۔ غزوۂ احد میں اکثر خواتین اسلام بشمول حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا، مشکیں بھر بھر کر

لاتی تھیں اور زخمیوں کو پانی پلاتی تھیں۔ خالی ہونے کے بعد پھر جاتیں اور بھر کر لاتی تھیں۔ عین اُس وقت جب کافروں کے ایک دستے نے ہجوم کر کے آنحضرت ﷺ کو شہید کرنے کی کوشش کی اور آپؐ کے ساتھ صرف چند جاں نثار رہ گئے تو حضرت اُمّ عمارہ رضی اللہ عنہا آنجناب ﷺ کے پاس پہنچیں اور سینہ سپر ہو گئیں۔ جب کُفّار آپ ﷺ کی طرف بڑھتے تھے تو یہ تلوار سے روکتی تھیں۔ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا حضور ﷺ کی پھوپھی اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہا کی بہن شکست کی خبر سن کر میدانِ اُحد میں پہنچیں۔ آنحضرت ﷺ نے ان کے صاحبزادے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو تاکید کر دی کہ یہ حضرت حمزہ کی لاش نہ دیکھنے پائیں، کیونکہ سیّد الشہداءؓ کا مشرکین کی خواتین نے بے دردی سے مثلہ کیا تھا۔ آنحضرت ﷺ کا پیغام سن کر بولیں کہ ''میں اپنے بھائی کا ماجرا سنتی ہوں، لیکن اللہ کی راہ میں یہ کوئی بڑی قربانی نہیں''۔ آنحضرت ﷺ نے اجازت دے دی۔ لاش پر گئیں، اور عزیز بھائی کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے، لیکن اِنا للہ وانا الیہ راجعون کہہ کر چپ ہو گئیں اور مغفرت کی دعا مانگی۔ انصارؓ میں سے ایک عفیفہؓ کے باپ، بھائی اور شوہر سب معرکے میں شہید ہوئے تھے۔ باری باری ان سب حادثوں کی خبر سنتیں لیکن ہر بار یہ پوچھتیں ''رسول اللہ ﷺ کیسے ہیں؟'' لوگوں نے کہا بخیر ہیں۔ بے اختیار پکار اٹھیں: کُلُّ

مُصِیْبَۃٍ بَعْدَکَ جَلَل ''آپؐ کے ہوتے ہوئے سب مصیبتیں ہیچ ہیں!''

نوعمروں کا جوہر جاں نثاری

یہ تو عاقل و بالغ حضرات و خواتین کی جاں نثاریوں اور سرفروشیوں کی ایک جھلک تھی جو میں نے آپ حضرات کے سامنے رکھی' اب ایک نظر اس پر بھی ڈال لیجیے کہ جو لوگ کمسن تھے' اور جن کی ابھی مسیں بھی بھیگی نہیں تھیں' ان کی فدائیت اور ذوقِ جہاد و قتال کا کیا حال تھا؟ کیسے کیسے جاں نثار اور فدائی نبی اکرم ﷺ کی جھولی میں ڈالے گئے تھے۔ غزوۂ اُحد کے لیے حضرت زید بن ثابت' حضرت براء بن عازب' حضرت ابوسعید خدری' حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عرابہ اوسی رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی فوج کے ساتھ آئے تھے' لیکن مدینہ سے نکل کر جب فوج کا جائزہ لیا گیا تو ان کو کمسنی کی وجہ سے واپس کر دیا گیا۔ حضرت رافع بن

خدیج رضی اللہ عنہ انگوٹھوں کے بل تن کر کھڑے ہو گئے کہ قد اونچا نظر آئے۔ یہ ترکیب کام آگئی اور وہؓ لے لیے گئے۔ ان کے ہم سن حضرت سمرہؓ جو ایک بالکل نوخیز نوجوان تھے' انہوں نے یہ دلیل پیش کی کہ میں رافع رضی اللہ عنہ کو کشتی میں پچھاڑ لیتا ہوں' اس لیے اگر ان کو اجازت ملتی ہے تو مجھ کو بھی ملنی چاہیے۔ دونوں کا مقابلہ کرایا گیا۔ حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ نے حضرت رافع رضی اللہ عنہ کو پچھاڑ دیا' لہٰذا ان کو بھی اجازت مل گئی۔

فدائیت کی ایک اور درخشاں نظیر

عضل اور قارہ نامی دو قبیلوں کے ایک وفد نے آنحضرت ﷺ کو یہ دھوکہ دیا کہ ان کے قبیلے والوں نے اسلام قبول کر لیا ہے اور دس صحابہؓ کے ایک وفد کو یہ مقصد بتا کر اپنے ساتھ لے گئے کہ یہ حضرات ان کو اسلام کے عقائد و احکام کی تعلیم دیں گے' لیکن مقامِ رجیع پر ان غداروں نے بنولحیان کو پہلے کی قرارداد کے مطابق اشارہ کر دیا کہ ان مسلمانوں کا کام تمام کر دیں۔ دو سو آدمیوں نے دس لوگوں کو گھیر لیا۔ سات صحابہؓ لڑکر شہید ہو گئے۔ تین اشخاص نے کافروں کے اس وعدے پر اعتماد کیا کہ ان کو کچھ نہیں کہا جائے گا اور خود کو ان کے حوالے کر دیا' تو ان ظالموں نے بدعہدی کی اور انؓ کو مکّہ میں لے جا کر فروخت کر دیا۔ ان میں سے حضرت خبیب رضی اللہ عنہ نے جنگ اُحد میں حارث بن عامر کو واصل جہنم کیا تھا' اس لیے حارث کے بیٹوں نے ان کو خرید کر قتل کر دیا۔ دوسرے صحابی زید بن وثنہ رضی اللہ عنہ تھے۔ ان کو صفوان بن امیہ نے قتل کے ارادے سے خریدا تھا۔ ان کے قتل کا تماشا دیکھنے قریش کے معزز سردار جمع ہوئے۔ جب جلاد نے تلوار ہاتھ میں لی تو ابوسفیان بن حرب (جو فتح مکّہ کے موقعہ پر ایمان لے آئے تھے) نے کہا: ''سچ کہنا' اس وقت تمہارے بدلے میں محمد (ﷺ) قتل کیے جائیں تو کیا تم اس کو اپنی خوش قسمتی نہ سمجھو گے؟'' حضرت زیدؓ نے جو جواب دیا وہ فدائیت کی تاریخ میں آبِ زر سے لکھا جائے تو بھی اس کی قدر افزائی کا حق ادا نہیں ہو گا۔ بولے: ''خدا کی قسم' میں تو اپنی جان کو اس کے برابر بھی نہیں

عزیز رکھتا کہ رسول اللہ ﷺ کے تلووں میں کانٹا چبھ جائے۔''
نبی اکرم ﷺ کے جاں نثار اصحاب رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی سرفروشیوں اور

اطاعت گزاریوں کے ایمان افروز حالات کی کچھ جھلکیاں میں نے آپ کو دکھائی ہیں کہ اس اعتبار سے بھی آنحضرت ﷺ کی امتیازی شان ہے۔ اطاعت شعاری اور فدائیت کی کچھ اور جھلکیاں ملاحظہ ہوں ۔آپ کو علم ہے کہ ذی القعدہ ٦ھ میں نبی اکرم ﷺ نے اپنے ایک خواب کی بنیاد پر عمرے کا قصد فرمایا' احرام باندھا' قربانی کے اونٹ ساتھ لیے اور فرمان جاری کیا کہ کوئی شخص ہتھیار باندھ کر نہ آئے 'صرف تلوار (جو سفر کا ایک ضروری آلہ سمجھی جاتی تھی) ساتھ ہو اور وہ بھی نیام میں بند ہو۔ یہ احتیاط اس لیے ملحوظ رکھی گئی کہ قریش اس بدگمانی میں مبتلا نہ ہوں کہ مسلمان جنگ کے ارادے سے آ رہے ہیں۔ چودہ سو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اس سفر میں آنحضرت ﷺ کے ہم رکاب ہوئے۔ جب قافلہ عسفان پہنچا تو آنحضرت ﷺ کو خبر ملی کہ قریش نے قرب و جوار کے تمام قبائل کو جمع کر کے جنگ کی پوری تیاریاں کر رکھی ہیں اور عزم کر رکھا ہے کہ محمد(ﷺ) کو کسی حال میں مکّہ میں داخل نہیں ہونے دیا جائے گا 'چاہے ان کا بچہ بچہ کٹ مرے۔ قبیلہ خزاعہ نے اگرچہ ابھی تک اسلام قبول نہیں کیا تھا لیکن وہ اسلام کے حلیف اور رازدار تھے۔ اس قبیلہ کے رئیس بدیل بن ورقاءؓ (جو فتح مکّہ میں ایمان لائے تھے)کو جب آنحضرت ﷺ کی تشریف آوری کا حال معلوم ہوا تو وہ چند ساتھیوں کے ساتھ بارگاہِ نبویؐ میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ قریش کی فوجوں کا سیلاب آ رہا ہے اور انہوں نے عزم کر رکھا ہے کہ وہ آپؐ کو مکّہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ نبی اکرم ﷺ نے ان ہی کو اپنا سفیر بنا کر بھیجا کہ قریش کو پیغام دیںکہ ہم عمرہ کی نیت سے آئے ہیں' جنگ مقصود نہیں۔ بدیل بن ورقاء آپؐ کا پیغام لے کر قریش کے پاس پہنچے' لیکن چند شریروں نے پہلے تو ان کو بات ہی کرنے نہیں دی۔ پھر پیغام سن کر اسے رد کر دیا۔ عروہ بن مسعود ثقفی (طائف کے مشہور سردار) نے پیشکش کی کہ مجھے اجازت دو کہ میں خود جا کر محمد(ﷺ) سے معاملہ طے کروں۔ قریش نے ان کی پیشکش منظور کر لی۔ وہ نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ گفت و شنید ہوئی لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا اور وہ واپس آ گئے۔ عروہ نے رسول ﷺ کے ساتھ صحابہ کی عقیدت کا جو منظر دیکھا اس نے ان پر عجیب اثر کیا۔ (فتح مکّہ کے بعد یہ بھی ایمان لے

آئے تھے) انہوں نے اپنا تأثر جن الفاظ میں قریش کے سامنے بیان کیا' اس کے سنانے کے لیے میں نے یہ تفصیل بیان کی ہے۔ عروہ نے اس سفارت پر جانے سے قبل قریش سے جو گفتگو کی تھی وہ پہلے سن لیجیے۔ جب بدیل بن ورقاء کی بات قریش نے رد کر دی تو عروہ نے اٹھ کر کہا: ''کیوں قریش ! کیا میں تمہارے لیے بمنزلہ باپ اور تم

میرے لیے بمنزلہ اولاد نہیں؟'' قریش نے جواب دیا: ''ہاں' ایسا ہی ہے!'' عروہ نے پھر کہا: ''میرے متعلق تم کو کوئی بدگمانی تو نہیں؟'' سب نے یک زبان کہا ''نہیں!'' ---- اب یہ کافر و مشرک سردار گفت و شنید کے بعد آکر نبی اکرم ﷺ کے ساتھیوں کے متعلق اپنے تاثرات ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

''یا معشر قریش! میں نے قیصر و کسریٰ اور نجاشی کے دربار دیکھے ہیں' لیکن محمد(ﷺ) کے اصحاب کو ان کے ساتھ جو عقیدت' محبت اور وارفتگی ہے' وہ میں نے کہیں نہیں دیکھی۔ ایسے جاں نثار مجھے کہیں نظر نہیں آئے۔ محمد(ﷺ) جب بات کرتے ہیں تو سناٹا چھا جاتا ہے۔ پورا مجمع گوش بر آواز ہو جاتا ہے' کوئی شخص ان کی طرف نظر بھر کر نہیں دیکھتا۔ وہ وضو کرتے ہیں تو جو پانی گرتا ہے اس پر خلقت ٹوٹ پڑتی ہے۔ لعابِ دہن گرتا ہے تو عقیدت کیش ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں اور اپنے چہروں اور ہاتھوں پر مل لیتے ہیں۔ ایسے عقیدت مندوں اور جاں نثاروں سے لڑنا پہاڑوں سے ٹکرانا ہے۔''

بیعتِ رضوان

چونکہ گفت و شنید ناتمام رہ گئی تھی' لہٰذا نبی اکرم ﷺ نے حضرت خراش بن اُمیہ رضی اللہ عنہ کو قریش کے پاس بھیجا' لیکن قریش نے ان پر حملہ کر دیا اور وہ کسی طرح اپنی جان بچا کر لوٹ آئے۔ پھر آنحضرت ﷺ نے حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کو بھیجا۔ قریش نے ان کو نظر بند کر لیا' لیکن عام طور پر یہ خبر مشہور ہو گئی کہ ان کو شہید کر دیا گیا۔ نبی اکرم ﷺ کو جب یہ خبر پہنچی تو آپؐ نے حضرت عثمانؓ کے خون کا قصاص لینے کے لیے چودہ سو صحابہؓ سے جاں نثاری کی بیعت لی۔ تمام صحابہؓ نے' جن میں مرد و زن دونوں شامل تھے' ولولہ انگیز جوش کے ساتھ دست مبارک پر جاں نثاری اور سرفروشی کا عہد کیا۔ اپنے مستقر سے سینکڑوں میل

دور مَرد و زن پر مشتمل چودہ سو کی نفری' جو عمرے کے لیے احرام باندھ کر نکلی تھی' جن کے مردوں کے پاس صرف ایک تلوار تھی' نہ تیر و تفنگ' نہ نیزے نہ دوسرا سامانِ حرب۔ زادِ راہ بھی اتنا جو عمرے کے سفر کے لیے کفایت کر سکے' لیکن یہ جاں نثار محمد ﷺ کے دست مبارک پر بیعت کر رہے ہیں قریش اور اس کے حلیف قبائل سے جنگ کرنے کے لیے۔ یہ بیعت گویا شہادت کی موت کے لیے بیعت تھی۔ مادی اسباب و وسائل کے اعتبار سے اس قافلے کا قریش کی منظم و مسلح فوجوں کے مقابلے میں کوئی تناسب ہی نہیں تھا۔ نبی اکرم ﷺ کے صحابہ کی جاں نثاری اور سرفروشی کی اس ادا پر اللہ تعالیٰ نے یہ سند بشارت عطا فرمائی:

{لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَ اَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ﴿۱۸﴾} (الفتح)

''(اے نبی ﷺ!) تحقیق اللہ مؤمنوں سے راضی ہو گیا جب وہ درخت کے نیچے آپؐ سے بیعت کر

رہے تھے‘ ان کے دلوں کا حال اس کو معلوم تھا‘ پس اس نے ان پر سکینت نازل فرمائی اور ان کو (انعام میں) قریبی فتح دی۔‘‘

پھر اسی سورۃ الفتح میں اپنے عبدِ کامل ﷺ کی رسالت کے اعلان کے ساتھ ان کے اصحاب رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی ان الفاظِ مبارکہ سے مدح فرمائی:

{مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ؕ وَ الَّذِیْنَ مَعَہٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَہُمْ تَرٰىہُمْ رُکَّعًا سُجَّدًا یَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰہِ وَ رِضْوَانًا} (آیت ۲۹)

’’محمد اللہ کے رسول ہیں‘ اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کُفّار پر سخت اور آپس میں رحیم ہیں۔ تم جب ان کو دیکھو گے تو انہیں رکوع و سجود میں پائو گے اور اللہ کے فضل اور خوشنودی کے جویا اور طالب پائو گے۔‘‘

تو اس معیار‘ ان اوصاف اور اس پائے کے ساتھی تھے اصحابِ رسولؐ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم وارضاھم اجمعین!

* * *

آئینۂ قرآن میں*

صدیق کا لغوی و اصطلاحی مفہوم

سب سے پہلے ہمیں لفظ ’صدیق‘ کا لغوی اور اصطلاحی مفہوم متعین کر لینا چاہیے۔

صدیق کا لغوی مفہوم

لغوی اعتبار سے صدیق‘ صدق سے فَعِیل کے وزن پر مبالغے کا صیغہ ہے۔ گویا اس کے لفظی معنی ہوئے پیکر صدق ووفا‘ سراپا راستی اور مجسم سچائی۔

سب جانتے ہیں کہ سیرت و اخلاق کے جملہ محاسن میں صدق و راستی کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ گویا وہ جملہ اوصافِ حسنہ کی اساس اور اُم ہے ‘جبکہ جھوٹ اور کذب کو اُم المعائب کا مقام حاصل ہے۔ وہ مشہور واقعہ بھی یقیناً آپ کو معلوم ہوگا کہ ایک شخص نے نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ حضور! مجھ میں بہت سے بڑے بڑے عیب ہیں لیکن میں ان سب کی بیک وقت اصلاح پر قادر نہیں ہوں ‘البتہ ان میں سے کوئی ایک جوآپؐ فرمائیں میں چھوڑ دوں گا ۔اس پر آنحضور ﷺ نے شراب نوشی اور بدکاری پر بھی ترک کذب کو مقدّم رکھا ۔چنانچہ یہی ایک چیز اس کی مکمل اصلاح کا ذریعہ بن گئی۔

صدق اور صادق کا مقام ازروئے قرآن

قرآن حکیم کے مطالعے سے صدق کی جو عظمت سامنے آتی ہے اور یہ جس گمبھیر معنی اور وسیع مفہوم میں استعمال ہوتا ہے اس کا کسی قدر اندازہ مندرجہ ذیل آیات سے ہو سکتا ہے۔

(۱) سورۃ الحجرات کی آیت ۱۵ میں حقیقی مؤمن کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا:

{اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَ جٰھَدُوْا بِاَمْوَالِھِمْ وَ اَنْفُسِھِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ؕ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصّٰدِقُوْنَ ﴿ ۱۵ ﴾}

’’مؤمن تو صرف وہ ہیں جو ایمان لاتے ہیں اللہ پر اور اس کے رسولؐ پر‘ پھر شک نہیں کرتے اور جہاد کرتے ہیں اپنی جانوں اور اموال کے ساتھ اللہ کی راہ میں۔ حقیقت میں صرف یہی لوگ سچّے ہیں!‘‘

گویا ازروئے قرآن ’مؤمن‘ اور ’صادق‘ ہم معنی الفاظ ہیں۔

(۲) سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۷۷ میں نیکی کے ایک محدود مفہوم کی نفی اور نیکی کا حقیقی اور جامع تصوّر پیش کرتے ہوئے فرمایا:

{لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْھَکُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ وَ لٰکِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلٰٓئِکَۃِ وَ الْکِتٰبِ وَ النَّبِیّٖنَ ۚ وَ اٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّہٖ ذَوِی الْقُرْبٰی وَ الْیَتٰمٰی وَ الْمَسٰکِیْنَ وَ ابْنَ السَّبِیْلِ ۙ وَ السَّآئِلِیْنَ وَ فِی الرِّقَابِ ۚ وَ اَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَی الزَّکٰوۃَ ۚ وَ الْمُوْفُوْنَ بِعَھْدِھِمْ اِذَا عٰھَدُوْا ۚ وَ الصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ حِیْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا ؕ وَ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿ ۱۷۷ ﴾}

’’نیکی یہی نہیں ہے کہ تم اپنے چہرے مشرق اور مغرب کی جانب پھیر دو بلکہ حقیقی نیکی اُس کی ہے جو ایمان لایا اللہ پر‘ فرشتوں پر‘ کتابوں پر اور انبیاء پر‘ اور دیا اس نے مال اس کی محبوبیت کے علی الرغم رشتہ داروں کو اور یتیموں کو اور محتاجوں کو اور مسافر کو اور سائلوں کو اور گردنوں (کو آزاد کرانے) میں ‘اور قائم کی نماز اور ادا کی زکوٰۃ ‘اور نبھانے والے اپنے عہد کے جبکہ باہم کوئی معاہدہ کر لیں ‘اور خصوصاً صبر کرنے والے فاقوں میں‘ تکلیفوں میں اور

جنگ کے وقت۔ یہی ہیں وہ لوگ جو حقیقتاً سچّے ہیں ‘اور یہی ہیں صحیح معنوں میں متقی۔‘‘

گویا ازروئے قرآن نیکی ‘تقویٰ اور سچائی مترادف ہیں۔

(۳) سورۃ الاحزاب کی آیت ۲۳ میں سچّے مؤمنوں کی مدح میں فرمایا:

{مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَ مَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ﴿۲۳﴾ لِّيَجْزِيَ اللّٰهُ

الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ ...}

’’اہل ِ ایمان میں وہ جواں مرد بھی ہیں جنہوں نے سچ کردکھایا اپنا وہ عہد جو انہوں نے اللہ سے کیا تھا۔ ان میں وہ بھی ہیں جو اپنی نذر پیش کر چکے اور وہ بھی ہیں جو اس کے منتظر ہیں‘(بہر نوع) انہوں نے اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی ‘تاکہ اللہ بھرپور صلہ دے سچوں کو ان کی سچائی کا۔‘‘

اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ سورۂ مریم (آیت ۵۴) میں جو حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بارے میں فرمایا:

{اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ...} ’’یقیناً وہ وعدے کا سچا تھا...‘‘

تو یہ کتنی بڑی ستائش اور کیسی عظیم مدح ہے۔

(۴) سورۃ العنکبوت کے آغاز میں اہل ِ ایمان کے لیے اللہ تعالیٰ کے مستقل ضابطہ ابتلاء و آزمائش کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے ابتداءً فرمایا:

{فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَ لَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۳﴾}

’’اللہ یقیناً واضح کرکے رہے گا کہ کون سچّے ہیں اور کون جھوٹے۔‘‘

اور چند ہی آیات کے بعد پردہ بالکل اٹھا دیا اور واضح الفاظ میں فرمادیا:

{وَ لَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ لَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ ﴿۱۱﴾}

’’اللہ یقیناً کھول کر رکھ دے گا کہ کون (واقعتاً) مؤمن ہیں اور کون (محض) منافق۔‘‘

گویا ’صادق‘ مؤمن ہے اور ’کاذب‘ منافق! اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سورۃ التوبہ میں منافقین کے مفصل ذکر اور طویل زجر و توبیخ اور لعنت و ملامت کے بعد جب یہ فرمایا:

{يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۹﴾}

’’اے اہل ِ ایمان اللہ سے ڈرتے رہو اور سچّے لوگوں کے زمرے میں شامل ہو جاؤ۔‘‘

تو یہ کتنی جامع نصیحت ہے اور نفاق سے بچنے کی کتنی پُرزور تاکید!

’’تصدیق بِالحُسنیٰ‘‘

'صدق' اور 'صادق' کے اس وسیع اور گمبھیر مفہوم کو ذہن میں رکھ کر مزید غور لیجیے تو یہ بات بالکل دو اور دو چار کی طرح یقینی نظر آئے گی کہ جو شخص خود سچا ہو اور جس کا اپنا موقف

راستی اور صداقت پر قائم ہو' یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ سچائی کا والہ و شیدا نہ ہو' یہاں تک کہ کوئی صداقت اس کے سامنے پیش کی جائے اور وہ اسے ردّ کر دے۔ اس کے بالکل برعکس ایسے شخص میں سچائی اور راستی کے لیے شدید حمیت پیدا ہو جانی لازمی ہے اور وہ ہر سچائی کو لپک کر قبول کرے گا اور ہر صداقت کی بڑھ کر تصدیق کرے گا اور اس راہ میں وہ نہ اپنی جھوٹی انا کو حائل ہونے دے گا نہ برخود غلط خودی کو' نہ کسی مصلحت کو آڑے آنے دے گا نہ کسی مفاد کو' نہ کسی خطرے کو خاطر میں لائے گا نہ اندیشے کو۔ نہ کسی سے کٹنا اسے گراں معلوم ہو گا نہ کسی سے جڑنا' نہ کوئی ترک' اسے بھاری محسوس ہوگا نہ 'اختیار' نہ کوئی 'امر' کٹھن نظر آئے گا نہ کوئی 'نہی'---- بلکہ صدق اور صداقت کے ساتھ اس کا خلوص ان سب مراحل کو آسان بنا دے گا۔ گویا صدیق کے لیے لازم ہے کہ وہ ہر صداقت کی تصدیق پر ہر دم اور ہر آن آمادہ ہو۔ اور قرآن حکیم کے الفاظ میں ''تصدیق بِالْحُسنٰی'' صدیقیت کا وصف لازم ہے

صدیق کا اصطلاحی مفہوم

چنانچہ علّامہ آلوسیؒ صاحب ِتفسیر روح المعانی جب لفظ ''صدیق'' کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ:

اَلْمُتَقَدِّمُ فِی التَّصدِیق وَالْمُبَالِغُ فِی الصِّدقِ وَالاخلاصِ فِی الاقوال والافعال

''وہ شخص جو تصدیق میں پہل کرے اور خود اپنے اقوال و افعال میں حد درجہ سچا اور مخلص ہو''

تو فنی اعتبار سے یقیناً یہ ایک بہت جامع و مانع تعبیر ہے' لیکن حقیقت ِصدیقیت کی اتنی ہی جامع و مانع تعبیر موجود ہے قرآن حکیم کے ان حد درجہ مختصر لیکن انتہائی پرشکوہ الفاظ میں کہ:

{وَ الَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَ صَدَّقَ بِهٖۤ} (الزمر:۳۳)

'وہ شخص جو خود بھی صداقت پر قائم رہا' اور ہر سچائی کی تصدیق بھی کرتا رہا۔''

مرتبۂ صدیقیت

حضرات منعم علیہم کے مراتب چہارگانہ کے پس منظر میں

و خصائص کے تفصیلی مطالعے سے قبل یہ حقیقت اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ صدیقیت بھی نبوت اور رسالت کی طرح قرآن حکیم کی ایک مستقل اصطلاح ہے' اور جس طرح نبوت ایک حقیقت معنوی ہے جس کا مصداق ظاہری خارج میں ہونا ضروری ہے اسی طرح صدیقیت کا مصداقِ خارجی بھی لازمی ہے۔

لہٰذا اگر کسی کے ذہن میں شعوری یا غیر شعوری طور پر' ایسا کوئی خیال یا گمان موجود ہو کہ شاید صدیقیت ایک بعد کا گھڑا ہوا خطاب یا القاب ہے' جو محض خوش عقیدگی یا حسن ظن کی بنیاد پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو عطا کر دیا گیا تو اسے اس سے تائب ہونا لازم ہے' اس لیے کہ یہ ایک مغالطہ ہی نہیں' بہت بڑی گمراہی ہے اور حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ یعنی یہ کہ نبوت اور رسالت کی طرح صدیقیت اور شہادت بھی قرآن حکیم کی مستقل اصطلاحات ہیں 'اورجس طرح اوّل الذکر کے مصداق خارج میں موجود ہیں اسی طرح مؤخر الذکر کے مصداق بھی موجود ہیں' بلکہ جیسا کہ میں نے آغاز میں عرض کیا تھا' جس طرح مقامِ نبوت اور مرتبۂ رسالت کا مظہر اَتم ہیں نبی اکرم ﷺ اسی طرح مقام صدیقی اور مرتبۂ صدیقیت کا مصداقِ کامل ہیں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ وارضَاہُ۔

منعم علیہم کے چار گروہ

اس سلسلے کی اہم ترین آیت سورۃ النساء کی آیت ٦٩ ہے جس میں نوعِ انسانی کے وہ خوش قسمت افراد جو انعام یافتہ یا منعم علیہم کہلانے کے مستحق ہیں' چار گروہوں میں منقسم قرار دیے گئے ہیں 'یعنی : انبیاء کرام' صدیقین' شہداء اور صالحین ۔ فرمایا:

{وَ مَنۡ یُّطِعِ اللّٰہَ وَ الرَّسُوۡلَ فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمَ اللّٰہُ عَلَیۡہِمۡ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَ الصِّدِّیۡقِیۡنَ وَ الشُّہَدَآءِ وَ الصّٰلِحِیۡنَ ۚ وَ حَسُنَ اُولٰٓئِکَ رَفِیۡقًا ﴿ؕ۶۹﴾}

''اور جو اطاعت کرتا ہے اللہ اور اُس کے رسول(ﷺ) کی تو انہیں معیت حاصل ہو گی ان کی جن پر اللہ نے انعام فرمایا 'یعنی انبیاء 'صدیقین' شہداء اور صالحین۔ اور بہت ہی اچھے ہیں یہ لوگ بحیثیت رفیق۔''

یہ آیۂ مبارکہ اس اعتبار سے انتہائی اہم ہے کہ اس میں سورۃ الفاتحہ کے ایک اجمال کی تفصیل ہے اور سورۃ الفاتحہ ہماری سب سے بڑی عبادت یعنی نماز کا جزو لازم ہے' بلکہ ایک حدیث ِقدسی کی رو سے عین نماز ہے۔ اس سورۂ مبارکہ کا خاتمہ ایک دعا پر ہوتا ہے جس میں ہم اپنے رب سے استدعا کرتے ہیں: ''اے رب ! ہمیں

سیدھے راستے کی ہدایت بخش !''اور پھر اس سیدھے راستے کی مزید وضاحت کے ضمن میں عرض کرتے ہیں: ''ان لوگوں کے راستے کی جن پر تو نے انعام فرمایا...الی الآخر''---یہاں فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ منعم علیہم لوگ کون ہیں؟ اسی سوال کا جواب ہے جو سورۃ النساء کی محولہ بالا آیت میں دیا گیا ہے 'یعنی یہ کہ یہ انعام یافتہ لوگ چار گروہوں پر مشتمل ہیں' انبیاء' صدیقین' شہداء اور صالحین۔

اس آیۂ کریمہ سے جہاں منعم علیہم کی چار گروہوں میں تقسیم واضح ہوئی وہیں یہ بھی واضح ہو گیا کہ ان کے مابین ترتیب ِ مراتب کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ نوعِ انسانی میں بلند ترین مرتبہ و مقام کے حامل تو ' بلاشائبہ ریب و شک حضرات ِ انبیاء ہیں' علیہم الصلوٰۃ والسلام ۔ ان کے متصلاً بعد مقام اور مرتبہ ہے صدیقین کرام کا۔ ان کے بعد ہیں حضرات شہداء اور سب سے آخر میں عام مؤمنین صالحین ۔رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔گویا اس آیۂ کریمہ میں حضرات منعم علیہم کا ذکر مرتبہ و مقام کے اعتبار سے نزولی ترتیب کے ساتھ کیا گیا ہے۔

نبوت اور صدیقیت

جہاں تک اس حقیقت کا تعلق ہے کہ مرتبۂ صدیقیت مقامِ نبوت کے متصلاً بعد اور اس کے بہت قریب واقع ہوا ہے تو اس کی شہادت قرآن حکیم کے بہت سے دوسرے مقامات سے بھی حاصل ہوتی ہے' مثلاً:

(ا) قرآن حکیم میں حضرت مریم (سلامٌ علیہا) کو صراحتاً ''صِدّیقہ'' کا خطاب دیا گیا۔(المائدۃ:۷۵)اب اگر ان کے اس مقام اور مرتبہ کو پیش نظر رکھا جائے جو قرآن مجید کے ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ:

{یٰمَرۡیَمُ اِنَّ اللّٰہَ اصۡطَفٰکِ وَ طَہَّرَکِ وَ اصۡطَفٰکِ عَلٰی نِسَآءِ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۴۲﴾} (آل عمران)

''اے مریم ! اللہ نے تجھے چُن لیا ہے اور تجھے پاک کر دیا ہے اور تجھے منتخب فرما لیا ہے تمام جہانوں کی خواتین میں سے۔''

اور دوسری طرف یہ حقیقت بھی سامنے رہے کہ نبوت کا دروازہ نوعِ انسانی کی صنف نازک پر بند رہا ہے تو یہ بات آپ سے آپ ثابت ہوجاتی ہے کہ بعد از نبوت افضل ترین مرتبہ صدیقیت کا ہے اور اعلیٰ ترین مدارج و مقامات صدیقین اور صدیقات کو حاصل ہیں !

(۲) سورۂ یوسف میں مذکور ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے زنداں کے ساتھیوں نے ''صدیق'' کہہ کر مخاطب کیا (یوسف:۴۶)۔ اب ظاہر ہے کہ یہاں دو ہی صورتیں ممکن ہیں۔یا تو اسے صرف زنداں کے ان ساتھیوں ہی کا کلام قرار دیا جائے' اس صورت میں بھی اس عظیم حقیقت پر روشنی پڑتی ہے کہ نبی کی شخصیت کا نمایاں ترین وصف 'صدق' ہی ہے اور جن لوگوں پر ابھی نبی کی نبوت منکشف نہیں ہوئی ہوتی وہ اسے 'صدیق' ہی قرار دیتے ہیں۔

چنانچہ خود نبی اکرم ﷺ کو قبل از اجرائے وحی اہل ِ مکّہ نے ''الصادق'' ہی کا خطاب دیا تھا --- یا دوسری صورت یہ ہے کہ یہ مانا جائے کہ زنداں کے ساتھیوں کا کلام اللہ تعالیٰ نے اپنے الفاظ میں نقل فرمایا ہے۔ اس صورت میں واحد ممکن تاویل یہ ہے کہ اُس وقت تک حضرت یوسف علیہ السلام پر وحی نبوت کا اجرا نہیں ہوا تھا اور ابھی آنجناب صرف صدیقیت کے مقام پر فائز تھے --- بہر صورت مقامِ صدیقیت اور مرتبۂ نبوت کا قرب اظہر من الشمس ہے۔

(۳) سورۂ مریم میں اللہ تعالیٰ نے اپنے دو جلیل القدر انبیاء یعنی حضرت ابراہیم اور حضرت ادریس علیٰ نبینا وعلیہما الصلوٰۃ والسلام کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا {اِنَّہٗ کَانَ صِدِّیۡقًا نَّبِیًّا ﴿۴۱﴾}(آیات ۴۱ و۵۶) ''بے شک وہ صدیق نبی تھا!'' جس سے معلوم ہوا کہ نہ صرف یہ کہ مقامِ صدیقیت اور مرتبۂ نبوت ایک دوسرے سے بہت قریب واقع ہوئے ہیں بلکہ صدیقیت نبوت کی تمہید ہے اور نبوت صدیقیت کی اگلی منزل!

صدیقین اور شہداء

منعم علیہم کے مراتب چہارگانہ میں سے نبوت تو ظاہر ہے کہ ہے ہی خالص وہبی' یعنی پہلے بھی صرف ذاتی قابلیت و صلاحیت اور محنت و ریاضت سے حاصل نہیں کی جا سکتی تھی' بلکہ

جسے بھی ملتی تھی خالص عطیۂ الٰہی اور فضل خداوندی ہی کے طور پر ملتی تھی اور اب تو اس کا دروازہ سرے سے ہی بند ہے' البتہ صدیقیت اور شہادت (۱) کے مراتب ِعالیہ پہلے بھی کھلے تھے اور اب بھی نہ ''مقطوعہ'' ہیں نہ ''ممنوعہ'' بلکہ مؤمنین صالحین اپنی ہمت اور محنت کے مطابق اور مزاجِ شخصی و افتادِ طبعی کی مناسبت سے ان مراتب ِعالیہ تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں' گویا بقول جگر: ؎

پھول کھلے ہیں گلشن گلشن لیکن اپنا اپنا دامن!!

یہی وہ حقیقت ہے جو سورۃ الحدید کی آیت ۱۹ میں بیان ہوئی ہے اور جس کے بارے میں بہت سا قیل و قال صرف اس لیے ہوا کہ سیاقِ کلام اور ربط ِآیات پیش نظر نہیں رہا۔ چنانچہ جب سلسلہ کلام سے صرفِ نظر کرتے ہوئے نگاہ صرف اس ایک آیت کے الفاظ پر مرتکز ہو گئی کہ:

{وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِاللّٰہِ وَ رُسُلِہٖۤ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الصِّدِّیۡقُوۡنَ ۟ۖ وَ الشُّہَدَآءُ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ ؕ}

''اور جو لوگ ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسولوں پر' تو یہی ہیں صدیق اور شہداء اپنے رب کے

نزدیک۔‘‘
تو ایک الجھن پیدا ہوگئی کہ اس سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ ہر مؤمن صدیق اور شہید ہے ‘جبکہ یہ بات بالبداہت غلط معلوم ہوتی ہے ۔چنانچہ اس اشکال کے حل کی کوششیں کی گئیں اور بہت سی آراء اور بے شمار اقوال کا ذخیرہ کتب تفسیر میں جمع ہو گیا‘ حالانکہ اگر سیاقِ کلام پر نگاہ رکھی

_____(۱) واضح رہے کہ اس پوری بحث میں شہادت کا لفظ عام معروف معنوں میں استعمال نہیں ہوا بلکہ قرآنِ حکیم کی ایک مخصوص اصطلاح کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ عجیب بات ہے کہ پورے قرآنِ مجید میں کسی ایک مقام پر بھی شہادت کا لفظ خدا کی راہ میں قتل ہونے کے معنی میں استعمال نہیں ہوا‘ اور سوائے ایک مقام کے کہیں بھی شہید کے معنی مقتول فی سبیل اللہ نہیں لیے جا سکتے۔ وہ ایک استثنائی مقام سورۂ آل عمران کی آیت ۱۴۰ ہے اور یہاں بھی جہاں شہداء کے معنی مقتولین فی سبیل اللہ لینے کی گنجائش ہے وہاں اتنی گنجائش عام اصطلاحی معنوں کی بھی ہے۔ بہرحال اس بحث میں لفظ شہادت اپنے مخصوص اصطلاحی معنوں میں مستعمل ہے !

جائے تو یہاں کوئی اشکال یا الجھن سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔
دراصل اس آیت کے صحیح فہم کے لیے اس سے پہلے کی تین آیات اور ان کے باہمی ربط کو سمجھنا ضروری ہے‘ وھو ھٰذا:

آیت ۱۶ میں اہلِ ایمان (گویا عام مؤمنین صالحین) کو جھنجھوڑا گیا ہے کہ کس تاخیر و تعویق میں پڑ گئے ہو اور کیوں قدم آگے نہیں بڑھاتے؟ اور متنبہ کیا گیا ہے کہ مبادا تم بھی یہود کے مانند ہو جائو جن کے دل امتدادِ زمانہ سے سخت ہوتے چلے گئے اور اب ان کی اکثریت فساق و فجار پر مشتمل ہے۔ گویا یہ آیت زجر و تہدید اور تنبیہ و ترہیب پر مشتمل ہے۔

آیت ۱۷ میں قرآنِ حکیم کے عام اسلوب کے مطابق ترغیب و تشویق کا اسلوب ہے اور حوصلہ بندھایا گیا ہے کہ اگر تم اپنے دلوں میں سختی محسوس کرو تب بھی مایوس مت ہونا۔ اللہ تعالیٰ جس طرح زمین کو مردہ ہو جانے کے بعد حیاتِ تازہ عطا فرما دیتا ہے اسی طرح تمہاری کشت قلوب کو بھی حیاتِ نو عطا فرما دے گا اور تمہارے دلوں کی کھیتی پھر ایمانِ حقیقی کی ہری بھری فصل سے لہلہا اٹھے گی !

اگلی آیت میں گویا‘ سلوکِ قرآنی‘ کی وضاحت کر دی گئی اور اس عمل تزکیہ کی نشاندہی کر دی گئی جس سے کشت قلوب میں ایمان کی فصل تازہ کی امید کی جا سکتی ہے‘ یعنی یہ کہ اگر دلوں کی کھیتی میں تازہ بہار چاہتے ہو تو

پہلے اس میں صدقہ و خیرات اور انفاق فی سبیل اللہ کا ہل چلائو اور حب دنیا اور حب مال کی نجاستوں سے دلوں کو پاک کرو ‘اس لیے کہ اصل میں یہی تمہاری ترقی کی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ اور تمہاری فطری استعدادات کے بروئے کار آنے میں سب سے بڑا مانع ہے۔

بعدۂ آیت ۱۹ میں واضح فرما دیا کہ اگر یہ مورچہ تم نے سر کر لیا اور یہ منزل طے کر لی تو پھر کوئی رکاوٹ نہیں۔ اب ترقی کا راستہ بالکل کھلا ہے اور تم اپنی اپنی ہمت اور محنت کے مطابق اور اپنے اپنے مزاج اور افتادِ طبع کی مناسبت سے صدیقیت یا شہادت کے مراتب عالیہ تک رسائی حاصل کر سکتے ہو۔

گویا یہاں ربط کلام وہی ہے جو سورۃ البلد میں ہے۔ وہاں اسی مورچے یا منزل کو

ایک دشوار گزار گھاٹی(۲) سے تشبیہہ دی گئی ہے اور نہایت تأسف اور حسرت کے پیرائے میں فرمایا گیا ہے کہ اگرچہ ہم نے انسان کو بے شمار ظاہری اور باطنی استعدادات سے نواز کر دنیا میں بھیجا۔ چنانچہ اسے {عَيْنَيْنِ ﴿ ۸ ﴾} بھی دیے اور {وَ لِسَانًا وَّ شَفَتَيْنِ ﴿ ۹ ﴾} بھی ‘اور پھر درجہ بدرجہ نوعی‘ جبلی اور فطری ہدایتوں سے نوازا ‘تاآنکہ{وَ هَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ﴿ ۱۰ ﴾} کی منزل بھی طے کرا دی ‘لیکن یہ کم ہمت اور تھڑدلا اس گھاٹی میں نہ گھس پایا ! جانتے ہو کون سی گھاٹی؟ ’’کسی گردن کا چھڑادینا یا کھانا ہی کھلا دینا‘ قحط کے ایام میں‘ کسی یتیم کو جو قرابت دار بھی ہو ‘یا مسکین کو جو خاک میں رل رہا ہو ! ‘‘ (کاش کہ کر پاتا وہ اس گھاٹی کو عبور !) اور پھر جا شامل ہوتا ان نفوسِ قدسیہ میں جو ایمان‘ تواصی بالصبر اور تواصی بالمرحمہ ایسے اوصافِ جلیلہ سے متصف ہیں ---- فرق صرف یہ ہے کہ سورۃ البلد میں درمیان میں کلمہ ’’ثُمَّ‘‘ آگیا جس نے ربط کلام کو واضح کر دیا ‘جبکہ سورۃ الحدید میں اس کی جگہ پر صرف حرفِ عطف ’’وَ‘‘ آیا جس سے ربطِ کلام قدرے مخفی ہو گیا !

بہرحال سورۃ الحدید کی آیت ۱۹ سے یہ حقیقت بھی ہر شک و شبہ سے بالاتر ہو کر ثابت ہو گئی کہ ’’صدیقین‘‘ اور ’’شہداء‘‘ قرآن حکیم کی مستقل اصطلاحات ہیں‘ اور یہ بھی واضح ہو گیا کہ یہی وہ بلند ترین مقامات ہیں جن تک اکتساباً رسائی ممکن ہے۔

مزاج اور افتادِ طبع کا فرق

اس معاملے میں مزید انشراحِ صدر کے لیے مناسب ہے کہ منعم علیہم کے مراتب چہارگانہ کے باہمی ربط و تعلق کو نفسیاتِ انسانی کی گہرائیوں میں اتر کر سمجھ لیا جائے اور طبائع کے فطری فرق اور مزاج وا فتاد اور رجحانِ طبعی اور میلانِ نفسی کے فطری اختلاف کے حوالے سے قرآن حکیم کی ان چار اصطلاحوں کا گہرا فہم حاصل کر لیا جائے۔

ذرا دقت ِنظر سے مشاہدہ کیا جائے تو تمام انسان مزاجِ شخصی' افتادِ طبعی اور فطری رجحانات و میلانات کے اعتبار سے دو گروہوں میں منقسم نظر آئیں گے:

_____(۲)پنجابی زبان کے ایک شاعر عبداللہ شاکر کی ایک طویل نظم کے ترجیعی بند کے یہ الفاظ اس مضمون کو خوب ادا کرتے ہیں کہ ع اوکھی گھاٹی مشکل پینڈا عشق دیاں اسواراں دا !

ایک وہ نسبتاً خاموش 'تنہائی پسند' ذہین' حساس' سنجیدہ اور متفکر المزاج لوگ جو خارج کی دنیا سے زیادہ اپنے باطن میں مگن رہتے ہیں اور باہر کی دنیا اور اس کی دلچسپیوں سے زیادہ انہیں خود اپنے ہی دل و دماغ کی گہرائیوں میں غوطہ زنی محبوب ہوتی ہے' گویا وہ ''تن کی دنیا'' سے کہیں زیادہ ''من کی دنیا'' کے باسی ہوتے ہیں۔اور دوسرے وہ خوش باش' بے فکرے' چست' فعال اور لاابالیانہ طبیعت کے حامل بلکہ نٹ کھٹ قسم کے لوگ جن کی اصل دلچسپی خارج کی دنیا سے ہوتی ہے اور وہ اس میں پوری طرح مصروف اور مگن رہتے ہیں ! غور و فکر' سوچ بچار اور تفکر و اعتبار سے انہیں طبعاً کوئی مناسبت ہی نہیں ہوتی ۔اس کے برعکس انہیں یا تو کھیل کود کا شوق ہوتا ہے یا سیر وشکار کا یا شہ زوری اور پہلوانی کا !

پہلی قسم کے لوگوں کو نفسیاتِ جدیدہ کی اصطلاح میں بروں بیں (extrovert) --کہتے ہیں اور دوسری قسم کے لوگوں کو دروں بیں(introvert) --- فطری طور پر پہلی قسم کے لوگوں کے قوائے فکریہ بہت مضبوط اور ترقی یافتہ (developed) ہوتے ہیں جبکہ قوائے عملیہ نسبتاً خوابیدہ (dormant)رہ جاتے ہیں' اور اس کے برعکس دوسری قسم کے لوگوں کے قوائے فکریہ دبے رہ جاتے ہیں جبکہ قوائے عملی پوری شان کے ساتھ نشوونماپاتے ہیں۔

ان دو کے علاوہ انسانوں کی ایک تیسری قسم جو بہت شاذ ہے' ان لوگوں پر مشتمل ہے جن کے قوائے فکری بھی نہایت بیدار اور ترقی یافتہ ہوتے ہیں اور قوائے عملیہ بھی پورے چاق و چوبند اور کامل نشوونما یافتہ ہوتے ہیں اور ان دونوں کے مابین ایک حسین توازن بھی موجود ہوتا ہے ۔ انہیں جدید نفسیات کی اصطلاح میں ambivert کہا جاتا ہے اور کہا جاسکتا ہے کہ اصلاً یہی لوگ حاصل نوعِ انسانی ہیں۔ ایسے لوگ اوّل تو ہوتے ہی بہت کم ہیں اور ان میں بھی وہ لوگ تو بالکل معدوم ہی کے حکم میں ہیں جن کے قوائے فکری و عملی میں کامل توازن موجود ہو ! غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے بھی کسی میں پہلا رنگ قدرے نمایاں تر ہوتا ہے اور کسی میں دوسرا۔

ان تینوں میں سے اعلیٰ ترین رتبہ تو ظاہر ہے کہ قسم ثالث کے لوگوں کا ہے ‘ان کے بعد نمبر قسم اول کے لوگوں کا ہے ‘اس لیے کہ انسان حیوانات سے ممتاز بہرحال اپنے قوائے فکری

و عقلی ہی کی بنا پر ہے ‘اور تیسرے درجے میں دوسری قسم کے لوگ ہیں جو فعال تو اگرچہ بہت ہوتے ہیں لیکن غور وفکر اور سوچ بچار کم کرتے ہیں۔

حضرات منعم علیہم میں سے صدیقین پہلی قسم کے لوگ ہوتے ہیں اور شہداء دوسری قسم کے۔ حضرات صدیقین ابتدا ہی سے طبع سلیم کے مالک ہوتے ہیں جو عبارت ہے عقلِ صحیح اور قلبِ سلیم دونوں کے مجموعے سے۔ چنانچہ ایک طرف ان کی اخلاقی حس شروع ہی سے زندہ وبیدار ہوتی ہے اور نہ صرف یہ کہ خیر و شر‘ نیکی وبدی اور ظلم و جور اور عدل و انصاف کا فرق ان پر واضح رہتا ہے بلکہ ان کی طبیعت کا فیصلہ کن میلان جانب خیر اور سمتِ عدل و ادائے حقوق ہی میں رہتا ہے اور دوسری طرف ان پر تعقل و تفکر کا غلبہ بھی ابتدا ہی سے ہوتا ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جستجوئے حق اور اکتشافِ حقیقت کا ایک زوردار داعیہ ان کے نفوس میں پیدا ہوجاتا ہے‘ چنانچہ ایک جانب ان کی عقل سلیم کتاب فطرت اور صحیفۂ کائنات کے مطالعے سے حقائق کونیہ کے عین در پر جادستک دیتی ہے تو دوسری جانب انہیں اپنے آئینہ قلب میں حقیقت الحقائق کا دھندلا سا عکس بھی نظر آنے لگتا ہے ---یہی وجہ ہے کہ جونہی کسی نبی کی دعوت ان کے کانوں میں پڑتی ہے وہ والہانہ لبیک کہتے ہوئے دوڑ پڑتے ہیں اور انہیں بالکل ایسے محسوس ہوتا ہے کہ ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں تھا !

اس کے برعکس حضراتِ شہداء کے قلوب و اَذہان پر ابتداءً ان کے رجحاناتِ طبعی اور میلاناتِ نفسی کے باعث ایک غلاف سا چڑھا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں نبی کی دعوت پر لبیک کہنے میں دیر لگ جاتی ہے۔ یہ تاخیر اصلاً تو صرف بے توجہی اور لاابالی پن کے باعث ہوتی ہے لیکن ان میں سے بعض اپنے آبائی تعصبات کے باعث شروع میں نبی کی مخالفت اور مزاحمت میں حد درجہ سرگرم بھی ہوجاتے ہیں۔ پھر ان کے قلوب و اذہان کا غلاف بھی اکثروبیشتر کسی عقلی یا استدلالی اپیل سے نہیں بلکہ جذباتی انگیخت ہی سے پھٹتا ہے۔ لیکن پھر ہوتا یہ ہے کہ جیسے ہی اس غلاف میں شگاف پڑتا ہے گویا سارا فاسد مواد ایک

دم خارج ہو جاتا ہے اور دعوتِ حق کو قبول کرنے کے بعد جب وہ برسر عمل ہوتے ہیں تو اپنے فطری جوشِ عمل اور جذبۂ کار کے باعث بظاہر صدیقین پر بھی بازی لے جاتے ہیں اور حضرت مسیح علیہ السلام کے ان الفاظ کا مصداقِ کامل بن جاتے ہیں کہ ''کتنے ہی ہیں جو بعد میں آتے ہیں لیکن اگلوں کو پیچھے چھوڑ جاتے ہیں!'' ----یہ عرض کرنا تحصیل ِ حاصل ہے کہ فرائض ِ رسالت کی ادائیگی میں کم از کم بظاہر احوال حضراتِ شہداء ہی انبیاء کرام علیہم السلام کے اصل دست و بازو نظر آتے ہیں۔

کبارِ صحابہؓ میں سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا صدیقیت کاملہ کی نہایت درخشاں مثالیں ہیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ طبقہ شہداء کی بہترین نمائندگی کرتے ہیں!

جہاں تک حضرات منعم علیہم کے چوتھے گروہ کا تعلق ہے' یعنی حضراتِ صالحین تو یہ وہ عامۃ المؤمنین ہیں جن میں استعداد اور صلاحیت تو موجود ہوتی ہے لیکن ابھی اس کا کوئی نمایاں ظہور کسی خاص رخ پر نہیں ہوا ہوتا۔ مزاج اور افتادِ طبع کے اعتبار سے ان میں پہلی دونوں ہی قسموں کے لوگ موجود ہوتے ہیں۔ گویا ان میں بالقوہ (potentially) تو صدیقین بھی ہوتے ہیں اور شہداء بھی ہوتے ہیں' لیکن ابھی وہ ترفع انہیں بالفعل (actually) حاصل نہیں ہوا ہوتا۔ البتہ اگر وہ اپنی ہمت کو مجتمع کر کے محنت کریں اور خصوصاً حب دنیا کی نجاست سے اپنے دل کو پاک کر لیجئے کا سب سے بڑا علم اور نشان (symbol) حب ِمال ہے' تو جیسا کہ سورۃ الحدید کی آیات ۱۶ تا ۱۹ اور سورۃ البلد کے حوالے سے مفصل بیان کیا جا چکا ہے' وہ اپنے مزاج اور افتادِ طبع کی مناسبت سے صدیقیت یا شہادت کے مراتب عالیہ تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ یعنی جن لوگوں کو بالفعل ترفع حاصل ہوجاتا ہے وہ اگر قسم اول سے تعلق رکھتے ہوں تو زمرۂ صدیقین میں شامل ہو جاتے ہیں اور اگر طبقہ ثانیہ سے ہوں تو حلقہ شہداء میں شریک ہو جاتے ہیں۔ یہاں ضمنی طور پر یہ بھی سمجھ لیا جائے تو اچھا ہے کہ اہل ِتصوّف کی اصطلاح میں پہلی قسم کے لوگ 'سالک مجذوب' کہلاتے ہیں اور دوسری قسم کے لوگ 'مجذوب سالک!'

رہے انبیاء کرام علیہم السلام تو اگرچہ نبوت ایک خالص وہبی اور عطائی ملکہ ہے اور اللہ جسے چاہے یہ نعمت عظمیٰ عطا فرما دے' تاہم بفحوائے آیہ قرآنی :{اَللّٰہُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَہٗ ؕ}(الانعام:۱۲۴) ''اللہ بہتر جانتا ہے کہاں رکھے اپنی رسالت!'' ان کا انتخاب قسم ثالث کے لوگوں ہی میں سے ہوتا ہے جن کی عقلی و فکری قوتیں بھی انتہائی بلندیوں کو چھو رہی ہوتی ہیں اور فعل و عمل کی قوتیں بھی پورے جوبن پر ہوتی ہیں اور پھر ان دونوں کے مابین ایک حسین توازن بھی موجود ہوتا ہے۔ گویا ہر نبی اپنے مزاج کے اجزائے ترکیبی کے اعتبار سے صدیق بھی ہوتا ہے اور شہید بھی۔ اگرچہ ان دونوں اجزائے ترکیبی کی کسی ذاتِ واحد میں بیک وقت بتمام و کمال موجودگی حد درجہ شاذ بلکہ حقیقتاً

کالمعدوم کے حکم میں ہے۔ چنانچہ جن انبیاء و رسل علیہم السلام کے حالات تفصیل سے معلوم ہیں ان میں ان دونوں قوتوں کی بیک وقت بتمام و کمال موجودگی اور پھر ان کے مابین کامل توازن کی مثال تو ایک ہی ہے اور وہ ہے ذاتِ محمدی علی صاحبھا الصلوۃ والسلام ۔ باقی حضرات بھی اگرچہ اپنے اپنے مقام پر نہایت جامع الصفات شخصیتوں کے مالک ہیں، تاہم کسی میں رنگِ صدیقیت نمایاں تر ہے، جیسے حضرت ادریس، حضرت ابراہیم اور حضرت یوسف اور کسی میں رنگِ شہادت زیادہ نمایاں ہے، جیسے حضرت نوح، حضرت اسماعیل اور حضرت موسیٰ علیٰ نبینا و علیہم الصلوٰۃ والسلام۔

نبوت و رسالت

یہاں اس حقیقت کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ نبوت اور رسالت دو مختلف یا علیحدہ چیزیں نہیں ہیں بلکہ ایک ہی حقیقت کے دو پہلو اور ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔ یہ بات تو صد فی صد درست ہے کہ نبوت عام ہے اور رسالت خاص۔ یعنی ہر رسول تو لازماً نبی بھی ہوتا ہے لیکن ہر نبی لازماً رسول نہیں ہوتا۔ اسی طرح یہ حقیقت بھی صد فی صد صحیح ہے کہ منکرین اور مخالفین پر فیصلہ کن غلبے کا وعدہ بھی صرف رسولوں سے ہے انبیاء سے نہیں۔ لیکن جس کسی نے یہ سمجھا ہے کہ رسالت مرتبہ و مقام کے اعتبار سے نبوت سے بلند تر ہے اسے یقیناً مغالطہ ہوا ہے۔

نبوت اور رسالت کے باہمی تعلق کو سرسری طور پر تو یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ نبوت ایک حیثیت یا رتبہ (class or cader) ہے اور رسالت ایک عہدہ یا منصب

(position or appointment) ہے۔ جیسے مثال کے طور پر سی ایس پی ایک حیثیت یا رتبہ ہے اور کسی ضلع کی ڈپٹی کمشنری ایک عہدہ یا منصب ہے۔ جس کسی نے سی ایس پی کا امتحان پاس کر لیا اس کی ایک حیثیت متعین ہو گئی ۔یہ مثال ہے نبوت کی۔ اور جب اس کی تعیناتی کسی ضلع کے ڈی سی کی حیثیت سے ہو گئی تو یہ ایک منصب ہے جو اسے ملا۔ یہ مثال ہے رسالت کی(۳)۔ اب ظاہر ہے کہ اصل اعتبار حیثیت کا ہے جو مستقل ہے، نہ کہ منصب کا جو بدل بھی سکتا ہے۔

اور اگر اسی حقیقت کو مزید گہرائی میں سمجھنا ہو تو اہل تصوف کی اصطلاحات سے مدد لینی ہوگی ۔نبوت مرتبہ عروج میں ہے سیر الی اللہ اور سیر فی اللہ دونوں کو، جبکہ رسالت مرتبہ نزول میں ہے اور عبارت ہے سیر عن اللہ الی اللہ سے۔ گویا نبوت کا اصل رُخ خدا کی جانب ہے اور یہ معراج ہے حیثیتِ عبدیت کی اور اس کے متصل واقع ہے مقام صدیقیت ،جبکہ رسالت کا اصل رخ خلق کی جانب ہے اور اس کے قریب تر ہے مرتبہ شہادت --- مزید واضح الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ صدیقیت ظل ہے مقام نبوت کا اور شہادت ظل ہے مرتبہ رسالت کا !

رسالت اور شہادت

یہی وجہ ہے کہ قرآنِ حکیم میں رسالت اور شہادت کا ذکر اکثر لازم و ملزوم کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ جیسے:

(۱) {اِنَّآ اَرۡسَلۡنَا اِلَیۡکُمۡ رَسُوۡلًا شَاهِدًا عَلَیۡکُمۡ ...} (المزمّل:۱۵)

''ہم نے بھیج دیا ہے تمہاری طرف ایک رسول تم پر گواہ بنا کر۔''

(۲) {اِنَّا اَرۡسَلۡنٰکَ شَاهِدًا...} (الاحزاب:۴۵)

''ہم نے بھیجا ہے تمہیں گواہ بنا کر۔''

(۳) {لِیَکُوۡنَ الرَّسُوۡلُ شَهِیۡدًا عَلَیۡکُمۡ ...} (الحج:۷۸)

''تاکہ ہو جائے رسول گواہ تم پر۔''

(۴) {وَیَکُوۡنَ الرَّسُوۡلُ عَلَیۡکُمۡ شَهِیۡدًا ؕ} (البقرۃ:۱۴۳)

---

(۳) یہی رمز ہے سورۃ الاحزاب کی اس مشہور آیت کے اسلوبِ خطاب میں کہ {یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِیۡرًا ﴿۴۵﴾}

''اور ہو جائے رسول تم پر گواہ!''

گویا بعثتِ رسل کی اصل غرض و غایت بھی شہادت ہے اور کارِ رسالت کی نسبت باطنی بھی شہادت ہی کی جانب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ 'جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا' فرائض رسالت کی ادائیگی میں انبیاء کرام علیہم السلام کے اصل دست و بازو حضراتِ شہداء ہی بنتے ہیں۔ اور یہیں سے سمجھ میں آسکتا ہے تفسیر و تاویل قرآن کا وہ غامض نکتہ کہ کیوں سورۂ مریم میں دو جلیل القدر انبیاء کو تو 'جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ''صِدِّیۡقًا نَّبِیًّا'' قرار دیا گیا اور دو ہی کو ''رَسُوۡلًا نَّبِیًّا'' کہا گیا۔ قرآن حکیم میں کوئی لفظ بے معنی نہیں اور کوئی ترکیب خالی از حکمت نہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہم ہی سرسری طور پر گزر جائیں اور ''علاجِ تنگیٔ داماں'' سے صرفِ نظر کر کے صرف ''چند کلیوں پر قناعت'' کی روش اختیار کر لیں۔ بات بالکل واضح ہے کہ 'جیسے کہ پہلے عرض کیا جا چکا' حضرت ادریس اور حضرت ابراہیم علیہما السلام کے مزاج میں رنگِ صدیقیت نمایاں ہے' گویا ان کا انتخاب صدیقین کے زمرے میں سے ہوا تھا' لہٰذا وہ صِدِّیۡقًا نَّبِیًّا قرار پائے اور حضرت اسماعیل اور حضرت موسیٰ e کے مزاج میں رنگ شہادت نمایاں تر ہے' جو اَقرب اور اَنسب ہے مرتبہ رسالت سے' پس وہ رَسُوۡلًا نَّبِیًّا قرار پائے۔ گویا ؎

گنجینہ معنی کا طلسم اس کو سمجھیو!
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

سیرتِ صدیقیؓ کے عناصر ترکیبی

سُورۃُ اللَّیل کی روشنی میں

حضرات منعم علیہم کے مراتب چہارگانہ کے پس منظر میں مرتبہ صدیقیت کے تعین کے بعد اب آیئے کہ قرآن حکیم ہی سے یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ مقامِ صدیقی کے خصائص کیا ہیں؟ یا بالفاظِ دیگر سیرتِ صدیقی کے عناصر ترکیبی کون کون سے ہیں؟ الحمد للہ کہ قرآن حکیم

میں یہ موضوع ایک ہی مقام پر پورے شرح و بسط کے ساتھ بیان ہو گیا ہے اور آخری پارے کی چھوٹی سورتوں میں سے ایک ہی سورت کا مطالعہ اگر بنظرِ غائر کر لیا جائے تو اس موضوع کے جملہ پہلو واضح ہو جاتے ہیں ---- ہماری مراد سورۃ اللیل سے ہے!

اس سورۂ مبارکہ کے آخری حصے یعنی آیات ۱۷ تا ۲۱ کے بارے میں تو مفسرین کا تقریباً اجماع ہے کہ وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شان میں نازل ہوئیں --- چنانچہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وَقَدْ ذَکَرَ غَیْرُ وَاحِدٍ مِنَ الْمُفَسِّرِیْنَ اَنَّ هٰذِهِ الْآیَاتِ نَزَلَتْ فِیْ اَبِیْ بَکْرٍ الصِّدِّیْقِ، رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ، حَتّٰی اِنَّ بَعْضَهُمْ حَکَی الْاِجْمَاعَ مِنَ الْمُفَسِّرِیْنَ عَلٰی ذٰلِکَ (تفسیر القرآن العظیم لابن کثیر، تفسیر سورۃ اللیل)

''متعدد مفسرین کے نزدیک یہ آیات حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شان میں نازل ہوئی ہیں، یہاں تک کہ ان میں سے بعض کے نزدیک تو اس پر مفسرین کا اجماع ہے!''

اس مضمون کی روایات بھی بکثرت موجود ہیں کہ آیات ۵ تا ۷ یعنی:

{فَاَمَّا مَنۡ اَعۡطٰی وَ اتَّقٰی ۙ﴿ ۵ ﴾ وَ صَدَّقَ بِالۡحُسۡنٰی ۙ﴿ ٦ ﴾ فَسَنُیَسِّرُہٗ لِلۡیُسۡرٰی ؕ﴿ ۷ ﴾ }

''تو جس نے دیا اور پرہیزگاری اختیار کی' اور تصدیق کی اچھی بات کی' تو ہم اس کو آسانی سے پہنچا دیں گے (آخری اور کامل) آسانی میں!''

کے مصداق بھی حضرت صدیق اکبر ہی ہیں' رضی اللہ تعالیٰ عنہ وارضاہ۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دراصل یہ پوری سورت ہی مقام صدیقی کی وضاحت اور سیرتِ صدیقی کے عناصر ترکیبی کی تفصیل پر مشتمل ہے اور اس میں تصویر کا دوسرا رُخ صرف ضمنی طور پر اس قاعدہ کلیہ کے تحت دکھادیا گیا ہے کہ ''تُعْرَفُ الْاَشْیَاءُ بِاَضْدَادِھَا''یعنی کسی شے کی معرفت کے حصول کا ایک ذریعہ یہ بھی ہے کہ اس کے ضد اور مقابل کی معرفت حاصل کر لی جائے ---- گویا یہ سورۂ مبارکہ اصلاً سورۂ صدیقیت ہے! اکابر مفسرین میں سے امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ اس حقیقت کے بہت قریب پہنچ گئے ہیں۔ چنانچہ سورۃ الضحیٰ کی تفسیر میں وہ ارشاد فرماتے ہیں:

سُوْرَۃُ وَاللَّیْلِ سُوْرَۃُ اَبِیْ بَکْرٍ وَسُوْرَۃُ وَالضُّحٰی سُوْرَۃُ مُحَمَّدٍ عَلَیْہِ الصَّلَاۃُ وَالسَّلَامُ ثُمَّ مَا جَعَلَ بَیْنَھُمَا وَاسِطَۃً لِیُعْلَمَ اَنَّہٗ لَا وَاسِطَۃَ بَیْنَ مُحَمَّدٍ وَاَبِیْ بَکْرٍ (تفسیر کبیر' سورۃ الضحیٰ)

''سورۂ واللیل حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی سورت ہے اور سورۂ والضحیٰ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سورت ہے اور (اللہ نے) ان دونوں کے مابین کوئی فصل نہیں رکھا تاکہ یہ حقیقت واضح ہوجائے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مابین کوئی فصل نہیں ہے!''

چہار سورۂ نور و ظلمت

قرآن حکیم کی سورتوں کے بارے میں یہ حقیقت تو خاصی معروف و معلوم ہے کہ اکثر سورتیں دو دو کے جوڑوں کی صورت میں ہیں۔ گویا{وَمِنۡ کُلِّ شَیۡءٍ خَلَقۡنَا زَوۡجَیۡنِ} (الذاریات:۴۹)کا قاعدۂ کلیہ قرآن حکیم کی سورتوں کے باب میں بھی جاری وساری ہے۔ بعض مقامات پر تو یہ حقیقت اتنی روشن وبین ہے کہ اندھوں کو بھی نظر آجائے۔ بعض دوسرے مقامات پر تو قدرے خفی و مخفی ہے اور کسی قدر غور کرنے ہی سے واضح ہوتی ہے۔

سورِقرآنی کے بارے میں ایک خفی تر حقیقت جو گہرے غور و فکر سے سامنے آتی ہے' یہ ہے کہ بعض مقامات پر تین تین سورتوں کے گروپ ہیں' جن میں سے دو دو کی حیثیت تو ''زوجین'' ہی کی ہے' تیسری یا تو ان دونوں کے ضمیمے کی حیثیت رکھتی ہے یا وہ دونوں مل کر اس کا تتمہ بنتی ہیں (سورۂ یونس سے سورۂ نور تک گروپ کی تمام سورتوں کی ترتیب اسی طرز پر ہے!) اور بعض دوسرے مقامات پر دو دو متصل جوڑوں نے باہم مل کر نہایت حسین و جمیل 'چہار سوروں' کی صورت اختیار کر لی ہے۔ (قرآنِ مجید کا آخری پارہ تو ان 'چہار سوروں' سے تقریباً پر ہی

ہے‘ طویل سورتوں میں بھی اس کی نہایت درخشاں مثالیں موجود ہیں ‘جیسے مثلاً سورۃ الفرقان سے سورۃ القصص تک اور سورۃ العنکبوت سے سورۃ السجدہ تک !)

آخری پارے کے ان ’چہار سوروں‘ میں سے ایک نہایت اعلیٰ و ارفع اور حد درجہ حسین و جمیل چہار سورہ‘سورۃالشمس‘سورۃاللیل‘ سورۃ الضحیٰ اور سورۂ الم نشرح پر مشتمل ہے‘ جسے چہار سورۂ ’نور و ظلمت‘ سے موسوم کیا جا سکتا ہے !

اس ’چہار سورے‘ کا پہلا جوڑا سورۃالشمس اور سورۃ اللیل پر مشتمل ہے اور دوسرا سورۃالضحیٰ اور الم نشرح پر۔ اور یہ حقیقت بادنیٰ تامل نظر آجاتی ہے کہ جبکہ پہلی دونوں سورتیں مطالع اور عمود دونوں کے اعتبار سے مستقل اور مکمل سورتوں کی حیثیت رکھتی ہیں وہاں مؤخر الذکر جوڑے کی دوسری سورت پہلی کے ساتھ اس طرح مربوط اور مسلسل ہے کہ بظاہر محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یہ کہ ایک ہی سورت کے اجزا ہوں (چنانچہ تابعین کرامؒ میں سے حضرت طائوس اور حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہما اللہ کے بارے میں منقول ہے کہ یہ دونوں حضرات سورۃ الضحیٰ اور سورۂ الم نشرح کو نماز کی ایک ہی رکعت میں بغیر کسی فصل کے پڑھتے تھے !) گویا یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ چہار سورہ مضمون کے اعتبار سے تین اجزاء پر منقسم ہے‘چنانچہ اس کا جزوِ اوّل سورۃالشمس پر مشتمل ہے‘ جزوِ ثانی سورۃاللیل پر اور جزو ثالث سورۃالضحیٰ اور سورۃ الم نشرح پر! حاصل کلام یہ کہ اس ’چہار سورۂ نور و ظلمت‘ میں سورۃاللیل کو مرکزی اہمیت حاصل ہے !

ان تینوں اجزاء کے بارے میں ایک حقیقت تو اظہر من الشمس ہے ‘یعنی یہ کہ تینوں کا آغاز قسموں سے ہوتا ہے ۔ان قسموں میں اَضداد کے جوڑوں کی شہادت قدرِ مشترک ہے اور اِن اَضداد میں سے بھی خصوصاً ایک جوڑا یعنی نور و ظلمت تینوں میں مشترک ہے۔

ایک دوسری لطیف تر حقیقت یہ ہے کہ ان تینوں اجزاء میں مقسم بہٖ تدریجاً سکڑتا اور سمٹتا چلا گیا ہے جبکہ مقسم علیہ ایک کلی کے مانند کھلتا وکُھلتا اور تدریجاً ترقی کرتا چلا گیا ہے۔ چنانچہ سورۃالشمس میں چار متضاد جوڑوں کی شہادت پیش کرنے کے بعد ‘جن میں سے تین آفاقی ہیں یعنی شمس و قمر‘ لیل و نہار اور ارض و سماء ‘اور ایک انفسی ہے یعنی امتیازِ فجور و تقویٰ‘ مقسم علیہ کو صرف دو جملوں میں سمیٹ لیا گیا:

{قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ زَکّٰىہَا ۪ۙ﴿۹﴾ وَ قَدۡ خَابَ مَنۡ دَسّٰىہَا ﴿۱۰﴾}

یعنی کامیاب وکامران ہو گیا وہ جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کر لیا اور ناکام و نامراد اور خائب و خاسر رہ گیا وہ جس نے اپنے نفس ناطقہ کو اپنے وجودِ حیوانی کے تودۂ خاک میں دبا کر گویا زندہ درگور کر دیا۔

سورۃ اللیل میں شہادت میں صرف دو جوڑے پیش کیے گئے۔ ایک آفاقی یعنی رات اور اس کی ظلمت اور دن اور اس کی روشنی اور دوسرا انفسی یعنی تقسیم نر و مادہ۔ اور مقسم علیہ کو اولاً

ایک آیت میں بیان کر کے یعنی {اِنَّ سَعۡیَکُمۡ لَشَتّٰی ؕ﴿۴﴾}(یقیناً تمہاری سعی و جُہد (کے نتائج) بھی مختلف ہیں!)اس کی مفصل تشریح و توضیح چھ نہایت جامع آیات میں کردی --- یعنی{فَاَمَّا مَنۡ اَعۡطٰی وَ اتَّقٰی ۙ﴿۵﴾ وَ صَدَّقَ بِالۡحُسۡنٰی ۙ﴿۶﴾ فَسَنُیَسِّرُہٗ لِلۡیُسۡرٰی ؕ﴿۷﴾ }جو گویا شرح و تفسیر ہے{قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ زَکّٰىہَا ۪ۙ﴿۹﴾ }کی -- اور {وَ اَمَّا مَنۡۢ بَخِلَ وَ اسۡتَغۡنٰی ۙ﴿۸﴾ وَ کَذَّبَ بِالۡحُسۡنٰی ۙ﴿۹﴾ فَسَنُیَسِّرُہٗ لِلۡعُسۡرٰی ﴿۱۰﴾ } جو گویا تفسیر و تفصیل ہے :{وَ قَدۡ خَابَ مَنۡ دَسّٰىہَا ﴿۱۰﴾ }کی۔

آخری جزو میں مقسم بہ تو مزید سمٹ گیا۔ چنانچہ سورۃ الضحیٰ میں اَضداد کے جوڑوں میں سے صرف ایک کی شہادت پیش کی گئی ‘یعنی دن اور اس کی روشنی اور سرگرمی اور رات اور اس کی تاریکی اور سکون‘ اور سورۂ الم نشرح کا آغاز بغیر کسی تمہیدی قسم کے ہو گیا (اگرچہ اس چہار سورے کے مجموعی مزاج کی مناسبت سے سورت کے درمیان میں ازواج متضادہ میں سے عسر اور یسر کا ذکر بتکرار کر دیا گیا) لیکن مقسم علیہ انتہائی بلندی کو پہنچ گیا ۔ چنانچہ احوالِ نبوت کے بعض اہم گوشے اور ذاتِ نبوی c کے بعض حد درجہ نازک احساسات زیر بحث آئے اور ان کے ضمن میں تسلی بھی دی گئی ‘ دلجوئی بھی کی گئی اور چند ہدایات بھی دی گئیں۔

حیرت کی بات ہے کہ اس کے باوجود کہ قرآن مجید کی ان دو سورتوں سے امت کی ایک عظیم اکثریت کو ایک خصوصی قلبی لگاؤ ہے‘ اکثر لوگ ان کے معانی کے باب میں حد درجہ سطحی سے فہم پر قناعت کیے ہوئے ہیں ‘حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ا دونوں سورتوں کے مضامین نہایت رفیع و وقیع بھی ہیں اور حد درجہ غامض اور عمیق بھی ! تاہم سردست یہ موضوع ہماری بحث سے خارج ہے اور مضمون زیر بحث کی مناسبت سے فی الحقیقت یہ سمجھ لینا کافی ہے کہ اس ’چہار سورۂ نور و ظلمت‘ کے پہلے جزو میں ایک مضمون کا آغاز ہوتا ہے‘ دوسرے میں وہ انسانی کسب کے دائرے کی حد تک مکمل ہو جاتا ہے‘ اس لیے کہ تیسرے میں اس کے وہ پہلو بیان ہوئے ہیں جو مرتبۂ نبوت سے متعلق ہیں اور نبوت چونکہ خالص وہبی‘ ملکہ ہے‘ لہٰذا انسانی کسب کے دائرے سے باہر ہیں۔

* * *

(ایک نشری تقریر)

قرآن حکیم کی رو سے انسان کی غایتِ تخلیق ہے 'عبادتِ رب' بفحوائے الفاظِ قرآنی: {وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴿ ٥٦ ﴾} (الذّٰریٰت)یعنی ''میں نے جنوں اور انسانوں کو پیدا ہی اس لیے کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں!''--یہ 'عبادتِ ربّ' قرآن حکیم کی ایک نہایت جامع اور ہمہ گیر اصطلاح ہے جس کے جملہ پہلوئوں کا احاطہ اس وقت نہ ممکن ہے نہ مطلوب۔البتہ اس کے اصل جوہر اور لب ِلباب کی جانب رہنمائی فرما دی ہے صاحب ِجوامع الکلم ﷺ نے اپنے ان حد درجہ مختصر لیکن غایت درجہ جامع فرموداتِ مبارکہ میں کہ: ((اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ)) --- اور --- ((اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ)) یعنی ''دعا ہی عبادت کا جوہر اور مغز ہے'' ---بلکہ ''دعا ہی اصل عبادت ہے۔'' (ترمذی)

یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں بکثرت دعائیں وارد ہوئی ہیں۔ کہیں انشائیہ اسلوب میں یعنی نبی اکرم ﷺ اور آپؐ کی وساطت سے جملہ اہل ِایمان کو تلقین کے پیرائے میں کہ یوں کہو' یایوں دعا مانگو 'جیسے :{وَ قُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا ﴿ ١١٤ ﴾}(طٰہٰ)یعنی ''کہو کہ اے میرے ربّ میرے علم میں اضافہ فرما''۔کہیں خبریہ انداز میں --- یعنی سابقہ انبیاء و رسل اور صلحاء و ابرار کی دعائوں کے نقل کرنے کی صورت میں' یا عمومی طور پر اپنے محبوب اور نیکوکار بندوں کے دلی احساسات و جذبات کی ترجمانی کے انداز میں --- مقدّم الذکر دعائوں کی نہایت درخشاں مثالیں ہیں حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی نہایت جامع دعا کہ:

{رَبَّنَا وَ اجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ }(البقرۃ:١٢٨)

''اے ربّ ہمارے !ہم دونوں کو بھی اپنا تابع فرمان بنائے رکھ اور ہماری نسل میں

سے بھی اپنی ایک فرماں بردار اُمت برپا کیجیو!''

یا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وہ دعا جو انتہائی کسمپرسی اور بے چارگی کے عالم میں ان کے قلب کی گہرائیوں سے اس وقت نکلی جب وہ مصر سے جان بچا کر بھاگے اور سینکڑوں میل کا سفر طے کر کے مدین پہنچے جہاں کوئی یارومددگار تو کیا ہوتا' جاننے اور پہچاننے والا بھی نہ تھا۔ اس عالم میں انہوں نے دعا کی کہ:

{رَبِّ اِنِّيْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ ﴿ ٢٤ ﴾} (القصص)

''اے میرے رب ! میں سراپا محتاج ہوں ہر اس خیر کا جوتُو میری جھولی میں ڈال دے۔''

مؤخر الذکر دعائوں کی نہایت درخشاں مثالیں سورۃ الفرقان کے آخری رکوع میں ملتی ہیں' جہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص بندوں یعنی 'عباد الرحمٰن' کے دلی احساسات و جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے فرمایا ہے :

{وَ الَّذِیۡنَ یَقُوۡلُوۡنَ رَبَّنَا ہَبۡ لَنَا مِنۡ اَزۡوَاجِنَا وَ ذُرِّیّٰتِنَا قُرَّۃَ اَعۡیُنٍ وَّ اجۡعَلۡنَا لِلۡمُتَّقِیۡنَ اِمَامًا ﴿۷۴﴾} (الفرقان)

''اے ربّ ہمارے ! ہمیں عطا فرما ہماری بیویوں اور اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک اور بنا ہمیں خدا ترس لوگوں کا پیش رو۔''

مزید برآں خبریہ اسلوب ہی میں قرآن مجید میں بیان ہوئی ہیں وہ دعائیں بھی جو عالمِ آخرت کے مختلف مراحل و مواقع یعنی میدانِ حشر' پل صراط اور جنت و دوزخ میں مانگیں گے' اہلِ حق و ہدایت یا اہلِ زیغ وضلال ! قرآن حکیم کی دعائوں میں جامع ترین اور ہر اعتبار سے کامل و اکمل دعا ہے سورۃ الفاتحہ جس میں مکمل ترجمانی ہے فطرتِ انسانی کی -- اور جس کے ضمن میں ادعیۂ قرآنیہ کا ایک دوسرا نادر اسلوب سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ اس کے آغاز میں نہ انشائیہ انداز ہے نہ خبریہ یعنی نہ فعل امر ' قُل' -- یا -- 'قُوْلُوا' وارد ہوا ہے نہ فعل ماضی یا مضارع ' قَالُوْا' یا 'یَقُوْلُوْنَ' -- گویا اسلوبِ بیان یہ اختیار کیا گیا کہ یہ ہے وہ صدا یا دعا جو ایک سلیم الفطرت اور سلیم العقل انسان کے قلب کی گہرائیوں سے از خود نکلتی ہے یا نکلنی چاہیے۔

اسی اسلوب کی دوسری نہایت اعلیٰ مثالیں ہیں وہ دعائیں جو ''الزَّھْرَاوَین'' یعنی سورۃ البقرۃ اور سورۂ آل عمران' دونوں کے آخر میں وارد ہوئی ہیں۔ چنانچہ سورۃ البقرۃ کی آخری

آیت کا آغاز تو ہوتا ہے نہایت شاہانہ انداز میں ان قوانینِ الٰہیہ کے بیان سے کہ: {لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَہَا} ''اللہ نہیں مکلّف ٹھہراتا کسی کو مگر اس کی وسعت کے مطابق''۔{لَہَا مَا کَسَبَتۡ وَ عَلَیۡہَا مَا اکۡتَسَبَتۡ} ''اُس کو ملے گا جو اس نے کمایا ہو گا اور اُسی پر پڑے گی جو برائی اُس نے کی ہو گی !''----------اور اس کے بعد بغیر کسی انشائیہ یا خبریہ تمہید کے دعا شروع ہو جاتی ہے:

{رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذۡنَاۤ اِنۡ نَّسِیۡنَاۤ اَوۡ اَخۡطَاۡنَا ۚ رَبَّنَا وَ لَا تَحۡمِلۡ عَلَیۡنَاۤ اِصۡرًا کَمَا حَمَلۡتَہٗ عَلَی الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِنَا ۚ رَبَّنَا وَ لَا تُحَمِّلۡنَا مَا لَا طَاقَۃَ لَنَا بِہٖ ۚ وَ اعۡفُ عَنَّا ۟ وَ اغۡفِرۡ لَنَا ۟ وَ ارۡحَمۡنَا ۟ اَنۡتَ مَوۡلٰىنَا فَانۡصُرۡنَا عَلَی الۡقَوۡمِ الۡکٰفِرِیۡنَ ﴿۲۸۶﴾ ٪}

''اے ربّ ہمارے ! نہ گرفت فرما ہماری اگر ہم بھول جائیں یا غلطی کر بیٹھیں۔ اے ربّ ہمارے ! مت عائد فرما ہم پر ایسی ذِمہ داریاں جیسی کہ تُو نے عائد کیں ہم سے پہلے والوں پر' اور نہ ڈال ہم پر وہ جس کی ہم طاقت نہ رکھتے ہوں' اور درگزر فرما ہم سے' اور بخشش فرما ہماری' اور رحم فرما ہم پر' اور مدد فرما ہماری کافروں کے مقابلے میں۔''

بالکل یہی اسلوب سورۂ آل عمران کے آخری رکوع میں ہے کہ: {الَّذِیۡنَ یَذۡکُرُوۡنَ اللّٰہَ قِیٰمًا وَّ قُعُوۡدًا وَّ عَلٰی جُنُوۡبِہِمۡ} کے فوراً بعد بغیر کسی فعل ' قَالُوۡا' یا 'یَقُوۡلُوۡنَ' کے آغاز ہوجاتا ہے اس عظیم دعا کا جو {رَبَّنَا مَا خَلَقۡتَ ہٰذَا بَاطِلًا ۚ} سے شروع ہوتی ہے -- اور --- {اِنَّکَ لَا تُخۡلِفُ الۡمِیۡعَادَ ﴿۱۹۴﴾} پر ختم ہوتی ہے۔

==========

سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۵۰ میں بنی اسرائیل کی تاریخ کے ایک اہم واقعہ کے ضمن میں حضرت طالوت کے اہلِ ایمان ساتھیوں کی وہ دُعا نقل ہوئی ہے جو انہوں نے اُس وقت مانگی تھی جب اُن کا سامنا جالوت اور اس کے لشکر سے ہوا۔ ارشاد ہوتا ہے:

{وَ لَمَّا بَرَزُوۡا لِجَالُوۡتَ وَ جُنُوۡدِہٖ قَالُوۡا رَبَّنَاۤ اَفۡرِغۡ عَلَیۡنَا صَبۡرًا وَّ ثَبِّتۡ اَقۡدَامَنَا وَ انۡصُرۡنَا عَلَی الۡقَوۡمِ الۡکٰفِرِیۡنَ ﴿۲۵۰﴾}

''جب وہ سامنے ہوئے جالوت اور اس کی فوجوں کے تو انہوں نے کہا: اے رب ہمارے ! انڈیل دے ہم پر صبر اور جما دے ہمارے قدم اور مدد فرما ہماری کافروں کے مقابلے میں !''

بادنیٰ تأمل واضح ہوجاتا ہے کہ اس دُعا میں ایک عکس کامل موجود ہے یا بالفاظِ دیگر یہ مکمل خلاصہ ہے اس مفصل اور عظیم دعا کا جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اور جس پر سورۃ البقرۃ ختم ہوتی ہے۔ اور ذرا غور کرنے سے معلوم ہوجاتا ہے کہ اس مناسبت و مشابہت کا سبب کیا ہے۔ تاریخ بنی اسرائیل میں معرکۂ طالوت و جالوت کو وہی مقام اور اہمیت حاصل ہے جو اُمّتِ محمد علی صاحبھا الصلو السلام کی تاریخ میں غزوۂ بدر کو حاصل ہے کہ جس طرح بنی اسرائیل کے دورِ عروج یا عہد زریں یعنی ملک دائود و سلیمان علیہما السلام کا آغاز ہوا معرکہ طالوت و جالوت سے' اسی طرح اسلام کا وہ دورِ غلبہ و عروج شروع ہوا غزوۂ بدر سے 'جس کا نقطۂ کمال یعنی climax ہے خلافتِ حضرات صدیق اکبر و فاروق اعظم و عثمان غنی رضوان اللہ علیہم اجمعین --- اب اگر یہ بات پیش نظر رہے کہ سورۃ البقرۃ کا زمانہ نزول ہے ہجرت کے متصلاً بعد سے لے کر غزوۂ بدر سے متصلاً قبل تک تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے ساتھیوں کو ماضی کی تاریخ کے اس ورق کے ذریعے دراصل دکھایا جارہا ہے آنے والے حالات و واقعات کا ایک واضح عکس 'کہ جس طرح سامنا کرنا پڑا تھا حضرت طالوت کے مٹھی بھر بے سروسامان اہلِ ایمان ساتھیوں کو جالوت کے غرقِ آہن لشکروں کا' اسی طرح تمہارا مقابلہ ہونے والا ہے کل تین سو تیرہ کی تعداد اور نہایت بے سروسامانی کی حالت میں قریش کے ایک ہزار کیل کانٹے سے لیس غرقِ آہن سورمائوں سے --- اور جس طرح صبر و ثبات کے صلے میں اللہ تعالیٰ نے انہیں فتح دی تھی ان کے دشمنوں پر اسی طرح اگر تم بھی صبر کا دامن تھامے رکھو اور اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید پر بھروسہ رکھو تو وہ (اللہ) تمہیں بھی فتح عطا فرمائے گا تمہارے دشمنوں پر۔ یہی وجہ ہے کہ سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۵۰ میں نبی اکرم ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کو وہ دعا بھی سنا دی گئی جو

حضرت طالوت کے ساتھیوں نے مانگی تھی اور پھر آیت ۲۸۶ میں وہ مفصل دعا بھی تلقین فرما دی گئی جو اب نکلنی چاہیے اہلِ ایمان کے قلوب کی گہرائیوں سے --- اور اسی پر ختم فرما دیا اس سورۂ مبارکہ کو --- ! !

واضح رہے کہ دعا کی اصل روح ہے اللہ کے سمیع و بصیر اور عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ہونے کا یقین کامل - اور اسی کی نصرت و تائید اور اور توفیق و تیسیر پر کامل توکل و اعتماد -- اور یہی دونوں چیزیں ہیں جو ہمیں ان دونوں دعائوں کے ایک ایک حرف میں رچی بسی نظر آتی ہیں۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَoo